
www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

[illegible]



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)------ 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ------ 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا------ 6000 روپے

مستقل سلسلے

ستمبر 2015

جلد 30 شمارہ 9

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: 91 بی، فرسٹ فلور، محمد علی ایجوکیشن سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32756872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

آپس کی بات

شعاع ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ ملک بھر میں امن و امان کی صورت حال میں بہت بہتری آئی ہے۔ شہر کراچی کی رونقیں بھی واپس لوٹ رہی ہیں۔ شہر کی رونقیں بحال ہو رہی ہیں۔ بہت سالوں بعد ایسا ہوا ہے کہ عید پورے اہتمام اور جوش و خروش سے منائی گئی۔ مارکیٹوں اور شاپنگ مالز میں بھرپور خریداری ہوئی اور کہیں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

جشن آزادی پر بھی غیر معمولی جوش و جذبے کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ لوگوں کے چہروں پر خوشی و مسرت کے وہ رنگ نظر آئے جو کئی سالوں سے ناپید ہو چکے تھے۔ شہر روشنیوں سے جگمگا رہا اور سبز ہلالی پرچموں کی بہار میں ملی نغموں اور ترانوں کی آوازیں گونجتی رہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ ملک اور یہ شہر ہمیشہ شاد و آباد رہے۔ آمین۔

پاکستان زندہ باد۔

عید نمبر۔ قارئین سے سروے،

شعاع کا اکتوبر کا شمارہ عیدالاضحیٰ سے پہلے آئے گا۔ اس لیے عید نمبر ہوگا۔ عید نمبر میں عیدالاضحیٰ کے حوالے سے تحریریں اور سلسلے شامل ہوں گے اور حسب روایت قارئین کی شرکت کے لیے سروے بھی شامل ہوگا۔

سروے کے سوال یہ ہیں۔

1۔ عیدالاضحیٰ کا دن کیسے گزرتا ہے؟ کیا آپ قربانی کے گوشت کی صفائی، تقسیم اور دیگر کاموں میں حصہ لیتی ہیں؟

2۔ ہر گھر کی ایک روایتی ڈش ہوتی ہے جو خاص موقعوں پر بنائی جاتی ہے۔ گوشت کی وہ کون سی خاص ڈش ہے جو بقرعید پر آپ کے گھر میں ضرور بنتی ہے۔ قارئین کے لیے اس کی ترکیب بھی لکھیں۔

3۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر مہمانوں کی تواضع کے لیے آپ کیا اہتمام کرتی ہیں؟ میٹھے میں کیا بناتی ہیں؟

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 16 ستمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

جب ہم ملے،

قارئین سائرہ رضا کی فرحین کو تو نہیں بھولے ہوں گے۔ بظاہر شوخ، لاپروا اور بے نیاز۔ اندر سے حساس، رشتوں اور رشتوں کا پاس کرنے والی۔

قارئین کے لیے خوشخبری ہے کہ پچھلے دو سالوں کی طرح اس بار بھی سائرہ رضا آپ کے لیے عیدالاضحیٰ کا تحفہ لائی ہیں۔ فرحین کی ایک اور کہانی آپ اکتوبر کے شمارے میں پڑھ سکیں گی۔

اس شمارے میں،

- مہوش افتخار کا مکمل ناول۔ جام آئندہ،
- نادیہ ... کا مکمل ناول۔ محبت روشنی ہے،
- سمیرا نادر کا مکمل ناول۔ ریت کی دیوار،
- رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- عائشہ کرم اور عقیلہ ایوب کے ناولٹ،
- میمونہ صدف، امل رضا، تنزیلہ ریاض، میرا شیخ، اقصیٰ رابعہ، فروا مشکور اور عظمیٰ صدیقی کے افسانے،
- باصلاحیت فنکار، اداکار ماہر قریشی سے ملاقات، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- آئینہ منقی کا مستقل سلسلہ، پیارے نبی کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شمارہ آپ کو کیسا لگا، ضرور بتائیے گا۔ منتظر رہیں۔

حمد باری تعالیٰ

اک حمد لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشم دل
یا صمد لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشم دل

رحمان تو، رحیم تو، عظیم تو، کریم تو!
خود کو عبد لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشم دل

آدم کا خطا پوش ہے تو ازل سے مولا
تجھے ابد لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشم دل

جبّاری و قہاری سے محفوظ مجھے رکھا
رحمٰن و رحیم لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشم دل

میں نے تیرے سوا مدد کسی اور سے نہ مانگی
المدد لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشم دل

رضاؤں میں رہی خوش نہ ملے ثمر انو کھے سے
الحمد لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشم دل

اپنی آغوش کی چھاؤں میں تو نے رکھا ہے ہر پل
اپنا مرقد لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشم دل

کوثر تیری یادوں میں فنا ہو میرے سبحان
تجھ کو اعلیٰ لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشم دل

کوثر خالد

نعت رسول مقبول ﷺ

پھر پیش نظر گنبد خضرا ہے حرم ہے
پھر نام خدا روضۂ جنت میں قدم ہے

پھر شکر خدا سامنے محراب نبی ہے
پھر سر ہے مرا اور ترا نقش قدم ہے

محراب نبی ہے کہ کوئی طور تجلی
دل شوق سے لبریز ہے اور آنکھ بھی نم ہے

پھر منت دربان کا اعزاز ملا ہے
اب فکر ہے کسی کا نہ کسی چیز کا غم ہے

یہ ذرۂ ناچیز ہے خورشید بداماں
دیکھ ان کے غلاموں کا بھی کیا جاہ و حشم ہے

ہر موئے بدن بھی جو زباں بن کے کرے شکر
کم ہے بخدا ان کی عنایات سے کم ہے

عالم توحید کا مظہر ہے کہ جس میں
مشرق ہے نہ مغرب ہے عرب ہے نہ عجم ہے

دل نعت رسول عربی کہنے کو بے چین
عالم ہے تحیّر کا زباں ہے نہ قلم ہے

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

بالوں کو سیاہ خضاب سے رنگنا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ فتح مکہ والے دن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ رضی اللہ عنہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں) پیش کیا گیا اور ان کا سر اور داڑھی سفیدی میں ثغامتہ (بوٹی) کی طرح تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اس کے سفید بالوں کو بدل دو، لیکن ان کو سیاہ کرنے سے بچو۔" (مسلم)

فوائد و مسائل : ابو قحافہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد کی کنیت ہے۔ ان کا نام عثمان بن عامر ہے۔ انہوں نے فتح مکہ والے دن اسلام قبول کیا۔

ثغامتہ، پہاڑوں میں پیدا ہونے والی ایک بوٹی ہے جو بالکل سفید ہوتی ہے۔ ان کے بال بھی سفید تھے، اس لیے آپ نے انہیں رنگنے کا حکم دیا، لیکن سیاہ کرنے سے منع فرمایا، جس سے معلوم ہوا کہ کسی ناگزیر صورت کے علاوہ، سر یا داڑھی کے بالوں کو سیاہ کرنا ممنوع ہے۔

قزع کی ممانعت یعنی سر کے کچھ بال مونڈ لینا اور کچھ چھوڑ دینا اور مرد کے لیے سر کے بالوں کا مونڈنا جائز ہے، لیکن عورت کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قزع (کچھ بالوں کے مونڈنے) سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ : قزع کے معنی ہیں : کچھ بال منڈوا لینا اور کچھ چھوڑ دینا۔ یہ منع ہے۔ آج کل پیالہ کٹ اس کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

کچھ بال مونڈنا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچے کو دیکھا کہ اس کے سر کے کچھ بال مونڈے ہوئے ہیں اور کچھ چھوڑے ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع فرمایا اور حکم دیا۔

"اس کے سارے بال مونڈ دو یا سارے بال چھوڑ دو۔" (اسے ابو داؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے جو کہ بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔)

فوائد و مسائل : کہتے ہیں کہ یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے منع فرمایا تاکہ اہل کتاب سے مشابہت نہ ہو کیونکہ بعض احبار و رہبان اس طرح کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اہل شروفسق کی بھی یہ عادت تھی۔ تاہم کسی بیماری یا عذر کی وجہ سے ایسا کرنا جائز ہے۔

بہرحال یا تو سارے بال منڈا دیے جائیں یا پھر سارے بال اس انداز سے رکھے جائیں کہ عورتوں سے مشابہت نہ ہو۔

بین کرنا

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر

رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کو (ان کی شہادت پر رونے کی) تین دن مہلت دی پھر ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا:

"آج کے بعد میرے بھائی پر مت رونا۔" پھر فرمایا

"میرے بھتیجوں کو میرے پاس بلاؤ۔" چنانچہ ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا گویا کہ ہم چوزے ہیں۔

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نائی کو میرے پاس بلاؤ۔" چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا اور اس نے ہمارے سر مونڈ دیے۔ (اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے جو کہ بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔)

فوائد و مسائل : 1۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے۔

یہ جنگ موتہ میں شہید ہو گئے تھے۔ شہادت اگرچہ ایک اعزاز ہے 'لیکن گھر والوں کو وقتی طور پر دائمی جدائی کا صدمہ تو بہرحال ہوتا ہے 'اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھر والوں کو بھی تین دن تک سوگ منانے کی اجازت دی۔

2۔ رونے کا مطلب یہ نہیں کہ تین دن تک نوحہ و بین کرنے کی اجازت دی۔ یہ تو ممنوع ہے۔ بلکہ مطلب وہ رونا ہے جو ان ایام میں تعزیت کے لیے آنے والوں سے گفتگو کے دوران میں فطری طور پر ہوتا ہے اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں 'اس طرح کا رونا اگرچہ تین دن کے بعد بھی جائز ہے 'اس لیے اس میں تین دن کے بعد رونے سے جو منع فرمایا گیا ہے تو یہ نہی تنزیہی ہے۔ تحریمی نہیں۔

چھوٹے بچوں نے اپنے آپ کو چوزہ اس لیے کہا کہ والد کی جدائی نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔

3۔ اس حدیث کو یہاں لانے سے اصل مقصد سر کے بالوں کے مونڈنے کا اثبات ہے 'جس کا اس میں ذکر ہے 'خاص طور پر چھوٹے بچوں کا۔ اگرچہ پورے بال رکھنا 'جنہیں پٹے کہا جاتا ہے 'افضل ہے 'کیونکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پٹے بال رکھے ہوئے تھے۔

عورت کے بال منڈوانا

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو اپنے سر کے بال منڈوانے سے منع فرمایا ہے۔ (نسائی)

فائدہ : عام حالات میں تو مردوں کی مشابہت سے بچنا عورت کے لیے ضروری ہے 'البتہ علاج وغیرہ کے لیے 'ضرورت پڑنے پر اس کی اجازت ہوگی۔

مصنوعی بال (وگ) جوڑنے اور گودنے اور دشر یعنی دانتوں کو باریک کرنے کی حرمت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"یہ اللہ تعالیٰ کے سوا مونث چیزوں ہی کو پکارتے ہیں اور صرف سرکش شیطان کی پوجا کرتے ہیں جس پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ اور شیطان نے (اللہ سے) کہا میں ضرور تیرے بندوں میں سے ایک مقرر حصہ لوں گا اور انہیں ضرور گمراہ کروں گا اور ان کو آرزوؤں میں مبتلا کروں گا اور میں انہیں حکم دوں گا کہ وہ (بتوں کے نام پر) جانوروں کے کانوں کو چیریں اور میں انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں میں ضرور تبدیلی کریں گے۔"

فائدہ آیات : اس میں ایک تو مشرکوں کی اس عادت کا بیان ہے کہ وہ جن بتوں کی پوجا کرتے تھے ان کے نام مونثوں والے ہوتے تھے یا مونث قسم کی چیزوں کی عبادت کرتے تھے 'جیسے فرشتوں کی 'جن کو وہ اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ان کے متعدد بتوں کے نام بھی مونث ہی تھے 'جیسے عزیٰ 'اساف 'نائلہ وغیرہ۔ بتوں کی عبادت کو شیطان کی عبادت قرار دیا 'اس لیے کہ وہی اس کا باعث تھا اور ہے۔ پھر اس کے سوا ان سے وہ لوگ جو اور غلط کام کرتے تھے 'انہیں بیان فرمایا۔

گیا ہے۔ اس عمل سے ایک اللہ کی پیدا کی صورتوں میں وہ تبدیلیاں ہیں جن کی تفصیل احادیث میں بیان کی گئی ہے۔

مصنوعی بال لگانا

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میری بچی کو حصبہ (جلدی بیماری) لگی جس سے اس کے بال جھڑ گئے ہیں۔ اور میں نے اس کی شادی کردی ہے۔ کیا میں اس میں مصنوعی بال جوڑ سکتی ہوں؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے بال جوڑنے والی پر اور اس پر جس کے بال لے کر جوڑے جائیں، لعنت فرمائی ہے۔" (بخاری و مسلم)

اور ایک روایت میں ہے: "بال جوڑنے والی اور بال جوڑنے کی خواہش کرنے والی۔" (پر لعنت فرمائی ہے۔)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح کی ایک روایت منقول ہے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ:

1۔ اس میں تین قسم کی عورتوں کا بیان ہے۔ بال جوڑنے یا ملانے والی۔

دوسری اس کی خواہش کرنے والی۔

تیسری جس کے بال لے کر کسی عورت کے بالوں میں ملائے جائیں۔ یہ تینوں ملعون ہیں۔ آج کل ان مصنوعی بالوں کو وگ کہا جاتا ہے۔ بیوٹی پارلروں کے ذریعے سے وگیں وغیرہ لگانے اور دیگر بے حیائی کے کاموں کو خوب فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

ہلاکت

حضرت حمید بن عبدالرحمن بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حج کے سال منبر پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا اور انہوں نے بالوں کا ایک گچھا لے کر ہاتھ میں پکڑا جو ایک پہرے دار کے ہاتھ میں تھا انہوں نے فرمایا:

"اے اہل مدینہ! تمہارے علماء کہاں ہیں؟ (جو تمہیں برائی سے روکتے نہیں۔) میں نے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے کام سے منع کرتے ہوئے سنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

"بنی اسرائیل اس وقت ہی ہلاک ہوئے جب ان کی عورتوں نے ان کاموں کو اختیار کرلیا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اشارہ عورتوں کے لیے کاموں کی طرف تھا جن کا ذکر پچھلی حدیث میں گزرا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ارباب اختیار کسی برائی کو پھیلتے ہوئے دیکھیں تو نہ خود بھی اس پر تنقید کریں اور لوگوں کو اس سے روکیں اور علماء کو بھی اس طرف متوجہ کریں۔ تاکہ وہ بھی اس کے خلاف اپنی آواز بلند کریں۔

2۔ لوگوں میں منکرات کی اشاعت کے خلاف آواز بلند نہ کرنا ہلاکت اور غضب الٰہی کا باعث ہے۔

3۔ اس میں آج کل کے مسلمانوں کے لیے بھی سخت تنبیہ ہے کہ مسلمان عورتوں میں بے پردگی، بازاری عورتوں کی طرح سولہ سنگھار کرکے اور مجسم دعوت نظارہ بن کر گھر سے باہر نکلنا اور اپنے حسن و جمال کا مظاہرہ عام کرنا وغیرہ جیسی بیماریاں عام ہو گئی ہیں جو بالوں کو جوڑنے اور جڑوانے سے کہیں زیادہ شدید جرم اور بے حیائی کا ارتکاب ہے۔

گدوانا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بال جوڑنے والی اور جڑوانے والی اور گودنے والی اور گدوانے والی پر لعنت فرمائی ہے۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ واشمہ: وشم کرنے والی۔ وشم کا مطلب ہے کہ

جلد میں سوئی وغیرہ چبھو کر خون نکالنا اور پھر اس جگہ پر سرمہ یا نیل وغیرہ بھر دینا تاکہ وہ جگہ سیاہ یا سبز ہو جائے۔ اسے گودنا کہتے ہیں۔ عہد رسالت کے عرب معاشرے میں حسن و جمال کے اضافے کے لیے عورتوں میں یہ طریقہ رائج تھا جیسے کسی کے بال لے کر اپنے بالوں میں جوڑنے کا رواج تھا۔ اور مستوشمہ وہ عورت ہے جو کسی عورت سے وشم کرنے کا مطالبہ کرے۔ یہ اللہ کی پیدائش میں تبدیلی کرنا ہے' اس لیے یہ کام کرنے اور کرانے والیاں سب ملعون ہیں۔

2۔ آج کل بھی عورتوں میں اس قسم کے بعض فیشن رائج ہیں' جیسے آنکھوں کی بھنووں کے بال نوچ کر ان میں رنگ اور میک اپ کی بعض چیزیں وغیرہ بھرنا یا ہندو عورتوں کی طرح تلک اور سیندور بھرنا وغیرہ۔ فیشن اور میک اپ کے جدید طریقے جو آج کل عورتوں میں عام ہیں اور جن پر قوم کا کروڑوں اور اربوں روپیہ برباد ہو رہا ہے' یہ سب اسی ذیل میں آتے ہیں جن پر لعنت فرمائی گئی ہے' اس لیے مسلمان عورتوں کو زیب و زینت کی ان تمام چیزوں سے بچنا چاہیے کہ اس میں

دین اور دنیا دونوں کی بربادی ہے۔ اسی طرح ناخنوں کی پالش ہے' جس سے وضو بھی اکثر علماء کے نزدیک نہیں ہوتا' علاوہ ازیں ناخنوں کو خوب بڑھایا جاتا ہے اور ان میں پھر سرخ پالش لگائی جاتی ہے۔

صورت میں تبدیلی کرنا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بدن گودنے والیوں اور گدوانے والیوں اور پلکوں کے بال اکھڑوانے والیوں اور خوب صورتی کے لیے دانتوں کے درمیان فاصلہ کرنے والیوں پر' جو اللہ کی پیدا کی ہوئی صورت میں تبدیلی کرتی ہیں' لعنت فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک عورت نے اس کی بابت حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بحث کی تو انہوں نے فرمایا: مجھے کیا ہے میں اس پر لعنت کیوں نہ کروں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے اور وہ اللہ کی کتاب میں موجود ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "رسول تمہیں جو (حکم) دے وہ لے لو اور جس سے تمہیں روک دے اس سے رک جاؤ۔" (بخاری و مسلم)

وہ عورت جو اپنے دانتوں پر ریتی پھرواتی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے قدرے دور ہو جائیں اور حسین ہو جائیں۔ اور یہی وشر ہے۔ (دانتوں کو خوب صورتی کے لیے باریک کرنا۔)

وہ عورت جو دوسری عورت کی بھنووں کے بالوں کو اکھیڑ کر باریک کرتی ہے تاکہ وہ خوب صورت ہو جائیں۔

وہ عورت جو کسی کو کہہ کر یہ کام کروائے' یعنی بال اکھڑوانے والی۔

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنے حسن میں (بزعم خویش) اضافہ کرنے کی نیت سے اللہ کی پیدا کی ہوئی صورت میں کمی بیشی کر کے رد و بدل کرنا ممنوع اور حرام ہے' جیسے وشم (بدن گدوانا) وشر (دانتوں کو باریک کرنا) تفلیج (دانتوں میں فاصلہ پیدا کرنا) نمص

(بھنووں کے بالوں کو اکھیڑنا) وغیرہ۔ تاہم سندی لگانا جائز ہے کیونکہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ عورت اس کا اظہار اجنبی مردوں کے سامنے نہ کرے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حجت کے اعتبار سے حدیث رسول کو بھی قرآن ہی کی طرح سمجھتے تھے اور یہی حق ہے۔

داڑھی اور سر وغیرہ کے سفید بال اکھاڑنے کی اور بالغ لڑکے کا داڑھی کے آغاز پر داڑھی کے بال اکھاڑنے کی ممانعت کا بیان

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا (حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما) سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں:

"سفید بالوں کو نہ اکھیڑو اس لیے کہ قیامت والے دن یہ مسلمان کے لیے نور ہوں گے۔" (یہ حدیث حسن ہے۔ اسے ابو داؤد' ترمذی اور نسائی نے حسن سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ: سفید بال جو بالعموم سن رسیدگی اور بڑھاپے کی علامت ہیں' انہیں اکھاڑنے سے بچنا چاہیے' کیونکہ اس کے حدیث میں بیان کردہ اخروی فائدے کے علاوہ دنیا میں بھی وہ ایک مسلمان کے لیے وقار و احترام کا باعث ہیں۔

بدعت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے ایسا کام کیا جس کی بابت ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ (کام) مردود ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس کی بابت ہمارا حکم نہیں ہے کا مطلب ہے: اس پر کوئی شرعی دلیل نہیں ہے' نہ اس پر شریعت کی کوئی اصل ہی دلالت کرتی ہے۔

2۔ اس سے واضح ہے کہ بدعات اور خلاف شرع کام مردود ہیں۔ ایک مسلمان کا کام اتباع ہے نہ کہ ابتداع (بدعت سازی) اور عمل حکمی۔

بغیر عذر کے ایک ہی جوتا یا ایک ہی موزا پہن کر چلنے اور کھڑے کھڑے جوتا اور موزا پہننے کی کراہت کا بیان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں سے کوئی شخص ایک جوتا پہن کر نہ چلے' چاہیے کہ دونوں جوتے پہنے یا دونوں ہی اتار دے۔"

اور ایک روایت میں ہے:

"یا دونوں پیروں کو ننگا کرلے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ: ایک پاؤں میں جوتا یا موزہ ہو اور دوسرے میں نہ ہو تو اس سے ایک تو لوگوں کو استہزا کرنے کا موقع ملتا ہے' دوسرے یہ شرف و وقار کے منافی ہے' تیسرے اس طرح چلنے میں بھی دقت ہوتی ہے اور انسان کی چال میں توازن نہیں رہتا' اس لیے حکم دے دیا کہ دونوں جوتے پہن کر چلو یا دونوں ہی اتار کر ننگے پاؤں چلو۔ ننگے پاؤں چلنے میں بھی شرعاً" قباحت نہیں ہے' تاہم عرف میں یہ ناپسندیدہ ہے۔

جس بات کا علم نہ ہو

حضرت مسروق (تابعی) بیان کرتے ہیں کہ ہم عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا:

اے لوگو! جس کو کسی بات کا علم ہو تو اسے بیان کرے اور جسے کسی چیز کا علم نہ ہو تو (وہاں) کہہ دے:

اللہ اعلم (اللہ ہی بہتر جانتا ہے) اس لیے کہ جس چیز کی بابت علم نہ ہو' وہاں اللہ اعلم کہنا ہی علم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

"کہہ دے! میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔" (بخاری)

فائدہ: جس چیز کی بابت علم نہ ہو وہاں محض ظن و تخمین اور اٹکل پچو سے گفتگو کرنا بھی تکلف ہے' جو ممنوع ہے۔ اس لیے علماء سے جب کوئی ایسی بات پوچھی جائے جس کا انہیں علم نہ ہو تو وہاں اپنی طرف سے اٹکل پچو جواب دینے کے بجائے لاعلمی کا اعتراف کرلینا چاہیے۔ گویا بغیر علم و تحقیق کے فتویٰ دینے اور رائے کے اظہار سے اجتناب کرنا چاہیے۔

تو نیہ وجدائی نا

آمنہ مفتی

مشاعرہ

مشاعرہ "نسو سدھانت کینڈر ٹرسٹ" کے آڈیٹوریم میں تھا۔ یہ ٹرسٹ شری ست پل متل نے 1983 میں قائم کی تھی۔ تیار ہو کے لالی میں آئے تو ہوٹل کے دونوں ہالز میں منگنی اور شادی کی تقریبات جاری تھیں۔ وہی جالی کی ساڑھیاں "کلام واردو بچے لینگے" لیے تھون اور میک اپ وہی گانے "گندی بات گندی بات گندی بات" کچھ بھی تو فرق نہیں تھا۔

سردی لگتا تھا آج کچھ مر نکل کے رہے گی۔ سرد ہوائیں بھالے کی طرح لگ رہی تھیں۔ باہر نکلے تو دروازے پہ کھڑے گارڈ نے کڑک کے کہا "ست سری اکال" جواب حلق میں ہی اٹک گیا اور ٹھنڈ کی لہروں نے کپکپا کے رکھ دیا۔

مشاعرہ گاہ میں کملیش ور گپتا اور ان کے شوہر ملے۔ یہ پروگرام کی کمپیئر تھیں۔ سنہری کنی کی سفید ساڑھی' ماتھے پہ سفید بندی اور اجیالی مسکراہٹ رخسانہ کیا لوٹ گئیں۔

"آپ کی ساڑھی لدھیانہ سے لی ہے؟"

طلسماتی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔ ماتھے کی بندی سے شعاعیں سی پھوٹیں۔

"ارے نہیں' لدھیانہ میں کچھ نہیں ملتا' یہ تو میں ساؤتھ سے لائی ہوں۔"

اور ہم جی مسوس کے رہ گئے' ہندوستان کا سارا جادو تو ساؤتھ میں ہے' لدھیانہ تو اپنا فیصل آباد ہی ہے۔

خیر کملیش ور نے مجھ سے میرے بارے میں اتنے سوال کیے کہ میں چکرا سی گئی۔ جانے کیا جھوٹ سچ گھڑا' اتنی دیر میں ایک رپورٹر صاحب نے کسی چینل کے لیے انٹرویو ریکارڈ کرنا شروع کیا۔ ساحر لدھیانوی کے بارے میں چار ایک سوال اور پھر پٹ سے کہہ دیا۔

"ذرا ساحر کا کوئی گیت تو گنگنا دیں۔"

انہوں نے تو گنگنا ہی کہا تھا مگر مجھے غنغنا ہی لگا۔ نزلے سے ناک کان تو بند ہی تھے۔ لیکن خیر' وہی نسیمی کھنکھار جس میں چون سو سال کی عظمت رفتہ اور تلواروں کی جھنکاریں ہیں' کام آئی۔

"نہیں معذرت چاہوں گی۔ ہاں تحت اللفظ میں حاضر ہے۔"

پھر جو ساحر کی تلخ غزل سنانی شروع کی تو رپورٹر بے چارے کو چھٹیاں آنے لگیں۔ بھلے کیا کریں۔ ایسی نابکار فرمائشیں کرے گا تو یہی انجام ہو گا ناں۔

پاکستان اور ہندوستان سے کئی شاعر جمع کیے گئے تھے۔ ہمارے گروپ کا تعارف تو ہو چکا ہے' ہندوستان سے ساغر سیالکوٹی تھے' حبیب سوز' معین شاداب' شکیل اعظمی' محسن کاظمی' مشتاق حسین' زخم ریاض اور پریکیلو کاس' تقریب کا آغاز شمع روشن کر کے کیا گیا۔

تعارف کے بعد سب کو فوراً "فوراً" سٹیج پہ بلایا گیا اور اپنی نسیان کی عادت کے باعث ہم ایک بار پھر کسی کو یہ نہ بتا سکے کہ بندہ اہم طبی یا غیر طبی "قطعاً" کسی قسم کے ڈاکٹر نہیں ہیں۔ نہایت ڈھٹائی سے ڈاکٹر آمنہ مفتی بن کے اسٹیج پہ چڑھ گئے۔

باہر بارش جو جم کے برسی ہے اس کا اندازہ ہمیں آنے والے لوگوں کے بھیگے پیراہنوں سے بخوبی ہو رہا تھا۔ چاگن کا بادل میرے سب اندازوں کو دھوکا دے گیا اور ساون کی جھڑی بن کے برسنے لگا۔

معین شاداب ایک پاکستانی اور ایک ہندوستانی شاعر

کو باری باری دعوت کلام دے رہے تھے۔ اسٹیج کے
درمیان مسند محفل پڑی رہی۔ شعراء اور مزے سے کلام
پڑھتے رہے اور سامعین تالیاں بجا بجا کے داد دیتے
رہے۔
عزت بیوی کی تھیں منچلی کا شعر ہے
دریاں کئی میں سو رہا ہوں
گلے لگائے تجھے نہ
اور میری تیکھی مسکراہٹ کے لیے
کیا حسن کلی کا شعر تھا
سب میرے چاہنے والے ہیں' میرا کوئی نہیں
میں بھی اس ملک میں اردو کی طرح رہتا ہوں
باہر بیٹھی ساری پارٹی سامعین اور شعراء کی
آنکھوں میں نمی سی۔ سب نے بے بسی سے ایک
دوسرے کو دیکھا جب بیایا ارشاد ہوا۔
محسن کا شعر
گیلی لکڑی کی طرح ہم تو نہیں جلتے
موسم دیکھ کے صاحب عشق نہیں ہوا
سب ہنس دیے تھے اشتیاق حسین صاحب کی جو
بہت ہی خوب صورت تھی بالکل ویسا ہی درد تھا کا سا
انداز مشاعرے کے درمیان وہ بھی اپنا دے گئے
میں رات تھی بادل کی بارش اور اپنا کلیجا بھر کے
صرف میں ہی بہت دکھاتے ہیں ویسا ہی یونیورسٹی کے
درمیان کرم اور گفتگو سے اشتیاق حسین صاحب
کے ادا کرنے کے لیے "ایئر مل" کے رابطے

صاحبزادی سلمیٰ صاحب موجود تھے۔ بہت مبارک باد تھی
صاحب بیٹی کی۔
"مبارک ہو تمہیں یہ محفل یادگار رہی۔ سائز
بالکل اسٹیج کے کہنے سے مسکرائے۔ وہ کمرے
سے نکلنے جا رہے تھے کہ قاضی صاحب کی والدہ
سے ملنے کے بعد کہ ان دنوں بہت بیمار اور
وہی ہے بیٹھی تھی۔
"مزہ تمہارا شعر ہو گیا گا... کی بات تھی ہے

ان کی معصوم مسکراہٹ میں اور نرمی سی ساری
باتیں تھیں اور آنکھوں میں آنسو کی چمک۔
قاضی صاحب صدر مشاعرہ تھے حسب روایت
آخر میں آئے اپنے خصوصی انداز میں محفل کو گفت
زعفران کیا اور اپنے مقبول عام اشعار سنائے۔
عاشقوں کا اک جہاں آباد ہونا چاہیے
اس نظام زر کو اب برباد ہونا چاہیے

قلم کے بیچ ہی رہا ہے کچھ دربار کی
ملا تو بھی صاحب اولاد ہونا چاہیے
مشاعرہ ختم ہوا تو ایک بار پھر گروپ فوٹو بننے شروع
ہو گئے اب مشاعرے کی ایک تقریب ذرا سی ابھی
ہمیں شاعروں پر کہا گیا کہ ان کی کلاس ساری میں اور
بار آنکھیں اور کا حسن بھی انداز ہمارے ساتھی
انداز سے کچھ فرق تھا لیکن ایسے بھی تھے۔
مجھے بھلانے کو یہ سکر میں جگائی ہوں
اسی کی شکل بنا ہے یہ وہی اکڑا
گروپ فوٹو ہو رہے تھے کہ ایک معصوم
صورت سکھ بچہ سترہ اٹھارہ برس کا ایک عمر
صاحب کے ساتھ آیا کہ آپ کے ساتھ تصویر چاہی
ہے ان صاحب مستقل مسکراہٹ انداز کے
جا رہے تھے لیکن پھر لوٹ کر آ کر کہا کہ میڈم یہ آپ
ہوں گی نے کہا میں آپ سے تعلق ہی ہے
بھی چھوٹی ہیں اور میری بیٹی کا نام بھی آپ ہے تو پتا
مجھے اچھا لگا کہ آپ کے ساتھ تصویر کھنچوا لیں۔"

اتنی طویل تمہید کے بعد اس کا مقصد معلوم
ہوا کہ اس کی بیٹی کی بھی تعریف میں لوگ
کہ تصویر کھنچوانے کی اجازت نہیں ہو آئی سے
صاحب اتنا گھبرا رہے تھے۔
خیر اس نے ہنس کر اس کو بھر گردن میں کیا اور
کیمرے سے بھی کچھ ہی جلدی سب کو دکھایا
بتا کہ یہ حقیقت کی تصویر لینے کے لیے
کیسے سے بھی کھینچا جا سکتا ہے

رات دس بجے ڈنر کے لیے اکٹھے ہوئے' یاسمین اور عودِ غمی' کملیشور' پُشپا' ترنم' پرگیا' فرحت' ناز بیگم' مرتضیٰ کریم اور ذکر پاکستانی ڈرامے کا۔

میں نے خوب منتری جھاڑی اور فی الفور "رسالہ اسباب بغاوت ہند" کے نمونے پر ایک تقریر "اسباب زوال پاکستانی فلم انڈسٹری" کر ڈالی جس میں اس مسئلے کے اس قدر خوفناک لسانی اور تہذیبی پہلو اور باریکیاں بیان کیں کہ رخسانہ آپا بھی حیرت سے مجھے دیکھنے لگ گئیں کہ ساری عمر فلمی صنعت میں گزار کے بھی ان بوالعجبیوں کا تذکرہ ان کے لیے حیران کن تھا۔

میں نے جلدی سے اپنے دریائے فصاحت کو سمیٹا اور باقی کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ جملہ حاضرین میں سے اب کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ کسی موضوع کو چھیڑ کے میری ہیبت ناک گفتگو سنیں۔

پرگیا سب کے لیے گلاب جامنیں لائی اور جانے اسے کیا سوجھی کہ کہا۔

"کسی جگہ بیٹھیں؟" یہاں کس کو انکار تھا۔

سب لوگ فرحت اور ناز کے کمرے میں اکٹھے ہوئے کوئی صوفے پر' کوئی بیڈ پہ بیٹھا' کوئی کرسی گھسیٹ لایا اور موضوع چھڑا "عشق"۔

کوئی عشق کو لافانی بتا رہا تھا' کسی کے نزدیک عشق فنا ہے' کسی کو عشق سخت سستا جذبہ لگتا ہے اور کسی کے تئیں عشق خدا سے ملنے کا ذریعہ تھا۔

درمیان میں شاعری کا دور بھی چلا میں بڑی مشکل سے چپ تھی۔ آخر حسین سے نہ رہا گیا کہا کہ "آپ بھی بتائیے عشق کیا ہے؟"

جمیرا منع کیا اتنے بہت سے شاعروں کے درمیان میں واحد غیر شاعرانہ انسان تھی لیکن وہ تو تُلے ہوئے تھے لیپنے تخیل کا ستیاناس کرانے پہ۔

وہی مشہور زمانہ کھنکھار اور سلسلہ کلام جاری کیا۔

"بھئی دیکھیے' یہ جو دل ہے نا اس میں نو راز ہیں اور ان عظیم عقلوں کی جھٹلوں میں حقی اور ثبت آئین ہوتے ہیں لہٰذا ہم اور ہو نا تیم تو جب ان کا توازن بگڑتا ہے تو ایک عجیب سی کیفیت وارد ہوتی ہے یہ توازن جسم میں ہارمونز کی وجہ سے یا کسی۔۔۔"

تو گی بات میں ہی سب شاعروں نے ہاتھ جوڑ لیے اور بعضوں نے کان بھی پکڑ لیے (اپنے) کہ "بخش دو بی بی ہم سے ہمارا عشق نہ چھینو۔"

سب کو دہلا کے ذرا سکون ملا' موضوع فوراً بدل دیا گیا اور تذکرہ چھڑا ہندوستان میں "مشاعرے" اور کوی سمیلن" کا مشاعرہ تو مشاعرہ ہوتا ہے' لیکن یہ معلوم کر کے دکھ ہوا کہ وہاں مشاعرہ بھی اردو کی طرح آخری دموں پہ ہے۔ "باہر اتنے بڑے بڑے لوگ کر رہے تھے اور ہم سب "لاسٹ سیلفی" کے لیے پرگیا کے کیمرے کے سامنے اکٹھے ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

لدھیانہ :۔

ہم دو روز سے لدھیانے میں مقیم تھے لیکن لدھیانہ ہم سے چھپا ہوا تھا۔ شہر بھی بڑی عجیب چیز ہوتے ہیں' بعض اوقات آپ عمر بھر ایک شہر میں رہتے ہیں لیکن شہر عجوبہ ہی رہتا ہے' کسی روز یکا یک یہ شہر سب پردے ہٹا کر سورج کی طرف بے محابانہ آپ کے سامنے آجاتا ہے اور خوف سے آپ کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں کہ خدایا میں اس شہر نگاراں کا باسی رہا؟ اور کور چشم ایسا کہ دیکھ ہی نہ پایا۔

ناشتے کی میز پر ارتضیٰ کریم صاحب سے دوبارہ ملاقات ہوئی اپنا نمبر دیا پاکستان آکے اس پہ پیغام بھیجا جواب ندارد' ارتضیٰ صاحب اگر خود پڑھیں تو رابطہ کریں' دہلی یونیورسٹی بھی چند رعایات کے باعث ہمارا وطن ہے۔

خیر یہاں سے اٹھے تو ترنم ریاض کے کمرے میں چوکڑی جمائی' ترنم نے ہمیں ایک ایسا قہوہ پلایا جو آج تک نہ پیا تھا چھلے ہوئے ثابت بادام' دار چینی' الائچی اور ذرا سے زعفران کو ابلتے پانی میں دم کیا۔

بھی کیا خوشبو تھی اور ساتھ ایک خوب صورت کشمیری گانا۔ ترنم واقعی اسم بامسمیٰ ہیں کھڑکی کے باہر لدھیانہ عمارات بھری بارش کے بعد جگمگا رہا شہر جو ہندوستان کے کثیف ترین اور آلودہ ترین شہروں میں سے ایک ہے لیکن آج ہمارے اعزاز میں ہاتھ منہ دھو کے اچھا بچہ بنا بیٹھا تھا۔

ترنم کے کمرے سے اپنے کمروں میں پہنچے تو نبیل کو اپنی تلاش میں پریشان پایا نبیل بے چارے نے آتے ہی پولیس رپورٹ نہیں کرائی تھی اب اس کے چکر میں پریشان تھا۔

ڈاکٹر کیول دھیر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ان سے شاپنگ کا پوچھا گیا تو انہوں نے کہا۔

"بھئی لدھیانے میں آپ خواتین کے شاپنگ کرنے کی کوئی جگہ نہیں یہاں تو فیکٹریاں ہیں گرم کپڑوں کی شالوں اور سائیکلوں کی کیا کرو گی تم لوگ؟"

قاسمی صاحب صبح ہی صبح دہلی اور اجمیر کا رخ کر چکے تھے شام کو ایک منسٹر آف اسٹیٹ سنتوش ڈھانڈا صاحب نے پاکستانی شعرا کو چائے پر بلایا تھا۔

چراغ نبیل کو لیے پھر رہے تھے ہندوستانی پولیس بھی پاکستانی پولیس کی طرح ہی ہے لگتا ہے دونوں کا منبع تو ایک ہی ہے سرخفتہ کالونیل طرز فکر۔

ہم چاروں ڈاکٹر کیول کے ساتھ ڈھانڈا بھائی کے گھر کے لیے روانہ ہوئے ایک دو گلیاں اور موڑ مڑے ایک بہت بڑے شیر کا سر نظر آیا۔ یہ ایک مندر کا دروازہ تھا شیر کے کھلے منہ سے گزر کے لوگ اندر مندر میں جا رہے تھے۔ مندر کے ساتھ ہی منسٹر صاحب کی چھوٹی سی پرانی مگر سنبھالی ہوئی کوٹھی تھی۔ باغیچے میں بہار آرہی تھی اور برآمدے میں منسٹر صاحب کے کارخانے میں بننے والی سائیکل رکھی تھی۔

ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے باہر ایک سنہری لیرے دور ہمیں دیکھ کے جو بھونکنا شروع ہوا ہے تو آخر اسے وہاں سے کہیں اور بھیجنا پڑا۔ منسٹر صاحب میوزک کے بے حد رسیا تھے۔ آتے ہی ساحر کی غزل ترنم اپنا ساگو خم

اپنی پریشانی مجھ سے دور لگا دی۔
اگلے جلسے میں اپنی عزیزہ بیگم ریتا کے انتقال کی خبر سنائی اور اس سے اگلے جلسے میں پھلجھڑی چھوڑی کہ میں اگر کسی خاتون کو دیکھتا ہوں تو نیڈی (needy) اور اگر کوئی اور دیکھتا ہے تو وہ گریڈی (Greedy) ہے اپنے اس مذاق پہ وہ دیر تک خود ہی ہنستے رہے۔
پھر ذرا انہوں کا ذکر اور جملہ دلغا کہ۔
"بھئی آپ کے ہاں تو طلاق فوراً" ہی ہو جاتی ہے کسی بات پہ غصہ آیا اور کہہ دیا طلاق' طلاق' طلاق بات ختم۔"
اب کی بار صرف تنبیہی کھنکھار سے کام نہیں چلنے والا تھا چنانچہ فوراً چہرے پہ ایک خشونت بھری سنجیدگی طاری کی اور بتایا کہ ایک بار میں چاہے ہزار دفعہ طلاق کہہ دیں' وہ ایک ہی طلاق ہوگی پھر ایک مقررہ مدت کے اندر اگر رجوع کرلیں تو طلاق نہیں یعنی اب دو طلاقوں کا حق محفوظ ہے اور اگر وہ مدت گزر جائے تو پھر طلاق واقع ہو جاتی ہے۔"
"اور یہ سب کہتا کون ہے؟ مولوی؟"
"جی نہیں' شریعت بچ۔" سب کچھ فی البدیہہ کہا تھا اس لیے مڑ کے باقی گروپ کو نہیں دیکھ رہی تھی۔
"اور چار شادیاں؟" اگلا جملہ۔
"چار شادیاں' دیکھیے یہ ایک الگ مسئلہ ہے' بیالوجی کے مطابق کسی بھی نوع میں مادہ کی شرح پیدائش ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے پھر جنگوں وغیرہ میں مردوں کے مارے جانے سے یہ تناسب مزید بگڑ جاتا ہے تو اس لیے"
تو سے جلسے میں منسٹر صاحب کو ایک کال آگئی اور وہ کمرے سے نکلے جان میں جان آئی تھوڑی دیر میں سب چائے منہ لٹکائے داخل ہوئے لدھیانہ میں اسی
روز ایک لڑکی کا ریپ اور قتل ہوا تھا پولیس والوں کی جان آفت میں تھی کیونکہ ایک روز پہلے ہی "لی لی سی" کی بنائی ہوئی ڈاکیومنٹری جو "نربھیا" کی دکھانے سے منع کیا گیا تھا اس کے چوبیس گھنٹے کے اندر یہ خبر حکومت کے لیے بے چینی کا باعث تھی۔
"دیکھا' یہ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے چار شادیوں کی اجازت ہے اور اگر آپ سنگسار کی سزا دیں ایک مجرم کو تو آئندہ کبھی ایسا نہ ہو۔" میں نے جلدی سے طعنہ مارا اور جی ای جی میں سرخرو ہوئی کہ لو بھئی معرکہ سر کرلیا۔ صلاح الدین ایوبی بن گئے۔
چائے کی میز بڑی پر تکلف تھی ڈھوکلا سبزی کا پڑا پیٹیز اور سموسے گلاب جامن جو خاص اسی دوکان سے منگوائے گئے تھے جہاں سے ساحر خریدا کرتے تھے۔
گلاب جامنوں میں واقعی ساحر کے مصرعوں کی مٹھاس تھی کسی الو کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ دلوں کو محبتوں سے فتح کیا جاتا ہے۔ جنگوں سے نہیں۔
منسٹر صاحب اب ذبیحہ پہ بات لے آئے میں نے تیر مارا کہ آپ کے ہاں بھی تو کچھ لوگ گوشت کھاتے ہیں کیا ان کا دھرم بھرشٹ نہیں ہوتا۔
بہت ہنسے اور بولے کہ بھئی میں تو اگر کسی روز گوشت نہ کھاؤں تو میرا بوٹا آکتا ہے۔ "واہ! میرے پیٹ میں گھاس اگ آئی ہے۔" یہ تو چھکے گھڑ سے نکلے۔
خیر ابھی بات باقی تھی۔ میں نے نئی الیکشن کا تیر نکالا اور چلے میں چڑھا کے چھوڑ دیا۔
بہت ہنسے کہ ہاں بھئی ہم نے خوب ہی دو سکی بائی اور خوب وہ یہ' مگر دیکھو تو' ساری نشستیں عام آدمی لے گیا۔
"انہوں نے کیا دیا؟" میں نے پھر تیر چھوڑا۔
"کچھ نہیں۔" بڑے اطمینان سے جواب دیا۔
اب کے میں نے "عام آدمی" پارٹی کی حمایت میں تقریر کرنے کی خواہش کا گلا بڑی مشکل سے گھونٹا۔
منسٹر صاحب کے گھر میں جگہ جگہ ان کی آنجہانی پتنی "ریتا" کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور وہ ہمیں بار بار کھانے پہ روک رہے تھے۔ لیکن ہم "گولڈ مارکیٹ" دیکھنے کا بہانہ کرکے کھسک آئے۔
باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

"اور شائقین کیا آن ایئر ہے اور کیا کچھ آنے والا ہے؟"
"آج کل جو آن ایئر ہے وہ "رنگ لاگا" کے نام سے ایک سیریل ہے اور آنے والی سیریلز میں "دل عشق" جو جیو سے آن ایئر آئے گا اور ایک سیریل ہم سے آن ایئر آئے گا۔"
"اور کوئی فلم بھی تو آنے والی ہے آپ کی؟"
"نہ ہی اور کوئی ایک فلم نہیں بلکہ تین فلمیں تقریباً تیار ہیں ریلیز ہونے کے لیے۔ ان میں ایک تو 14 اگست کو ریلیز ہو گی جس کا نام "سایۂ خدائے ذوالجلال" ہے "بلائنڈ لو (Blind Love)" عید الاضحیٰ کو ریلیز ہو گی اور ایک کینیڈین فلم ہے "خواب" یہ اردو فلم ہے جو کینیڈا میں ریلیز ہو گی۔"



اداکار، موسیقار

عامر قریشی سے ملاقات

شاہین رشید

ایک وقت تھا کہ کچھ عرصہ پہلے تک عامر قریشی کی پہچان ان کے والد مصطفیٰ قریشی تھے۔ مگر اب شوبز میں عامر قریشی ایک معتبر نام ہے جو نا صرف فن اداکاری میں اپنا لوہا منوانے میں کامیاب ہو چکے ہیں بلکہ دیگر فیلڈز میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔
"کیسے ہیں عامر قریشی صاحب؟"
"جی اللہ کا شکر ہے۔"
"روزے کیسے گزرے عید کیسی گزری؟"
"الحمد للہ سب کچھ بہت اچھا گزرا۔"
"جلی ہوا میں آپ کی پرفارمنس بہترین تھی۔ نیگیٹو رول میں لوگوں کی باتیں سنیں؟"
"داد بھی پائی اور باتیں بھی سنیں۔ نیگیٹو رولز میں ایسا ہی ہوتا ہے مگر مجھے رسپانس بہت اچھا ملا اس سب کا۔"
"اس کی شوٹنگ بھی کینیڈا میں ہی ہوئی ہو گی؟"
"یہ پاکستان میں تیار ہوئی ہے مگر پہلے یہ کینیڈا میں ریلیز ہو گی اس کے بعد شاید پاکستان میں آئے گی۔"
"اور آپ کے دیگر کام میوزک اور گلوکاری کیسی چل رہی ہے؟"
"الحمد للہ، وہ کام بھی سیٹ جا رہے ہیں۔ بس مجھے کرنٹ کام کر کے بہت اچھا لگتا ہے۔"
"کچھ عرصے پہلے اداکاری کی طرف آپ کا رجحان کافی کم تھا اب آپ ڈراموں میں نظر آنے لگے ہیں۔ وجہ؟"
"بس بات اچھے اسکرپٹ کی ہے۔ اچھی کہانی ہو، اچھا کردار ہو تو انکار نہیں کرتا۔ کیونکہ اداکاری بھی میرا شوق اور میرا جنون ہے۔ شروع شروع میں کم آتا تھا ڈراموں میں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈراموں کی

شوٹ میں وقت بہت کم لگتا ہے اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے وقت ضائع ہو رہا ہے۔"

"شاید آپ کافی عرصہ باہر رہ کر آئے تھے اس لیے۔"

"ہاں یہ وجہ بھی ہے، لیکن اب میں ایسا ہی ہو گیا ہوں جیسے یہاں کے لوگ ہیں۔ یہاں کے لوگ وقت کی پابندی نہیں کرتے تو میں نے بھی پابندی کرنا چھوڑ دی ہے۔ باہر کی تو آپ بات ہی نہ کریں، جتنی پابندی وہاں کی جاتی ہے اس کے بارے میں ہم صرف سوچ ہی سکتے ہیں۔ وہاں سنسان روڈ پر بھی ریڈ سگنل کا احترام کیا جاتا ہے اور یہاں بھرے ہجوم میں ریڈ سگنل کا کوئی احترام نہیں ہوتا۔"

"آپ کا اصل شعبہ میوزک ہے۔ تو آپ کیا کیا کر چکے ہیں؟"

"بہت کام کیا ہے ماشاءاللہ سے بے شمار ڈراموں کا بیک گراؤنڈ میوزک دے چکا ہوں۔ بیرون ملک جب سرکاری سطح پہ کوئی وفد جاتا ہے تو ان کے جانے سے پہلے وفد کے اعزاز میں جو تقریبات ہوتی ہیں ان کا میوزک بھی میں ہی دیتا ہوں اور سیف گیمز کی افتتاحی اور اختتامی تقریب کا میوزک بھی میں نے ہی ترتیب دیا ہے۔"

"سارے فن آپ کو ورثے میں ملے ہیں؟"

"جی الحمدللہ۔ میری والدہ مدینہ قریشی کو بھلا کون نہیں جانتا گلوکاری کا فن ان سے ملا۔ میوزک کی سوجھ بوجھ بھی ان کی طرف سے ملی اور اداکاری کے بارے میں تو سب کو معلوم ہی ہے۔ بطور موسیقار میں کافی کام کر چکا ہوں۔"

"پھر ٹی وی پہ آنا بھی والدین کا ہی مرہون منت ہو گا؟"

"جی نہیں بلکہ ہرگز نہیں۔ بے شک مجھے بچپن سے سب جانتے ہیں کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے کبھی میری سفارش کی اور نہ ہی میں نے ان کے نام کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ مجھے تو اس فیلڈ میں لانے کا سہرا منظور قریشی صاحب کے سر جاتا ہے انہوں نے ہی مجھے اپنی فلم میں کاسٹ کیا تھا اور پھر اس کے بعد خود بخود مجھے آفرز آنے لگیں۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اپنی محنت سے یہ مقام بنایا ہے۔"

"بے شک آپ کا بہت نام ہے، لیکن اگر آپ اپنے والد کے نام کے ساتھ آگے بڑھتے تو کیا بہت آگے نہ نکل چکے ہوتے؟"

"بے شک بہت آگے نکل چکا ہوتا لیکن شاید مجھے اطمینان نہ ہوتا اور مجھے ہر دم یہی احساس پریشان کرتا کہ میری محنت سے زیادہ میرے والد کا نام ہے۔ تو آج میں بہت فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ مقام میں نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔"

"کب سے ہیں اس دشت کی سیاحی میں؟"

"1991ء میں اس فیلڈ میں آیا اور ایک نجی چینل سے ریڈیو جنکشن کی میزبانی کی اور یوں اپنی فنی زندگی کا آغاز کیا اور پھر "اسٹار پلس" کے لیے "ہوسٹ کارڈ فرام پاکستان" کے عنوان سے ایک پروگرام کرتا تھا اور میں پہلا پاکستانی تھا کہ جس نے اس پروگرام کی میزبانی کی۔"

"اچھا اسٹار پلس۔ کیسے گئے وہاں تک؟"

"اسٹار پلس کے لیے کوشش ہو رہے تھے اور میرا



آڈیشن نوآب گیلانی صاحب نے لیا تھا اور اس آڈیشن کے لیے پورے پاکستان سے کافی لوگ آئے ہوئے تھے لیکن کامیابی میرے نصیب میں لکھی ہوئی تھی سو مجھے مل گئی اور جب سب کچھ او کے ہو گیا۔ تب میں نے والد صاحب کو بتایا تو وہ بہت حیران ہوئے اور دلچسپ بات بتاؤں کہ یہ پروگرام ملک سے باہر بھی دیکھا جاتا تھا تو جب میں انگلینڈ پڑھنے کے لیے گیا تو کافی

لوگ مجھے پہچانتے تھے۔"

"اچھا گڈ۔ کہاں تک پڑھائی کی۔ مطلب ڈگری ؟"

"میں نے ایم بی اے اور ایم ایس سی ان مارکیٹنگ کی ڈگری حاصل کی ہے اور کچھ عرصہ ایک ایڈور ٹائزنگ ایجنسی میں کام اور کمپنی پروڈکٹ کے لیے جنگلز بھی لکھے۔"

"پڑھائی کے لیے گئے 'میڈیا میں گیپ دیا آپ نے نقصان ہوا یا بہتر ہوا؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ گیپ دینا میرے لیے نقصان کا باعث بنا۔ میں اس وقت ویڈیو جنکشن کرتا تھا اور ایک کامیاب وی جے تھا۔ اسی زمانے میں صدیقہ کیانی' شیراز ہیل' ابرار الحق' جوا احمد' مجم شیراز وغیرہ بھی تھے۔ یہ لوگ پروگرام تسلسل کے ساتھ کرتے رہے اور ان کی جگہ جی گئی جبکہ میں پڑھائی کی وجہ سے منظر سے غائب ہو گیا اور آپ کو پتا ہی ہے کہ یہاں تو آنکھ او جھل پہاڑ او جھل والی بات ہوتی ہے۔ مجھے میرے گیپ نے ایکدم سے پیچھے کر دیا۔"

"یہ کس سن کی بات ہے؟"

"یہ بات ہے 2001ء کی پھر میں کافی عرصہ ملک سے باہر رہا۔ تعلیم مکمل کی۔ جاب کی اور پھر پاکستان واپس آیا۔ مگر پچھتا تا ہوں اس وقت پر جب میں نے ملک سے باہر جا کر پڑھنے کا فیصلہ کیا۔"

"اگر آپ پاکستان میں ہی رہ کر اپنی تعلیم مکمل کرتے اور ساتھ ساتھ اپنے شوق کو بھی جاری رکھتے تو یقیناً آج کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہوتے؟"

"بالکل۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں ایک بار پھر اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اور اب شوبز کی اس فیلڈ کے ہر شعبے میں کافی کام کر رہا ہوں۔"

"کمپائلنگ کا عمل کب سے شروع ہوا؟"

"کمپائلنگ کا عمل تو بہت کم عمری میں ہی شروع ہو گیا تھا مجھے یاد ہے کہ جب میں شاید 6th کلاس میں تھا تو مجھے ایک اسٹیج ڈرامے میں کام کرنے کا موقع ملا تو مجھے اس میں کام کرنے کے پیسے بھی ملے۔ یہ یاد نہیں کہ کتنے ملے

تھے۔ البتہ جب میں ریڈیو جنکشن کرتا تھا تو مجھے ایک پروگرام کے چار ہزار روپے ملا کرتے تھے۔ باقاعدہ جاب میں نے 2000ء میں شروع کی۔ فری لانس بہت کام کیا ہے۔ تھیٹر میں کام کرنا۔ جنگلز بنانا۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"آپ نے شوبز کے ماحول میں آنکھ کھولی' آپ کی تربیت میں بھی اس کے اثرات آئے؟"

"ہم اپنے والدین کی دو ہی اولادیں ہیں۔ ایک میں اور ایک میری بہن تو والدین نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ ہمارے گھر کا ماحول شوبز والا نہ ہو۔ لہٰذا انہوں نے اپنے گھر کو ہمیشہ شوبز کے ماحول سے دور ہی رکھا۔ ہمارے گھر کا ماحول بہت سادہ اور مذہبی رہا۔ گھر میں فلم کے بارے میں زیادہ بات چیت بھی نہیں ہوتی۔ یہ تو ورثے میں ملی ہوئی صلاحیتیں ہیں کہ میں اس فیلڈ میں آ گیا ورنہ جس طرح کا ہمارا ماحول تھا میں شاید اس فیلڈ میں نہ ہوتا۔"

"زیادہ کیا اچھا لگتا ہے اپنی پہچان اپنے حوالے سے یا والد کے حوالے سے؟"

"اپنے حوالے سے اپنے کام کے حوالے سے پہچان کی خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے لیکن والد کے حوالے سے پہچان بھی بہت اچھی لگتی ہے بلکہ فخر ہوتا ہے کہ میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں۔ جس کو ساری دنیا جانتی ہے جس کا ایک نام ایک پہچان ہے۔ مجھے فخر ہے اپنے والد پے۔ کاش میں ان کی توقعات پہ پورا اتر سکوں۔"

"اپنے لیے کردار کا انتخاب کرتے وقت کیا

ترجیحات ہوتی ہیں آپ کی؟"

"میں کبھی یہ نہیں دیکھتا کہ کردار کتنا بڑا ہے یا کتنا چھوٹا ہے میں تو صرف یہ دیکھتا ہوں کہ وہ لفظوں کے ڈائیلاگ میں بھی پاور ہے یا نہیں بس پھر وہی کردار میرے لیے اہم ہو جاتا ہے اور نہ صرف فلم میں بلکہ ٹی وی کے ڈراموں میں بھی میں کردار کو ہی اہمیت دیتا ہوں۔"

"ڈائریکٹر اور پروڈیوسر آپ کے سامنے کردار رکھتے ہیں یا صرف آفر دیتے ہیں؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ ڈائریکٹر اور پروڈیوسرز میرے سامنے پوری کہانی پورا اسکرپٹ رکھتے ہیں۔ مجھے کرداروں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ اپنی رائے بھی دیتے ہیں اور مجھ سے مشورہ بھی لیتے ہیں۔ تب کسی بات پہ معاہدہ ہوتا ہے اور میں کام کرنے پر راضی ہوتا ہوں۔"

"کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو جائیں... ازدواجی زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

"جی الحمدللہ بہت اچھی گزر رہی ہے۔"

"بچے؟"

"ہو جائیں گے جب اللہ کا حکم ہوگا۔"

"مذہب کا رجحان؟"

"بہت زیادہ رجحان ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھوں اور روزے بھی پورے رکھوں اور ہر وقت وضو میں رہوں۔ سنا ہے کہ ہر وقت وضو میں رہنے سے اللہ کی نعمتیں نازل ہوتی رہتی ہیں اور رزق میں اضافہ ہوتا ہے۔"

"شاپنگ کریڈٹ کارڈ سے کرتے ہیں یا کیش کی صورت میں؟"

"میں کریڈٹ کارڈ سے شاپنگ کرنا پسند نہیں کرتا کیونکہ میری نظر میں یہ ایک ادھار ہوتا ہے اس لیے بہتر ہے جو کام کرو کیش پہ کرو تو میں ہمیشہ کیش ہی رکھتا ہوں اپنے ساتھ۔"

"اپنی کوئی اچھی بری عادت بتائیں؟"



"اچھی عادت تو یہ ہے کہ دین کے مذہب کے قریب ہوں اور بری عادت یہ ہے کہ لوگوں پر جلدی بھروسا کر لیتا ہوں' جس کی وجہ سے نقصان بھی اٹھاتا ہوں۔"

"مزاجاً کیسے ہیں آپ؟"

"میں جناب ایک ٹھنڈے مزاج کا بندہ ہوں۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کسی پہ ہاتھ اٹھایا ہو یا میں کسی پہ چیخا چلایا ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عامر قریشی سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل	فرینا اعجاز
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر	موسیٰ رضا

بڑی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
کھلتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
ہر طاق میں گڑیاں چھوڑی ہیں
جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

ایک لڑکی کا بابل کا گھر چھوڑ کر پیا دیس جانا ایسا ہی ہے جیسے پودا ایک زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں لگا دیا جائے۔ اگر موافق زمین اور ماحول ملے تو یہ پودا پھلتا پھولتا ہے ورنہ مرجھا جاتا ہے۔
غیر اور اجنبی لوگوں کی بات تو جانے دیں' کبھی کبھی سگی خالہ اور سگے چچا کے گھر میں بھی شادی ہو تو مختلف رویوں اور ماحول کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تصور کریں ایک پڑھی لکھی نازک خیال نفیس طبع لڑکی کو رخصت ہو کر ایسے ماحول میں جانا پڑے جہاں ان پڑھ لوگ گالم گلوچ لڑائی جھگڑا معمول ہوں' اس طرح کے ماحول کو تبدیل کرنے اور سسرال خود کو منوانے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے اور کبھی پوری عمر ہی رائیگاں ہی چلی جاتی ہے۔ خود کو مٹا کر بھی کچھ نہیں ملتا۔ اس ماہ ہم اسی حوالے سے نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

میلہ علی

پہلے تو سلسلے سے پہلے جو آپ نے تین شعر لکھے ہیں وہ ہر شعر شادی شدہ خواتین کے دل کی عکاسی کرتا ہے۔

س ۔ "شادی کب ہوئی؟"

ج ۔ "جناب میری شادی 7 فروری 1999ء کو ہوئی۔ اب عمر کتنے نہ لگ جایے گا' میں بمشکل اٹھارہ سال کی تھی۔ جو ظلم تھا۔"

س ۔ "شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟"

ج ۔ "شادی سے پہلے زندگی زندہ تھی۔ نہ جانے کب یا شاید جب جملے بنانے پھر پڑھنے سیکھ لیے تو کتابوں سے عشق ہو گیا۔ بادشاہوں کی ایک ایک روپے کی بکنے والی کہانیاں' پھر ہمسایوں کے گھر دیکھے اخبار جہاں تو جاسوسی کہانیوں کا چسکہ جو لگا تو جاسوسی ڈائجسٹ' سسپنس ڈائجسٹ کے دیوتا کی سونیا بنی پھر آئی۔ عمران ڈائجسٹ' اس طرح پڑھے گویا کہ میرے ہی لیے تھے اور پڑھنے کی رفتار اتنی تیز کہ چھوٹے بہن بھائی صبح شام لائبریری جانے سے تنگ' لائبریرین الگ حیران۔

ابن صفی' نسیم حجازی اور ہر وہ رائٹر جس نے تجسس لکھا۔ پھر کالج میں اردو ادب لیا اور لائبریرین سے دوستی گانٹھ لی۔ میرا لائبریری کارڈ دیکھ کے دوستیں حیران ہوتیں۔ اتنی کتابیں کب پڑھتی ہو۔ کالج ورک کیسے کرتی ہو اور بس جی تب سے گھڑی کے مطابق چلنے کی جو عادت پڑی تو اسے چھٹنے نہیں دیا۔ گھر میں بہن بھائیوں میں بڑی تھی تو ماں کا آدھا حصہ تھی۔ لہٰذا اہتمام ترسلیقے اور ہنر انہوں نے میرے اندر اتارنے کی سعی کی۔ شادی سے پہلے زیادہ سے زیادہ ڈگریاں جمع کرنے کا شوق تھا۔ لہٰذا استاد محترم بہت مخلص ملے۔ انہوں نے سال میں دو دو چھلانگیں لگوائیں۔ میٹرک

کیا تو بی پی سی ساتھ ایف اے مکمل ہوا تو سی پی آئی کروالیا۔ کمپیوٹر تب نیا نیا کالجز میں رائج ہوا تھا۔ اس کے شارٹ کورسز کیے۔ بی اے کیا تو بی ایڈ اور پھر شادی۔ سسر صاحب جو پھوپھا بھی ہیں اس وعدے کے ساتھ کہ تعلیم جاری رکھواؤں گا۔ (جو بعد میں بھول گئے۔)

کپڑے، برتن، ڈیزائن کرنا شوق تھا تو کٹنگ تو گھٹی میں تھی۔ ایف اے کے بعد پرائیویٹ اسکول میں جاب کی تو بچوں کی ہر دلعزیز ٹیچر رہی۔ عزت، قدر اور تعریف بے تحاشا سمیٹی۔

س۔ "اس رشتے میں آپ کی مرضی تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟"

ج۔ "یہ رشتہ تب سے جڑ گیا تھا، جب سے دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں۔ ہوا کچھ یوں کہ پھوپھو جن کے یہ صاحب زادے ہیں۔ ڈلیوری کے لیے اپنے میکے آئی ہوئی تھیں۔ تو وہاں میری امی جان بھی گئی ہی تھیں۔ تو دس دن پہلے یہ تشریف لائے رمضان میں اور عیدالفطر کے روز میں نے دنیا میں آنکھیں کھولیں، تو ان کے چچا جو بھتیجے کو دیکھنے آئے ہوئے تھے گوجرانوالہ سے گجرات تو بولے کہ بھئی یہ بچی ہماری بہو بنے گی، تو پھر آپ خود سوچیں کہاں کی مرضی، کہاں کے خیالات۔ ہاں جب جوان ہوئے تو لوگوں نے رولے بھی ڈالے۔"

س۔ "ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے پہلے سے کوئی تصور تھا؟ نیز وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھی؟"

ج۔ "ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے بہت سی خواہشات تھیں۔ بہت سے خیالات تھے۔ ہر کہانی میں میں خود کو ہیروئن دیکھتی اور انہی کو ہیرو کہانی کا بنا کے اور اس طرح طاری کر کے پڑھتی کہ ساتھ موجود لوگوں سے ناتا توڑ لیتی۔ کان خود بخود بند ہو جاتے۔ جی چاہتا بہادر، غیور اور محنتی بے تحاشا مخلص، محبت کرنے والا ساتھی ملے۔ جو میں اور تم کا فرق مٹا کے محبت کرے۔

شکر ہے رب کا خوب صورتی بھی ملی۔ غیور اور محنتی بھی ملا۔"

س۔ "منگنی کتنا عرصہ رہی شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات وغیرہ؟"

ج۔ "اس سوال کا جواب یہ ہے کہ منگنی اٹھارہ سال رہی۔ (ہاہا) پی ٹی سی ایل فون تھا اور جرات ذرا کم تو ایسی کوئی کوششیں نہیں ہوئیں۔ والد صاحب کو اللہ جنت دے۔ ہمارے دلوں پر اپنا بے انتہا رعب رکھتے تھے۔"

س۔ "شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات تھے؟"

ج۔ "شادی سے پہلے سسرال والے نہیں تھے، بلکہ پھوپھو اور پھوپھا تھے اور مجھے میرے والد صاحب سے بہت منتوں ترلوں سے لیا تھا کیونکہ ہمارے جوان ہونے پر ظالم سماج بھی آڑے آ گئے تھے۔ رشتے داروں کی صورت میں تو ابو جان رشتہ دینے سے انکاری اور میاں صاحب نے گھر والوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ خودکشی کے ارادے رہے وغیرہ تو بے چاروں نے خوب ناک سے لکیریں کھینچیں، بے انتہا وعدے وعید کرنے کے بعد میرا رشتہ لیا۔ سب میری بے تحاشا عزت کریں گے، میں اپنا سلیقہ اور ہنر آزمایا کروں گی اور خوب دعائیں سمیٹا کروں گی۔ پڑھا لکھا ماحول بناؤں گی۔ محبتیں بانٹوں گی محبت پاؤں گی مگر ساتھ ہی کہیں قسمت کھڑی میری منصوبہ بندیوں پہ قہقہے لگا رہی تھی کہ میں تمہارا ساتھ چھوڑ رہی ہوں تم کو اللہ کی امان میں۔"

س۔ "شادی کے لیے تعلیم چھوڑنا پڑی یا کوئی قربانی دینا پڑی؟"

ج۔ "شادی کے بعد تعلیم چھوڑنا پڑی اور اس کے بعد قربانیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور ریت کی طرح پھسلتے ہوئے خوابوں کی کرچیاں سمیٹتی ہوں۔"

س۔ "شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسموں کے دوران لین دین کے معاملے پر بدمزگی ہوئی؟"

ج۔ "شادی تیرہ جولائی انجام پائی۔ میرے ابو جان اور امی جان جیسا کمینہ دین پھوپھی اور چھوٹی بیٹی کا بھی دھیان رکھنا پورے خاندان میں کسی کا بھی نہیں۔ لہٰذا کوئی موقع رہا ہی نہیں گیا۔ ہاں رسم رونمائی نہ ہو پائی۔ ہوا کچھ یوں کہ جو زیورات مجھے چڑھائے جانے تھے وہ دوسری پھوپھو کے حوالے تھے اور انہوں نے آتے ہی بارات کے ساتھ مجھے پہنا دیے۔ اس میں ایک لاکٹ اور انگوٹھی جو دولہا نے دلہن کو گفٹ دینا تھا۔ وہ بھی شامل تھے۔ رات کو مجھ سے مانگیں اور میں نہ دوں اور خوب انجوائے کیا۔ بعد میں پھر رونمائی میں پیسے ملے۔ ولیمہ بھی بہترین رہا۔ مگر ہاں ایک بات اور بارات سے میری دوستیں، سارے گاؤں سے میرے اسٹوڈنٹس کی حاضری بھی کی اور میرے سسرال والے حیران۔ اتنے گفٹ تو کبھی کسی کو نہیں ملے۔ بعد میں بھی میری سسرال میں اس بات کا تذکرہ رہا۔ ہر چاہنے والے کا شکریہ۔"

س۔ "شادی کے بعد شوہر نے پہلی بار آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟"

ج۔ "شادی کے بعد دولہا میاں دیکھتے ہی بولے" ماشاء اللہ۔ شکر ہے، سب خیریت سے ہو گیا اور تم مجھے مل گئیں۔"

س۔ "شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟"

ج۔ "حیران ہوں اتنی کہ بس حیرانی جاتی ہی نہیں۔ جو کچھ ابھی تک لکھا ہے وہ اک رخ تھا اور زندگی شادی کے بعد دوسرا سخن تھی۔ سب سہیلیاں، سب سلیقے نیل ہو گئے، پاک کر دیے گئے۔ سب سے پہلے کتب بینی پہ پابندی لگائی گئی۔ رسالے پھینکے گئے۔ ہر دم متحرک زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا۔ سسرال نما قید خانے کا پنجوانا ہو نہیں تھا کہ بیوی کو اذان کے لیے جگہ ملتی۔ سو چاروں طرف بے بسی ہی بے بسی تھی۔ والدہ محترمہ کی خاص نصیحتوں میں سے ایک "لوٹ کر پیچھے نہیں دیکھنا (ورنہ پتھر کی ہو جاؤ گی۔)" سب کچھ ملا۔ عزت، اعتبار، قدر، محبت، خلوص نہیں ملا۔ وہ سب کچھ جو ملا اس میں لالچ، حسد، خودغرضی کی فراوانی تھی۔ خوابوں کے ملبے کے نیچے سے اب بچے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت پہلے جب مجھے ہوش آیا اور پتا چلا کہ

مجھے بیاہ کے پھوپھی کے گھر گوجرانوالہ جانا ہے۔ تو میں بے ساختہ بولی" وہ گوجرانوالہ جہاں کے پہلوان مشہور ہیں۔ ہاں۔ وہ تو دماغ سے نہیں پیٹ سے سوچتے ہوں گے" واہ رے رب تیری قدرت۔ میں نے عرصے کے بعد ان لوگوں کو ایسا ہی پایا۔ (سوری۔ ان لوگوں سے جن سے میرا واسطہ نہیں پڑا۔) مگر جن جن سے پڑا وہ ایسے ہی ہیں۔ ظاہر ہے وسیع نظر اور وسیع دل لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں، یہاں بھی ہوں گے۔"

س۔ "شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟"

ج۔ "شادی کے پانچ چھ دن بعد کام سنبھال لیا۔ کھیر چٹوائی کی رسمیں یہاں نہیں ہوتی۔ میں پہلی بہو تھی۔ گھر کو سنبھالنے کے لیے ماسی مل گئی، کام ختم اور وہ بھی پڑھی لکھی ماسی۔ سات بچوں کی ماں نئی نویلی دلہن بن گئی اور نئی دلہن میں بوڑھی روح سما گئی۔"

س۔ "کیا میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے؟"

ج۔ "سسرال اور میکے کے کھانوں میں کافی فرق تھا۔ وہ لوگ ابلے چاول کھاتے ہیں۔ میکے والے دم کے والے چاول کھاتے تھے۔ میکے میں امی جان ناشتا اور کھانا ٹائم پر دے دیتی تھیں۔ ہم اسکول سے آتے تو کھانا تیار ملتا۔ یہاں تین بجے ہنڈیا اور رات کا کھانا جب آنتیں بھوک سے سوکھ جاتیں، تب پکانے کو لایا جاتا۔ ہمارے ہاں رواج نہیں تھا پھوپھوں، خالاؤں کے گھر جانے کا۔ اس لیے کبھی آنا نہیں ہوا تھا لہٰذا ماحول کا اندازہ نہیں تھا مگر بڑے جن میں ابو سرفہرست تھے۔ جانتے تھے اسی لیے رشتہ دینے سے انکاری ہو گئے۔ مگر ہر حال ہو کے رہا۔ جو منظور خدا تھا۔ ماحول پڑھا لکھا نہیں تھا۔ بچے سب چھوٹے تھے اور ابھی پڑھ

رہے تھے اور خوب تو تکار ہوتی۔ میں وقت کی پابند تھی' نیند لا سب سست تھے۔"

س۔ سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور کب تنقید کا سامنا کرنا پڑا؟
ج۔ میں نے سسرال میں تیئس سال گزارے۔ شوہر اور ساس کی منشا کے مطابق۔ ہر وقت دھڑکتے دل کے ساتھ کہ اب کوئی بم پھٹا کہ پھٹا۔ کوئی کار نئی نہیں ہوتی بیٹیوں کے مقدر کی' یہ ٹھیک ہے' مگر چھان بین ضرور کریں۔ لڑکے کا اخلاق' اس کی کمائی' سب دیکھیں' بعد کی ذلیل خواری سے بہتر ہے۔ نقل پرانے رشتوں کی وجہ سے خدارا لوگ نئے رشتے آنکھیں بند کرکے نہ بنائیں۔ ورنہ بیٹیوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ تنقید ہی تنقید ہر طرف' تعریف کا تو دور تک پتا نہیں۔ (خاص ہدایت تھی' بیویوں کی تعریف کریں تو سر پر چڑھ جاتی ہیں۔) مگر پھر بھی چھوٹے دیوروں' نندوں سے (بچپن کے) کچھ جملے حاصل زندگی تھے۔ چھوٹی نند نے کہا اتنے کام کرتی ہیں آپ ہر وقت مصروف رہتی ہیں۔ ایک دفعہ کہا کالج کی فرینڈز کو کہ یہ میری بھابھی کچن سے لے کر موچی تک سب کام کرتی ہیں اور ڈریس ڈیزائننگ تو کمال کی ہے۔ بڑی نند نے کہا (جب کنواری تھی تب) آپ کا ہی حوصلہ ہے بھابھی جو اس جن نما انسان کے ساتھ رہتی ہیں اور میں بن پڑی پاگل ہوئے بھائی ہیں تمہارے۔ چھوٹے دو دیور میرے کھانوں کی اکثر اوقات تعریف کرتے بے شک بعد میں ان کی کلاس خوب لی جاتی۔ یہ ساری باتیں تب کی ہیں' جب وہ خود بھی چھوٹے تھے' میرے بچے بھی چھوٹے تھے نا سمجھی کلو دور تک انھیں افراد کا گر تجربہ جوں جوں بڑے ہوتے گئے بھول گئے کہ کس نے بڑا کیا ہے' اس نے ہمیں پالا ہے۔ جتنی تعلیم زیادہ حاصل کرتے گئے اتنے مجھ سے میرے بچوں سے اپنے بھائی سے دور ہوگئے۔ ان کے دل پتھر کے ہوگئے شاید۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی رنجشیں اختیار کرگئیں جو میرے اختیار سے باہر ہوگئیں۔ میں تو بس بند کمرے میں رویا کرتی۔ دو سال حیران ہی رہی کہ یہ لوگ اتنے بدل گئے ہیں۔ مجھے جہیز میں کپڑے سلائی والی مشین ملی تو میں نے شوق میں نکال کے لگائی' ساس صاحبہ فرمانے لگیں ناک چڑھا کے' کپڑوں پہ پکے بل پڑ جاتے ہیں اس سے۔ یہ تم ہی کو مبارک ہو۔ ہمارے کپڑے نہ اس میں ڈالنا۔

میں نے رسان سے سمجھایا' نہیں' پھوپھو ایسا نہیں ہے۔ جلدی سنبھالے جائیں گے اتنے زیادہ کپڑے' آپ کے سے مجھے خوب سنائیں۔ (اول کتھوں آئی اے ڈی فیشنی) لو جی بات ختم۔ ایسی بے شمار لاتعداد تنقیدیں مقدر ٹھہریں۔ کس کس کا ذکر کریں۔ شکر ہے رب کی ذات کا' وقت گزر گیا' مگر دل بہت کھنڈے ڈول گیا' وہ جیسے جالا میں نظر آتے ہیں نا' مگر تعلیم نے زبان بندی سکھا رکھی تھی' جو ہمیشہ کام آئی۔ دو سال کے بعد میرے جیٹھ کی شادی ہوئی تو کچھ صبر' جھمیلا کو دیکھ آئیں۔ کچھ ہدایتیں' کچھ نصیحتیں اس نے پلے باندھ دیں۔ تو گزارا ہونے لگا۔ میں میاں کے گھر سے جانے کے بعد گھر کو سنوارنے لگی۔ گھر کے کام کوشش کرتی ان کے آنے تک ختم ہو جائیں۔ مگر یہ لوگ مردوں کو دکھا دکھا کے کام کرتیں' سو پھر سوچ لیجیے میں کیا سمجھتے۔"

س۔ سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟ سسرال میں گھریلو اور خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے؟
ج۔ سسرال والوں نے قطعی وہ حق نہیں دیا جو میرا تھا۔ بیٹے سے ہی کام چلا لیتے' اس کی انہیں ضرورت تھی۔ رشتے کرتے ہوئے' کہیں جانا ہوتا ہمیں نہیں بتایا جاتا تھا' چپ چاپ سب کام کرلیے جاتے۔"
س۔ سسرال والوں سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟
ج۔ سسرال والوں سے وابستہ کوئی توقع پوری نہیں ہوئی۔ ان کے سامنے تو میرا جانا ہوگا تو بھی ان سے کتنے لگیں گے۔"

س ۔ "بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں بہت بڑا امتحان بن کر آتی ہے۔ خصوصاً "پہلا بچہ" ایک طرف خود میں آتی تبدیلی' دوسری طرف شوہر اور سسرال والے' آپ کو کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔؟"

ج ۔ "بچوں کی پیدائش عورت کے لیے واقعی بڑا امتحان ہوتی ہے' پہلی بیٹی کی پیدائش سے پندرہ دن پہلے

ساس بھرا پرا گھر چھوڑ کے بہن کے گھر جا کے بیٹھ گئیں۔ میں الگ پریشان' کاموں کی نہ ختم ہونے والی لسٹ اور مردوں سے بھرا گھر' بہرحال صبر کیا کوئی شکوہ نہیں کیا۔ میرے چچا سسر ایک دن آئے' پانی مانگا میں دینے گئی تو کہنے لگے بھابھی کہاں ہیں میں نے بتایا تو پانی وہیں چھوڑا اور اٹھ کھڑے ہوئے' بعد میں پتا چلا کہ جاکے بھابھی کو خوب سنائیں کہ بچی کو اس حالت میں گھر اکیلے چھوڑ کے یہاں آ کے فالتو بیٹھ گئی ہیں گھر چلیں' تب آئیں۔ بہرحال میری امی نے اسپتال سے گھر تک سات دن میرے ساتھ گزارے' بچی سیزرین پیدا ہوئی اور ٹھیک آپریشن کے گیارہویں دن میرے

جیٹھ جی کی منگنی کا شوشہ چھوڑ دیا گیا تو ایسی حالت میں سارے کاموں کی نگرانی بظاہر مگر زیادہ تر خود کرنا' خوب گرمی کا موسم' جولائی میں چھوٹی سی بچی تھی۔ مہمانوں کی آمد روز کا معمول تھی۔ پھر سسر صاحب گاؤں کے کونسلر بھی تھے۔ ڈیرہ داری بھی تھی۔ بھینسیں' گائیں' نوکر چاکر' ڈھیروں ڈھیر مصروفیات' ایسے میں آرام کرنا تو خواب ہوا۔ ساتھ ساتھ سننا پڑتا کہ کوئی انوکھے بچے ہیں' ہم نے بھی تو پیدا کیے تھے۔ بچے سوئیں تو ماؤں کو کام کرنے چاہئیں۔ (تو پھر ماؤں کو کب سونا چاہیے' جب بچے اٹھ جائیں؟) بگڑنے والا بھی تو کوئی ہو۔ اللہ کا شکر رہا میاں صاحب جہاں بہترین بیٹے ہیں وہاں بہترین باپ بھی رہے۔ بچوں کا خیال کرتے۔ شہزادیوں کی طرح پالنے کی کوشش کی بساط بھر۔ تمام تر مخالفتوں کے باوجود اور میں نے پھر اللہ کا نام لے کر بہترین ماں بننے کی ٹھان لی اور صد شکر

کامیاب رہی' آئندہ بھی اللہ کرے' ساری دنیا کو چھوڑ کے جو عورت گھر اور بچوں کی ہو جائے' اللہ کی رضا کے لیے تو آسانیاں اللہ خود پیدا کرتا ہے۔ جو انگنت قیلی

سسٹم فی زمانہ بہت مشکل ہے۔ گھر میں تو بڑے بڑے گھرے تھے۔ بھرے پُرے گھر میں آج تو تنہائی مشکل لگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے ابو جان کو جنت الفردوس عطا کرے۔ (آمین) وہ ہم سے نو سال پہلے بچھڑ گئے۔ اپنی طویل بیماری کے بعد۔ گھر ان کا طریقہ' زندگی ہمارے لیے مشعل راہ ہے اور والدہ صاحبہ کی اعلا ظرفی' مہمان نوازی اور خوش اخلاقی ہمارے دلوں میں راج کرتی ہے اور ہم نے اس کا دامن کبھی نہیں چھوڑا' یہی وجہ ہے رونق لگا کے رکھتی ہوں۔ لاہور سے بیٹے والے اگر مجھے ملے بغیر گجرات چلے جائیں تو بھی اور اگر گجرات والے مجھے بتائے بغیر لاہور نکل جائیں تو سخت ناراض ہو جاتی ہوں۔ چھوٹے بھائی کے بقول دربار پر حاضری ضروری ہے تو اپی کا کہنا "میرے ہوتے ہوئے ناممکن ہے اسے ملے بغیر چلا تو مل ہی نہ دیا۔"

س۔ "آپ جوائنٹ فیملی سسٹم سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند ہے؟"

ج۔ "مجھے تو جوائنٹ فیملی اگر محبت بھری ہو تو اس جیسا کچھ نہیں لگتا' آپ کے اردگرد محبتیں ہوں۔ خلوص ہو' دکھ سکھ کے ساتھی ہوں۔ چوٹ بھی لگے تو وہ تو ازیں کیا ہوا؟ گر اپنا مشکل ہی نہیں' آج ناممکنات میں سے ہے۔ سو بچوں کی آسانی کے لیے علیحدہ رہنا چاہیے۔"

س۔ "آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے کوشش کی؟ آپ کی کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی؟"

ج۔ تمام تر ناراضیوں اور خفگیوں کے باوجود میں ماحول کو بہتر رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں نے سسرال کے ماحول کو پڑھا لکھا صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی رہی۔ نماز کی پابندی سکھائی۔ جہاں تو بڑے عالم تھے وہاں بچوں تہذیب جھلکنے گی۔ میری دیکھا دیکھی صفائی پسندی کی عادات اپنائی گئیں۔ لباس کی وضع قطع میں فرق آیا۔ مہمان نوازی میں فرق آیا۔ کوئی مانے یا نہ مانے' میں نے بے شمار خامیاں دور کیں۔ ہاں ذہن صاف نہ کر سکی' دل وسیع نہ ہو سکے۔ اس کے لیے رب سے ہر لمحہ دعا گو ہوں۔ مجھے فخر ہے اپنے ماں باپ پر جنہوں نے ہمیشہ ہمیں محبت کرنا سکھایا۔ بڑوں کا ادب سکھایا۔ نماز' روزے کا پابند بنایا۔ ہمسایوں کے حقوق کی پاسداری سکھائی' رشتہ داروں سے بہترین سلوک سکھایا' تربیت و عبادت کا شعور دیا۔ غرضیکہ کسی چیز میں کمی نہیں رکھی' گھر آگے کیسے رہنا ہے' نہیں سکھا پائے' ہائے بے چارے والدین۔ وہ عورتیں یا مائیں جن کے بہوؤں اور بیٹیوں کے لیے الگ الگ قانون ہوتے ہیں۔ وہ اپنا گھر تو جہنم بناتی ہی ہیں۔ بیٹیوں کا بھی سکھ برباد کرتی ہیں کہ بے شک منصف اوپر بیٹھا ہے اور وہ دیکھ رہا ہے۔ شادی شدہ عورت کی کامیابی آج تک سمجھ ہی نہیں آئی کس میں ہے' خاوند کے ساتھ منافقت اور جھوٹ میں' اس سے نافرمانی میں؟ تو پھر جنت میں کیسے جایا جائے گا۔ تو بس پھونیا چھوڑیں' نفرت کم کریں' صبر بھی آجائے گا۔ مشکلیں بھی ٹل جائیں گی' رب سے لو لگائیں۔ یقین جانیں سکون آجائے گا اور دشمن اور حاسد لوگ حیران ہوں گے کہ یہ سکون سے کیسے ہیں۔ اس کی ذات آپ کو اپنی رحمتوں کے حصار میں جب لے لے گی تو آسانیاں خود بخود نکل آئیں گی۔ یہ یقین کامل مجھے سولہ سال کے تجربے کے بعد ملا۔"

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثل ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوشش کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظمیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ عدیل سے شادی سے قبل ظمیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہیں بنی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بعد ازاں عدیل کو بھی پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کرتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہیں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کرکے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کرکے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مترلین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کی سختی سے لوٹی لے کر آ جاتا ہے کہ دوران عدت انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آ جائے۔ سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے





جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور ویرانے میں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ وہاں سے وہ عدیل کی مدد سے گھر پہنچ پاتی ہے۔

لاولد ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سوہا اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔ اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ دو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔

بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے۔ بشریٰ کے آنے کے بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مشال کو چھین لیتا ہے۔ مشال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مشال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرچہ کٹوا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل، مشال کو لے جائے، تاکہ وہ بشریٰ کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی اچانک شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ انسپکٹر طارق ذکیہ بیگم سے بشریٰ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں۔ مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے، پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ ایک طویل عرصے بعد دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور ایک بار پھر بشریٰ سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشریٰ تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بشریٰ اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مشال کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعوا کرتا ہے مگر بشریٰ قطعی نہیں مانتی۔ پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہو جاتے ہیں کہ ہفتے کے ابتدائی چند دنوں میں مشال بشریٰ کے پاس رہے گی اور بقیہ چند دن عدیل کے پاس۔ گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل عفت سے شادی کر لیتا ہے۔ والدین کی شادی کے بعد مشال دونوں گھرانوں کے درمیان گھن چکر بن جاتی ہے۔ بشریٰ کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔ مشال کے لیے مزید تنگ بشریٰ اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد پڑ جاتی ہے۔ مشال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ملائیشیا چلا جاتا ہے اور مشال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر بھجوا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مشال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مشال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک شخص تنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آکر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مشال اپنے ماموں عمران کو فون کر کے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ پوش ایریا میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کوچنگ سینٹر خوب ترقی کر جاتا

ہے۔ مثال 'واثق کی نظروں میں آ چکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔

عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں عائشہ اور اریبہ کو اپنے بیٹوں وقار 'وقاص کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور واثق بہت خوش ہوتے ہیں۔

سیفی 'مثال پر بری نیت سے حملہ کرتا ہے تاہم مثال کی چیخوں سے سب وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ سیفی الٹا مثال پر الزام لگاتا ہے کہ وہ اسے بہکا رہی تھی۔ احسن کمال بیٹے کی بات پر یقین کر لیتا ہے۔ مثال اور بشریٰ مجبور اور بے بسی سے کچھ کہہ نہیں پاتیں۔ احسن کمال پوری فیملی سمیت دوسرے ملک میں شفٹ ہو جاتا ہے۔ بشریٰ مثال کو مستقل عدیل کے گھر چھوڑ جاتی ہے۔ جہاں عفت اور پرینشے اسے خاطر میں نہیں لاتیں۔ واثق کو بہت اچھی نوکری مل جاتی ہے۔ مثال اور واثق کے درمیان ان کہا سا تعلق بن جاتا ہے۔ مگر مثال کی طرف سے دوستی اور محبت کا کوئی واضح اظہار نہیں ہے۔ واثق البتہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کر چکا ہے۔ واثق 'عاصمہ سے اپنی کیفیت بیان کرتا ہے۔ عاصمہ خوش ہو جاتی ہے مگر غائبانہ ذکر پر بھی مثال کو پہچان نہیں پاتی۔ واثق عاصمہ کو لے کر مثال کے گھر لے جاتا ہے۔ مگر دروازے پر عدیل کو دیکھ کر عاصمہ کو برسوں پرانی رات یاد آ جاتی ہے۔ جب زبیر نے عاصمہ کی عصمت دری کر کے اسے ویرانے میں چھوڑ دیا تھا اور عدیل نے عاصمہ کو گھر پہنچایا تھا۔ اگرچہ عدیل نے اس وقت بھی نہیں سمجھا تھا کہ عاصمہ پر کیا بیتی ہے اور اب بھی اس نے عاصمہ کو نہیں پہچانا تھا مگر عاصمہ کو عدیل بھی یاد تھا اور اپنے ساتھ ہونے والا وہ بھیانک حادثہ بھی۔ شرمندگی اور ذلت کے احساس سے عاصمہ کو انجائنا کا اٹیک ہو جاتا ہے۔ واثق دروازے سے ہی ماں کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مثال اس کا انتظار کرتی رہ جاتی ہے۔ پھر بہت سارے دن یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ ان ہی دنوں عدیل اپنے دوست کے بیٹے فہد سے مثال کا رشتہ طے کر دیتا ہے۔ عفت 'مثال کے لیے اتنا بہترین رشتہ دیکھ کر بری طرح جل جاتی ہے۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ کسی طرح یہ رشتہ پرینشے سے طے ہو جائے۔ مثال بھی اس رشتے پر دل سے خوش نہیں ہے۔ مگر اپنی کیفیت سمجھ نہیں پا رہی۔ عاصمہ کی طبیعت ذرا سنبھلتی ہے تو وہ مثال کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ اتفاق سے اسی دن مثال کی فہد سے منگنی کی تقریب ہو رہی ہوتی ہے۔ وہیں گھر سے واثق کی ملاقات پرینشے سے ہو جاتی ہے۔ جو کافی ناز و ادا سے واثق سے بات کرتی ہے اور اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ اس کی کلاس فیلو وردہ جو اسے بہت پسند کرتی ہے 'واثق کی بہن ہے۔ منگنی کے بعد مثال ایکدم شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ عفت خوش ہو جاتی ہے۔ عدیل بہت غصہ کرتا ہے اور بشریٰ کو فون کر کے مثال کو بھیجنے کی بات کرتا ہے۔ گھر میں ٹینشن پھیلی ہے۔ اسی ٹینشن میں مثال کالج کی لائبریری میں واثق سے ملتی ہے۔ واپسی میں عفت اسے واثق کے ساتھ دیکھ لیتی ہے اور عدیل کو بتا دیتی ہے۔ عدیل ازحد پریشان ہو جاتا ہے۔ پرینشے' وردہ سے ملنے اس کے گھر جاتی ہے تو واثق سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

اٹھتیسویں قسط

عدیل ایک طرف ہو کر نکاح خواں کو فون کر رہا تھا۔ عفت اس کے ساتھ شانہ ملا کر کھڑی تھی۔ اس کے دل کی مراد پوری ہونے جا رہی تھی۔

مثال سے چھٹکارا بھی مل رہا تھا اور ساری زندگی سوتن کی موجودگی کے احساس سے کانٹوں کے بستر پر گزارنے والی سے عفت کے دل کو شاد کرنے کے لیے کافی تھی۔

وقار اور فائزہ اپنے وکیل کو فون کرنے کے بعد اب بے چینی سے اس کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

باہر ملازم اور کام والے لڑکے از سر نو اسٹیج کو ٹھیک کر رہے تھے۔

بچے کھچے قریبی مہمان اب گروپ کی شکل میں کرسیاں جوڑے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

کھانے کے برتنوں کے نیچے دھیمی آنچ میں آگ لگائی جا چکی تھی۔

"تمہاری خوشی کی بات ہے یہ تو۔ بظاہر دیکھا جائے تو فہد بھائی میں کچھ برائی نہیں' یوں بھی ان کی پہلی بیوی امریکا میں ہے ناں۔ تمہیں کوئی مسئلہ تو ہوگا نہیں اس کے ہونے نہ ہونے سے۔"

پری کمرے میں آکر مثال کا میک اپ پھر سے تازہ کررہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ جیسے مزے لیتے ہوئے مثال کو آنے والی سچویشن کے لیے تیار کررہی تھی۔

مثال کسی بے جان بت کی طرح اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

ان چند گھنٹوں میں اس کے دل نے جو آس پاس دیکھی تھی' جو نئے سرے سے خواب بنے تھے وہ سب راکھ ہوچکے تھے۔ اسے عدیل سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ وہ یوں جانتے بوجھتے ان لوگوں کی اصلیت پہچان کر بھی مثال کو اس گڑھے میں دھکیل دے گا۔

"ویسے ہو بھی ٹھیک' آپی ایک بگڑی بات پھر سے بن چلی' ورنہ تو میں نے موسٹلی موویز میں دیکھا ہے' ایسے موقع پر ایک بار بارات واپس چلی جائے تو پھر اس لڑکی کی شادی نہیں ہوپاتی۔ ہے ناں تم نے بھی دیکھی ہوں گی ایسی موویز تو۔"

وہ دل سے چاہ رہی تھی کہ مثال کچھ ایسا بولے کہ پری اسے مزید سنائے۔ مگر مثال کے لب تو جیسے سل ہی گئے تھے۔

"ویسے بری نہیں ہے فہد بھائی کی پہلی بیوی بھی اور اس کی بچی تو بہت کیوٹ ہے۔ طلاق ولاق تو نہیں دیں گے فہد بھائی اسے' تم دیکھ لینا' اس وقت صرف معاملہ سیدھا کرنا ہے۔" وہ ماں کی طرح جو غوا کرتے والے لہجے میں بول رہی تھی۔

"پلیز تم جاؤ یہاں سے۔ مجھے کچھ دیر اکیلا چھوڑ دو۔" مثال ایکدم سے اس کے ہاتھ زور سے پرے جھٹک کر روکھے سے لہجے میں بولی۔

"اب اکیلا پن تو ملنا مشکل ہے' چند منٹوں میں نکاح ہونے جارہا ہے' مجھے ممانے کہا ہے کہ تمہیں تیار کرکے اپنے ساتھ باہر لے آؤں' یوں بھی تو آدھی رات تو ہو چلی ہے پہلے ہی سب کچھ لیٹ ہوچلا ہے۔" وہ بڑے فکرمند سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ جیسے یہ سارے مسائل اسی کو درپیش ہیں۔

"تم ابھی جاؤ یہاں سے۔ جب میری ضرورت ہوگی میں آجاؤں گی خود سے باہر۔"

"مگر مما نے کہا۔" اس نے بولنا چاہا۔

"گیٹ لاسٹ۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ نکلو۔"

اس سے پہلے کہ پری اپنی بات پوری کرتی' مثال نے اٹھ کر پوری طاقت سے پری کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر باہر کی طرف دھکیلا تھا۔ پری کے لیے یہ بہت غیر متوقع تھا۔ مثال نے اسے باہر دھکا دیتے ہی کمرے کا دروازہ لاک کرلیا تھا۔ پری لمحہ بھر کو گنگ سی کھڑی رہ گئی۔

"مثال آپی! کیا کرنے جارہی ہو تم۔ دیکھو کچھ ایسا ویسا نہیں کرنا۔ مطلب سوسائیڈ وغیرہ۔ پاپا بے چارے پہلے ہی بہت زیادہ پریشان ہیں۔ تم سمجھ رہی ہونا؟"

وہ کرے کھاسے ہوش آیا تو دروازہ پیٹتے ہوئے وہ بے اختیار چلائی تھی۔

اندر مثال نے اپنا دوپٹا نوچ کر پھینک دیا تھا۔ گجرے' چوڑیاں اتار دی تھیں۔ اب وہ بند دروازے کے ساتھ لگی زمین پر بیٹھی بے آواز آنسوؤں کے ساتھ رو رہی تھی۔

"باوری۔ تم کہاں ہو؟" وہ شاید اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آئی تھی۔

"مشال آپی! آفار گاڈ سیک دروازہ کھولو۔ خدا کے لیے۔ اب مزید کسی ڈرامے کی گنجائش نہیں ہے۔" وہ دروازہ کی طرف متوجہ ہوئے بغیر پھر سے دروازہ پیٹتے ہوئے اونچا اونچا بولی تھی۔

"مشال آپی اندر کمرے میں ہیں۔" درِ ثمین بھی اس کے پاس آکر ہمدردی سے پوچھنے لگی۔

"یار! انہوں نے مجھے باہر نکال کر کمرہ لاک کرلیا ہے۔" پری روہانسی ہو کر بولی تھی۔

"او مائی گاڈ۔ کچھ مس ہیپ (بری بات) بھی ہو سکتا ہے۔" درِ ثمین بھی پریشانی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

"یہی تو مجھے فکر ہے' مجھے آپی کی ذہنی حالت بھی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ بالکل بت کی طرح خاموش تھی۔" وہ فکر مندی سے بتانے لگی۔

"تو تمہیں باہر نہیں آنا چاہیے تھا' انہیں اکیلا چھوڑ کر کمرے میں۔" درِ ثمین نے پریشانی سے کہا۔

"آپی! مشال آپی! خدا کے لیے دروازہ کھول دو۔ مما' پاپا پہلے بہت پریشان ہیں۔ میری شامت آجائے گی۔ کہ میں نے تمہیں اکیلا کیوں چھوڑا۔"

وہ درِ ثمین کی بات ان سنی کرتے ہوئے پھر سے دروازہ پیٹ کر ملتجی لہجے میں بولی تھی۔

جواب میں اندر بالکل خاموشی تھی۔

"یار! مجھے ڈر لگ رہا ہے اندر کی خاموشی سے' کوئی آواز نہیں۔" درِ ثمین کچھ ڈر کر بولی۔

"کہیں اس نے کچھ کر تو نہیں لیا؟" پری اڑی رنگت کے ساتھ بولی تھی۔

"میں مما کو بتاتی ہوں جا کر' وہی آکر کچھ کریں گی۔" وہ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔

درِ ثمین چند لمحے وہاں تاسف بھرا چہرہ لیے کھڑی رہی' پھر آہستگی سے وہاں سے چلی گئی۔

✡ ✡ ✡

"نہیں مما! کچھ فائدہ نہیں ہے' بے کار ہے یہ سب سوچنا۔" واثق مایوسی کی انتہا پر تھا۔

وہ بالکل ہمت ہار کر ایک طرف آکر بیٹھ گیا تھا۔

دوسری طرف پھر سے نکاح کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ نکاح خواں ابھی ابھی اس کے پاس سے گزر کر اندر گیا تھا۔ فائزہ اور وقار وکیل کو لیے بیٹھے تھے۔

فہد اور ریلی میں بھی کچھ بات چیت چل رہی تھی۔

"نہیں واثق! یوں ہمت نہیں ہارتے بیٹا! اور یہ سب جو کچھ ہونے جا رہا ہے' یہ ان کے پاس لاسٹ آپشن ہے' اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے تو اس لیے یہ کیا جا رہا ہے۔" عاصمہ اس کے پاس بیٹھ کر ہمت بڑھانے والے انداز میں بولی۔

واثق سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

عفت اور عدیل ایک طرف کھڑے آپس میں کچھ بحث کر رہے تھے۔ مشال کی زندگی دوسروں کے لیے عبرت کی مثال بننے جا رہی تھی اور یہ سب کچھ اس کے اپنے بہت پیارے باپ کی مرضی سے ہو رہا تھا۔

یہ اس کی اپنی مرضی سے بھی تو ہو رہا تھا' وہ بھی تو ہمت ہار کر بیٹھ گیا ہے۔

"کیا محبت صرف موافق حالات میں پنپنے کا نام ہے۔ اگر حالات مناسب نہیں ہوں تو محبت جرم بن جاتی ہے؟"

کوئی اس کے اندر سے بولا تھا۔

اسے خود بھی نہیں پتا چلا اس کے خون میں ایکدم سے جو جوش بھری لہر اٹھی تھی وہ کس طرح جا کر عدیل کے

سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

عدیل نے کچھ ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

عفت کے چہرے کے تاثرات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔

مگر اس لمحے وہ فیصلہ کر کے آیا تھا کہ وہاں سے بات ضرور کرے گا۔ وہ اب پیچھے نہیں ہٹے گا۔

"سر! مجھے آپ سے بات کرنا ہے، بہت ضروری ہے۔" وہ ٹھوس اٹل لہجے میں عدیل کی آنکھوں میں دیکھ کر پراعتماد انداز سے کہہ رہا تھا۔

عاصمہ آہستگی سے اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے اچھا لگا کہ واثق نے کسی کا بھی سہارا لیے بغیر خود اپنا کیس لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"آپ کسی اور وقت آئیے گا' اس وقت میں کچھ ایسی بات نہیں ہو سکتی —— اس وقت میں کچھ ایسی بات نہیں سن سکتا۔" عدیل اسے ٹال کر جانے لگا تھا۔

"بات اسی وقت ہو گی اور مجھے کرنا ہے۔ آپ کو سننی ہے کہ یہ بات بھی بہت اہم ہے۔" وہ اس کے رستے میں جم کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے مسٹر!" عدیل سخت درشتی سے بولا تھا۔

"واثق کہتے ہیں مجھے اور میں.... میں آپ کی بیٹی منال سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ اسی پراعتماد لہجے میں آنکھوں میں چمک لو دیتا سا جوش لیے بولا تھا۔ عدیل یک دم جیسے ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔

" Are You Senses "(تم اپنے حواس میں ہو۔) وہ کچھ دیر بعد کچھ تحقیر سے بولا تھا۔

"عدیل بھائی! میرا بیٹا ہے یہ اور اصل میں ہم پہلے بھی آپ کے پاس آپ کی بیٹی کے رشتہ کے سلسلے میں آئے تھے۔ مگر آپ اس وقت منال کی بات طے کر چکے تھے تو مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں یہ بات آپ سے کروں' ہم خاموشی سے واپس چلے گئے کہ یقیناً اس میں منال کے لیے بہتری ہو گی' جبکہ میں اور میرا بیٹا دل سے آپ کی بیٹی کو اپنے گھر کی عزت بنانا چاہتے ہیں۔"

اب عاصمہ کو آگے بڑھ کر بیٹے کا کیس پیش کرنا پڑا تھا۔

عفت کے چہرے پر اب غصہ جھلکنے لگا تھا۔

"دیکھیں یہ رشتے ناتے جوڑنا کھیل یا مذاق نہیں کہ کوئی بھی اٹھ کر آئے اور رشتہ مانگ لے اور ہم صرف اس بنیاد پر "ہاں" کر دیں کہ مانگنے والا دل میں چاہت رکھتا ہے ہماری بیٹی کے لیے۔" عفت درشتی اور روکھائی سے کہہ رہی تھی۔

"دل میں بات ہے بس' وہ غلط پن یا منافقت نہیں اور خدانخواستہ دھوکا تو بالکل بھی نہیں ہے۔" عدیل نے ٹھٹک کر عاصمہ کو اور پھر واثق کو دیکھا تھا۔

"یہ سب جو کچھ ہو رہا ہے اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ لوگ جو پہلے ہی آپ لوگوں کو اتنا بڑا دھوکا دے چکے ہیں۔ آگے جا کر منال کے ساتھ کیا نہیں کر سکتے۔"

وہ پھر سے عدیل کو احساس دلانے والے انداز میں بولی۔

"تو آپ کے پاس کیا گارنٹی ہے کہ آپ کی بہو بن کر منال کو دنیا جہان کی خوشیاں مل جائیں گی' جبکہ ہم آپ لوگوں کو جانتے بھی نہیں۔"

"چھوڑیں عدیل! ٹائم ضائع نہیں کریں۔ ویسے بھی نکاح سیٹ ہو چکا ہے" آ جائیں جلدی سے..."

"جن کو جانتے تھے وہ کیا نکلے؟ اگر جان پہچان کا یہی معیار ہے تو۔" عاصمہ پیچھے سے بولی تھی۔

عدیل وہیں کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب الجھن سی تھی۔ عفت ناگواری سے پلٹی تھی۔ اس نے بظاہر سرسری انداز میں مگر واثق کو بہت گہری نظروں سے دیکھا تھا اور اسے پری کا پاگل پن یاد آیا۔

"کہیں یہ ہی تو وہ لڑکا نہیں۔ ورنہ کا بھائی ہے' یہ جس کے گھر سے لوٹ کر آنے کے بعد پری بیمار رہی تھی اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی سے محبت کرنے لگی ہے۔"

لمحوں میں اس نے بہت ساری الجھی باتوں کی کڑیاں جوڑلی تھیں۔

ایک بار پھر شائل اور پری بالمقابل تھیں۔

"بھائی صاحب آپ ان لوگوں پر ایک بار پھر بھروسا کرنے جارہے ہیں' جو بہت بری طرح سے آپ کو دھوکا دے چکے ہیں۔" عاصمہ' عدیل کو خاموش دیکھ کر پھر سے چوٹ لگاتے ہوئے بولی۔

عدیل کچھ بول نہیں سکا۔

"میں اور میرا بیٹا' میری فیملی' آپ جس طرح چاہیں ہمارے بارے میں معلوم کروائیں' آپ کی چھوٹی بیٹی پری میری بیٹی کی کلاس فیلو ہے' دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہے۔ اس کے علاوہ جو آپ معلوم کروانا چاہیں' آپ کو سب معلوم ہوجائے گا۔ آنکھوں سے اوجھل کچھ بھی نہیں رہے گا آپ کی۔" وہ رک کر بولی تھی۔

"شریف لوگ ایک بار زبان دے کر مکرا نہیں کرتے۔ پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ ہم لوگ ان سے بات کرچکے ہیں۔" عفت نے ایک اور کوشش کے طور پر جتا کر کہا۔

"شریف لوگ بار بار دھوکا بھی نہیں کھاتے عفت بس۔ اور آزمائے ہوئے لوگ جب دھوکے باز نکلیں اور صرف یہ سوچ کر آئندہ یہ دھوکا نہیں دیں گے کیا ہمیں ان پر بھروسا کرلینا چاہیے؟ اپنی سب سے قیمتی چیز ان کے حوالے کردینی چاہیے۔" عاصمہ بھی پوری تیاری کے ساتھ بولی تھی۔

"سر! آپ مجھے جانتے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہم بہت دولت مند' بہت امیر پیسے والے لوگ ہیں' میری مدر کی اکیڈمی ہے اور میرا چھوٹا سا بزنس جو میں اسٹارٹ کرچکا ہوں' اور جاب بھی کررہا ہوں۔ میں ان شاء اللہ آپ کی بیٹی کو عزت کے ساتھ وہ تمام خوشیاں دینے کی کوشش کروں گا جو ایک سیلف میڈ محنتی نوجوان دے سکتا ہے۔"

واثق بہت متانت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"سر میرے پاس نہ تو کسی دوسرے ملک کی نیشنلٹی ہے کہ میں کہیں آپ کو دھوکا دے کر بھاگ جاؤں گا' نہ میرے پاس ایسی جائداد یا پیسہ ہے' جس کو بنیاد بنا کر کہ اسے آپ کی بیٹی کے نام کرنے کا وعدہ کرکے رشتہ جوڑوں' میرے پاس عزت ہے' غیرت اور خوف خدا کہ میں کسی کے ساتھ برا نہیں کروں اور اپنے زور بازو سے سب کچھ حاصل کرنے کا جذبہ' بچپن کی یتیمی نے مجھے بہت پہلے ہی خود پر اور خدا پر بھروسا کرنا سکھادیا تھا۔"

واثق ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔

"یہ سب فضول لفظی کہانیاں ہیں اور آپ ہمیں یہ سب کیوں سنارہے ہیں جب ہمیں یہ نہیں سننا' نکاح ہونے جارہا ہے۔ چلیں عدیل! سب بلا رہے ہیں ہمیں۔"

وہ مضبوطی سے عدیل کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچ کر لے جانے لگی تھی۔

"ٹھہرو عفت! جب جانے بوجھے لوگوں سے دھوکا کھانا ہے تو پھر انجان لوگوں کو آزمانے میں کیا حرج ہے۔"

وہ واثق کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچ بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"عدیل! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ ان لوگوں کی باتوں میں آرہے ہیں۔ وقار بھائی اور فائزہ بھابھی کیا سوچیں

کے لئے سب پیپرز تیار کروا چکے ہیں بس چلیں اب آپ تو بری طرح سے مصر تھی۔

"کیا وقار اور فائزہ نے یہ سوچا تھا کہ جب ان کا دھوکا کھلے گا تو میں کیا سوچوں گا۔ میری بیٹی پر کیا بیتے گی۔" وہ رک رک کر بول رہا تھا۔

"عدیل کیا ہو گیا ہے۔" عفت کچھ پریشان ہو کر بولی۔

"عفت یہاں ہر انسان صرف اپنا فائدہ' اپنا مطلب دیکھتا ہے۔ کس میں اس کا فائدہ ہے اور کس میں نقصان' یہاں کسی کو دوسرے کے فائدے اور نقصان سے کچھ غرض نہیں ہوتی۔ یہی معاشرے میں اصول بنتا جا رہا ہے Survive کرنے کا تو پھر ہمیں بھی اپنا فائدہ' اپنا مفاد دیکھنا چاہیے۔"

عدیل کیا کچھ سوچ رہا ہے واثق اور عاصمہ کو کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا۔

دونوں نے طمانیت بھرے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

"مما! مما! وہ مثال آپی نے اپنے کمرے کا دروازہ لاک کر لیا ہے' انہوں نے مجھے باہر نکال دیا اور اب بہت بار کہنے پر بھی نہیں کھول رہیں اندر خاموشی ہے۔"

پری پھولے سانسوں کے ساتھ حواس باختہ سی ماں کے پاس آ کر بولی تھی۔

"میرے اللہ یہ کیا ہونے جا رہا ہے اب۔" عفت بے اختیار دل پکڑ کر بولی تھی۔

عدیل پری سے کچھ بھی پوچھے بغیر تیزی سے مثال کے کمرے کی طرف بھاگا تھا۔

واثق اور عاصمہ بھی اس کے پیچھے گئے تھے

"یہ دونوں خدا جانے کہاں سے ٹپک پڑے ہیں' اچھا بھلا سب کچھ ٹھیک ہونے جا رہا تھا اور یہ عدیل تو ایسا کچے کانوں کا کوئی ہے کہ فوراً ہر کسی کے کہنے پر چل پڑتا ہے۔"

وہ سخت بیزاری سے بڑبڑا کر ان کے پیچھے جا رہی تھی۔

"یہ مثال آپی والا معاملہ نپٹ جائے تو میں مما کو واثق کے بارے میں بتا دوں گی۔"

پری سرشاری سی واثق کے چوڑے کندھوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ بتا دیا تم نے اپنی مدر کو مثال آپی کے بارے میں۔" وہ اس کے پاس آ کر کھڑی تھی۔

"ہوں' اُدھر ہی گئے ہیں سب۔ آ جاؤ تم بھی۔" پری بے خیالی میں اس کی طرف دیکھے بغیر یونہی سر کو جنبش دے کر بولی اور مثال کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"مثال' مثال دروازہ کھولو۔" عدیل اس کے کمرے کے باہر جا کر سختی سے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے دھیمی مگر بھاری آواز میں بولا تھا۔

اندر جامد خاموشی تھی۔

"اگر اس نے خود کو کچھ کر لیا' اسے کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔" اس کا دل بے اختیار ڈرا تھا۔

"بشریٰ کو میں کیا جواب دوں گا؟" دوسری سوچ یہی آئی تھی اس کے دل میں۔

"مثال' بیٹا دروازہ کھولو پلیز بات کرو مجھ سے مثال!" وہ جیسے گڑگڑا کر کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

آہستگی سے دروازہ کھلا تھا۔

اجڑے روپ اور بکھرے حلیے کے ساتھ سرخ آنکھیں اور آنسوؤں بھرا چہرہ لیے مثال اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"اور اگر میرے اس فیصلے سے یہ آنسو ہمیشہ کے لیے مثال کا مقدر بن گئے تو میں کیا کروں گا۔" اس کا دل بری طرح سے تڑپا تھا۔

بڑھ کر اس نے ٹوٹی بکھری مثال کو اپنے گلے لگا لیا تھا۔ وہ اب تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی اور وہ خود بھی اس کے ساتھ جیسے بکھر گیا تھا۔

پیچھے سے سب کے آنے کا پتا چل رہا تھا اور اس وقت عدیل کو لگا انہیں کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہیے' اس نے بے حد آہستگی سے مثال کو اپنے کندھے کے ساتھ لگا کر اپنے قدم کمرے کے اندر کیے تھے۔

"پاپا' پاپا پلیز مجھے شادی نہیں کرنی' پاپا مجھے نہیں کرنی شادی!" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

عفت' عاصمہ اور واثق وہاں پہنچے تو کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پاپا پلیز۔" محمد چڑے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

"ابھی بھی تم یہ سب کہو گے۔"

وقار تیز غصے بھرے لہجے میں بولا تھا۔

فائزہ کی نظروں میں بھی بہت لعن طعن سی تھی۔

"کچھ رہ نہیں گیا ہمارے پاس اب گنوانے کے لیے۔ عزت' سا کھ سب کچھ خاک میں مل گیا ہے اور ایسی دو نمبر بازاری عورت کو تم پھر بھی اپنے ساتھ چپٹائے رکھنا چاہتے ہو' جس کی وجہ سے ہم سارے میں ذلیل و خوار ہوئے ہیں' تم ابھی بھی اسے طلاق نہیں دینا چاہتے۔" فائزہ پھٹی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

"یہ چاہتا ہے کہ یہاں سے ہم دھکے مار کر نکالے جائیں صرف اس بات کی کسر تو رہ گئی ہے۔" وقار اسی غصے میں بولا تھا۔

"کس بات کی مجبوری ہے آپ کو مجھے بتا دیں' جو اتنا گر کر ہم یہ شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔" محمد جیسے برداشت کھو کر بولا تھا۔

"یہ تم ہم سے پوچھ رہے ہو؟ شرم تو شاید اب تم میں بچی ہے' نہ ذرا سی غیرت ہے۔" وقار غصے میں بولا۔

"میری بچی ہے اس کے پاس۔" وہ تلخی لہجے میں جیسے گڑگڑا کر بولا ساں باپ کو یاد کرانے کو۔

"لے لیں گے ہم اس سے بچی کو تم اس کی فکر مت کرو۔" وقار لاپروائی سے بولا تھا۔

"اور تم اس بات کی ٹینشن نہیں لو اس طرح کی عورتیں بستر پر قید رہ کر بچوں کا بوجھ اپنے ساتھ نہیں اٹھاتی ہیں' وہ خود بھی تمہارے حوالے کر دے گی محض چند مہینوں میں۔" فائزہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"یہی خیال آپ کا اس وقت بھی تھا جب میں نے اس سے شادی کی تھی کہ یہ چند ہفتے تو کیا چند دن بھی میرے ساتھ نہیں گزار سکے گی۔" محمد بڑبڑا کر بولا۔

"اور اس نے نہ چھوڑا تمہیں' تم چھ سال سے اس کو جونک کی طرح اپنے ساتھ چپٹائے بیٹھے ہو۔" وقار نفرت سے بولا۔

"اور اب ہمیں مزید تماشا نہیں بناؤ۔ یہاں طلاق نامے پر سائن کرو اور ختم کرو اس قصے کو۔"

وقار نے پیپرز اس کے آگے کیے محمد بے بسی سے بیٹھی لیلیٰ کو دیکھتا چلا گیا جس کی گود میں اس کی بیٹی بچپن کی معصوم اور میٹھی نیند سو رہی تھی اس سے بے خبر کہ اس کا دادا اور دادی اس کے بارے میں کتنا ظالمانہ فیصلہ کر

سبے ہیں۔
وہ سخت مشکل میں جتلا اپنے آگے رکھے پیپرز کو دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ مشل کو اپنانے کو تیار تھا مگر لیلی کو چھوڑنا۔
ایک بھیانک سا خیال جو اسے کانٹوں پر گھسیٹ رہا تھا۔
"فراست سوچو اتنا' اس وقت اور کوئی آپشن نہیں ہے ہمارے پاس۔" قائزہ اب کے کچھ نرمی سے بولی تھی اس کا اندھا تھپک کر۔
"اگر میں لیلی کو طلاق نہیں دوں' اس پیپر پر سائن نہیں کروں تو؟" وہ بے بسی سے پوچھ رہا تھا۔
"تو پھر عاق تو ہم تمہیں کر ہی دیں گے ہم دونوں کے جنازوں میں بھی تمہیں شامل ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔ یہ وصیت ہوگی ہماری' اب تم فیصلہ کرلو۔"
وقار بے لچک لہجے میں کہہ رہا تھا اور فراست ساکت سا دیکھے جا رہا تھا باپ کو!

☼ ☼ ☼

"بابا!" مشل لہجے میں شاک لیے باپ کو دیکھ رہی تھی' جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔
وہ باپ کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر بے اختیار سی ہوگئی۔ بہت سال پہلے یونہی بچپن میں بھی وہ عدیل کے اداس و پریشان چہرے کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔
اس وقت بھی اس کے دل میں یہی ہوتا تھا وہ جیسے بھی' جس طرح بھی جتن کرے اور عدیل کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دے اور آج تو پاپا کو میری وجہ سے جس مسلسل پریشانی' ہزیمت سے گزرنا پڑا' میں چاہتے ہوئے بھی اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔
وہ یک ٹک باپ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچے جا رہی تھی' ابھی چند منٹ پہلے وہ اپنی جان لینے جا رہی تھی۔
مگر ان لمحوں میں بھی عدیل کی ایک آواز' ایک پکار نے اسے پانی کی طرح پگھلا کر رکھ دیا تھا۔
وہ جانتی تھی واپس زندگی کی طرف پلٹنا عمر بھر پھانسی کے پھندے پر لٹکنے کے برابر ہوگا۔
لیکن وہ اپنے آئیڈیل باپ کی خاطر عمر بھر کے لیے اس پھندے پر بھی جھولنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔
"بابا! آپ جو کہیں گے جیسے کہیں گے میں ایک بھی سوال نہیں کروں گی میں صرف آپ کے چہرے پر سکون' خوشی اور اطمینان دیکھنا چاہتی ہوں۔"
وہ باپ کے دونوں ہاتھوں کو ہونٹوں اور آنکھوں سے چوم کے جذباتی لہجے میں بولی۔
"پاپا! میری وجہ سے آپ نے اتنے سال بہت سی پریشانیاں دیکھی ہیں' بہت ٹینشن' جب کہ میں نے کبھی بھی نہیں چاہا کہ آپ دکھی ہوں اور ہر بار آپ ہوئے صرف میری وجہ سے' پاپا مجھے معاف کریں۔"
وہ اس کے ہاتھوں پر چہرہ رکھ کر رو پڑی تھی کہ عدیل کے دل پر جیسے چوٹ پڑی۔
وہ آہستہ آہستہ اس کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا' جذبات کی یورش اسے کچھ بولنے نہیں دے رہی تھی۔
"مشل! انسان وہی کچھ کاٹتا ہے' جو وہ بوتا ہے۔ میں نے پریشانیاں بوئی تھیں تو اپنی مرضی سے تمہارا اس میں کچھ قصور نہیں تھا اور تمہیں میں سزا دینے کا حق بھی نہیں رکھتا۔ لیکن میں دیتا رہا اتنے سارے سال' تمہیں ان جرائم' ان گناہوں کی سزا دیتا رہا جو تم نے کیے ہی نہیں تھے۔"
وہ بمشکل اپنی آنکھیں پونچھ کر گلوگیر لہجے میں بولا تھا۔
"پلیز پاپا! ایسا نہیں کہیں' آپ آج بھی میرے آئیڈیل ہیں' مجھے اس دنیا میں سب سے پیارے ہیں۔"

وہ پھر سے باپ کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر رونے لگی تھی۔

"اور تمہارا آئیڈیل باپ تمہارے ساتھ کیا ظلم کرنے جارہا تھا اپنی اتنی پیاری اتنی حساس بیٹی کے ساتھ۔" وہ اس کی آنکھیں صاف کرتے ہوئے شکستگی سے کہہ رہا تھا۔

"پاپا! مجھے صرف آپ کی خوشی چاہیے جس میں آپ کو سکون ملے اور میں نے خدا سے دعا کی ہے پاپا کہ آئندہ آنے والے دنوں میں میری وجہ سے کبھی آپ کو کوئی دکھ نہیں ملے اور میں نے ابھی رو رو کر اللہ سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ میری یہ دعا ضرور قبول کرے۔" وہ بچوں کی سی معصومیت سے کہہ رہی تھی جیسے سالوں پہلے وہ باپ کی پریشانی بانٹتے ہوئے اس کی گود میں بیٹھ کر یہ سب کہا کرتی تھی۔

"میری بیٹی! میں بھی تمہیں کوئی خوشی نہیں دے سکا۔" دل کا پچھتاوا لبوں پر آگیا تھا۔

"نہیں پاپا! یہ نہیں کہیں جب مما مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔ آپ نے رکھ لیا تو آپ نہیں جانتے آپ نے مجھے اپنا کون سا خزانہ بخش دیا تھا آپ نے مجھے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے دی تھی' مجھے آپ سے اور کچھ نہیں چاہیے پاپا!"

وہ اس بار بہت پرسکون لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ہمیشہ خوش رہو مشال! میری دعائیں ہیں تمہارے ساتھ ہر لمحہ' ہر گھڑی ایک باپ کی دعا جسے خدا رد نہیں کرتا۔" وہ بہت جذباتی سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میرے پاپا میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں آپ میرے لیے جو بھی فیصلہ کریں گے۔ میں زندگی بھر اسے ہنسی خوشی نبھاؤں گی' یہ میرا آپ سے وعدہ ہے' آپ کو کبھی میری طرف سے کوئی شکایت' کوئی غم نہیں ملے گا۔"

عدیل اسے ساتھ لگا کر تھپکنے لگا۔ اس کے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ کیا کہہ رہے ہو عدیل تم؟" وقار شاک بھرے انداز میں سامنے کھڑے عدیل کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"وہی جو مجھے کہنا چاہیے تھا تمہاری اور تمہارے بیٹے کی اصلیت جان لینے کے بعد۔" عدیل کی آنکھوں میں سرد مہری تو تھی ہی کہری اجنبیت بھی تھی۔

"لیکن اس پر تو ہم بات کر چکے ہیں تمام معاملات طے پا چکے ہیں جیسے تم چاہ رہے تھے۔ گھر بھی مشال کے نام ہو چکا ہے اور فہد اس لڑکی کو طلاق ——"

"بس!" عدیل نے ایک ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا تھا۔

فائزہ اور وقار نے سخت پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ سب کچھ بکھرا لٹنے جارہا تھا۔

عفت کے چہرے پر ناگواری الجھن تھی۔

مگر وہ آگے بڑھ کر اب عدیل کو روک نہیں سکتی تھی اسے پھر سے بھری محفل میں ذلیل ہونے کی ہمت نہیں تھی۔

"آگے نہیں وقار۔۔۔ آگے کچھ نہیں بولنا میں ایک بار زندگی میں اپنا یہ حق استعمال کر چکا ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ برس ہا برس بیٹی ایسے کسی بھی معاملے میں حصہ دار بنے' جس میں کسی کو طلاق ہو۔"

"مگر عدیل! اس میں تمہارا یا مشال کا کوئی ہاتھ نہیں ہم تو پہلے ہی لینا چاہتے تھے۔" وہ فوراً صفائی دیتے ہوئے

انداز میں بولا۔
عدیل نے اسے تاسف بھری نظروں سے دیکھا۔
"اور مجھے بہت افسوس ہے کہ اتنے سال دوستی رہنے کے باوجود میں تمہیں ٹھیک سے پہچان نہیں سکا۔" وہ اس کے چہرے پر سرد نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔
"عدیل۔۔۔ دیکھو سب معاملے طے پاچکے ہیں۔" وقار نے صلح جو انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم اتنے خود غرض، بے حس اور مفاد پرست ہو کہ صرف اپنی غرض کی خاطر کسی کی بھی زندگی کو تباہ کرسکتے ہو اور میں۔۔۔ بے وقوف دوسری بار' وہی غلط فیصلہ کرنے جا رہا تھا جس سے بچانے کے لیے قدرت نے اس لڑکی کو غیبی مدد بنا کر بھیجا۔"
عدیل نے ایک طرف کھڑی لیلیٰ کو ہمدردی سے دیکھ کر کہا۔
"تم اس کی باتوں میں مت آؤ عدیل۔" وقار اسے وارن کرنے والے انداز میں بولا۔
"نہیں آرہا بالکل بھی بلکہ میں اس کے لیے صرف دعا کر رہا ہوں' کیونکہ بہرحال یہ بھی کسی کی بیٹی ہے اور تمہاری پوتی کی ماں بھی۔"
"تم نہیں جانتے عدیل۔۔۔"
"وقار! جھوٹی ضد اور بے کار کی انا چھوڑ کر ان دونوں کو اپنالو جبکہ تمہارا بیٹا بھی اسے نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اس کی خاطر ان دونوں کو قبول کرلو تو شاید میری نظروں میں کچھ تمہارا مقام رہ جائے ورنہ میں ہمیشہ یہی شکر ادا کرتا رہوں گا کہ خدا نے میری بیٹی کو تم جیسی دھوکے باز فیملی کے ہتھے چڑھنے سے بچالیا۔"
اس نے دوٹوک انداز میں کہہ کر جیسے بات ہی ختم کردی۔
"لے جاؤ اس لڑکی کو اپنی بہو نہیں' اپنی بیٹی بنا کر' ایک بار اسے کھلے دل سے قبول کرلو۔ تمہارے لیے زندگی آسان ہو جائے گی۔ بیٹا بھی تمہارے پاس آجائے گا۔ تمہارا گھر ہمیشہ کے لیے آباد ہو جائے گا۔ میں صرف تمہیں مشورہ دے سکتا ہوں۔"
"عدیل بھائی! نکاح شروع کروائیں' لیلیٰ والے معاملے کو بھی بعد میں دیکھ لیں گے۔"
فائزہ شوہر کی مدد کو آگے بڑھی تھی۔
"عفت بھابھی! مثال بیٹی کو لے کر آئیں۔" وہ عفت کو بہت اپنائیت سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔
"میرا خیال ہے کہ مثال کو اب لے آئیں عفت! کیونکہ ذرا سی دیر میں نکاح ہے اس کے باوجود کہ تم نے مجھے بہت بڑا دھوکا دیا ہے وقار! پھر بھی میں چاہوں گا تم میری بیٹی کے نکاح میں ضرور شامل ہو۔"
عدیل کی بات پر وقار اور فائزہ نے کچھ پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔
"واثق بیٹا! آجائیں آگے آپ!" عدیل نے پیچھے کھڑے واثق کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے کیا تھا۔
وقار' فائزہ' فہد اور باقی سب کے لیے یہ کسی جھٹکے سے کم نہیں تھا۔
اور عفت تو لمحہ بھر کو بے یقین سی کھڑی رہ گئی تھی۔
ایک بار پھر عدیل نے فیصلہ کرتے ہوئے اس کو کسی قابل نہیں سمجھا تھا' وہ غصے میں کھولنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

واثق اور مثال کا نکاح ہو رہا تھا۔

دونوں کے چہروں پر ایک مسلسل بے یقینی کی کیفیت ثبت تھی۔ عفت اور پری ششدر سی سب دیکھ رہی تھیں۔

وردہ خان اور معالی کو خوش دیکھ کر مطمئن سی ہو چکی تھی۔

عدیل کے چہرے پر جیسے صدیوں بعد ایک سکون بھرا ٹھہراؤ آیا تھا۔ وقار اور اس کی فیملی عدیل کے اصرار کے باوجود یہاں نہیں رکی تھی۔

عدیل نے بھی انہیں جانے دیا۔ یہی مقام شکر کیا کم تھا کہ مثال کو سرحال اللہ نے بچا لیا تھا۔

نکاح ہو جانے کے بعد عاصمہ عدیل کو مبارک باد دیتے ہوئے بے اختیار مثال کو ساتھ لپٹا کر پیار کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

سالوں پہلے کی وہ رات جب عدیل کو اللہ اس کے لیے فرشتہ بنا کر بھیجا تھا۔

اور اس نے جب جب عدیل کو یاد کیا اس کو بہت دعائیں دی تھیں اور سمجھ رہی تھی شاید قرض چکا دیا لیکن آج جو کچھ ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ اللہ اس سے کچھ اور بھی تو چاہتا تھا۔

اسے اپنے اللہ پر بھی اس لمحے بہت پیار آ رہا تھا۔

"میری بچی بہت سادہ بہت معصوم ہے عاصمہ بہن! اس نے ابھی اس چھوٹی سی زندگی میں مکمل خوشی نہیں دیکھی اگر اس سے کچھ بھول ہو جائے کچھ غلطی تو آپ اسے اپنی بچی سمجھ کر نظر انداز کر دیجیے گا۔"

رخصتی سے پہلے عدیل نے جب رندھی آواز میں واثق کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھی مثال کو دیکھتے ہوئے کہا تو عاصمہ کے چہرے پر بڑی اعتماد بھری مسکراہٹ ابھری تھی۔

"عدیل بھائی! مثال کو میں اپنی بہو نہیں اپنی بیٹی بنا کر لے جا رہی ہوں۔ پلیز اب آپ بھول جائیں یہ آپ کی بچی ہے۔ مجھے اپنے واثق سے بھی بڑھ کر عزیز ہے ان شاء اللہ آپ کو اس کی طرف سے کبھی کوئی ایسی ویسی بات سننے کو نہیں ملے گی۔"

اور عدیل کی آنکھیں مزید بھیگ گئیں۔

"اور آپ کا بہت شکریہ آپ نے مجھ پر میرے بیٹے پر بھروسا کیا اللہ نے چاہا تو میرا بیٹا آپ کی توقعات پر پورا اترے گا۔"

"ان شاء اللہ میری دعائیں ہیں ساتھ۔" وہ طمانیت سے چہرہ صاف کر کے مسکرایا تھا۔

"تو اب ہمیں رخصتی کی اجازت دیں' رات کافی سے زیادہ بیت چکی۔" عاصمہ نے کہا تو عدیل لمحہ بھر کو جیسے منجمد سا رہ گیا ایک لمحہ کو اسے محسوس ہوا کہ اگر مثال اس سے ہمیشہ کے لیے دور چلی گئی تو وہ کیا کرے گا۔

اس نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔

ہر لمحہ صرف مثال کو ایک بوجھ سمجھ کر اتارنے کی خواہش کی تھی۔

اور آج جب یہ بوجھ کوئی بہت بھاؤ سے اتار کر اپنے سینے سے لگا کر لے جانے کا خواہش مند تھا تو جیسے اس کا دل ٹھٹک سا گیا تھا۔

مثال کی دوری کے خیال نے تو بہت اسے ہراساں کیا تھا۔

"کیا یہ ممکن نہیں عاصمہ بہن کہ رخصتی چند دنوں بعد ہو جائے کیونکہ جس طرح نکاح عجلت میں ہوا ہے تو مثال کو ہمیں اس سارے کو ذہنی طور پر قبول کرنے کا کچھ وقت مل جائے گا۔" وہ ذرا دیر بعد لجاجت سے کہہ رہا تھا۔

"عدیل بھائی!" عاصمہ کچھ خفگی سے بولی۔ "تو آپ کو بھروسا نہیں ہم پر۔"

[illegible]

[illegible] سا کہہ اٹھا۔

[illegible] گی۔

عاصمہ حیرت سے [illegible] دیکھ رہی تھی۔

عدیل [illegible]

"[illegible]"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"[illegible]"

عاصمہ [illegible] سی ہو گئی۔

[illegible]

"[illegible]"

[illegible]

[illegible]

"آپ سمجھ سکتی ہیں اب کہ میری مثال نے یہاں کیسی زندگی گزاری ہوگی۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں۔ اجازت دیں اب ہمیں... میں اپنی بچی کو اپنے گھر لے جاسکوں۔"

عاصمہ بیگم تھکے انداز میں کہہ کر آہستگی سے قدم بڑھاتی اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔

جب بیٹیوں کی نئی زندگی شروع ہونے جارہی ہو تو اپنی ماؤں کی موجودگی کتنی ضروری ہوتی ہے اس لمحے عدیل کو بہت شدت سے احساس ہوا تھا۔

"اب تو تمہیں یقین آگیا ہوگا مثال! کہ کسی کے جذبے سچے ہیں اور اس میں کتنی طاقت تھی جبکہ تم تو مجھے ہمیشہ کی جدائی دے کر کسی اور کی ہونے جارہی تھیں نا؟"

وہ چہرہ جھکائے بہت سرشار لہجے میں اپنے پیروں پر بنے مہندی کے خوب صورت بیل بوٹوں کے ڈیزائن پر نظریں جمائے کھڑی مثال سے کہہ رہا تھا۔

وہ جواب میں بہت گہری مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سیاہ بوٹوں کو دیکھتی رہی۔

✲ ✲ ✲

اور رات کے آخری پہر بالآخر رخصتی ہو ہی گئی۔

عاصمہ نے عفت کے اصرار کے باوجود بہت کم سامان ساتھ لیا تھا عفت یوں تو نخرے دکھاتے ہوئے انکار کیے جارہی تھی مگر دل میں وہ طرح طرح سے دل کھا رہی تھی۔

"کیسی قسمت کی دھنی ہے یہ مثال' پہلے سسرال والے کیا کم تھے۔ پیار محبت لٹانے والے' پیسہ دولت مال رکھنے والے' بچھے دھوکے بازتھے کہ اب یہ جو ابر جیسی میں رشتہ ہوا اس طرح نچھاور ہو رہے ہیں سب جیسے مثال بلبل جہان کی آخری خوب صورت ترین لڑکی ہو۔"

معنوز جاتی گاڑی کی ٹیل لائٹس کو دیکھتے ہوئے دل میں کلس رہی تھی۔

عدیل نے جس طرح آخری وقت میں آکر فیصلہ بدلا تھا عفت کو یقین ہوگیا کہ مثال کے لیے عدیل کسی بھی حد تک جاسکتا ہے وہ کیا بھی ہے۔ اس نے ایک عمر کی دوستی تعلقات سب گنوا لیے تھے تو شاید عفت کو بھی اپنی زندگی سے الگ کردیتا اگر وہ مزید ہنگامہ کرتی۔

"یہ چڑیل اس گھر سے رخصت ہو کر بھی کبھی نہیں جائے گی۔" عفت کو یقین تھا۔

"تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو پری۔"

عفت بے تحاشا روتی پری کو دونوں ہاتھوں سے جھنجوڑتے ہوئے غصے اور طیش میں بولی تھی۔

"ہاں میں ہوگئی ہوں پاگل! میں نے چاہا تھا واثق کو۔ پہلے میں نے محبت کی تھی اس سے۔ میں نے اللہ سے مانگا تھا اسے تو پھر یہ مثال کو کیسے مل سکتا ہے' وہ میری محبت ہے مما! میں اسے مثال کو تو کیا کسی کو بھی نہیں دے سکتی۔ میں جان سے ماردوں گی مثال کو۔ اسے کبھی بھی واثق کے ساتھ نہیں رہنے دوں گی۔"

وہ پاگلوں کی طرح بے سوچے سمجھے شدید جذباتی پن میں بولتی چلی جارہی تھی۔

"شادی ہوگئی ہے دونوں کی ہوش کرو کچھ اور اس لڑکے میں ایسا کچھ نہیں جو تم یوں ہوش کھو بیٹھو۔" عفت غصہ دکھاتے ہوئے اسے سمجھانے کو بولی۔

"شادی ہوگئی ہے نا صرف تو کیا ہوا۔ شادیاں ختم بھی تو ہو جاتی ہیں۔ اس کی ماں کی بھی تو ختم ہوئی تھی اس کی بھی ہو جائے گی۔ میں کروں گی اس کی شادی ختم۔" اور باہر کھڑا عدیل ششدر سا رہ گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

مشال اس اجنبی کمرے کو دیکھ رہی تھی جہاں آج سے پہلے کبھی بھی نہیں آئی تھی۔
مگر ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے اس کے تصویری اسٹل اسکیچ کچھ اور ہی داستان سنا رہے تھے۔
وہ ششدر سی ان دونوں تصویروں کو دیکھے جا رہی تھی۔
"یہ میرا دیوانہ پن تھا۔ مانو کی ناں ان تصویروں کو تو دیکھ کر۔" وہ اس کے کان کے بالکل پیچھے آکر اس طرح سرگوشی میں بولا کہ مشال کو لگا اس کا دل تھم گیا ہے۔
صرف اس کا دل نہیں اس کائنات کی ہر شے اور مشال کے دل میں دھڑکتی دھڑکنیں بھی!
وہ بے حد خواہش کے بھی پلٹ کر اس کو اپنے اتنے قریب نہیں دیکھ پا رہی تھی جس کو پانے کی خواہش کو اس نے کبھی خواب میں بھی خود سے کہنے کی ہمت نہیں کی تھی۔
اور یہ تو اسے پتا تھا' وہ کبھی بھی قسمت کی اچھی نہیں رہی' لیکن ان چند گھنٹوں میں جو کچھ ہوا' وہ اپنی قسمت کے بارے میں اپنا گلہ فراموش کر چکی تھی۔
یاد تھا تو صرف اتنا کہ وہ اس شخص کی ہو چکی ہے جس کی چاہت اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی کہیں بہت پیچھے ہی بے نیچے پوشیدہ تھی۔
"کچھ نہیں کہو گی تم؟" اس نے بہت نرمی سے اسے بازوؤں سے پکڑ کر عین اپنے سینے کے بالمقابل کھڑا کیا تھا۔
اور اس کی پلکیں یوں بوجھل ہو رہی تھیں جیسے ان پر بڑا بھاری بوجھ پڑا ہو۔ وہ کبھی پلکیں اٹھا کر سامنے کھڑے اس بھرپور محبت میں گندھے شخص کو نہیں دیکھ پائے گی۔
"مشال! تم خوش تو ہو ناں۔ پلیز کچھ کہو۔ کچھ بولو۔ کچھ ایسا کہ مجھے لگے تمہاری محبت میرا وہم نہیں تھا۔ میرا یقین تھا۔ میری زندگی کا سب سے خوب صورت یقین جس کے سہارے میں تمہارے پاپا کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔" وہ بہت بھاری بوجھل لہجے میں کہہ رہا تھا۔
وہ صرف اس کی وائٹ شرٹ کے بٹنوں پر نظریں جمائے بالکل ساکت کھڑی تھی۔
"مشال! تم خوش ہو ناں۔ بتاؤ مجھے۔" اس نے پھر بے قراری سے پوچھا۔
اور وہ ضبط کھو کر اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حمیرا نوشین

اب اور نہیں

"ابھی خورشید بھابھی کی پسند کی دال ونڈ دستار یاتی ہو گی تینوں بہوئیں کھن ملائی برنی کی ڈلیاں ہیں۔ حسن صورت اور حسن سیرت ماشاء اللہ تینوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ روز بھی جاؤ تو ایسے ملتی ہیں گویا کوئی صدیوں کا بچھڑا آن ملا ہو۔ خندہ لب و خندہ پیشانی سے ایسے استقبال کرتی ہیں کہ ان کے گھر جانے والا اپنی خوش نصیبی پہ ناز کرے۔

خورشید بھابھی کے پاس بیٹھے ابھی حال احوال ہی پوچھنے کی نوبت آتی ہے کہ چھوٹی بہو لسٹی بوتل کا گلاس تھامے آ جاتی ہے جسے پی کر پورے جسم میں ٹھنڈک اتر آتی ہے۔ ادھر بوتل ختم ہوئی ادھر خورشید بھابھی پان کا بیڑا ہاتھ میں تھما دیتی ہیں۔ بہتیرا کہتی ہوں کہ بھابھی پان کھانے کی عادت نہیں مگر ان کے اصرار پر منہ میں رکھ لیتی ہوں۔ بوتل کی ٹھنڈک کا اثر بھی زائل ہونے نہیں پاتا کہ مجھلی چائے کے ساتھ ڈھیر سجائے آجاتی ہے۔

اور بڑی بہو تو اپنی خوش گفتاری سے ہی آنے والے کا جی موہ لیتی ہے۔

سچ ہے ایسی بہوئیں ہر کسی کے نصیب میں کہاں۔" انہوں نے سرد تو بھری اور سبزی بناتی کترا کے دل میں یہ فقرہ کھب گیا۔ بے اختیار ہی اس کے منہ سے نکلا۔

"ایسی ساسیں بھی ہر کسی کے نصیب میں کہاں۔" شکر ہے کہ اس کی بڑبڑاہٹ عذرا بیگم کے کانوں میں ثقل سماعت کے باعث نہ پہنچ سکی ورنہ سبزی کاٹتی چھری بٹ بھر میں کترا کا قیمہ بنا رہی ہوتی۔

اس نے جلدی جلدی سبزی کاٹی اور کچن کا رخ کیا۔ سبزی دھو کر اس نے چولہا جلایا اور سالن کی تیاری شروع کر دی۔

جب بھی عذرا بیگم خورشید آنٹی (محلے دار) کے گھر سے ہو کر آتیں گھنٹے ہی ان تک ٹھنڈی آہوں کے ساتھ جھلسا دینے والے فقرے ان کے تلخ دہن سے ادا ہوتے رہتے اور دونوں بہوئیں ان کے فقروں سے ایسی تڑپ اٹھتیں گویا کوئی انہیں کند چھری سے کاٹ رہا ہو۔ دکھ، صدمے، افسوس سے وہ بے حال ہو جاتیں، کیونکہ وہ خورشید آنٹی کی بہوؤں کی خوش خلقی اور مہمان نوازی تو دیکھ آتی تھیں مگر انہیں خورشید آنٹی کی اپنی بہوؤں سے محبت ان کو دیا ہوا اعتماد اور آزادی نظر نہ آتی تھی۔

یہاں تو گھر میں کوئی آجائے تو بہوؤں کو جب تک ساس کی آنکھ کا اشارہ نہ مل جائے چائے پانی کے لیے کھڑے ہونے کی اجازت نہ تھی۔

اول تو آنے والے کو باتوں ہی پر ٹرخا دیا جاتا اور اگر کسی خوش بخت کے نصیب میں عذرا بیگم کے گھر کا دانہ پانی لکھا ہو تو خود اٹھ کر کچن میں بہوؤں کو ہدایات دینے آتیں۔

"چینی کم سے کم ہونا بھی ہے مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔" اور چائے میں وہ پتی تو خود ڈال کر جاتیں۔

کم دودھ، پتی اور چینی کی چائے پی کر کون سا ایسا مہمان ہو گا جو عذرا بیگم کی بہوؤں کی مہمان نوازی کے قصیدے پڑھے گا اور کبھی بھول کے کوئی بہو کسی آئے گئے کے پاس بیٹھ جاتی تو عذرا بیگم کی گھرکی ہی وہاں سے اٹھانے کے لیے کافی ہوتی۔ بعد میں وہ اس کے ایسے



لیتے لیتیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے توبہ کرلیں تو پھر خود ہی سوچیں کہ ان کی بہوؤں میں خوش مزاجی کہاں سے آئے گی۔

"بدمزاج، پھوہڑ اور کنجوس، بہوؤں کے خطاب تو پورے محلے میں انہوں نے خود مشہور کردیے ہیں۔" کنزا سے پھولی ہانیہ آٹا گوندھتی جاتی تھی اور بڑبڑاتی جاتی۔

"چھوڑو بھی ہانیہ کیوں اپنا خون جلاتی ہو۔ یہاں تو دل اور خون جل جل کر خاک ہو جائیں تو نقصان تو ہمارا اپنا ہی ہے۔ کل کو اگر کوئی بیماری لگ گئی تو ہمارے ہی بچوں نے رلنا ہے۔ اس لیے ایسی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا کرو۔ پانچ سال ہو گئے مجھے یہ دل جلے فقرے سنتے، کلیجہ بھی چھلنی ہو گیا مگر ان کی فطرت میں سر مو فرق نہیں آیا۔" کنزا نے ہانڈی بھون کر ایک طرف رکھی اور ہانیہ نے روٹی بنانے کے لیے توا چولہے پر رکھا۔

"کیا ہو گیا! آج کی تاریخ میں کھانا ملے گا یا نہیں؟ ساس کے خلاف کون سے منصوبے تیار ہو رہے ہیں جو ابھی تک کچن سے ہی مہارانیاں فارغ نہیں ہو رہیں۔" عذرا بیگم کی کڑک آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تو دونوں یک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔

انہیں کب یہ کسی طور گوارا ہوتا تھا کہ وہ دونوں کبھی مل کر بیٹھیں، جہاں وہ دونوں اکٹھی ہوتیں ان میں سے کسی ایک کو کلیجہ لگا دیتیں۔

شوہروں سے شکوہ تو بالکل ہی بے کار تھا۔ وہ ماں کے بالموکلوں کے آگے چوں و چرا نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کوئی بیٹا غلطی سے بیوی کی حمایت میں دو جملے بول دیتا تو ان پر غشی طاری ہو جاتی، با آواز بلند پکارتیں۔

"جانو جی۔ ہائے جانو جی۔"

ان کے جانو جی میں ایسی دہائیاں و آہیں ہوتیں کہ سننے والے کا کلیجہ منہ کو آجائے۔

"ہائے جانو جی! اپنی عذرا کو کن کے سہارے چھوڑ گئے۔ ہائے مجھے بھی کیوں نہ جاتے ہی اپنے پاس بلا لیا۔ یہ دن دکھانے کو چھوڑ گئے تھے مجھے کہ بیٹے جورو کے غلام بنے مجھ کو باتیں سنائیں۔ کیا اسی واسطے ان کو جگر کا خون پلا کر بڑا کیا کہ کل کو غیر عورت کے مقابلے میں ماں کے سامنے تن کر کھڑے ہو جائیں۔" نکاح میں آئی عورت ان کی نظر میں غیر تھی۔ "اے اللہ یہ وقت دیکھنے سے پہلے فرشتہ اجل میرے پاس کیوں نہ بھیج دیا۔" وہ ہاتھ رگڑتی اس انداز سے گریہ و زاری کرتیں کہ بیٹے سو سو کلیجہ تھام لیتے۔

بیٹے اس وقت کو کوستے جب غلطی سے ان کے منہ سے الفاظ نکل گئے۔ کمان سے نکلا تیر واپس آ سکتا ہے نہ منہ سے نکلی بات، سو لب ماں کے سامنے نتیجہ بھگتنے کے لیے تیار تھے۔ وہ ان کے گھٹنوں پہ سر رکھ دیتے تو پر سکھ کا سانس لیتیں۔

"دفعہ ہو جا نا ہنجار، کوئی واسطہ نہیں میرا تمہارے سے، بیوی کے گوڈے سے جا کے لگ جاؤ" کی بشواتیں کی تھیں۔ ماں کے قدموں تلے جنت

کملا۔ جنت میں تو یہ حوریں لے جائیں گی تمہیں۔" وہ ہتھیلیاں رگڑ رگڑ کر روتیں اور بار بار جانو جی کو پکارتیں۔

شروع شروع میں تو بہوئیں ان کے اس انداز میں پکارنے پر حیران ہوتیں بعد میں پتا چلا کہ ان کے سسر کا نام رمضان عرف جانو تھا۔ جس کا نام وہ اپنے لہجے میں دنیا جہان کا پیار سموئے جانو جی کہہ کر اٹھاتیں۔ وہ جانو جی کو پکارے جاتیں۔ جانو جی تک تو ان کی پکار کیا جاتی وہ سب ان کی ہر پکار پر لرز کر رہ جاتے۔

بہوئیں لائن حاضر ہو جاتیں۔ کان پکڑ کر معافیاں مانگتیں کہ ہماری سات پشتوں کی توبہ جو ہم آپ کی کسی دیاری کا گلہ اپنے شریک حیات سے کریں۔ بیٹے ناک سے لکیریں کھینچتے تب کہیں جا کے خلاصی ہوتی اور جانو جی کا مقبول میں کہیں گم ہو جاتا۔

☼ ☼ ☼

"جانوروں کو بھی مات دے دی تم لوگوں نے۔" وہ بھی آوازیں سن کے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔ ارے کوئی حیا شرم ہے کہ نہیں۔ جوان بہنیں گھر میں ہیں اور یہ دن چڑھے تک بیوی کو بغل میں لیے پڑے ہیں۔"

اماں نے اتنے زور سے دروازہ دھڑدھڑایا گویا بھونچال آ گیا ہو۔ نازک سی کنڈی ان کی دھڑ دھڑاہٹ سے کھل گئی اور دروازے کا ایک پٹ بھی ان کی نگاہوں کو راستہ دینے کے لیے سائڈ پہ ہو گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور بکھرے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹا اور دوپٹہ اچھی طرح اوڑھ کر باہر نکل آئی۔

"ہاں بھئی! مردوں کا کیا قصور جب حوریں بال بکھرائے سنگھار کیے میاں کے پہلو میں ہوں گی تو کس کافر کو ہوش آئے گا۔" انہوں نے اس کے لبوں پہ لپ اسٹک بھی دیکھ لی تھی حالانکہ رات کو وہ صاف کر کے سوئی تھی مگر ان کی نگاہوں نے پل میں پوسٹ مارٹم کر ڈالا تھا۔ پو پھٹ رہی تھی اور رات اس کے سکون کی طرح رخصت ہو رہی تھی۔

"آئندہ یہ بے حیائی اس گھر میں نہیں چلے گی۔ منہ اندھیرے اپنا جسم پاک کر لیا کرو گھر سے رزق اڑتا ہے۔ جوان نند اور دیور گھر میں ہیں۔ سسر صبح سویرے فجر کی نماز کو نکلتے ہیں۔ حیا کا دامن پکڑو۔" انہوں نے اس کے غسل خانے میں گھستے گھستے بھی فقرے اچھالے اور وہ شرم سے زمین میں گڑ گئی۔

سارا دن ان کے ساتھ گزارنا اس کے لیے کڑے امتحان سے کم نہ تھا۔ ایک کام ختم ہوتا تو دوسرا شروع، دوسرے سے فراغت ملتی تو تیسرا تیار رہتا۔ ناشتہ دوپہر اور رات کے کھانے تک وہ ہلکان ہو جاتی، شکوہ لبوں کو چھو نہ سکتا تھا۔

مرد صبح کے نکلے رات کو گھر میں گھستے۔ دن میں عورت ہی عورت سے کیا سلوک کرتی ہے۔ وہ جان کر بھی انجان بنے رہتے بقول اماں کے عورتوں کے معاملات میں ——— مردوں کا کیا کام۔

سالن کے لیے وہ ٹماٹر، ہری مرچیں، مسالہ سب نکال کر دیتیں۔ اس کا کام صرف پکانا ہوتا تھا۔ صحن میں بنے چولہے پر کام کرتی بہو، ساس کی نگاہوں کی مسلسل زد میں ہوتی۔ کبھی جو نمک جاننے کی غرض سے وہ مسالہ چکھتی تو اماں وہیں سے چلاتیں۔

"بس بھی کرو اب چکھنے ہی چکھنے میں ہانڈی چٹ کر جائے گی۔ برکت الگ اڑے گی۔" وہ بیچاری شرمندہ ہو جاتی۔

ہنڈیا روٹی کر کے وہ ایک طرف ہو جاتی اور اماں بانٹنے کے لیے چولہے کے پاس آموجود ہوتیں۔ کس کو کتنی بوٹیاں شوربا دینا ہے اس کا فیصلہ وہ خود کرتیں۔ اس کے حصے میں ہمیشہ ہڈی والی بوٹی اور شوربے سے بھری کٹوری ہی آتی۔ وہ صبر و شکر سے نوالے اپنے اندر اتارتی۔

گرمی اور جاڑے کا کپڑا تک بھی سسرال سے نہ ملا، جو کبھی سال چھ مہینے میں اماں کے جانا نصیب ہوتا یا کسی بچی کی چھٹی آتی تو نیا سوٹ بھی تن پہ سج جاتا۔

آدمی کی تو یہ مثال تھی کہ اندھے کے آگے روئے اپنے بھی نین کھوئے۔

”حق ہاں۔ کبھی دن کے اجالے میں تمہارے ابا کی شکل ڈھنگ سے دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ اماں کی نگاہیں میرے چاروں اور گھومتیں ذرا جو پاس سے گزری تو جوان مردوں کا طعنہ سر اٹھانے نہ دیتا۔ اللہ بخشے اماں مرحومہ کو، یہ تم دونوں کے شوہر اور تمہاری چار نندیں جانے کیسے دنیا میں آ گئے۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تو دنیا میں آنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اماں کا بس چلتا تو رات کو بھی بیٹے کو کمرے کا رخ نہ کرنے دیتیں۔ بری بھلی جیسی گزرنی تھی گزر گئی۔ اللہ بہشت کے درجات بلند کرے۔“ وہ آنکھوں سے چھلکتے چند آنسو پونچھنے لگیں۔

”بس چھوڑو۔ کہاں تک میری کتھا سنو گی۔ کئی راتیں سیاہ ہو جائیں پر میری داستان ختم نہ ہو گی۔“ انہوں نے اپنی ٹانگوں پر سے کنزا اور ہانیہ کے ہاتھ ہٹائے اور ٹانگیں سمیٹ لیں۔ گویا یہ بدعادات، لہجے کی تلخی اور الفاظ کا چناؤ ان کی ساس کی دین تھا۔ کنزا کو ان سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

”اماں پھر تو ہماری بہوئیں بھی ہمارے عتاب سے بچ نہ پائیں گی ہم بھی ساری کسر نکالیں گے۔“ ہانیہ کہہ کر چھپاک سے کمرے سے نکل گئی۔ عذرا بیگم کو اس کے فقرے نے سن کر دیا۔

”یہ کیا کہہ گئی بہو۔ ہم بھی اپنی بہوؤں سے ساری کسر نکالیں گے۔“

اس ایک جملے نے لمحے میں ان کی آنکھیں روشن کر دیں۔ انہیں بہوؤں پر اپنی زیادتیاں بالکل واضح دکھائی دینے لگیں۔ ساری رات نیوازی پلنگ پر کروٹیں بدلتی رہیں۔ نیند آنکھوں سے غائب۔ ہانیہ کا فقرہ سوچ کے کئی در وا کر گیا تھا۔

بہو کے ایک جملے نے راتوں رات عذرا بیگم کے ذہن و دل میں بے پناہ وسعت پیدا کر دی۔ صبح ناشتے سے فراغت کے بعد انہوں نے دونوں کو اپنے پاس بلایا۔ ان کی پیشانی پہ بوسہ دیا اور چابیاں بڑی بہو کنزا کے ہاتھوں میں تھما دیں۔

”آج سے اس گھر کی مالکن تم دونوں ہو۔ سیاہ کرو یا سفید یہ گھر تمہارا ہے۔ میں پاگل بیوقوف اپنے دکھوں کا بدلہ انجانے میں تم سے لے کر سکون محسوس کر رہی تھی۔ میرے نصیب میں تمہاری توں کا کیا دوش۔ اگر تم مجھے معاف کر دو تو کیا پتا میرا اللہ بھی مجھے بخش دے۔“ انہوں نے اپنے ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے۔ کنزا اور ہانیہ نے ان کے ہاتھوں کو چوم لیا اور کنزا چابیاں ان کے پاس واپس رکھتے ہوئے بولی۔

”اماں یہ گھر اور اس گھر کی ہر شے آپ کی ہے۔ ہم بھی آپ کے بیٹے بھی آپ کے بس آپ ہم دونوں کو اپنی چاہت اور اعتماد کی دولت سے نواز دیں۔ خورشیدہ آنٹی کی بہوئیں اگر برف کی ڈلیاں ہیں تو آپ کی بہوئیں مصری کی ڈلیاں بن کر اپنی گفتگو کی شیرینی سے سب کا دل جیت لیں گی۔ ہم نہیں چاہتے کہ جو کچھ آپ کی ساس نے آپ کے ساتھ کیا، وہ کل کو آنے والی بہوؤں میں نسل در نسل منتقل ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ محبتوں کے چراغ سے چراغ جلتا رہے اور ایک ہنستا مسکراتا، دل سے بزرگوں کی عزت کرنے والا گھرانہ پروان چڑھے۔“ عذرا بیگم نے اس کی اتنی اچھی سوچ پر نم آنکھوں سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دونوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

کمرے کے باہر کھڑے فذار اور شہوار دونوں پلکیں جھپک جھپک کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ کل کی چابیاں وہ گھر پر بھول گئے تھے، لینے کے لیے جو آئے تو یہاں تو کایا ہی پلٹی ہوئی تھی۔ وہ بے یقینی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔

بے اختیار انہوں نے منڈیلیں کی طرف دیکھنے کو نگاہیں اٹھا دیں کہ آج وہ کس سمت سے نکلا ہے۔ عذرا بیگم کنزا اور ہانیہ نے ان کے حیران چہروں کو —— دیکھا تو تینوں قہقہہ لگا کر ہنس دیں اور وہ بھی خجل سے ہو کر ماں کے قدموں سے لپٹ گئے۔

میمونہ صدف

گدائی منش

"آ۔ اب۔ ب۔ پ۔ ت۔ ث۔ غ۔"

مسجد کے صحن میں بیٹھے بچے نورانی قاعدہ کھولے دِکّت سے متعلق تختی نمبر چار دوہرا رہے تھے۔ ان کے جنبش کرتے لبوں کے ساتھ کسی کونے کھدرے میں دبکے چاچا شوکے کے لبوں میں بھی حرکت ہوتی۔ وہ بچوں کی تقلید میں لب کے ساتھ ساتھ سر بھی ہلاتا۔ اس کے سامنے کوئی نورانی قاعدہ نہ ہوتا کہ نہ ضرورت تھی اور نہ ہی فائدہ۔ وہ کون سا ان پڑھ تھا؟ انگوٹھا چھاپ۔ کورے کاغذ کی مانند چٹا صاف۔۔۔ نہ پڑھنا جانتا تھا نہ لکھنا۔

اور تو کوئی نہیں بس کلام اللہ پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ اکلوتا شوق۔ آنکھوں کے آگے لب جالا سا بنتا اور کسی حرف پر نظر نہ ٹکتی۔ ذہن بھی کمزور تھا اور نظر بھی۔ پھر بھی امام صاحب سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ ہنس دیے۔

"اب اس عمر میں کیا سیکھے گا چاچے! جب وقت سے نہ سیکھا تو۔"

"سیکھنے کی کوئی عمر نہیں ہوندی جھلیا۔"

اور یوں فجر کی نماز پڑھ کر چاچا امام صاحب سے قرآن پڑھنے لگا۔ امام صاحب نے نورانی قاعدہ سے آغاز کیا۔

"پہلی تختی حروف مفردات کی ہے۔" چاچے کو بھلا اس سے کیا سروکار، وہ تو بس پڑھتا تھا۔

امام صاحب روز سکھاتے مگر چاچا بھول جاتا۔ روز بھول جاتا۔ ایسا نہیں تھا کہ چاچا کوشش نہیں کرتا تھا، روز کا سبق کئی کئی بار دہرائی کرتا۔ مسجد میں الگ، رستے میں الگ اور گھر پہ الگ۔ مگر پچھلے دن کا سبق اگلے دن ہی بھول جاتا۔ مرض نسیان جو لاحق تھا سو کیا کرتا۔

"رہنے دیں امام صاحب۔ چاچا تو ویلا ہے۔ اپنے ساتھ آپ کا وقت بھی برباد کرتا ہے۔" کسی نے آتے جاتے پھبتی کسی۔

"کیا کرے گا چاچے اس عمر میں سیکھ کر۔" منچلے مسجد سے نکلتے چاچے پر جملے کستے اور ایسے جملے سننے تو پچھلے چار سال سے وہ سن رہا تھا۔

سیکھنے کی کون سی عمر ہوتی ہے۔ شوق شوق کی بات ہوتی ہے۔"

"بڑھاپے میں ہی شوق چڑھا۔" وہ ہنستے۔

"شکر ہے اس رب کا بڑھاپے میں ہی سہی موت سے پہلے ہوش تو آیا۔" وہ گہری سانس بھر نماپاس گزار سامان جاتا۔

☼ ☼ ☼

شوکت علی عرف شوکا چاچا ان پڑھ، غریب اور سادے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ پرانا وقت تھا، غربت زیادہ تھی، سو کسی میں عقل و مت نہ تھی کہ زندگی جانور کی طرح نہیں گزارنا چاہیے۔ پیدائش سے موت تک بس اناج اگایا، کمایا، کھایا اور سو لیا۔ گاؤں میں بڑی غربت تھی، سو بچے اسکول تک نہ جاتے۔ شوکا بھی اپنے ابا کے ساتھ کھیتوں میں کام کرواتا، باڑے میں مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا اور مٹی کے برتن بناتا۔

ایک روز یونہی اماں سے پوچھ بیٹھا۔

"کل میں مدرسے نہیں جاؤں گا؟"



اور اماں کہتی "مدرسے جا کر کیا کرے گا پتر۔ اپنے کے ساتھ کام کروا اس کا سہارا بن۔"

وہ تابع داری سے سر ہلاتا ابے کا سہارا تو بن گیا مگر اماں ابا جیسا ان پڑھ رہ گیا۔ کبھی کبھار گاؤں کے مولوی صاحب اسے پکڑ کر چند سورتیں پڑھا دیتے "رٹوا دیتے"۔ پوری زندگی جفاکش کسان کی طرح گزر گئی اور جب چالیس کے پیٹے سے لگا تو سمجھ جانے لگا' روزے رکھنے لگا۔ حج کی استطاعت نہ تھی اور زکوٰۃ فرض نہ تھی۔ کچھ دعائیں رٹ رکھی تھیں جو چلتے پھرتے پڑھتا رہتا۔ پھر بس قرآن پڑھنے کا شوق چرایا تو احساس ہوا کہ جوانی کی عبادت ہی اصل عبادت۔ بڑھاپے میں نہ نظر کام کی نہ ذہن۔

"کیا کرنا ہے اب سیکھ کر؟" وہ ابرار علی تھا۔ سب کا پیارا بھائی۔

چاچا آہیں بھرتا۔ "جتنی مٹھی بھر جائے' بھر لینی چاہیے۔"

"اس عمر میں جب آنکھیں' دماغ اور زبان بھی کام نہیں کرتے۔"

"یہ سب تو اللہ کے حکم کے تابع ہیں جو وہ حکم دے۔ سوچنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کہا کہ مجھ

سے لحد تک علم حاصل کرو۔ فرد بن علم ہوئی کیا مرہونی ہے؟ شہادت دیرالحد

چاچا سو باتوں کی ایک بات کر گیا تھا۔

"تم لوح و قلم کے مطلب بھی جانتا ہے۔؟"

اور چاچا کو رالف پڑھنا تھا مگر اتنا تو جانتا تھا۔

"سب جانتا ہوں پتر۔۔ بس لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ وہ بھی اب جاننا چاہتا ہوں۔" بچوں میں سچا اور سیانوں میں سیانا تھا۔

"تو مہد سے لحد اتنے سال کہاں رہا ہے؟" اور وہ کیا بتاتا کہ بس ہوش ہی اب آیا ہے۔ غفلت کا پردہ ہی اب چاک ہوا۔ چاچا روز کا سبق روز دہراتا اور روز بھولتا تھا مگر کوشش جاری رکھتا۔ زبان میں لکنت تھی

سے اٹکنے لگا مگر سوچا صبر و کوشش کے لیے ہیں سو دیے والا بھی تو دے گا ہی۔ ایک روز امام صاحب نے بھی لگا سا جواب دے ڈالا۔

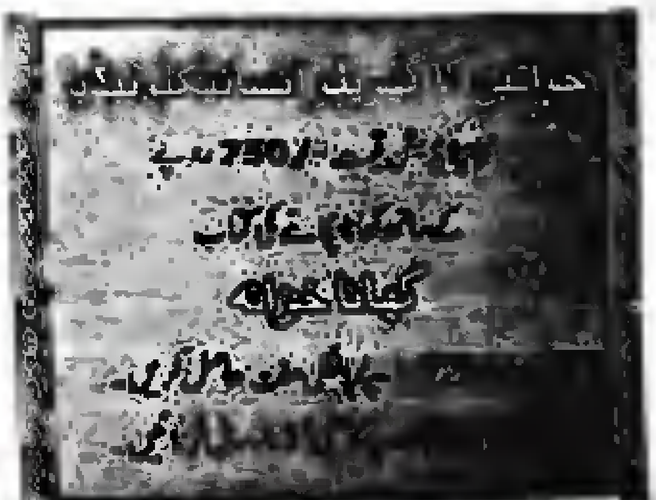
"بڑھاپے مطلب تیرے بس کا کام نہیں ہے یہ۔" اور چاچا نم آنکھیں لیے انہیں دیکھنے لگا۔

"سیکھنے والا نہیں ہارا تو سکھانے والا کیسے ہار گیا ہے؟" امام صاحب گنگ رہ گئے۔

"میں اللہ سے دعا کروں گا چاچے تیرے لیے۔"

"دعا تو کر دے گا پر مجھے دوا بھی دے دے۔" بس اتنا کہہ کر نم آنکھوں سے جھکے سر نیت گھر کی راہ لی۔

پھر چاچے نے نیا وطیرہ اپنایا۔۔ جب سبق بھول جاتا تو اس سبق پر انگلی پھیرتا جاتا اور دل ہی دل میں کلمہ



"اسے کی جھلیا؟" چاچی نے پوچھا۔

"سوچتا ہوں وقت لگانے اور کوشش کرنے کے بھی تو نمبر ملتا ہو گا نا مولا۔"

اور چاچی سر تھام کر رہ گئیں کہ بھلا یوں سبق پڑھا جاتا ہے کیا؟

"او جھلیے! اللہ نیت دیکھتا ہے۔۔ وہ میری صاف کوشش دیکھتا ہے۔۔ وہ میں نے کی وقت دیکھتا ہے۔۔ وہ میں نے لگایا۔" سو چاچا روز کوشش کرتا اور خوش ہوتا۔ چھوٹی نیکی تھی مگر روز کرتا۔۔ مسلسل کرتا۔۔ جی جان سے کرتا۔

بھلے سے ذہن، نظر اور زبان ساتھ نہ دیتے مگر ہمت نہ ہاری۔۔ مجاہدہ جاری رکھا۔

☼ ☼ ☼

پھر ایک روز اچانک چاچا کو فالج ہوا اور پھر جو بستر سے لگا تو اس کا ہو کر رہ گیا۔۔ چاچی قرآن لے کر آتی اور چاچے کی نظروں کے سامنے کر دیتی۔۔ بس وہ روزانہ کے سبق پر نظریں پھیرتا رہتا۔ جسم نے ساتھ چھوڑ دیا تھا مگر ہنوز کوشش جاری تھی اور اس رات چاچا نے بستر پر پڑے پڑے قرآن ختم کیا اسی روز زندگی

ختم ہو گئی۔ پورا گاؤں جمع تھا۔۔ جب چاچا کو قبر میں اتارا جا رہا تھا تو ریکی مٹی مشک و زعفران بن گئی۔

سب دفنا کر گھروں کو لوٹنے کی بجائے چاچا شو کے گھر گئے اور چاچی سے پوچھا کہ ایسا کیا تھا جو چاچا کی قبر معطر ہوئی ہے۔ چاچی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

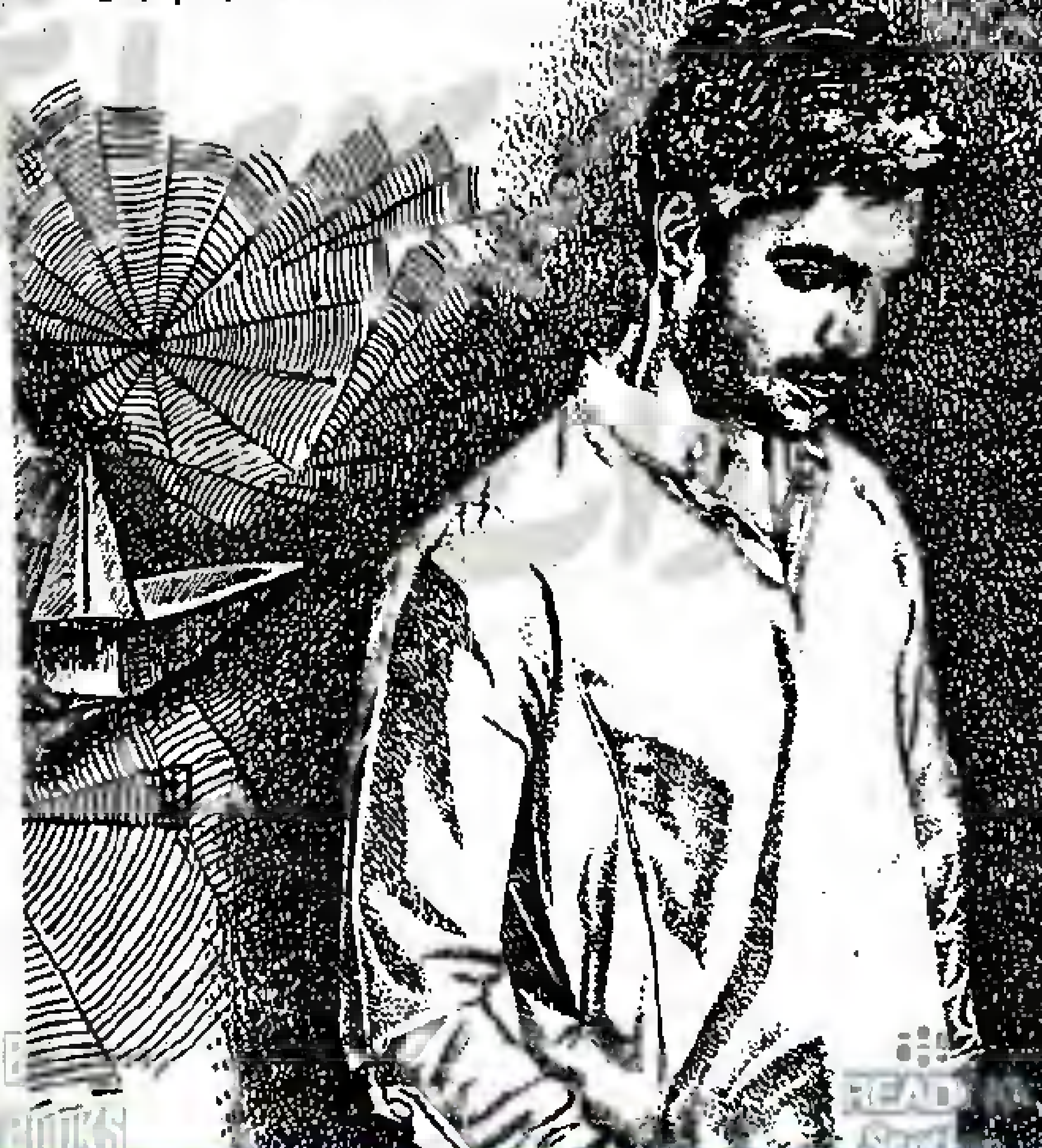
"بس علم کی طلب تھی اور مسلسل کوشش کرتا رہا۔"

اور سننے والے اس گتھی کو جان گئے کہ وہ ان پڑھ تو تھا مگر جاہل گنوار نہ تھا۔۔ اک شوق تھا جو ایسا پسند کیا گیا کہ وہ گز زمین بھی بول اٹھی۔

عتیقہ ایوب

زندگی تیرے آغوش میں

کراچی سٹی ہسپتال میں ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ عید کا دن تھا' صرف کچھ مستقل مریض تھے جو عید والے دن بھی ہسپتال میں مقیم تھے۔ باقی سب مریض گھر چلے گئے تھے۔ چھ منزلہ ہسپتال کی شان دار عمارت میں چند ہی ڈاکٹرز آن ڈیوٹی تھے' باقی سب عید کی چھٹیوں پر تھے۔ کامن روم میں اس وقت ڈاکٹرز



فارحہ اور ڈاکٹر فاطمہ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی ڈاکٹر وہاں نہیں تھا۔

"کیا یار! عید کے دن بھی ہم ڈیوٹی پر ہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے" فارحہ صوفے کی بیک سے سر لگاتے ہوئے بولی البتہ فاطمہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں اپنا ہاؤس جاب مکمل کر رہی تھیں نئی کیر ہسپتال میں کراچی کے حالات ایسے تھے کہ ہر وقت کسی نہ کسی ایمرجنسی کا خطرہ رہتا تھا' سو ـــــ اب سب ڈاکٹرز کو چھٹی نہ ملتی تھی۔ کوئی نہ کوئی آن ڈیوٹی ہی ہوتا تھا۔

"فاطمہ۔" فارحہ کے پکارنے پر وہ چونکی۔

"ہاں۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟" فارحہ نے بغور اس کی چمکتی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں دیکھیں۔

"کچھ نہیں' بس پاپا کا سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں کچھ کھایا بھی ہوگا انہوں نے یا نہیں۔" فاطمہ کے لہجے میں فکر مندی تھی۔ تب ہی پولیس گاڑیوں اور ایمبولینس کے تیز بجتے سائرن پر وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئیں۔ سائرن کی آواز سے پورا ہسپتال گونج رہا تھا۔

ان دونوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر تیزی سے کھڑکی کی طرف بھاگیں۔ وہ سیکنڈ فلور پر تھیں کھڑکی کے باہر' مناظر دل دہلانے کو کافی تھے۔ ہسپتال کے احاطے میں پولیس گاڑیوں اور ایمبولینس کا ہجوم تھا۔ مریضوں کو جلدی جلدی اسٹریچر پر ڈالا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتیں' کامن روم کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور سینئیر ڈاکٹر وہاب اندر داخل ہوئے۔

"ڈاکٹر فارحہ' فاطمہ! جلدی آپریشن روم میں آ جائیے' ہری اپ" تیز تیز لہجے میں کہہ کر وہ مڑے۔

"سر کیا ہوا؟" فارحہ نے پوچھا۔

"ایمرجنسی ہو گئی ہے شہر میں بدترین ٹارگٹ کلنگ ہوئی ہے بہت لوگ زخمی ہوئے ہیں سنا ہے ایک مجرم بھی پکڑا گیا ہے لیکن شدید زخمی حالت میں ہے ہر صورت بچانا ہے۔ جلدی آؤ" وہ کہہ کر رکے نہیں اور

ناولٹ



باہر نکل گئے۔

"یہ بلیک ایگل کون ہے؟" فاطمہ نے ناسمجھی سے فارحہ کو دیکھا جو ابھی تک بے یقینی کی حالت میں کھڑی تھی۔

"بلیک ایگل۔ تم نہیں جانتیں؟" فارحہ نے سبز لبادہ اور سبز نقاب پہنتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" فاطمہ بھی تیزی سے آپریشن تھیٹر جانے کے لیے ڈریس اپ ہو رہی تھی۔

"سنا ہے انتہائی خطرناک، بہادر، نڈر اور تیز مجرم ہے۔ پولیس کب سے اس کی تلاش میں ہے۔ کھلم کھلا واردات کرتا ہے مگر پکڑا ابھی نہیں گیا۔ مگر آج پہلی بار۔" فارحہ کے بتانے پر اس وقت وہ اپنی حیرانی کا اظہار نہیں کر سکی تھی، سو جلدی جلدی فارحہ کے پیچھے بھاگی۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ سارے آن ڈیوٹی ڈاکٹرز زخمیوں کا علاج کر رہے تھے۔ آپریشن روم کے باہر پولیس کی بھاری نفری موجود تھی، وہ دونوں تیزی سے آپریشن روم میں داخل ہوئیں۔ جہاں ڈاکٹر وہاب اسٹریچر پر لیٹے وجود پر جھکے ہوئے تھے۔ سبز واشنیوں تلے لپٹا لمبا چوڑا وجود بالکل ساکت تھا۔

"تین گولیاں لگی ہیں، آپریشن کرنا ہوگا۔ بچنے کے چانسز بہت کم ہیں، اتنی آسانی سے اسے نہیں مرنے دینا۔" ڈاکٹر وہاب ان دونوں سے مخاطب ہوئے وہ اینستھیسیا دے چکے تھے شاید۔ وہ بے ہوش پڑا تھا۔ آپریشن شروع ہو چکا تھا، ڈاکٹر وہاب اور فارحہ کے ہاتھ بہت تیزی سے چل رہے تھے البتہ فاطمہ گم صم سی کھڑی اس لیٹے وجود کو دیکھ رہی تھی۔ چھ فٹ سے نکلتے قد کی وجہ سے پاؤں بیڈ سے باہر نکل رہے تھے، کسرتی جسم اور چہرے پر چھائی معصومیت، بند آنکھیں

اور بے حد لمبی گھنی پلکیں۔ اس نے کبھی کسی مرد کی اتنی لمبی پلکیں نہیں دیکھی تھیں۔ کھڑی ناک عجیب سی مغروریت پیدا کر رہی تھی یوں جیسے کوئی بادشاہ بے بس پڑا ہو۔ کیا اتنے خوب صورت اور معصوم ہوتے ہیں مجرم!

"فاطمہ خون روکو۔" ڈاکٹر وہاب کے چلانے پر وہ اپنے حواسوں میں آئی اور تیزی سے کام کرنے لگی۔ مگر پانچ منٹ بعد جب آپریشن ابھی جاری تھا، اس کے بے بس وجود کو ایک جھٹکا لگا اور تھوڑی سی حرکت ہوئی۔ اس کے بے ہوش وجود میں حرکت ہو رہی تھی، نتھنے پھولنے اور پچک رہے تھے۔

"یہ، یہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں نے اسے خود تین گھنٹوں کے لیے اینستھیسیا دیا ہے۔ پھر یہ کیسے کیسے ہوش میں آ سکتا ہے۔" حیرت کی شدت سے ڈاکٹر وہاب کی آنکھیں پھٹنے کو تھیں۔ اب حرکت تیز ہو چکی تھی۔

"اینستھیسیا دو جلدی۔" ڈاکٹر وہاب چلائے۔ کمپاؤڈر تیزی سے انجکشن بھرنے لگا۔

"مگر سر مزید اینستھیسیا تو خطرناک ہوگا۔ اس کی ڈیتھ بھی ہو سکتی ہے۔" پہلی بار فاطمہ نے زبان کھولی۔

"اس کے علاوہ اب کوئی چارہ نہیں، بچ گیا تو خوش نصیب ہوگا۔" وہ انجکشن بازو میں لگاتے ہوئے بولے۔ حرکت بند ہو گئی، وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو چکا تھا۔ پھر تین گھنٹوں کے طویل ترین آپریشن کے بعد معجزاتی طور پر وہ بچ گیا تھا، تینوں گولیاں اس کے جسم سے نکال دی گئی تھیں۔

"حیرت انگیز قوت مدافعت کا مالک ہے یہ۔ میں نے آج سے پہلے کبھی کسی میں اتنی ول پاور نہیں دیکھی۔" ڈاکٹر وہاب نقاب اتارتے ہوئے ٹھنڈے لہجے میں بولے۔

"خیر! ڈاکٹر فاطمہ چکر لگاتی رہیے گا یہاں، مزید آدھے گھنٹے تک اسے ہوش آ جائے گا۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں باہر پولیس کی بھاری نفری موجود ہے۔" وہ ہدایات دیتے باہر چلے گئے۔ پیچھے وہ اور فارحہ تھیں جبکہ ڈاکٹر وہاب باہر پولیس اور میڈیا کو بریف کر رہے تھے۔

"حیرت ہے ویسے تین گولیوں اور اینستھیسیا کی اتنی زیادہ مقدار کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا اس پہ۔" فاطمہ

اب بھی حیران تھی۔

"ایسے ڈھیٹ اور بے حس لوگوں پر کوئی اثر ہوتا بھی نہیں۔ تمہیں پتا ہے اپنے باپ کو بھی اس نے قتل کیا ہے۔ ایسے لوگوں کے پاس نہ دل ہوتا ہے نہ جذبات" ان پر نہ گولیاں اثر کرتی ہیں نہ دوائیاں۔" فارحہ کا لہجہ نفرت سے بھرپور تھا۔ اور فاطمہ تو بس "باپ کو خود قتل کیا" پر ہی اٹک گئی تھی۔

"کیا واقعی؟ تمہیں کیسے پتا" وہ حیران تھی فارحہ کی انفارمیشن پر۔

"کس دنیا میں رہتی ہو تم فاطمہ۔ کچھ ارد گرد کی بھی خبر لیا کرو۔ تین سال پہلے بہن اور باپ کو قتل کرنے کے جرم میں اسے قید ہوئی تھی مگر یہ جیل سے بھاگ گیا۔ جن کے لیے یہ کام کر رہا ہے' انہی لوگوں نے اسے وہاں سے فرار کروایا تھا۔ ان تین سالوں میں اس نے کتنے جرائم کیے ہیں۔ کتنے بینک لوٹے ہیں' کتنا بھتہ لیا ہے' یہ تو گنا ہی نہیں جا سکتا۔ ہر جگہ یہ اپنا نشان چھوڑ کے جاتا ہے 'بلیک ایگل'۔ وہی بلیک ایگل کا ٹیٹو اس کی باذو پر بھی بنا ہے' اصل نام تو کچھ اور ہے مگر بلیک ایگل کے نام سے ہی مشہور ہے۔" فارحہ نے اب تفصیل سے بتایا' فاطمہ کو بے اختیار گھن آنے لگی تھی۔

"اس کو تو مر ہی جانا چاہیے تھا' کیوں بچایا اسے" وہ بھی نفرت سے بولی۔

"نہیں' اگر یوں مر جاتا تو یہ بہت آسان موت ہوتی اس کی۔" فارحہ کے کہنے پر اس نے زور زور سے سر ہلایا۔ پھر وہ دونوں ہی باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

چھٹی کا دن ایسا ہی ہوتا تھا جیسے کوئی خوش خبری۔ وہ بھی کافی دیر سے سو کے اٹھا پھر فریش ہو کر نیچے آ گیا۔

جہاں زہرہ مشین لگا کر بیٹھی تھی۔ آدھے سے زیادہ کپڑے دھل چکے تھے' زنیرہ پڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ دونوں مسکرائیں۔

"ناشتہ لگاؤں؟" زہرہ نے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کبھی ہفتے میں وہ میکے آئی تھی تو وہ نئی گھر کے کام سمیٹ کے جاتی تھی تاکہ زنیرہ کو زیادہ کام نہ کرنا پڑے۔ حالانکہ کام والی بھی رکھی ہوئی تھی مگر زہرہ پھر بھی ہفتے میں ایک دن میکے ضرور رہتی۔ اور عموماً" چھٹی والے دن ہی رہتی تھی۔ شادی سے پہلے سارا گھر اس نے سنبھال لیا تھا اماں کی وفات کے بعد۔ پھر شادی کے بعد زہرہ ہفتے میں ایک چکر لگا لیتی۔

"ابا کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"بیٹھک میں ہیں۔" زہرہ نے جواب دیا۔

"ناشتہ کر لو' کتنے کمزور ہو گئے ہو تم۔ ٹھیک سے کھاتے پیتے نہیں ہو کیا؟" اس نے اب پھر ٹوکا۔ وہ مسکرا دیا۔

"میں ٹھیک سے کھاتا ہوں زہرہ' تمہاری نظر کمزور ہو گئی ہے۔ عدیل بھائی سے کہہ کر چیک کرواتا' پھر چشمہ لگا کر مجھے دیکھنا' بالکل فٹ اور ٹھیک نظر آؤں گا میں۔" وہ وہیں برآمدے میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں از الوںذاق اور تو کوئی کام نہیں ہے۔" زہرہ نے منہ بنایا سو وہ ہنس پڑا۔

"میری پھوپھی نے تلپ کرتا ہے اس بار؟" اس نے اب زنیرہ کے سر پر چپت لگائی جو رٹے لگانے میں مصروف تھی۔

"ان شاء اللہ۔" وہ بھی پرعزم لہجے میں بولی۔ وہ دونوں ہنس پڑے۔

"سعد کہاں ہے؟" اب کے بھانجے کا پوچھا۔

"سو رہا ہے' ابھی تو نہ ہی جگانا۔ پھر تنگ کرے گا' کوئی کام نہیں کرنے دے گا۔" زہرہ نے منع کیا بیٹے کو جگانے سے وہ سر ہلاتا بیٹھک کی طرف مڑا۔

"کہاں جا رہے ہو؟ ناشتہ تو کر لو۔" زہرہ نے پھر پکارا۔

"نہیں کرنا' کرنا ہوا تو خود کر لوں گا۔" وہ نظر انداز کرتا بیٹھک میں آ گیا۔ پھر دروازے پر ہی رک گیا۔ ابا کے پاس پندرہ سولہ لوگ بیٹھے تھے محلے کے۔

بھی وہیں بیٹھ گیا۔ اتنا مصروف رہتا تھا کہ کم ہی موقع ملتا تھا ابا کی خوب صورت باتیں سننے کا۔ دو بہنوں کے ساتھ' ان کی چھوٹی سی فیملی مکمل تھی۔ زہرہ بڑی تھی' پھر وہ تھا' پھر زنیرہ۔ زہرہ نہ صرف بیٹی' بہن تھی بلکہ اس کی سب سے اچھی دوست بھی تھی اور ابا بھی۔۔۔ ابا پولیس انسپکٹر تھے مگر ساری زندگی اپنا دامن حرام سے بچا کر رکھا۔ اسی لیے وہ اپنے ہم منصبوں سے بہت پیچھے رہ گئے' نہ اچھا گھر بنا سکے' نہ کار' نہ بینک بیلنس' لیکن اپنے بچوں میں انہوں نے نیکی' ایمان داری اور خلوص' نرمی اور سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس عمر میں بھی وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ایسے ہی ہوشیار تھے جیسے جوانی میں۔ محلے میں ان سے زیادہ کسی کو بھی قابل اعتبار نہ سمجھا جاتا تھا۔ لوگ ان کے پاس آتے اور مسئلے حل کرواتے۔ نہ صرف مسئلے حل کرواتے بلکہ ان کی خوب صورت باتوں سے بھی لطف اندوز ہوتے۔ وہ کوئی عالم نہیں تھے' نہ عالم اسکالر بس ایک سادہ آدمی۔ مگر اس سادگی میں بھی علم کا سمندر چھپا تھا۔ اس کے ابا اس کے آئیڈیل تھے' وہ انہی جیسا بننا چاہتا تھا۔ اس وقت وہ ایم ایس سی کیمسٹری کا اسٹوڈنٹ تھا' یونیورسٹی سے آکر ایک ورکشاپ پہ پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا۔ اپنی پڑھائی کا بوجھ خود اٹھاتا' زندگی بڑی سہل گزر رہی تھی۔

اسے پیچھے بیٹھا دیکھ کر ابا چونکے پھر ساتھ والے کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"مگر گناہ کیوں انسان کو اس شدت سے اپنی طرف کھینچتا ہے؟ گناہ سے بچنا نا ممکن کیوں ہے۔ گناہ سے پناہ کیوں نہیں ملتی؟" وہ آدمی کہہ رہا تھا۔۔۔ وہ بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"گناہ ایک فطری چیز ہے اور فطرت سے کون بھاگ سکتا ہے۔" ابا مسکرا کر بولے۔

"مگر رضوی صاحب بھاگیں گے نہیں تو بچیں گے کیسے یہ تو ہمیں جہنم میں کھینچ کر لے جائیں گے۔" وہ آدمی پریشان تھا۔ ابا اب بھی مسکرا رہے تھے۔

"میں سمجھ رہا ہوں احسن صاحب کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔۔۔ میں بتاتا ہوں آپ کو۔۔۔ گناہ نہیں گناہوں پہ آ کے رک جانا انسان کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے' گناہوں پہ آ کے ٹھہر جانا لے کر جاتا ہے جہنم کی طرف' جہنم کے تو لفظی معنی ہی رک جانے کے ہیں۔ جو گناہ کرے پھر توبہ کر کے پلٹ آئے تو یہی گناہ اس کی عظمت کو چار چاند لگا دیتا ہے' اللہ کو اس کے لیے رحیم بنا دیتا ہے اور جو گناہ کرے' پلٹے ہی نہ۔ مڑ کر ہی نہ دیکھے' وہیں ٹھہر جائے تو۔" ابا سانس لینے کے لیے رکے۔

"ٹھہر جانا تباہی ہے۔ رک جانا ہی موت ہے۔ سانس رک جائے' جسم کی موت' دھڑکن رک جائے تو دل کی تباہی۔۔۔ مومن اپنی زندگی میں کبھی نہیں رکتا' گناہ کر کے پلٹ آتا ہے۔ وہ ایک نیکی پر بھی نہیں رکتا' آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مومن کی زندگی میں چلنا لکھا ہے' موت تک کی مسافت ہے' آرام نہیں۔ آرام اور سکون دنیا میں اس کے لیے باقی ہیں ہاں یہ نعمتیں اسے اخروی زندگی میں ہمیشگی کے ساتھ دی جائیں گی۔ آخرت میں اہمیت ہی ہمیشگی والے اعمال کی ہے۔ جس نے ہمیشہ گناہ ہی کیے' گناہ پر جا رہا' رکا رہا تو پھر یقیناً اس کے لیے ہاویہ ہے' آگ ہے۔ گناہ گار دنیا میں بھی جلتا ہے' اس کا ضمیر اسے جلاتا ہے' وہ آخرت میں بھی جلتا ہے۔ جلنا اس کا مقدر ہے۔" ان کی آنکھیں اب نم ہو چکی تھیں' ہر کوئی عقیدت سے انہیں دیکھ رہا تھا اور وہ فخر سے دیکھ رہا تھا۔ اسے فخر تھا کہ وہ عرفان رضوی کا بیٹا تھا۔۔۔ ایک عام مگر ایماندار پولیس انسپکٹر کا۔ کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ لوگ نکلتے چلے گئے پھر صرف وہ اور ابا رہ گئے کمرے میں۔

"کچھ دیر اور آرام کر لیتے تم۔ ایک دن ہی تو ملتا ہے تمہیں چھٹی کا۔" ابا فکر مندی سے بولے۔ رات گئے تو وہ تھکا ہارا آتا تھا' صبح سویرے پھر چلا جاتا تھا۔

"آرام کرنا تباہی ہے' رک جانا موت ہے۔ مومن کی زندگی میں چلنا لکھا ہے ابا۔" وہ چمکتی بھوری آنکھوں

کے ساتھ مسکرایا۔ ابا ہولے سے ہنس پڑے۔ انہیں فخر تھا کہ وہ اچھا اسٹوڈنٹ تھا' سبق جلدی یاد کرلیتا تھا پڑھایا ہوا۔ اب بھی وہ ان کی بات ان پہ ہی لوٹا گیا۔

"شہروز' حسان آیا ہے تم سے ملنے" زہرہ کی آواز پر وہ چونکا پھر باہر آگیا۔ جہاں حسان جرنل ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔

"کیا خیال ہے بنائیں لونس آج" حسان کے کہنے پر وہ مسکرایا۔

"چلو آؤ" وہ رضامند ہوا مگر تبھی زہرہ آگئی۔

"پہلے ناشتہ کرلو تم اور تم بھی حسان۔ مجھے پتا ہے تم نے بھی نہیں کیا ہوگا" زہرہ کے کہنے پر وہ دونوں ہنس پڑے۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ' میں نے واقعی ناشتہ نہیں کیا۔" اس نے مان لیا۔ زہرہ مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی ناشتہ لگانے۔

☆ ☆ ☆

آئی سی یو میں شفٹ کردیا گیا تھا اسے' آپریشن کے ایک گھنٹے بعد وہ اب بس بے ہوش تھا۔ پولیس اب بھی وارڈ کے باہر تھی۔ فاطمہ گاہے بگاہے چکر لگا رہی تھی۔ اس وارڈ میں بلیک ایگل کے علاوہ دو اور مریض تھے' دونوں کوما میں تھے۔ فاطمہ اندر آئی تو کمپاؤڈر تلاوت لگا رہا تھا۔ یہ روز کی روٹین تھی کہ ان دونوں کومے میں گئے مریضوں کو روز دو گھنٹے قرآن پاک کی تلاوت سنائی جاتی تھی۔ فاطمہ' بلیک ایگل کا باڈی ٹمپریچر دیکھنے لگی جو نارمل تھا مگر وہ ہوش میں نہیں آرہا تھا۔ سورۃ الزمر کی تلاوت شروع ہوئی تو بلیک ایگل کے جسم کو جھٹکا لگا۔

"ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا" اب کے اس کے جسم میں حرکت شروع ہو گئی۔ فاطمہ نے بے اختیار طویل سانس لیا۔ شکر ہے وہ ہوش میں آرہا تھا۔ اس نے جھک کر اس کی آنکھوں کو کھولنا چاہا مگر اب کے وہ خود جھٹکے سے پیچھے ہو گئی۔ بند آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر پھسل رہے تھے۔ وہ ساکت ہو گئی۔ کیا وہ رو رہا تھا؟

"اے لوگو جو اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے ہو' اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا" آنسوؤں میں تیزی آگئی تھی۔

"بے شک اللہ سارے ہی گناہ معاف کردیتا ہے" اب کے اس کے منہ سے سسکی نکلی۔ وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی بند آنکھوں سے بے تحاشا نکلتے آنسوؤں کی جھڑی دیکھ رہی تھی۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے' وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ فاطمہ قریب ہوئی۔

"ال۔۔۔ لل۔۔۔ لل" وہ لاشعوری طور پر بول رہا تھا۔ بے خبری کی حالت میں سرہلا رہا تھا۔

"لل۔۔۔ ال۔۔۔ اللہ۔۔۔" اب کے اس کے منہ سے سسک کر اللہ نکلا تھا۔ اتنا درد' اتنا کرب تھا اس کی سسکی میں کہ یوں جیسے کوئی پوری شدت کے ساتھ اللہ کو پکار رہا ہو۔ فاطمہ پھٹی آنکھوں کے ساتھ اس کے منہ سے نکلے الفاظ سن رہی تھی۔

"اللہ۔۔۔ اللہ۔۔۔ اللہ۔۔۔" سسکیوں کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر الفاظ نکل رہے تھے۔ اتنا بڑا مجرم رو رہا تھا' رو کر کہہ بھی کیا رہا تھا؟ پکار بھی کس کو رہا تھا۔ وہ بے یقینی کی پیچھے ہٹی پھر ڈاکٹر وہاب کو بتانے بھاگی۔

ڈاکٹر وہاب نے اس کے ہوش میں آنے کی خبر سنتے ہی اسے دوسرے کمرے میں شفٹ کروانے کے آرڈر دیے' ایک بار پھر سخت سیکیورٹی میں اسے شفٹ کیا گیا۔ اب وہ اکیلا ایک کمرے میں تھا۔ وہ' ڈاکٹر وہاب اور ڈاکٹر سعید اکٹھے' اس کے کمرے میں آئے تھے۔ اس کا جسم شدید زخمی حالت میں بھی بستر میں جکڑا ہوا تھا تاکہ بھاگ نہ سکے۔ ان کے آنے پر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا' کیا تھا ان آنکھوں میں؟ صرف سرد مہری۔ اتنی سرد مہری' فاطمہ کو لگا وہ جم ہی جائے گی بالکل بے تاثر آنکھیں تھیں' ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ نظریں دوبارہ چھت پر جما گیا۔ چہرہ بھی آنکھوں کی طرح بے تاثر تھا۔ نہ تکلیف کے آثار تھے نہ بے زاری کے۔

"کیسا محسوس کر رہے ہو اب؟" ڈاکٹر وہاب نے

پروفیشنل لہجے میں پوچھا۔
کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ چپ تھا یوں جیسے سنا ہی نہ ہو۔

"دیکھو' بتاؤ ہمیں کہ کیسا محسوس کر رہے ہو تاکہ ہمیں پتا لگے کہ تمہیں کتنی دیر لگے گی ٹھیک ہونے میں؟" ڈاکٹر سعید نے آگے ہو کر اسے ہلایا۔ اس نے اب بھی جواب نہ دیا۔ منہ پہ "نو لفٹ" کا بورڈ لگا تھا۔ تینوں ڈاکٹرز نے ایک دوسرے کے ساتھ نظروں کا تبادلہ کیا' پھر تینوں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

دروازہ کھول کر ایک وجیہہ سا شخص اندر داخل ہوا' ایس پی شاہ زیب' آنے والے نے اپنا تعارف کروایا اور ڈاکٹرز سے تفصیل پوچھی۔

"اس کا منہ کھلوانا میرا کام ہے ڈاکٹر! یو ڈونٹ وری۔ آپ جا سکتے ہیں' جو سامنے آن ڈیوٹی ہے وہ بے شک موجود رہے' باقی آپ آرام کریں" ایس پی مسکرا کر بولا تو ڈاکٹر وہاب اور ڈاکٹر سعید باہر چلے گئے۔ فاطمہ وہیں رہ گئی کیونکہ وہی آن ڈیوٹی تھی۔ شاہ زیب حسن نے ایک نظر اس دھان پان سی لڑکی پر ڈالی۔

"آپ کی ڈیوٹی ہے یہاں؟" وہ نرمی سے بولا۔

"جی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ وہ سر ہلاتا بلیک ایگل کی طرف مڑا۔ جو اب بھی چھت پر ہی دیکھ رہا تھا۔

"دیکھو ایگل' آخر کار میں نے تمہیں پکڑ ہی لیا۔ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں' کبھی نہ کبھی مجرم تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ صحیح کہہ رہا ہوں ناں میں؟" ایس پی طنزیہ لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔ فاطمہ چپ بیٹھی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ بلیک ایگل نے چھت سے نظر ہٹا کر ایس پی پر ڈالی پھر بولے بنا منہ پھیر لیا۔

ایس پی کا منہ اس بے عزتی پر سرخ ہو گیا تھا۔

"پولیس کے تو تمہارے فرشتے بھی۔۔۔ ذرا ایک بار تم ٹھیک ہو جاؤ گے' پھر جہاں ہم تمہیں لے کر جائیں گے وہاں پر لوگ تو کیا' ان کی روحیں بھی بول اٹھتی ہیں۔" وہ غصے میں چلا رہا تھا۔

بلیک ایگل کے چہرے پر گہری مسکراہٹ بکھر گئی تھی' خوب صورت مسکراہٹ۔ وہ حیران کھڑی اسے مسکراتا دیکھ رہی تھی۔ بولا وہ اب بھی نہیں تھا' صرف مسکرایا تھا ایس پی کی بات پہ۔ شاہ زیب حسن پھر تپ گیا تھا اسے مسکراتا دیکھ کر۔

"دیکھ لوں گا تمہیں میں" جھٹکے سے کہہ کر وہ مڑ گیا۔ "عزہ سلام کہہ رہی تھی تمہیں ایس پی" وہ بول رہا تھا طنزیہ مسکراتا لہجہ۔ باہر جاتا شاہ زیب حسن تڑپ کر مڑا تھا' اس کا چہرہ اور آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئی تھیں۔ مگر آنکھوں کی سرخی میں عجیب سی بے بسی تھی پھر وہی سرخ آنکھیں لیے باہر چلا گیا۔ اب کے وہ بولا تھا تو شاہ زیب حسن نہیں بولا تھا۔ فاطمہ اب بھی حیران کھڑی تھی' اس کو ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آیا تھا۔ نہ اس کا نہ ایس پی کا۔ اس نے دوبارہ اسے دیکھا' وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ چمکتی بھوری آنکھیں اس پر جمی تھیں' پہلی والی سرد مہری نہ آنکھوں میں تھی' نہ چہرے پر۔ وہ پزل سی ہو کر آنکھیں جھکا گئی۔

"مجھے سونا ہے ڈاکٹر! مجھے نیند کا انجکشن لگاؤ۔" وہ رعب سے بولا۔

"سوری' ابھی ہم آپ کو انجکشن نہیں لگا سکتے۔" وہ بھی سنجیدہ لہجے میں بولی۔ جواباً وہ اسے گھورنے لگا۔ مگر وہ آنکھ نہیں ملا رہی تھی' اسے اعتراف تھا کہ سامنے لیٹے بندے کی آنکھوں میں دیکھنا ایک مشکل کام تھا۔

"کیوں نہیں لگا سکتیں آپ؟" ایک اور سوال آیا تھا۔ فاطمہ کو غصہ آ گیا۔ مجرم ہو کر ایسے تن رہا تھا جیسے پرائم منسٹر کا بیٹا ہو اور ہسپتال اس کے باپ کا ہو۔

"نہیں لگا سکتے بس۔۔۔ اور ڈاکٹر میں ہوں' آپ نہیں۔ مجھے پتا ہے کہ آپ کو کیا لگانا ہے کیا نہیں۔ ہمیں سختی سے آرڈر ہے آپ کا خیال رکھنے کا ورنہ تو آپ جیسے قابل نفرت لوگوں کو تو دل کرتا ہے ہمیشہ کی نیند سلا دوں۔" وہ تنخ کر بولی۔ جواباً مقابل کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ بڑی تپا دینے والی مسکراہٹ تھی یوں جیسے وہ اس کی بے بسی پر ہنس رہا ہو۔ وہ پاؤں پٹخ کر باہر نکل گئی۔

کیسے۔ دل ہی دل میں اسے کھلیاں دیتی وہ کلاس روم کی طرف آگئی۔

☼ ☼ ☼

"شہوز۔" ابا کے پکارنے پر وہ مڑا۔

"جی ابا۔"

"بابو کے گھر تک چلو گے میرے ساتھ؟" بابا کے پوچھنے پر وہ حیران ہوا۔

"بابو؟ وہ غنڈہ۔ آپ کیوں جا رہے ہیں وہاں وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا مگر ابا کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پھیل گئے تھے۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے کیا سند ہے تمہارے پاس؟" وہ ناگواری سے بولے۔ شہوز شرمندہ ہو گیا۔

"اس کی شہرت اچھی نہیں ہے بابا۔" اس نے آہستگی سے کہا اور وہ صحیح کہہ رہا تھا' محلے میں اس کی کاروائیاں مشکوک تھیں۔ پتا نہیں کیا کام کرتا تھا کیا نہیں' رہتا خوب ٹھاٹ باٹ سے تھا۔ دو بار گرفتار ہو کر ابا کی ہی جیل میں گیا تھا۔ پھر بھی ابا؟

"شہرت تو پولیس کی بھی اچھی نہیں ہے' تو پھر تو میں بھی اچھا آدمی نہیں کیوں کہ میں پولیس والا ہوں۔"

ابا نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ وہ ہونٹ بھینچ گیا۔

"وہ بیمار ہے۔ مزاج پرسی کرنے جانا ہے۔ جب عیادت کے لیے جاتے ہیں تو مریض کی عادت نہیں دیکھتے' حالت دیکھتے ہیں ایک مسلمان کی عیادت دوسرے مسلمان پر اس کا حق ہے اور جو حق نہ دے' وہ لوگ اللہ کو پسند نہیں۔" اب کے وہ نرمی سے سمجھا رہے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔

"چلیں ابا۔" اس نے سر ہلا کر رضامندی دی اور ساتھ چل پڑا۔ بابو انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

"السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" ابا نے کھنکار کر سلام کیا۔ بابو حیران سا انہیں بٹھا رہا تھا۔

"کیسے ہو میاں؟" ابا نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں رضوی صاحب۔ آپ یہاں؟ معاف کیجئے گا' مجھے آپ کے آنے کا مقصد سمجھ نہیں آیا۔" وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ابا مسکرا دیے۔

"وردی کے بغیر آیا ہوں تو بنا کسی مقصد اور مطلب کے آیا ہوں۔ مقصد تو وردی ہوتی ہے۔ ہم تو تمہاری طبیعت کا حال پوچھنے آئے تھے سنا ہے بیمار ہو" ابا نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ بابو کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"میرا حال؟ اتنی کرم نوازی اور محبت ہم جیسے لوگوں کو راس نہیں آتی۔ ہمیں ہماری اوقات میں ہی رہنے دیں۔

ہمارا تذکرہ چھوڑ دیں' ہم ایسے لوگ ہیں جن کو نفرت کچھ نہیں کہتی محبت مار دیتی ہے۔"

بابو کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔

"ایسے نہیں کہتے بابو" ابا نے اسے روکا پھر ہاتھ میں پکڑا ڈبہ اس کی طرف بڑھایا۔ بابو نے سوالیہ نظروں سے دیکھا گویا پوچھ رہا ہو' یہ کیا ہے؟

"کھانا ہے اس میں' گھر کا بنا ہوا۔ بیماری میں باہر کا کھانا کھانا ٹھیک نہیں اور تم ہو بھی اکیلے' گھر کا کھانا بنانے والا بھی کوئی نہیں۔ اسی لیے میں لے آیا" انہوں نے ڈبہ اس کے پاس رکھا۔ بابو ایک پل کے لیے ساکت ہو گیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں دانش کی دوڑ گئی جسے وہ فوراً چھپا گیا۔

"شکریہ" اس نے کہہ کر آہستگی سے تھام لیا۔

"آپ تو دشمنی بھی پیار سے نبھاتے ہیں" عجب سے وہ مسکرا کر بولا۔ ابا ہنس پڑے۔ اس سارے عرصے میں وہ خاموش بیٹھا دونوں کو دیکھتا رہا تھا۔

"افسوس' میں آپ کی خاطر داری نہیں کر سکتا مگر چائے بنا سکتا ہوں۔ وہی بنا لیتا ہوں" بابو اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں بابو بس ہم چلتے ہیں۔ میرا بیٹا ہے نا' اس کے پاس وقت نہیں ہوتا زیادہ" ابا کی باتیں۔ لفنگہ سمجھتے سمجھتے پاگل ہو جائے گا شاید۔ بابو نے ایک نظر بیٹے پر بھی ڈالی' نوجوان' کھڑی ناک یوں جیسے کوئی شہزادہ ہو۔ باپ کی نسبت بیٹے کے چہرے پر عجیب سی

بے نیازی تھی عجیب سی کشش۔

"اچھا بیٹا۔ خدا حافظ خدا تمہیں صحت مند کرے اپنے لیے۔" انہوں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ شہوز نے بھی ابا کی تقلید کرکے ہاتھ ملایا' وہ ہر کام ابا کی تقلید میں کرتا تھا۔ اس سے ہاتھ ملا کر یوں لگا جیسے کسی پتھر سے ہاتھ ملا لیا ہو' بڑے سخت ہاتھ تھے۔ اس نے بغور شہوز کو دیکھا' ہاتھوں جیسی سختی بہرحال چہرے پر نہیں تھی مگر اپنے باپ جیسی نرمی بھی نہیں تھی اس کے چہرے پر۔

☆ ☆ ☆

رات کو وہ گھر لوٹی تھی۔ عید کا سارا دن ہسپتال میں گزر گیا تھا۔ گھر آتے ہی وہ پاپا سے لپٹ گئی تھی۔ پاپا نے اس کا سر چوما تھا۔

"تھک گیا میرا بیٹا۔" انہوں نے اسے ساتھ لگایا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی اماں بھی آگئیں۔

"کہہ دو اپنے ہسپتال والوں سے' کم بخت عید کے دن تو چھٹی دیا کریں۔ لے دے کے میری بچی کی ڈیوٹی لگا دی آج بھی۔" اماں شروع ہوگئی تھیں۔ ابھی تو معاذ کی گوہر فشانیاں باقی تھیں۔ وہ اور پاپا ہنس پڑے تھے۔

"سچ تو کہہ رہی ہیں اماں' آج پہلی عید تھی' جب میں نے تمہارے بنا کھیر کھائی' مزا آگیا' قسم سے تمہارا حصہ کھانے کا بھی۔" سیریس لہجے میں کہتا کہتا آخر میں وہ پھر شرارتی ہوگیا تھا۔ فاطمہ نے بیگ کھینچ کر اسے دے مارا۔ دونوں جڑواں تھے' بنتی بھی خوب تھی آپس میں اور لڑائیاں بھی خوب ہوتی تھیں۔ معاذ انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ اماں اب کھیر لے آئی تھیں اس کے لیے' پاپا نیوز دیکھ رہے تھے۔

"بڑی قتل و غارت ہوگئی ہے۔ عید کے دن کا بھی لحاظ نہیں۔ دل نہیں پتھر ہیں پتھر لوگوں کے پاس۔" ساتھ ساتھ تبصرہ بھی ہو رہا تھا۔

"شکر ہے کچھ تو کام کیا ہماری پولیس نے بھی۔" پاپا نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

"تمہارے ہسپتال میں ہے ناں یہ انوسینٹ ڈیول۔"

معاذ نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"ہیں؟ کون انوسینٹ ڈیول؟" وہ چونکی۔

"وہی بلیک اینجل۔ معصوم شیطان' نیوز تو صبح ہی آ رہی تھی کہ وہ شدید ترین زخمی حالت میں سٹی ہسپتال ہی لے جایا گیا ہے۔" معاذ نے وضاحت کی تو اس نے طویل سانس لیا۔

"ہاں ہمارے ہسپتال میں ہی ہے۔ میں بھی تھی آپریشن روم میں جب آپریشن ہوا۔" اس نے بتایا۔

"تو تمہیں کیا ضرورت تھی پنگا لینے کی۔ دور رہا کرو ایسے لوگوں سے۔ کہہ دینا اپنے ڈاکٹروں کو کہ میں نہیں کرتی ایسوں کا علاج۔" اماں پھر شروع ہوگئی تھیں۔ وہ اور معاذ دونوں مسکرا دیے۔ ابھی تو اس نے اماں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے کمرے میں ڈیوٹی پر بھی وہی تھی۔ ہاں معاذ کو اس نے بتا دیا تھا میسج کر کے۔ یہ اس کی اور معاذ کی پرانی عادت تھی' جب بھی انہوں نے ــــ بات کرنی ہوتی اور اماں پاپا بیٹھے ہوتے تو وہ ایک دوسرے کو میسج پہ بتانا شروع کر دیتے۔

"بی کیئرفل۔" معاذ کا اسمائل کے ساتھ ریپلائی آیا۔

"سنا ہے اس کی شکل بہت معصوم ہے۔ اس لیے اسے معصوم شیطان کہتے ہیں۔ کیا واقعی؟ ایسا ہے؟" معاذ کا اگلا میسج آیا۔

"ہاں واقعی۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا مجھے دیکھنے دو گی اسے؟" اس کا اگلا میسج آیا۔

"نہیں' وہاں تو میڈیا کو آنے کی اجازت نہیں۔ تم کیسے آسکتے ہو۔" اس نے جواب دیا۔

"تم پک بنا لینا اس کی کل۔" معاذ نے نئی ترکیب بتائی۔

"اوکے کل جب وہ سوئے گا' تب بنالوں گی۔" اس نے جواب دیا۔

"گھر آکر تو اس موئے کی جان چھوڑ دیا کرو' کم بخت ہر وقت انگلیاں اسی میں گھسائے رکھتے ہو۔" اماں

والوں کو موبائل پر جھکا دیکھ کر غصہ ہوئیں۔ ان دونوں نے فوراً "موبائل آف کیے" ایک دوسرے کو دیکھا پھر ہنس پڑے۔۔۔۔

٭ ٭ ٭

جسے کر کے دل کو دکھ نہ ہو تجھے اس گناہ کی تلاش ہے۔

"سی" اس کے منہ سے سسکاری سی نکلی۔ نرس ڈرپ کی سوئی اس کے ہاتھ پر لگا رہی تھی۔ تبھی وہ اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی نرس نے سلام کیا۔ وہ سر ہلاتی آگے آگئی۔

"کیا پوزیشن ہے؟" اس نے نرس سے پوچھا اور سائیڈ ٹیبل پر پڑی فائل دیکھنے لگی اٹھا کے، جس میں اس کے ہوئے ٹیسٹوں کی رپورٹس تھیں۔

"فائن ہے میڈم، ٹمپریچر، ہارٹ بیٹ، بلڈ پریشر، ایوری تھنگ؟" اس نے پوچھا۔

"یس ڈاکٹر۔" نرس نے سر ہلایا۔ فاطمہ نے اس کی طرف دیکھا۔ بے زار سا لیٹا ہوا تھا۔

"کیسا فیل کر رہے ہو؟" فاطمہ اب اس سے مخاطب ہوئی۔

"یہ کسی کو بھی جواب نہیں دیتا ڈاکٹر، بولتا ہی نہیں ہے۔ رات ڈاکٹر مدحان آن ڈیوٹی تھے انہوں نے بہت سر کھپایا مگر نو رسپانس۔" اس کی بجائے جواب نرس نے دیا۔ فاطمہ نے گھور کر اسے دیکھا، ڈرامے باز کہیں کا۔ کل تک تو بول رہا تھا، مسکرا رہا تھا اس کے سامنے۔

"بند کرو ڈرامے بازی اپنی" وہ ترخ کر بولی۔ معصوم شیطان نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا، آنکھوں میں شرارت تھی۔ یوں جیسے چھیڑ رہا ہو، کہہ رہا ہو تم بلاؤ گی تو بولوں گا، ورنہ نہیں۔

"بتاؤ کیسا فیل کر رہے ہو، درد تو نہیں ہو رہا ٹانگوں میں؟" فاطمہ چڑ گئی تھی آنکھوں سے۔

"ہو رہا ہے۔" وہ آرام سے بول پڑا۔ نرس نے حیران ہو کر اسے دیکھا، پھر فاطمہ کو۔ کل ساری رات ڈاکٹر مدحان نے کوشش کر لی تھی، وہ نہیں بولا تھا۔

"کتنا ہو رہا ہے؟ کھنچاؤ محسوس ہو رہا ہے یا الٹی سی ہو رہی ہے؟ یا اری ٹیشن؟" فاطمہ تکتے ہوئی اس کے قریب۔

"کھنچاؤ" وہ سکون سے بولا لگ تو نہیں رہا تھا کھنچاؤ کہیں سے، فاطمہ نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ چہرے پر تو اذیت کے آثار بھی نہ تھے۔

"میں سچ بول رہا ہوں" وہ گویا اس کا چہرہ پڑھ گیا تھا۔ آنکھوں میں اب بھی شرارت تھی۔ کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔ یہاں سے بچ کے بھی تو جانا کسی ہی جیل میں تھا اس نے، پھر بھی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ نہ ہی خوف، وہ چپ چاپ اس کے ٹانکے دیکھنے لگی۔۔۔

"ابھی تازہ تازہ ہیں ناں۔ تبھی تکلیف ہو رہی ہے۔ ہو جائیں گے ٹھیک۔" فاطمہ نے تسلی دی۔

"میری باڈی کیوں کھلی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"مجرموں کو باندھ کے ہی رکھا جاتا ہے" وہ ترخ کر بولی۔ بھلا یہ بھی پوچھنے والی بات تھی۔ اوپر سے کمبخت ایسی معصومیت سے پوچھتا، واللہ پیار آتا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا جواب سن کر۔

"زخمیوں کو تو باندھ کے نہیں رکھا جاتا" مسکراتے ہوئے پوچھا۔ فاطمہ نے گھورا، مسکراتے ہوئے اس کے دونوں گالوں پر گڑھے ابھر رہے تھے۔ وہ اسیر ہو گئی ایک لمحے کے لیے۔ یوں لگا جیسے قدیم دور میں چلی گئی ہو، یوں جیسے سامنے کوئی یونانی دیوتا کھڑا ہو اور وہ ایک عام سی پجارن جو کچھ نہ بول سکے۔

وہ سحر زدہ سی دیکھ رہی تھی۔ مقابل کے ہونٹوں مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ وہ تو بنا کچھ کیے مسکرا کر ہی جیت گیا تھا، ادھر سے سارے ہتھیار آزما کر بھی وہ ہار گئی تھی۔

"پولیس آ جائیں گی۔" بالآخر اس نے کہا تو وہ جھٹکے سے حواسوں میں لوٹی۔ آنکھیں اس کی آنکھوں سے ملیں، اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں اپنی فتح پر۔ وہ شرمندگی سے آنکھیں چرا گئی۔ باندھنے کی بات کرتے کرتے وہ باندھ گیا تھا اسے۔

"پولیس کھڑی ہے باہر؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" فاطمہ نے خود کو کمپوز کیا۔ وہ اسے جواب دینے کی پابند نہیں تھی۔ وہ انجکشن لگا رہی تھی۔

"میں سونا نہیں چاہتا" وہ انجکشن دیکھ کر منہ بنا رہا تھا۔ نخرے تو دیکھو سرکار کے۔ اٹھ کر جیل جاتا تھا اور نخرے ایسے تھے جیسے صدر مملکت کی سیٹ پر بیٹھا ہو۔

"تمہارے چاہنے یا نا چاہنے سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔" وہ غصہ ہوئی۔ کچھ دیر پہلے ہونے والی شرمندگی کا غصہ نکل رہا تھا۔ وہ سب سمجھ رہا تھا' چہرہ خاموش تھا' آنکھیں بول رہی تھیں' سرگوشیاں کر رہی تھیں کہ میں جانتا ہوں۔ سب جانتا ہوں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ غافل ہو گیا تھا' بے خبر۔ وہ چپ چاپ کھڑی اس معصوم شیطان کو دیکھتی رہی۔ سوتے میں تو اور بھی معصوم لگ رہا تھا۔ چہرے پر وہی ازلی سکون' نہ ڈر' نہ خوف۔ اس نے ایک نظر بیرونی دروازے پر ڈالی پھر آہستہ سے موبائل نکال کر کیمرہ آن کیا اور تصویر بنالی۔ پھر فوراً" کمرے سے نکل گئی۔ دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آج لیب نہیں جانا تم نے؟" وہ یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں بیٹھا تھا جب حسان نے اس کا شانہ ہلایا۔

"جانا ہے۔" اس نے فوراً" کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ لیب میں داخل ہوتے ہی لڑکیوں کی خود پر اٹھتی نگاہیں دیکھ کر وہ نظریں جھکا گیا۔ البتہ حسان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔ اسے اس سب میں کبھی بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پروفیسر ساجد پریکٹیکل کے متعلق ہدایات دے رہے تھے' وہ لکھنے لگا۔ تبھی باہر سے فائرنگ کی آوازوں نے سب کو چیخنے پر مجبور کر دیا۔

"سائلنس' سائلنس پلیز۔" پروفیسر نے ڈیسک بجایا۔ الیکشن کا دور تھا' یونیورسٹی میں روز ہی یہ ہنگامے ہوتے تھے۔ تبھی فائرنگ کے ساتھ نسوانی چیخیں بھی سنائی دیں' کلاس میں خاموشی چھا گئی۔ اب کہ نسوانی چیخیں بلند ہوئیں تو وہ خود کو روک نہیں سکا' پین پھینک کر بھاگا باہر۔

"شہوز' شہوز' رک جاؤ" پیچھے سے مختلف آوازیں آئیں مگر اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ اسے ابا کی بات یاد تھی بس۔ ابا کہا کرتے تھے "جب بیٹیاں' بہنیں' مائیں تکلیف میں ہوں تو ہر مرد کا فرض ہے کہ ان کا مان بن جائے۔" وہ تیزی سے ڈیپارٹمنٹ سے نکلا۔

وجاہت ڈوگر اور اس کے کارندے کھینچ رہے تھے اس لڑکی کو کار میں۔ کوئی انہیں روکنے والا نہیں تھا اس حلقے کے ایم این اے کا بیٹا تھا آخر وہ۔ یونیورسٹی والوں کی کیا مجال کہ اسے روک سکیں۔ اس نے آگے ہو کر ایک جھٹکے سے لڑکی کا بازو کھینچ کر پرے کیا' اردگرد سناٹا چھا گیا۔ وجاہت اور اس کے بندے آنکھوں میں خون لیے اس کی طرف مڑے' وہ لڑکی ایک طرف کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"میرے راستے سے ہٹ جاؤ شہوز ضوی۔" وجاہت پھنکارا۔ شہوز نے فوراً" عمل کیا' راستے سے ہٹا' مڑا اور لڑکی کا بازو پکڑ کر چلنے لگا' گن مین نے گن نکالی مگر وجاہت نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"رک جاؤ" وہ چیخا۔ شہوز رک گیا۔

"میری تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں شہوز۔ بہتر ہے تم جاؤ یہاں سے" وجاہت نے دوبارہ دھمکی دی۔ اس سے پہلے کہ شہوز کچھ کہتا' وہ لڑکی مضبوطی سے اس کا بازو پکڑ کر شہوز کے پیچھے ہو گئی۔

"اس سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟" شہوز نے اپنے پیچھے کھڑی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"اسی سے پوچھو" وہ آہستہ سے بولا۔ شہوز مڑا' لڑکی رو رہی تھی۔

"تم جاؤ وجاہت۔۔۔ وہ نہیں بتائے گی' ہمارے ہاں لڑکیوں سے تحقیق اور تفتیش نہیں کی جاتی" وہ دوبارہ وجاہت کی طرف مڑا۔ اب کہ اس کے چہرے پر چٹانوں والی سختی تھی' وجاہت ڈھیلا پڑ گیا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو شہوز! میں ہنگاموں کا قائل نہیں۔ مگر یہ لڑکی چھلاوا اس نے مجھے اپنے جال میں پھنسائے رکھا' مجھے لوٹتی رہی مگر میں اس کے

ساتھ فلرٹ تھا۔ تم مجھے بھی جانتے ہو نہ 'میں فلرٹ نہیں ہوں۔ میں نے کبھی کسی لڑکی کے ساتھ فلرٹ نہیں کیا' میں اس کے ساتھ فیئر تھا۔ حالانکہ یہ اسٹیٹس میں میرے ہم پلہ نہیں تھی' پھر بھی' میں کمٹمنٹ نبھاتا رہا اور یہ چھ ماہ بعد کہہ رہی ہے مجھے بھول جاؤ' میرا تو نکاح ہو چکا ہے اپنے کزن کے ساتھ۔ چھ ماہ اس نے میرا تماشہ بنایا' میرے جذبات کے ساتھ کھیلا۔ خود کو تماشہ بنانے والوں کو نہیں چھوڑتا میں۔"

وہ چیخ رہا تھا۔ لڑکی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ہر طرف سکوت طاری ہو گیا تھا۔ شہوز نے ایک طویل سانس لے کر لڑکی کو دیکھا' پھر آگے بڑھ کر وجاہت کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کھول ڈاؤن" اس نے آہستہ سے کہا۔ مگر وجاہت اب بھی لال پیلا ہو رہا تھا۔

"معافی بہترین انتقام ہے وجاہت۔ چلے جاؤ یہاں سے" اس نے کہا۔ وجاہت نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ پرے کیا اور چلا گیا۔ سب حیرانی سے شہوز کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن وہ دیکھے بنا لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔

"لڑکیاں غرور ہوتی ہیں اپنا بھی' اپنے گھر والوں کا بھی۔ افسوس اس غرور کو وہ خود توڑتی ہیں۔ چلو گھر اٹھو۔" اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر اسے ساتھ لے کر چلنے لگا۔ پھر رکشہ کروا کر اسے بٹھایا اور لوٹ آیا۔ محمد بن قاسم بننے کے لیے ضروری تو نہیں تھا کہ نیک بیٹیوں کی پکار پر ہی جایا جائے۔ بیٹیاں تو بیٹیاں ہوتی ہیں۔ اسے آج کم از کم ابا کی یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ بیٹیاں بیٹیاں ہی ہوتی ہیں چاہے غلط ہوں چاہے صحیح۔ ابن آدم کا حق ہے کہ وہ ان پر نرمی کرے۔

ایک اور بات جو اس کی سمجھ میں آ گئی تھی وہ یہ کہ ہمیشہ ابن آدم ہی غلط نہیں ہوتا۔ وجاہت اس کا کالج فیلو رہا تھا گو کہ اب وہ فزکس میں تھا اور شہوز کیمسٹری میں۔ مگر اس نے پھر بھی مان رکھا تھا شہوز کی مان کر اس کے دل میں اس کی عزت بڑھ گئی تھی۔ ایک اور بات بھی جو سمجھ میں آنے والی تھی۔ وہ یہ کہ بدلے کی آگ جس میں وجاہت جل رہا تھا' نرمی کے چند بولوں نے بجھادی تھی۔ وجاہت کو صحیح راہ دکھانے والا مل گیا تھا' جبھی آگ بجھ گئی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ شہوز کو یہ آخری بات نہ سمجھ میں آئی تھی اور نہ ہی اس کا دھیان گیا تھا ——— کہ بدلے کی آگ اکیلے بجھائے نہیں بجھتی۔

☼ ☼ ☼

عید کا تیسرا دن تھا اور اس کا ہسپتال میں تیسرا دن تھا۔ آج بھی اس کے کمرے کے باہر پولیس کی بھاری نفری تھی۔ ڈاکٹر عدنان ابھی نائٹ ڈیوٹی کر کے گیا تھا اور وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔

"ڈاکٹر کب آئیں گی؟" اس نے سسٹر سے پوچھا۔ نرس نے مشکوک ہو کر اسے دیکھا۔

"کون ڈاکٹر؟" نرس نے پوچھا۔

"وہی جو یہاں ہوتی ہیں صبح کے ٹائم۔" اس نے کہا۔

"اچھا۔ ڈاکٹر فاطمہ۔ وہ بس آتی ہی ہوں گی۔" نرس کے کہنے پر اس نے سر ہلایا مگر نام سن کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ تبھی وہ آ گئی تھی دروازہ کھول کر۔ آج کلر کے سوٹ میں وائٹ اوور آل پہنے 'سر پہ دوپٹہ اوڑھے آسمان سے اتری حور لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چھائی بے زاری فورا" دور گئی' وہ فریش ہو گیا تھا اسے دیکھتے ہی۔ آتے ہی وہ اس کی نبض دیکھنے لگی۔ پھر مڑی۔

"ڈاکٹر عدنان نے دوا تبدیل کی ہے؟" وہ سسٹر سے پوچھ رہی تھی۔

"جی ڈاکٹر۔" سسٹر نے سر ہلایا۔ وہ چپ چاپ دوائیں دیکھنے لگی۔

"کیا نئی دواؤں سے آرام فیل ہو رہا ہے تمہیں؟" اب کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور وہ تمہیں پر بے اختیار مسکرا دیا۔ جتنے بھی ڈاکٹرز آئے تھے' آپ ہی کہتے تھے۔ بڑی ولیری سے وہ "تم" کہتی تھی۔

"ہوں' ہو رہا ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ ایسی

سے بچنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اسے ہنسی آ گئی۔ کوشش بھی تو وہ مشکوک ہو رہی تھی، جب کام ہو گیا تھا۔ اسیر ہونے کے بعد اسیری سے رہائی طلب ہو رہی تھی۔

"ہوں، صحیح۔" وہ بھی بس ہوں ہاں کر رہی تھی۔ پھر چلی گئی۔ وہ طویل سانس لے کر سر نکا گیا۔ اور وہ نیچے آ گئی۔

"کیسا ہے تمہارا مریض؟" فارحہ نے اسے کامن روم میں آ کر دیکھ کر پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ اس سے پہلے کہ فارحہ کچھ اور پوچھتی، فائرنگ کی تیز آوازوں سے وہ دونوں اچھل پڑیں۔ ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں زبردست فائرنگ ہو رہی تھی، ہر طرف بھگدڑ مچ گئی تھی، باہر نکلنے کے لیے بیک ڈور کھول دیا گیا تھا۔ بلیک ایگل کے روم کے باہر موجود ساری پولیس نیچے بھاگی، بالآخر ایک گھنٹے بعد وہ فائرنگ کرنے والے گرفتار ہو گئے تھے، وہ لوگ تھے اور تیمی کا ناچ نچا کر رکھ دیا تھا سب کو۔ ان کے پکڑے جانے پر حالات معمول پر لوٹے، بیک ڈور بند کر دیا گیا۔ ڈاکٹرز واپس اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے، فاطمہ بھی اٹھ کر اوپر آ گئی۔ پولیس بھی واپس روم کے باہر آ گئی تھی، وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ کمرہ خالی تھا، وہاں کوئی نہیں تھا، بلیک ایگل بھاگ چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"لعنت ہے اتنی نفری پر، لعنت ہے۔ ایک بندہ چکمہ دے کر بھاگ گیا، وہ بھی شدید زخمی حالت میں اور تم کچھ نہ کر سکے، کچھ بھی نہ کر سکے۔" ایس پی شاہ زیب برس رہا تھا، سارے سپاہی سر جھکا کر کھڑے تھے۔ یہ وہی روم تھا جہاں سے وہ بھاگا تھا، ایک طرف ڈاکٹر وہاب، دوسرے سینئر ڈاکٹرز اور ڈاکٹر فاطمہ بھی کھڑے تھے۔

"سر! وہ نیچے فائرنگ ہوئی تو ہم ادھر بھاگے تو۔۔۔" ایک منمنایا۔

"وہ فائرنگ تمہارا دھیان ہٹانے کے لیے ہی کی گئی تھی۔" شاہ زیب چلایا۔

"اور تم سارے کے سارے نیچے بھاگ گئے، یہی تو پلان تھا ان کا۔ فائرنگ کروا کے تمہارا دھیان ادھر لگا دیا، بھگدڑ مچ گئی اور وہ نکل گیا۔" وہ مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بلیک ایگل اس کے سامنے آئے اور وہ اسے کچا چبا جائے۔

"مگر اس کی ٹانگ تو کلپڈ تھی پھر وہ؟" اب کے فاطمہ بولی۔

"ایسے کلپس سے رکنے والا نہیں وہ، اسے راڈز میں بھی جکڑ دیتے، وہ تب بھی بھاگ نکلتا۔" ایس پی ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ فاطمہ چپ چاپ پیچھے ہٹ گئی، دل میں یکدم ویرانی سی اتر آئی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اس بیڈ کو دیکھ رہی تھی جہاں کچھ گھنٹے پہلے وہ لیٹا تھا۔ پھر ایک طویل سانس لے کر باہر آ گئی اور ڈاکٹر فارحہ کو بتا کر گھر چلی آئی۔

"بلیک ایگل بھاگ گیا؟" اس کے گھر آتے ہی معاذ نے پوچھا۔ وہ یقیناً خبریں سن چکا تھا۔

"ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

"تم نے تصویر نہیں بنائی اس کی، میں نے کہا تھا تمہیں؟" معاذ نے پھر پکارا۔ فاطمہ مڑی، ایک نظر اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر ڈالی اور پھر موبائل پر گرفت سخت کر کے بولی۔

"نہیں، میں نے نہیں بنائی۔" کہہ کر وہ تیزی سے مڑ گئی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے معاذ کے ساتھ جھوٹ بولا تھا مگر وہ کسی کو نہیں بتانا چاہتی تھی کہ اس کے پاس اس کی فوٹو ہے، فی الوقت وہ اسے صرف اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی، صرف اپنے پاس۔۔۔ معصوم شیطان کی یہ بھاگنے والی شیطانی اسے اداس کر گئی تھی۔ وہ کیوں اداس تھی، اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا نہ ہی اسے اس سے نفرت محسوس ہو رہی تھی اور نہ ہی غصہ آ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے ابا؟ کچھ پریشان ہیں" وہ کب سے دیکھ رہی تھی ابا کو یوں خاموش لیٹے۔ زینو بھی دو تین مرتبہ پوچھ چکی تھی۔

"نہیں بیٹا۔" انہوں نے تسلی دی۔

"نہیں کچھ تو ہے۔ کیا ہوا ہے" اب کے زینو بولی۔ وہ دونوں اٹھ کر ابا کے تخت پر آ بیٹھے۔ ابا مسکراتے ہوئے اٹھ گئے۔

"جس باپ کی تمہارے جیسی اولاد ہو وہ پریشان نہیں ہوا کرتا۔" انہوں نے دونوں کو ساتھ لگایا۔ آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

"زہرہ سے ملنے کا بہت دل کر رہا تھا۔ اسے لے آتے شموز" انہوں نے کہا۔

"کل لے آؤں گا ابا" وہ فوراً مان گیا۔

"کل کس نے دیکھا ہے؟" ابا کا لہجہ۔۔۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

"ابا؟ آپ ٹھیک ہیں۔" اس نے تڑپ کر کہا۔ زینو تو رونے لگی۔

"ارے میری گڑیا بیٹی۔ میری بیٹی تو بہت بہادر ہے نا، وہ کیوں رو رہی ہے؟" ابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ اور شدت سے رونے لگی۔ شموز پریشان ہو گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے ابا؟ کچھ تو بتائیں۔" اس نے اصرار کیا۔ ابا مسکرا دیے۔

"کچھ نہیں ہوا شموز۔" انہوں نے طویل سانس لے کر دوبارہ دونوں کو ساتھ لگایا۔

"ایک بات یاد رکھنا تم دونوں۔ زندگی میں جو کام بھی کرنا، پوری ایمانداری اور سچائی کے ساتھ کرنا اور ایسا کرتے ہوئے کبھی بھی انجام سے مت ڈرنا۔ انسان کو زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اور اصل بات تو یہ ہے کہ یہ جو زندگی ہم جی رہے ہیں یہ تو خواب ہے۔ آنکھ تو مرنے کے بعد کھلے گی، زندگی تو وہاں شروع ہو گی، جس میں موت نہیں ہو گی تو کوشش کرنا کہ خواب میں تو اچھے کام کر سکو۔" ان کا لہجہ بھر آیا تھا۔

"تم میرا غرور ہو زنانی۔" انہوں نے زینو کا ماتھا چوما۔

"اس غرور کو ٹوٹنے نہ دینا کبھی، بہادر اور اچھی بیٹیاں خود کو توڑ لیتی ہیں، ماں باپ کے غرور کو نہیں ٹوٹنے دیتیں۔" وہ اس کے آنسو صاف کر رہے تھے۔

"اور تم میرا مان ہو شموز۔ غرور ٹوٹنے کا تو اتنا دکھ بھی نہیں ہوتا جتنا مان جانے کا ہوتا ہے۔ میرا مان نہ توڑنا کبھی۔ ایمانداری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لینا۔" وہ اب شموز کا ماتھا چوم رہے تھے۔ پھر وہ اٹھ گئے۔

"میں ذرا زہرہ سے مل آؤں۔ وہ میری سب سے صابر بیٹی ہے۔" انہوں نے کہا اور چلے گئے۔ پیچھے وہ دونوں ساکت بیٹھے تھے، بالکل ساکت۔

☆ ☆ ☆

"خوش آمدید، خوش آمدید، ویلکم بیک" سلطان نے کھڑے ہو کر اسے گلے لگا لیا۔

"میرا شیر لوٹ آیا ہے، جاؤ اعلان کرو آج جشن ہو گا، ساں جشن" سلطان دونوں ہاتھ اٹھا کر بول رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی مسرت اور خوشی اندھا بھی دیکھ سکتا تھا۔ وہ خوش تھا، بے تحاشا خوش۔

"ابھی تم آرام کرو۔ تمہارے زخم ٹھیک ہو جائیں پھر بات کریں گے۔" سلطان نے اس کا شانہ تھپکا۔

"میری زندگی میں آرام کا لفظ نہیں ہے سلطان۔ آئندہ میرے لیے یہ لفظ بولنا بھی مت۔" اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ وہاں موجود کچھ لوگ اسے رشک، کچھ حسد اور کچھ حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہی تو تھا احمد جو سلطان کے آگے بولتا تھا اور سلطان کبھی برا بھی نہیں مانتا تھا۔ سلطان کا لاڈلا تھا وہ۔ لاڈلا شیر۔ اب بھی وہ ہنس پڑا تھا۔

"اوئے میرے شیر، چل جا پھر جو تیرا دل کرتا ہے کر۔" اس نے فوراً الفاظ واپس لیے۔ وہ اٹھا، لنگڑا کر چلنے لگا۔ وہ قوی ہیکل آدمی اسے سہارا دینے کو بڑھے مگر اس

نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا اور ویسے ہی چلتا ہوا اوپر آگیا۔ کمرے میں آتے ہی وہ بیڈ پر گر گیا' تبھی کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور خوب صورت سی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر وہ دوبارہ اٹھ بیٹھا۔

"کانگریچولیشنز ڈیول' اینڈ ویلکم بیک" وہ بولی۔ یا قوتی لبوں سے الفاظ نکل رہے تھے' دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے میدے کی بنی ہو۔ نازک سی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"ایس پی کو تمہارا اسلام کہا تھا۔" وہ بولا۔ اب کے آنے والی کے چہرے کی مسکراہٹ سمٹ سی گئی تھی۔

"اوہ۔" وہ بولی۔ پھر دوبارہ ہنس پڑی۔

ان کی نظروں نہ جان پائیں' ہماری اچھائیاں محسن

ہم جو سچ میں خراب ہوتے تو سوچو کتنے فساد ہوتے

اس نے شرارت سے شعر پڑھ کر بلیک ایگل کو دیکھا۔ وہ بھی ہنس پڑا۔

"میں ایس پی بن کر جواب دوں' تمہیں اس کا؟" اس نے پوچھا' عزہ نے سر ہلا دیا۔

کس کے دل میں کیا چھپا ہے' یہ رب ہی جانتا ہے

دل جو بے نقاب ہوتے تو سوچو کتنے فساد ہوتے

وہ گمبھیر لہجے میں پڑھ رہا تھا۔ عزہ نے سر جھکا لیا۔ وہ آنکھوں میں آئی نمی چھپا رہی تھی۔

"کیسا تھا وہ؟" کچھ دیر بعد وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک... لیکن تمہارا نام سنتے ہی چپ لگ گئی تھی اسے۔" اس نے عادت کے مطابق سچ بولا۔ عزہ ہونٹ بھینچ گئی۔

"آئی وش کہ تمہیں عقل آجائے۔" بلیک ایگل کے بولنے پر وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"اینڈ آئی وش کہ مجھے موت آجائے۔" اس نے مسکرا دینے والے لہجے میں کہا۔

"موت نہیں مانگتے کبھی بھی۔" وہ ٹوک رہا تھا۔

"پہلے تو مانگنے پر جیسے سب کچھ مل گیا ہے ناں' جو اب موت بھی مل جائے گی۔" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ وہ میز سے جوس اٹھا کر گلاس میں انڈیلنے لگی۔

"اور تم مجھے پاگل کہہ رہے ہو' اپنے متعلق کیا خیال ہے۔" اب کے وہ اس کی طرف مڑی۔

"میں ایک برا آدمی ہوں۔ اپنے متعلق بس میں اتنا ہی جانتا ہوں۔" وہ کہہ کر سر جھکا گیا۔

"تم سے زیادہ اچھا آدمی کوئی نہیں ہے ڈیول۔ میں بھی بس اتنا ہی جانتی ہوں۔" وہ جوس اسے تھماتے ہوئے بولی۔

"ایس پی بھی نہیں؟" اس نے پوچھا۔ اب کہ وہ ہنس پڑی۔

"نہیں۔" اس نے تسلی دی۔ اب کہ وہ دونوں ہنس پڑے۔

"جھلی۔" اس نے ہنستے ہوئے گلاس تھام لیا۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں کیا ہوا ہے' اتنی چپ کیوں ہو گئی ہو؟" معاذ نے اسے ٹہوکا دیا۔ ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے خزاں کی شام اتر آئی ہو اس پر۔

"کچھ نہیں' مجھے کیا ہونا ہے؟" وہ آہستہ سے بولی۔ وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے' آج اس کا ہسپتال سے آف تھا۔ دونوں لیٹ اٹھے تھے اور ناشتہ کر کے بیٹھے تھے۔

"کچھ تو ہوا ہے؟ تم کبھی اتنا چپ نہیں رہتیں" معاذ بھائی ہی نہیں' دوست بھی تھا۔ رگ رگ سے واقف۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔

"کچھ نہیں ہوا" وہ کہہ کر اٹھ گئی اور باہر آگئی۔ لان میں پالتو کبوتر آزادانہ پھر رہے تھے۔ وہ کبھی ان کو دیکھتی' کبھی ایک طرف پنجرے میں بند عقاب کو۔ عقاب معاذ کا تھا' ایک سال پہلے لے کر آیا تھا۔ اسے عقاب اچھے نہیں لگتے تھے۔ مگر آج وہ پہلی بار بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ "بلیک ایگل" اس کے ہونٹوں نے بے آواز حرکت کی۔ معاذ کبھی بھی عقاب کو کھلا نہیں چھوڑتا تھا کہ اسے ڈر ہی رہتا کہ کہیں وہ اڑ کر بھاگ نہ جائے۔ اتنا تو وہ بھی سمجھ گئی تھی کہ ایگلز کو کھلا

سیمل چھوڑنا چاہیے۔ وہ اڑ جاتے ہیں' بھاگ جاتے ہیں۔ کسی کے لیے نہیں رکتے۔

"مجرموں کو باندھ کے ہی رکھا جاتا ہے۔" کسے اپنی آواز آئی۔

"زخمیوں کو تو باندھ کے نہیں رکھا جاتا۔" اس نے کہا تھا۔

"مجھے سونا ہے۔ مجھے انجکشن لگاؤ۔"

"مجھے نہیں سونا' پلیز' مجھے انجکشن مت لگاؤ۔"

"درد ہو رہا ہے۔"

"وہ پی سن لو' ریاب کا قاتل ہے وہ۔"

"وہ انوسینٹ ڈیول' بلیک اینجل کے نام سے جانا جاتا ہے۔"

"خون سے رنگے ہیں اس کے ہاتھ۔" طرح طرح کی آوازیں۔ اس نے ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ وہ قابل نفرت تھا اور وہ نفرت کرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے چھوڑا ہی نہیں تھا اسے اس قابل۔ اسے تو بس وہ آنکھیں ہی بے بس کر گئی تھیں۔

"ڈاکٹر عدن کے بلانے پر تو یہ بولے ہی نہیں۔"

"بند کرو ڈرامے بازی۔" عقاب اس کی نظریں خود پر بھی محسوس کر کے پھر پھڑا رہا تھا۔ گویا رہائی کا کہہ رہا ہو مگر۔۔۔ آہستہ وہ کبھی سوچے گی بھی نہیں اس کو رہا کرنے کا۔ ورنہ پہلے تو معاذ کے عقاب کو وہ اکثر آزاد کرنے کا سوچتی۔۔۔ اب تو اسے پتا لگ گیا تھا' عقاب کا کام ہی اڑان بھرنا ہے' بھاگنا ہے۔ رکنا نہیں' ان کو آرام سے نفرت ہوتی ہے۔

"فاطمہ! تم رو رہی ہو؟" معاذ کب وہاں آیا۔ اسے پتا ہی نہ چلا۔ اس نے سٹپٹا کر اسے دیکھا' پھر اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا جو بھیگے ہوئے تھے۔

لف۔۔۔ وہ رو رہی تھی اور اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ رو رہی تھی۔۔۔ معاذ حیران پریشان اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھے اور اندر کی طرف بھاگی' لب اس کی سسکیاں نکل رہی تھیں۔

"قل۔۔۔ قل۔۔۔ اللہ۔۔۔ اللہ۔۔۔ کوئی اس کے اندر

سسک رہا تھا۔ آیت پڑھ کر نیم بے ہوشی میں تڑپ رہا تھا۔ وہ بھی تڑپ رہی تھی۔۔۔

☼ ☼ ☼

ایم ایس سی کیمسٹری فرسٹ سمسٹر میں وہ ٹاپ کر گیا تھا۔ آج رزلٹ کا اعلان ہوا تھا' وہ بے تحاشا خوش گھر لوٹا تھا۔۔۔ سب سے پہلے ابا کو بتانا چاہتا تھا' گھر کے قریب آتے ہی اسے عجیب سی ویرانی کا احساس ہوا۔ دوپہر کا وقت تھا' ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ سر جھٹکتا آگے بڑھا' گیٹ بجانے کے لیے ہاتھ گیٹ پر رکھا' ہاتھ رکھتے ہی گیٹ کھل گیا۔۔۔ بجانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔۔۔ ان کے گھر کا گیٹ کھلا تھا۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا' صحن میں کوئی نہیں تھا۔ کیاری میں لگا سکھ چین کا درخت بھی جیسے آج زیادہ بوڑھا ہو گیا تھا' عجیب یاسیت ٹپک رہی تھی اس سے بھی۔

"زینو۔"

"ابا۔" اس نے صحن میں آواز لگائی۔ کوئی جواب نہیں آیا' وہ پریشان سا ابا کے کمرے کی طرف دوڑا۔ دروازہ کھولتے ہی ساکت ہو گیا۔ آنکھیں پھٹ گئی تھیں' ایک لمحے کے لیے سانس بھی رک سا گیا۔۔۔ دوسرے ہی لمحے اس کی چیخ نکل گئی۔

"ابا! ابا!" وہ چیختا ہوا اندر بڑھا۔ کمرے میں خون ہی خون تھا' ابا فرش پر گرے ہوئے تھے۔

"ابا۔۔۔" وہ چیختا ہوا جھکا اور پھر ایک بار پھر ساکت ہو گیا۔ بیڈ کے نیچے سے خون بہتا ہوا آ رہا تھا' وہ جھکا اور دوسرے ہی لمحے اس کی چیخوں سے پورا گھر گونج اٹھا۔ بیڈ کے نیچے سر خود اس کی بہن کا تھا۔

"زینو۔۔۔ زینو۔۔۔ زینو۔" اس نے اسے باہر کھینچا' وہ پوری شدت سے رو رہا تھا۔ ابا کہتے تھے

"شہروز بڑے حوصلے والا ہے۔" ابا غلط کہتے تھے۔ اس کی بہن کا سر خون سے رنگین تھا' یوں جیسے کوئی نوکیلی چیز اس کی سر پہ لگی ہو' اس کی نظریں اس کی بند

مٹی پر تھیں، جن میں کانچ رہا تھا تو کیا اس نے خود کو مارا۔ اس کے بازو کی آستین لوتھڑی ہوئی تھی۔

کیا ہوا تھا وہاں؟ وہ ابا کی طرف مڑا۔ ابا کا سینہ خون سے رنگین تھا، انہیں یقیناً گولیاں ماری گئی تھیں۔ وہ اپنے حواس کھو رہا تھا، پاگلوں کے انداز میں وہ ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر ابا کے پاس گرا پسٹل اس نے اٹھایا، اس کے ہاتھ پر لگا زنیو کا خون بھی پسٹل پر لگ گیا تب ہی بھاری بوٹوں کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ سامنے پولیس کھڑی تھی، وہ کھڑا ہو گیا، پسٹل اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کچھ؟ آنسوؤں سے اس کی آواز گلے میں دب گئی تھی۔ وہ چیخنا چاہتا تھا، واویلا کرنا چاہتا تھا مگر۔

"یو آر انڈر اریسٹ مسٹر شہوز رضوی" الفاظ تھے یا بم۔ آج قیامت کا دن تھا۔ قیامت آ گئی تھی، ہتھکڑیاں اسے لگائی جا رہی تھیں۔ باہر لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ چیخ رہا تھا، ابا کی طرف دوڑ رہا تھا مگر اسے پولیس گاڑی میں لے جایا جا رہا تھا، لاشوں کو ہسپتال لے جایا جا رہا تھا۔

"ابا۔ ابا۔ زنیو۔ زنیو۔" اس کی چیخیں گلی میں گونج رہی تھیں۔ وہاں موجود ہر بندہ رو رہا تھا۔ پورا محلہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ تب کہاں تھے سب، جب یہ ظلم ہوا تھا۔ پولیس کیسے آ گئی وہاں؟ ان باتوں کا ہوش کسے تھا، لوگ تو حیران کھڑے تھے۔ خون سے اٹے وہ وجود ایمبولنس میں ڈالے جا رہے تھے اور یہی خون پولیس کی گاڑی میں اس کے ہاتھوں پر تھا۔ وہ بلک رہا تھا، سسک رہا تھا، اس کی کوئی نہیں سن رہا تھا، کوئی بھی نہیں۔

☆ ☆ ☆

کمرہ عدالت میں خاموشی طاری تھی۔ دلائل اور ثبوت پیش ہو چکے تھے۔ اپنے باپ اور بہن کا قاتل کٹہرے میں کھڑا تھا نڈھال۔ جج کے فیصلے کا انتظار تھا۔ سات پردوں میں رہنے والی اس کی بڑی بہن زہرہ بھی وہیں بیٹھی بلک رہی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ جیل میں تھا، سنا تھا ایک دنیا آئی تھی اس کے باپ اور بہن کے جنازے پر۔ بس سنا ہی تھا، وہ سن ہی سکتا تھا اب۔ ابا کا مان ٹوٹ گیا تھا، وہ ان کے جنازے میں نہیں تھا۔ ان کا مان ہی آخری مسافت میں ساتھ نہیں تھا۔ باپ غرور وہ اپنا ساتھ لے گئے تھے۔ درد کراب تو آنکھوں کا پانی بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے اور گردن پر تشدد کے نشانات تھے، ایسے ہی نشانات کمر پر بھی تھے مگر وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ کپڑوں کی وجہ سے پولیس والوں نے مار مار کر اسے پاگل کر دیا تھا، وہ دھاڑیں مار مار کر روتا، وہ سمجھتے مار کھانے پر رو رہا ہے جب کہ وہ ابا کو یاد کر کے روتا، زنیو پر روتا۔ سب سے برا حال زہرہ کا تھا، سوجی آنکھیں لیے وہ عدالت میں بیٹھی تھی۔ وہ ان سے کہہ رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ تو اپنے باپ پر جان دے سکتا تھا، لے کیسے لیتا، وہ تو کسی کی بیٹیوں کے لیے بھی بن قاسم تھا پھر اپنی گڑیا کے لیے۔ مگر اس کے پاس اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت نہیں تھا اور نہ ہی اس کے علاوہ کوئی گناہ گار پکڑا گیا تھا۔ ساری زندگی اس نے صاف ستھری گزاری تھی، ابا اور زنیو کا خواب تو ٹوٹ گیا تھا۔ ابا خواب ہی تو کہا کرتے تھے اس زندگی کو۔ لیکن اس کا خواب ڈراؤنے خواب میں بدل گیا تھا۔ سامنے سکتے میں بیٹھی زہرہ، عدیل، حسان۔ وہ انہیں نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے بس خون تھا خون۔

"سائلنس پلیز۔" جج کی آواز پر ہال میں خاموشی چھا گئی۔

"تمام گواہوں اور ثبوتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ عدالت مجرم شہوز رضوی کو عمر قید کی سزا سناتی ہے۔" نقارہ بج گیا تھا، دو گھنٹے پہلے وہ ملزم تھا اب وہ مجرم بن گیا تھا۔ اسے مجرم بنا دیا گیا تھا۔ زہرہ کی چیخیں، عدیل، حسان کی سسکیاں، شہوز کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ سزا سن کر نہ وہ چیخا تھا، نہ اس نے احتجاج کیا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا تھا بالکل خاموش۔ میڈیا پر خبریں آ گئی تھیں، اس کی فوٹو کے ساتھ دکھایا جا رہا تھا اس کا کردہ ظلم۔

"اللہ انسانوں کو آزماتا ہے۔ جس کا جتنا ظرف ہو اسے اتنا ہی آزمایا جاتا ہے۔" اس نے بے اختیار دعا کی کہ وہ کم ظرف ہوتا۔ یا وہ ابا کا بیٹا نہ ہوتا۔ ایک ہفتہ پہلے تک اس کے پاس سب کچھ تھا مگر شہرت نہیں۔ ایک ہفتے بعد سب چھن گیا اور بدنامی مل گئی۔

وہ جیل کی کال کوٹھری میں آگیا تھا۔ زہرہ آئی تھی' اس نے ملنے سے انکار کردیا۔ یہ ضروری تھا اگر وہ انکار نہ کرتا تو وہ بار بار تھانے آتی اور وہ بار بار اپنی پاک بہن کو وہاں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں لاوا ابل رہا تھا۔ ایک میڈیا والے نے تو اس کے گھر جاکر اس خون آلود کمرے کی ویڈیو بھی دکھادی تھی اور ساتھ ہی ساتھ بے حس بیٹے پر ایسے ڈائیلاگ مارے کہ مائیں پناہ مانگنے لگیں کہ خدا ایسے بیٹوں سے تو بیٹے نہ ہی دے۔

دل میں ابلتا لاوا پکتا گیا' وہ مدتوں بعد اس نے پہلی بار سوچا کہ آخر یہ سب کس نے کیا؟ جس جیل میں اس کے ابا مجرم لایا کرتے تھے' آج ان کا بیٹا تھا وہاں۔ "ایماندار پولیس انسپکٹر کا کرپٹ بیٹا جس نے اپنے باپ اور بہن کو مارڈالا۔ کیوں مارا؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔ جانتا بھی کیسے جب بیٹے نے وجہ ہی نہیں بتائی تھی۔ تین دن بعد اس سے ملاقاتی آیا تھا۔

"کون ہے؟" وہ حیران کھڑا پولیس والے سے پوچھ رہا تھا۔

"کوئی بابو ہے۔" پولیس والے نے کہا تو وہ چونکا۔ تب ہی بابو آگیا۔

"یہ اچھا تو نہیں ہے لیڈ" اسے اپنے الفاظ یاد تھے۔ وہ چپ کھڑا بابو کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سلاخوں کے اندر تھا' بابو باہر۔ سلاخوں کے اندر تو برے لوگ جاتے ہیں۔ برا کون تھا پھر؟ بابو یا وہ۔ وہ مجرم تھا' بابو تو ملزم ہی رہتا تھا پھر رہا ہوجاتا تھا۔ وہ پہلی بار میں ہی اسیر کرلیا گیا تھا ملزم سے مجرم بننے کا سفر دنیا نے ایک جھٹکے میں طے کروادیا تھا اسے۔ دنیا کی عدالت کا فیصلہ آگیا تھا۔ بابو اسے دیکھ رہا تھا۔

"تمہارے باپ کا قاتل چودھری غلام حسین ہے۔" بابو نے آکر دھماکہ کیا۔ وہ ساکت کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی نہیں کہہ سکا کون چودھری غلام حسین؟

"اپنے سندھ کے وزراء کراچی میں ہی مقیم ہوتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک کا وکیل ہے یہ۔ رضوی صاحب اس کے راستے کی دیوار تھے' ان کا لاکھوں کا ناجائز مال جو بنا چیکنگ ہر پولیس ناکے سے گزرتا تھا' رضوی صاحب کے ناکے سے نہ گزر سکا۔ بس پھر رضوی صاحب اڑ گئے' ان کی ایمانداری نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ رشوت لے کر جانے دیں۔ الٹا انہوں نے اس بات کو اوپر رپورٹ کردیا مگر اوپر والے تو خود اوپر والوں کا ہی ساتھ دیتے ہیں۔ تمہارے ابا کی وجہ سے پہلے بھی اوپر والوں کو بہت مسئلے تھے۔ ایک عام سا پولیس انسپکٹر ان کے آڑے آئے' انہیں گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ تمہارے ابو کو معطل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جب تمہارے ابا کو یہ پتا چلا انہوں نے خود ریزائن لکھ دیا مگر ساتھ ہی ناکے والی بات انہوں نے میڈیا میں لانے کا فیصلہ کرلیا اور میڈیا کے نمائندے کو بلایا۔ وہ تو نہیں آیا مگر تمہارے ابا کی موت آگئی' تمہاری بہن کے ساتھ جو وہ کرنا چاہتے تھے وہ نہ کرسکے' اس نے خود کو خود مارلیا مگر اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دیا۔ پھر خود ہی انہوں نے پولیس کو بھیجا اور یوں تھا کہ تحقیقات چلیں گی' آخر میں کوئی مجرم نہیں ملے گا تو پھر اس کیس کو بھی فائلوں میں دبادیا جائے گا۔ مگر ان کی خوش قسمتی' مجرم کی صورت میں انہیں تم مل گئے یعنی بنی بنائی صورت حال بھی مل گئی۔ انہیں اور کیا چاہیے تھا۔" بابو سانس لینے کے لیے رکا۔ وہ سکتے میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

"ساری زندگی ایماندار رہنا" اسے یاد تھی ابا کی بات۔ ایمانداری اور زندگی ساتھ رہ سکتے تھے بھلا؟" جب ایمانداری آتی ہے' زندگی چلی جاتی ہے۔ موت قبول کرنی پڑتی ہے۔ پھر بابو نے اس سے جو کچھ کہا' وہ نہیں سن رہا تھا۔ بابو بولتا رہا' جب وہ خاموش ہوا تو وہ بس ایک لفظ بولا۔

"مجھے یہاں سے باہر نکالو' مجھے باہر نکلنا ہے ہر

قیمت پر۔" اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ پاؤں سے اپنا بھاری ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا پھر تھپتھپا کر مڑ گیا۔

☼ ☼ ☼

تھپ۔ تھپا۔ تھپ۔ تھپ۔" کھڑکی بج رہی تھی۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے' وہ تیزی سے اٹھی۔ خوف کی لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔ آہستگی سے چلتی چلتی وہ کھڑکی کے پاس آگئی۔

"کک۔ کک کون۔ کون؟" اس نے بمشکل کہا' ساتھ ہی موبائل اٹھا لیا تاکہ معاذ کو بلا سکے اندر کمرے میں۔

"آپ کا مریض۔" آواز تھی یا بم۔ وہ اچھل پڑی' دو منٹ تک وہ بے یقینی رہی پھر اس نے دھڑ سے ہٹا دی۔ وہ وہی تھا' وہ واقعی وہی تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی' بڑے عجیب طریقے سے وہ پائپ پر چڑھا ہوا تھا۔

"تت۔ تت۔ تم۔ تم؟" الفاظ اس کے منہ سے ٹوٹ کر نکلنے لگے۔ مقابل نے ہاتھ بڑھا کر اندر چھلانگ لگائی' اس کے منہ سے چیخ سی نکلنے لگی تھی مگر اس نے آگے ہو کر فوراً" ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اس کی چیخ اس کے بھاری ہاتھ تلے دب کر رہ گئی تھی۔ وہ اس کے قریب کھڑا تھا' بہت قریب' اس کے منہ پر ہاتھ رکھے۔ گھر تک آگیا تھا۔ اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔

"کیسی ہو ڈاکٹر؟" آنکھیں شرارت سے بھرپور تھیں۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہوئی۔

"تم کیا کر رہے ہو یہاں۔ تم۔" اس کی آواز اونچی ہونے لگی' اس نے دوبارہ ہاتھ رکھ دیا۔

"ٹانکے کھلوانے آیا ہوں ڈاکٹر۔ آپ نے لگائے تھے' آپ نے باندھا تھا' کھولیں گی بھی آپ ہی۔" وہی ڈھولس جتاتا لہجہ۔

"میرا گھر کیسے ملا تمہیں؟" اس نے خود کو کمپوز کیا۔

ادھر ایک بار پھر شرارت ابھر آئی تھی۔

"ڈھونڈنے نکلا تو مل ہی گیا" کہہ کر مزے سے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ حیران کھڑی اس کی حرکتیں دیکھ رہی تھی۔

"مجھ سے ڈر تو نہیں لگ رہا ڈاکٹر؟" وہ مسکرایا۔ وہی جان لیوا معصوم شیطانوں جیسی مسکراہٹ۔ وہ واقعی ڈر تو نہیں رہی تھی اس سے۔

"شٹ اپ" اس نے غصے سے کہا۔

"چلو اٹھو میرے بیڈ سے' نکلو یہاں سے۔" وہ زخمی وحشی پڑا تھا۔

"ٹانکے کھولیں' پھر جاؤں گا۔" وہی ضد بھرا لہجہ' فاطمہ نے گھور اگر ایک پل بھی نہ دیکھ سکی' فوراً" ہی آنکھیں جھکا گئی۔

کمبخت دیکھنے بھی نہیں دیتا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کو سنبھالتی الماری سے میڈیکل باکس نکالنے لگی۔ اتنا تو سمجھ گئی تھی کہ وہ جانے والا نہیں۔ وہ مزے سے بیڈ پر بیٹھا تھا۔ وہ بھی پاس بیٹھ گئی۔

"شرٹ اتارو۔" اس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ اس نے بڑی فرمانبرداری سے اتار دی۔ وہ ٹانکے دیکھنے لگی' پروا تو جناب نے کی نہیں تھی' وہ تو پہلے ہی اکھڑے پڑے تھے۔ وہ جگہ سرخ ہوئی پڑی تھی۔ اس نے ٹانکے کاٹے' دھاگے کھینچے۔ اس کوشش میں وہ پوری اس پر جھک گئی تھی۔ سنہری بالوں سے ڈھکا سر اس کے سینے پر ہی تھا تقریباً"۔ وہ سرشار سا سیپو کی آنکھیں تک سوتا رہا تھا۔

"درد تو نہیں ہو رہا؟" اس نے جھکے جھکے ہی پوچھا۔

"ہو رہا ہے نا۔" وہ مستی خیزی سے بولا۔ فاطمہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' چہرے پر وہی ازلی سکون تھا۔ سکون ہی سکون۔

"لگ تو نہیں رہا کہ درد ہو رہا ہے۔" وہ غصے میں آگئی۔ اس نے مسکراہٹ دبائی۔

"ہو رہا ہے نا۔ دل میں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا؟" وہ چیخ اٹھی۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ دھانے میں

کے منہ پر رکھا۔

"میں چلتا ہوں ڈاکٹر' شکریہ۔" مسکراتا لہجہ' مسکراتی آنکھیں' وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ پھر مڑا۔

"وہاں میری تصویر سنبھال کر رکھنا" وہ کہہ کر باہر کود گیا اور وہ سن ہو گئی۔ اسے۔ اسے۔ اسے کیسے پتا کہ میں نے اس کی تصویر بنائی۔ اوہ میرے خدایا۔

☆ ☆ ☆

بابو اسے جیل سے فرار کروا کر سلطان کے پاس لایا تھا۔ سلطان کے پاس آکر وہ بلیک ایگل بن گیا تھا۔ میڈیا پر اس کے فرار کی بھی خبریں آگئیں اور جب اس نے پہلی بار بینک لوٹا تب وہ جان بوجھ کر اپنا کارڈ چھوڑ آیا تھا اپنی فوٹو کے ساتھ تب سب جان گئے کہ وہ شہوز رضوی بلیک ایگل بن گیا تھا۔ آخر کو وہ ایمان دار ایس پی کا بیٹا تھا' ہر کام ایمان داری سے کرنا اس کی عادت تھی۔ پولیس کو دہشت میں نہیں ڈالتا تھا' بتا رہا تھا کہ میں نے کیا ہے یہ کام۔ اس نے بینک لوٹے' چوہدری غلام حسین کے خاندان کو نہیں چھیڑا لیکن اس نے کبھی قتل کیا۔ وہ عرفان رضوی کا بیٹا تھا' خون سے اپنے ہاتھ بھی نہیں رنگ سکتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ مشہور قاتل تھا۔ اب تو شہر میں جہاں بھی ٹارگٹ کلنگ ہوتی' نام اس کا آتا۔ حالاں کہ وہ کلر نہیں تھا۔ وہ بس چوہدری غلام حسین کا کاروبار تباہ کر رہا تھا۔

اور عزہ رحمان' سلطان کی بیٹی۔ بس وہ تھی اس کی دوست لکس پی شاہ زیب کے ساتھ اس نے محبت کی تھی بالکل معصوم لڑکی بن کر' آخر میں سلطان کے خلاف جتنا ریکارڈ تھانے میں تھا' وہ سارا لے کر وہ ایس پی کو چھوڑ آئی تھی۔ مگر اپنا دل بھی وہیں چھوڑ آئی تھی۔ عید کے دن ہونے والی قتل و غارت میں بھی اس کا ہاتھ نہیں تھا' وہ بس وہاں سے گزر رہا تھا جب فائرنگ شروع ہوئی۔ وہ لوگوں کو بچانے کے لیے اترا تو خود گولیاں کھا بیٹھا۔ اور گرفتار ہو گیا۔ سلطان کوئی ٹارگٹ کلر نہیں تھا' اس کا کاروبار بس بھتہ لینے' بینک لوٹنے تک تھا۔ مگر بلیک ایگل ٹارگٹ کلر کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اب تو جو بھی ٹارگٹ کلنگ کرتا' وہاں بلیک ایگل کے کارڈ پھینک آتا اور نتیجے میں سارا نزلہ اس پر گرتا۔

ایک بار پھر عدالت لگی تھی' کٹہرے میں ارمان غلام کھڑا تھا۔ جج بیٹھا تھا گواہ بیٹھے تھے۔ فیصلہ آنے والا تھا۔

"یہ عدالت تمام ثبوتوں اور گواہوں کے پیش نظر یہ فیصلہ کرتی ہے کہ شہوز رضوی جو تین سال پہلے جیل سے فرار ہوئے تھے وہ باعزت طور پر اس کیس سے بری کیے جاتے ہیں اور۔ فیصلہ سنایا جا رہا تھا۔ ہر کوئی ٹی وی پر دیکھ رہا تھا' سن بھی رہا تھا۔ جو وہ چاہتا تھا وہ ہو گیا تھا۔ چوہدری غلام حسین اور اس کا بیٹا خود عدالت میں جا کر مانے تھے' اس نے ان کی زندگی اتنی تنگ کر دی تھی ان پر کہ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ سلطان اور وہ اپنی فتح پر مسکرا رہے تھے۔

"میں ملوں گا آج ایس پی سے" اس نے عزہ کے کان میں سرگوشی کی' وہ اچھل پڑی۔

"خبردار' وہ تمہیں گرفتار کر لے گا فوراً" ۔ ایک کیس سے بری ہوئے ہو تم' باقی کا کیا؟" عزہ نے روکا۔

"نہیں کرتا' میں اس سے مل کر اسے ساری حقیقت بتاؤں گا اور پھر" وہ کہتے کہتے رکا۔

"پھر تمہیں اس کے ساتھ بھگا دوں گا" اس نے شرارت سے کہا۔ عزہ نے زوردار مکا اس کے کندھے پر مارا۔

"فاطمہ پھر بھی نہیں ملنے والی تم کو" عزہ نے چڑایا۔

وہ ہنس پڑا۔

"ملیں گے تو اس کے فرشتے بھی۔" اس نے کہا' آنکھوں میں وہی شرارت تھی جو فاطمہ کو دیکھنے پر آتی تھی۔ اب بھی ایسے لگ رہا تھا جیسے تصور میں ہی فاطمہ کو دیکھ رہا ہو۔ عزہ نے دل ہی دل میں نظر اتاری اس کی' جب سے ہسپتال سے آیا تھا' یونہی خوش رہتا تھا وہ۔ ورنہ ان تین سالوں میں وہ تین بار ہی مسکرایا تھا۔ فاطمہ تھی جو اس کے چہرے پر مسکراہٹ بن کر دوڑ

رہی تھی۔ وہ کہتا تھا "عزہ جب وہ چڑتی ہے ناں۔ واللہ میں بتا نہیں سکتا کہ کتنی اچھی لگتی ہے۔" اور وہ ہنس پڑی۔

نماز پڑھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی' دل میں ایک سکون اتر آیا تھا عدالت کا آج کا فیصلہ سن کر۔ وہ آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

تبھی عدیل اندر آیا۔

"زہرہ باہر پولیس۔" آواز اس کی منہ میں ہی تھی کہ دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا اور اسے دیکھ کر زہرہ ساکت ہو گئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ دوسرے ہی لمحے پورا گھر ان کی سسکیوں سے گونج رہا تھا' وہ رو رہے تھے بے تحاشا' پیچھے کھڑے شاہ زیب حسن اور عزہ بھی رو پڑے تھے اور عدیل بھی ایک طرف کھڑا وہ چار سالہ بچہ حیرانی سے سب دیکھ رہا تھا۔

"میں مر گئی تھی شہوز۔ میں مر ہی گئی تھی۔" ہچکیاں لے رہی تھی۔ وہ بھی رو رہا تھا۔ تین سال سے اندر چھپے آنسو آج سیلاب بن کر نکلے تھے۔

"ابا۔ زیبو" اس کے دل سے ایک بار پھر ہوک سی نکل گئی۔ زیبو زیبو ہی تھی' اس نے ابا کا غرور نہیں ٹوٹنے دیا تھا' خود ٹوٹ گئی تھی۔ زہرہ بار بار اس کا منہ چوم رہی تھی۔

"یہ۔ یہ سعد اتنا بڑا ہو گیا۔" اس نے حیرانی سے سعد کو دیکھا جو شرما رہا تھا پھر تڑپ کر اسے ساتھ لگا لیا تھا۔ ایک بار پھر آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب نکلا تھا' کچھ خسارے زندگی میں کبھی پورے نہیں ہوتے۔ کچھ کمی ہمیشہ رہ جاتی ہے' کچھ کسک رہ ہی جاتی ہے۔ اسے ابا یاد آئے۔ اور بڑی شدت سے یاد آئے آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

"مبارک' مبارک۔ ہر طرف سے مبارک سلامت کا شور گونج اٹھا۔ اب وہ گلے مل رہے تھے۔ اس کے چہرے پر خوشیوں کا موسم تھا۔ زہرہ بھی خوش تھی اور سعد بھی۔ ابھی اس کا نکاح فاطمہ سے ہوا تھا' بلیک ایجل آج دولہا بن گیا تھا۔ حیرت کی بات تھی ناں مگر اس سب کے پیچھے شاہ زیب حسن تھا جو اپنی بیوی عزہ رحمان کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جس دن شہوز رضوی اسے ملا تھا' اسی دن وہ اس کا فین ہو گیا تھا۔ وہ اب بری تھا' اور سلطان کے خلاف تو ویسے بھی سارا ریکارڈ ختم ہو چکا تھا۔ عزہ نے شرمندگی سے جب اس سے معافی مانگی تھی' اس کا سارا غصہ پل میں اتر گیا تھا۔ محبت کرنے والوں کو بھلا محبوب پہ کہاں غصہ آتا تھا۔ وہ عزہ سے کیا ملا' اسے زندگی مل گئی۔ پھر فاطمہ کے گھر والوں کو منانے والا بھی وہی تھا۔ کچھ دیر بعد فاطمہ کو اس کے ساتھ لا کر بٹھا دیا گیا۔ ڈیپ ریڈ فراک میں وہ آسمان سے اتری حور لگ رہی تھی' آنکھیں جھکی ہوئی لرز رہی تھیں' دل دھڑک رہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھتے ہی اس کی آنکھوں میں شرارت اتر آئی تھی۔ ابھی نکاح ہوا تھا' رخصتی دو ماہ بعد تھی۔

"میں آج پھر آؤں گا ڈاکٹر' کھڑکی کھول کے رکھنا۔" اس نے شرارت سے سرگوشی کی۔ وہ بے اختیار ہنس سی گئی۔

"پھر دکھاؤں گا تمہیں کہاں کہاں درد ہوتا ہے تمہیں دیکھ کر۔" وہ مزید شرارتی ہوا۔ وہ سرخ ہو گئی۔ لوگ چاند سورج کی جوڑی کہہ رہے تھے۔

"آج دوا نہیں دو گی مجھے؟" اس نے پوچھا۔ فاطمہ نے سر جھکا دیا۔ وہ ہنس پڑا۔

"علاج کرتے کرتے لاعلاج کر دیا مجھے۔" وہ سرشار تھا اپنی فتح پر۔ وہ جھکے سر کے ساتھ مسکرا دی۔ زندگی کی راہ گزر روشن تھی' راستہ صاف تھا۔ معصوم شیطان اس وقت اس کے پہلو میں بیٹھا مسکرا رہا تھا اور ابا کو سوچ رہا تھا۔ ابا نے زندگی گزار دی' اس کی بھی گزر جاتی تھی۔ وہ اپنے باپ کی ہر بات نہیں مان سکا تھا مگر اس نے ہر بات رد بھی نہیں کی تھی۔ وہ اللہ سے معافی کا طلب گار تھا اور اسے پتا تھا کہ اسے معافی مل جائے گی۔ کیونکہ ابا کہتے تھے گناہ پر رک جانا بہترین جاننا گناہ ہے' یہ دوزخ کی طرف لے جاتا ہے۔ گناہ کر کے پلٹ آنا اللہ کو بندے کے لیے رحیم بنا دیتا ہے۔

تنزیلہ زبیدہ افضل

محبت سے آگے

مجھے وہاں چھت پہ بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی جب یک دم گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ دوسرے ہی پل دھریک کے درخت پہ بیٹھی بہت ساری چڑیاں پھر سے وہاں سے اڑ گئیں۔ میرا اپنا دل بھی گویا اچھل کر حلق میں آیا تھا۔

"کیا ہوا؟ کس نے چلائی ہے یہ گولی؟" میں نے بدحواسی میں منی کی طرف دیکھا تو اس نے ہنستے ہوئے مجھے بتلایا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا سدرہ! تم تسلی سے بیٹھو۔ گلی میں لڑکے یونہی نشانہ بازی کر رہے ہیں۔"

اس نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا اور خود منڈیر کی طرف گئی تھی۔ میں نے بھی غور سے اس کی پیروی کی پھر منڈیر کے پاس کھڑے ہو کر نیچے گلی کی طرف جھانکا تو سامنے کے منظر نے مجھ پر سب کچھ واضح کر دیا تھا۔

وہاں کونے میں بہت سارے لڑکے جمگھٹا لگائے کھڑے تھے اور ان میں سب سے نمایاں اورنگ زیب اس وقت کلائی میں ربن باندھے، بندوق ہاتھ میں لیے چڑیوں کا نشانہ لگائے کھڑا تھا۔ باقی دیہاتی لڑکوں کے برعکس اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی اور بالوں کا اسٹائل بھی ایک معروف انڈین فلمی ہیرو جیسا تھا۔

"وہ رہا رنگ زیب" منی نے دبے دبے جوش کے ساتھ مجھے کہنی ماری تو یک دم میرا پارہ چڑھ گیا۔

"یہ کیا تم رنگ زیب، رنگ زیب لگا رکھی ہو، سیدھی طرح اورنگ زیب کہا کرو۔" میں نے تپ کے اس سے کہا "دیکھ رکھا ہے رنگ زیب پہلے بھی میں نے کوئی نئی بات نہیں" میرا انداز کچھ اس طرح کا تھا کہ منی کا چہرہ یک دم اتر گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے، ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔" اس نے منہ پھلا کر کہا تو مجھ سے بھی برداشت نہ ہوا، جھٹ جواب دیا تھا۔

"ہونا کیا ہے؟ دنیا بدل گئی مگر اس کی حرکتیں نہیں بدلیں۔ پہلے چھروں والی پستول لیے پھرتا تھا اب اس بچوں والی پستول کے بجائے سچ مچ کی بندوق ہاتھ میں آگئی ہے۔ پتا نہیں کس کی اٹھا لایا ہے۔" میں نے دل کی بھڑاس نکالی تو منی کچھ اور برا مان گئی۔

"ایسے تو نہ کہو، بے چارہ کبھی کبھار گاؤں آتا ہے تو موج میلہ کر لیتا ہے، ورنہ اب تو اس کو ٹیم (ٹائم) ہی نہیں ملتا۔" اس نے فوراً اس کی طرف داری کی تھی۔ مجھے غصہ تو بے حد آیا، مگر ضبط کر گئی۔

جانتی تھی منی اور رنگ زیب (وہ اسے ہمیشہ رنگ زیب ہی کہتی تھی) دونوں ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ بقول منی "محبت اور عشق کے لازوال رنگ میں۔"

"چلو منی نیچے چلیں۔" میں نے اس کی توجہ اورنگ زیب ہی کی طرف مبذول دیکھی تو فوراً اسے کہنی ماری تھی اس نے پہلے تو ناگواری سے منہ بنایا پھر دل پہ پتھر رکھ کر میرے ساتھ ہی سیڑھیاں اتر آئی۔

پھر نیچے آ کر میں نے ادھر ادھر کی جو بات بھی کی اس نے محض ہوں ہاں میں ہی جواب دیا۔ میں کچھ دیر تو وہاں بیٹھی رہی، لیکن منی نے سیدھے منہ بات نہ کی تو میں شگفتہ کے ساتھ واپس حویلی آگئی تھی۔

اس بڑی سی حویلی میں میرے دادا، دادی اور چچا، چچی رہتے تھے۔ ویسے تو ان لوگوں کا پرانا گھر گاؤں کے دوسرے گھروں کے درمیان میں ہی تھا مگر چند سال پہلے چچا نے سارا سامان گاؤں سے کچھ فاصلے پر بنی اس حویلی میں شفٹ کر لیا تو دادا، دادی کو بھی چار و ناچار یہیں آنا پڑا۔

"کتنے دن رہو گی تم اس بار۔" میں حویلی میں واپس آ کر صحن میں بچھی چارپائی پہ جا کر بیٹھی ہی تھی کہ دادی نے پوچھ لیا۔ وہ بھی اسی چارپائی پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

"تھوڑے ہی دن رہوں گی۔" میں نے جواب دیا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

امی ابو کے شہر چلے جانے پر میں بھی ان کے ساتھ ہی گئی تھی مگر موسم گرما میں دادا، دادی سے ملنے یہاں ضرور آتی تھی۔ وہ بھی بڑی شدت سے میرے آنے کے منتظر رہتے تھے اور جس دن یہاں سے میری واپسی ہوتی اس روز دادی کا چہرہ کھلنے والا ہوتا تھا۔

"دادی منی کی منگنی ہو گئی ہے؟" میں نے دادی کو خاموش پا کر یونہی سرسری انداز میں پوچھا تو وہ تسبیح پڑھتے پڑھتے یکدم رک گئیں۔

"غلام رسول ترکمان کی لڑکی کی بات کر رہی ہو؟" انہوں نے استفہامیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"جی وہی۔" میں نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔

"کہاں۔۔۔ ابھی کہاں ہوئی۔" تاپروائی سے کہہ کر پھر تسبیح پڑھنے لگیں۔

"وہاں لڑکیاں تو کہہ رہی تھیں کہ ہو گئی۔۔۔ وہ جو اس کے چچا کا لڑکا ہے اورنگ زیب اس کے ساتھ۔" میں نے ذرا تجسس سے انداز میں کہا تو دادی نے یکدم آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔

"تو ترکمانوں کے گھر گئی تھی؟"

"جی، وہ منی اور زبیدہ دونوں یعنی سہیلیاں ہیں نا میری۔۔۔ شگفتہ کے ساتھ گئی تھی۔" میں نے فوراً وضاحت کی۔



شگفتہ کلاس کی ہی لڑکی تھی اور ہر روز کالج کے لیے حویلی آیا کرتی تھی اس کے ساتھ جانے پر دادی کو اعتراض نہ ہوتا۔

"جب آپ پرانے گھر ہوتے تھے تو تب بھی تو ان کے گھر جایا کرتی تھی میں۔ پچھواڑے ہی تو گھر تھا ان کا۔"

میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر فوراً" ہی انہیں یاد کروایا تاکہ ان کی کسی بھی قسم کی ڈانٹ سے بچا جاسکے۔ دادی نے بات سن کر ہولے سے سرہلایا تھا اور تسبیح کے دانے گراتی رہیں۔

"پتا نہیں' میں نے تو نہیں سنا کہ اس کی منگنی ہوگئی۔ ویسے اچھا ہو صغریٰ' نہ ہی کرے اپنی لڑکی کا رشتہ اس نکمے لڑکے سے۔" انہوں نے ناگواری سے کہا۔

"دو چار دن شہر جا کر کام کرلیتا ہے پھر واپس آکر وہی پھر سے گلیوں کی آوارہ گردی۔" وہ بدمزہ سے انداز میں کہتی چارپائی سے اٹھ کر نماز پڑھنے کے لیے برآمدے کی طرف چلی گئیں۔

اس شام منی ہماری طرف آئی تو میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ "تونے جھوٹ کیوں بولا تھا؟ مجھے تو پتا چلا ہے کہ تیری کوئی منگنی وگنی نہیں ہوئی ابھی۔"

"مسعد یہ جی! ایک ہی گل (بات) ہے نا۔ آج نہیں ہوئی تو کل ہوجائے گی۔ ہمارے بیچ کون سا کسی دوسرے نے آنا ہے۔ لمبا رشتے دار ہے' ذات کا وہ بھی ترکھان' میں بھی ترکھان۔" اس نے ہنستے ہوئے کچھ اس انداز سے کہا کہ مجھے بھی ہنسی کو ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔

پھر وہ کتنی ہی دیر اپنا "رنگ نامہ" کھول کے بیٹھی رہی' رنگ زیب یہ رنگ زیب وہ۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے چپ کروایا تھا۔

دادی کو اس کی باتوں کی بھنک بھی پڑجاتی تو اس کا یہاں آنا ہی بند کروادیتیں اور شاید مجھے بھی خوب ڈانٹتیں' میں نے اسے یہی بات کہی تو وہ کچھ دیر بیٹھ کر خود ہی اٹھ کر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

ان چھٹیوں میں' میں جتنے دن وہاں رہی' منی کے گھر یا کہیں اور آتے جاتے میرا کئی بار اورنگ زیب سے سامنا ہوا تھا۔ وہ اکثر یہاں سے وہاں پھرتا نظر آتا۔ کبھی ہاتھ میں بندوق لیے نشانہ باندھ رہا ہے تو کبھی واک مین لیے پھر رہا ہے۔ اس زمانے میں واک مین کسی کسی کے پاس دیکھنے کو ملتا تھا اور گلوں کے اس لڑکے کے ہاتھ میں دیکھ کر مجھے اچھی خاصی حیرت ہوئی تھی پھر تو اس کے بعد جب بھی دیکھا واک مین ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے' انڈین فلموں کے گیت بج رہے ہیں اور اورنگ زیب صاحب ایک ہیرو کی مانند لڑکوں کی جھرمٹ میں چل رہے ہوتے تو ادھر ادھر جاتی لڑکیاں ذرا ٹھہر کر اسے دیکھنا نہ بھولتیں اور پھر جیسے ہی اورنگ زیب کو احساس ہوتا اس کی ناک آسمان کو چھونے لگتی۔

ایک روز مجھے بھی دیکھ کر ایک ادا سے مسکرایا اور ہاتھ پیشانی تک لے جاکر سلام کیا تھا۔ میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جیسے ہی شام کو منی آئی میں نے اسے خوب سنائیں۔

"ہیا پھوپھو' اچھا ہے تمہارا چچازاد اور تم پھر بھی اس کی تعریفوں کے پل باندھتی رہتی ہو۔" میں نے جھڑکا تو اس نے فوراً" اس کی صفائی پیش کی۔

"ویسے تو نہ کبھی کیا برائی ہے اس میں۔ وہ تو اس کو پتا ہے کہ تم میری سہیلی ہو اس لیے سلام کیا ہوگا ورنہ ایسا ویسا تو نہیں۔" اس کی بات سن کر میں خاموش کی خاموش رہ گئی۔

جانتی تھی کہ منی کو خود مرضی کہوں وہ ایک بات بھی اس کے خلاف سننے پر تیار نہ ہوگی۔

"بے چاری منی' ظاہری چمک دمک سے متاثر ہوگئی ہے مگر آگے جاکے زندگی میں اسے پتا چلے گا کہ صرف شکل و صورت سے کام نہیں چلتا اور بھی کئی ضروری ہیں۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا ضرور مگر

زبان سے کچھ نہ کہا کہ بہرحال منی کی دوستی مجھے خاصی عزیز تھی اور اگر میں اورنگ زیب کے خلاف کوئی بات کرتی تو یقیناً" اس نے مجھ سے ناراض ہو کر یہاں آنا ہی چھوڑ دینا تھا جو میں بالکل بھی نہیں چاہتی تھی۔

وہ چند منٹ تک تو منہ پھلائے بیٹھی رہی پھر میں نے خود ہی موضوع بدل لیا تو وہ بھی دوبارہ چہک چہک کر باتیں کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

پھر متواتر دو برس گزر گئے' لیکن میں گاؤں نہ جا سکی۔ ہر بار ارادہ کرتی' سامان باندھنے کی تیاری بھی کرتی مگر کوئی نہ کوئی ایسی مجبوری آڑے آجاتی تھی کہ مجھے ارادہ ملتوی کرنا پڑتا۔ اس بار البتہ میں مقررہ تاریخ کو ابو کے ساتھ حویلی پہنچ ہی گئی۔

توقع کے عین مطابق مجھے دیکھ کر سب ہی بے حد خوش ہوئے تھے' دادی بھی خوب چہکیں۔ دوپہر تک میں ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی پھر شام ہوئی تو شگفتہ کے ساتھ چھت پر آگئی تھی۔

"اب اوپر کھانا پکاتے ہو۔" میں نے شگفتہ سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"گرمی ہوتی ہے تو شام کو ہوا اچھی چلنے کی وجہ سے یہیں آجاتے ہیں۔" وہ لکڑیاں لے کر مٹی کے بنے چولہے کے ساتھ مصروف ہو گئی تھی اور میں چلتی چلتی چھت کے کونے پر جا کھڑی ہوئی۔

یہاں سے سامنے پگڈنڈی کا راستہ خاصا واضح نظر آتا ہے اور ارد گرد پھیلے کھیتوں کی وجہ سے منظر بھی بے حد خوب صورت ہو جاتا ہے' میں یونہی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جب یک دم پگڈنڈی سے شہر کو جاتے رستے پر مجھے ایک مرد اور عورت چلتے نظر آئے۔

"شگفتہ ادھر آنا جلدی سے۔" میں نے کہا تو وہ فٹافٹ بھاگ کر آئی تھی۔

"وہ دیکھو وہ سامنے منی ہی جا رہی ہے نا؟" میں نے منی کی چال سے اسے پہچان لیا تھا۔

شگفتہ نے ادھر دیکھا تو اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں جی وہی ہے۔ شادی ہو گئی ہے اس کی۔" اس نے مجھے سرسری سے انداز میں بتایا تو میں یک دم چونک گئی۔

"اچھا۔ کب۔؟ اور وہ ساتھ اورنگ زیب ہے؟" میں نے فوراً" شگفتہ کی طرف دیکھا تو اس بار اس کا جواب نفی میں تھا۔

"نہیں۔ یہ تو اس کا شوہر ہے' اورنگ زیب سے کہاں شادی ہوئی اس کی' یہ تو دوسرے گاؤں کا لڑکا ہے۔" اس نے مزید تفصیل بتائی تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"کیا؟ اورنگ زیب سے نہیں ہوئی' لیکن وہ تو۔" میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی شگفتہ نے بات کاٹی تھی۔

"وہ سب تو ختم ہو گیا کب کا۔ بڑی لڑائی ہوئی تھی دونوں گھروں کی۔ منی کی تاچی رشتہ لے کر گئی تو منی نے انکار کر دیا تھا۔"

"کیا منی نے انکار کر دیا؟" مجھے یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں اس نے۔ اصل میں اورنگ زیب کام چھوڑ آیا تھا اور سارا دن گاؤں میں آوارہ پھرتا رہتا تھا۔ منی نے چند روز تو دیکھا پھر کہنے لگی کہ میں نے ساری زندگی اس کی نشانے والی پستول اور فیشن بالوں کے ساتھ تو گزارنی نہیں' کوئی ہنر بھی سیکھے تو پھر بات بھی بنے۔" شگفتہ کہتے کہتے ہنسی۔

"اورنگ زیب نے سنا تو بڑا غصہ کیا تھا۔ بس پھر وہیں بات ختم ہو گئی۔" وہ کہہ کر رکی نہیں بلکہ چولہے کی طرف مڑ گئی تھی اور میں وہاں کھڑی کتنی ہی دیر پگڈنڈی پہ جاتے ان دو سایوں کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔ منی اتنی بے وقوف ثابت نہیں ہوئی تھی جتنا میں اسے سمجھ رہی تھی میں نے یہی سوچا اور واپس مڑ گئی۔

اس پل گاؤں کی طرف سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی اور پھر دور بہت سی چڑیاں پھر سے اڑتی دکھائی دیں۔

"آج یقیناً" اورنگ زیب کا نشانہ خطا گیا ہے۔" میں نے گہری مسکراہٹ لیے زیر لب کہا تھا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے آگئی۔

☆

نادیہ احمد

محبت روگ ہے

فٹ پاتھ پہ بازار مصر کا گماں تھا۔ کپڑوں سے جھلکتے عریاں بدن۔

لہراتی بل کھاتی وہ حوا کی بیٹیاں اپنی اداؤں سے گاہکوں کو ترغیب دے رہی تھیں۔

حسن کے بازار میں بولیاں لگ رہی تھیں۔ کیا حشر بپا تھا۔ یہاں رنگ و نسل کی تمیز نہیں تھی۔ بس ہوس ہر شے پہ حاوی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف ٹیکسیوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ سروس لین میں گاڑیاں رینگ رہی تھیں۔ گاڑیوں کے شیشوں سے سر نکالے کچھ لوگ حریص نظروں سے ان عورتوں کو دیکھ رہے تھے۔ بات بن جاتی تو وہ اسے اپنے ساتھ بٹھا لیتے تھے۔ رات کے دس بجے شہر کی ان سڑکوں پہ رات جوان تھی۔

یہ اس شہر کا ریڈ لائٹ علاقہ نہیں بلکہ مشہور کاروباری مرکز تھا جہاں دن کی روشنی میں لاکھوں کروڑوں کا کاروبار ہوتا تھا۔ سڑک پہ ٹریفک جام اور سب وے اسٹیشن پہ لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ مگر رات کو اس سڑک پہ بنے چند مشہور کلبوں میں زندگی کی ایک اور جھلک دیکھنے کو ملتی تھی۔

یہاں پہ زیادہ تر وہ لڑکیاں تھیں جو دن میں چھوٹی موٹی نوکریاں کرتی تھیں اور رات میں یا ویک اینڈ پہ اچھے ٹائم پاس کی غرض سے اور کچھ اضافی پیسے کمانے کی لالچ میں یہاں موجود ہوتی تھیں۔ وہی سنگل کمیونٹی کے لیے مشہور بھی ہے اور بدنام بھی۔ لڑکیاں اپنی معمولی سی تنخواہ سے اپنے خواب پورے کرنا تو دور کی بات وہ اس ہائی لائف دبئی کو چھونے کا سوچ بھی نہیں سکتیں، جو اس شہر کی سب سے بڑی کشش ہے۔ ایسے میں اگر کلب میں لڑکیوں کا داخلہ اور مفت ڈرنک کی آفر سے فائدہ اٹھایا جائے تو کیا برا ہے۔

اسے اس شہر میں رہتے دو سال ہو چکے تھے اور اس ہوٹل کو وہ دن میں دو بار دیکھتی تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اس عالیشان عمارت کو اندر سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی بلڈنگ باہر سے بھی قابل ستائش تھی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا یہ اندر سے اتنا عالیشان ہو گا۔ بلاشبہ یہ آرکیٹیکچر کا نادر نمونہ تھا۔ وہ عمارت جتنی شاندار



مکمل ناول



باہر سے نظر آتی تھی اس کا انٹیریئر اس سے زیادہ مبہوت کر دینے والا تھا۔ لابی میں اس وقت کافی لوگ تھے جو اسے سرسری نگاہ سے دیکھ کر آگے چلے گئے' کلب میں داخل ہوتے وقت اس کا دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا' اگر اس وقت وہ مجبور نہ ہوتی تو کبھی اس جگہ قدم نہ دھرتی۔ قیمتی ٹائل فلور پر دھیمے قدموں سے چلتی وہ اس ہوٹل سے ملحقہ کلب میں داخل ہو گئی تھی۔ اندر کا ماحول اس کی سوچ سے زیادہ آزاد تھا۔

اس کی نظریں لوگوں کے ہجوم میں سحرش کا تعاقب کر رہی تھیں اور پھر وہ اسے ڈانس فلور پہ نظر آگئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھی۔ گھٹنے سے اونچا رائل بلیو سلیولیس لباس اور چہرے پہ انتہائی ڈارک میک اپ کیے سحرش پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اس کی طرف آئی تھی۔

"یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ اب اگر کلب آ ہی رہی تھیں تو کچھ حالت بھی سنوار لیتیں۔" اسے لے کر کلب سے باہر جاتے ہوئے سحرش نے تمسخر سے کہا۔

سیاہ ٹاپ اور بلیک جینز میں سر پر اسکارف اوڑھے وہ اس ماحول میں پوری طرح مس فٹ تھی۔

"کیا خرابی ہے میرے حلیے میں سحرش؟" وہ اس کے مذاق اڑانے پہ کچھ شرمندہ ہو کر بولی تھی۔

سحرش اس کی کسی بھی بات کا جواب دیے بغیر تیز قدم اٹھاتی چلتی جا رہی تھی۔ اس کا رخ ریسٹ روم کی طرف تھا۔

"اب چونکہ کچھ وقت تمہیں یہاں میرے ساتھ گزارنا ہے تو پلیز یہ اسکارف اتار دو۔" اس کے سر سے اسکارف کھینچ کر اتارتے ہوئے اس نے کلپ میں جکڑے اس کے لمبے سیاہ بالوں کو کھول دیا تھا۔ اپنے پرس سے ایک لپ اسٹک نکال کر اس نے زبردستی اس گہری سرخ لپ اسٹک سے اس کے ہونٹوں کو رنگ دیا تھا۔

"میں نہیں کرتی میک اپ اور پلیز میرا اسکارف واپس کرو مجھے الجھن ہو رہی ہے۔" اس کی حرکتوں پہ اپ سیٹ ہوتی وہ اپنے بال باندھنے لگی تھی۔

"دیکھو اگر تمہیں میرے ساتھ یہاں کچھ دیر رہنا ہے تو اپنا حلیہ میرے مطابق کرنا ہو گا' اب تمہاری بدولت میں اپنے فرینڈز کے سامنے شرمندہ نہیں ہو سکتی۔" اس کے دو ٹوک لہجے پہ لب کاٹتے اس نے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا۔

"جمی کب تک آئے گا؟" وہ واپس کلب کی طرف جاتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"بس آتا ہی ہو گا' ابھی اتنا وقت نہیں ہوا۔" سحرش نے لاپروائی سے کہا۔

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ اسے ایک بار اسٹول پہ بیٹھنے کا کہہ کر دوبارہ ڈانس فلور پہ چلی گئی تھی۔

بے دلی سے وہ کلب میں بیٹھی ہوئی تھی جہاں رات کے اس پہر میلے کا سماں تھا۔ تیز آواز میں کانوں کو چیرتا میوزک اور لوگوں کا ہجوم۔ اسے وہاں بہت گھٹن ہو رہی تھی۔ یہاں لیڈیز کی نہ صرف انٹری فری تھی' بلکہ اندر انہیں ڈرنک بھی مفت سرو کیا جاتا تھا اور مردوں کو کافی مہنگی ادائیگی کرنا پڑتی تھی' اس کی وجہ خالصتاً کاروباری تھی۔ لڑکیوں کے چکر میں زیادہ سے زیادہ مرد وہاں آتے تھے۔ وہ سہمی ہوئی الگ تھلگ سی بیٹھی تھی' جب ویٹر اس کے پاس ڈرنک لے کر آیا' لیکن اس نے انکار کر دیا تھا' وہ کندھے اچکا کر حیرت سے وہاں سے چلا گیا۔ وہاں اکثر لڑکیاں اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ تھیں۔ جو سنگل تھیں وہ اپنا پارٹنر تلاش کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ خاموشی سے اس انجان ماحول میں بیٹھی تھی۔ اسے یہ سب دیکھ کر وحشت ہو رہی تھی وہ وہاں ان فٹ تھی۔ اس شور و غوغا سے اس کے اعصاب پہ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ بارہ بجے کے بعد میوزک کا موڈ بدل جاتا تھا۔

اب نان اسٹاپ میوزک شروع ہو چکا تھا۔ میوزک کا لہجہ بدلا تو لوگوں کا جوش و خروش بھی عروج پہ تھا۔ میوزک کے شور سے اس کا دماغ پھٹ رہا تھا۔ بہت دیر تک صبر سے وہ اس بے ہنگم اور بیہودہ شور کو برداشت کرتی رہی' لیکن جب اس کا ضبط ختم ہو گیا تو وہ وہاں سے اٹھ کر ایک بار پھر سحرش کے پاس آئی تھی۔

"میں اگر مزید کچھ دیر یہاں رہی تو پاگل ہو جاؤں گی۔" اس نے جلاتے ہوئے سحرش سے کہا۔

"میں چیک کرتی ہوں جمی اب تک کیوں نہیں آیا تم ایسا کرو اوپر روم میں چل کر بیٹھو تب تک میں جمی کا پتا کرتی ہوں۔" کلب سے نکل کر سحرش اسے ہوٹل روم کی طرف لے آئی تھی۔ ایک کمرے کے سامنے رک کر اس نے کارڈ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ کارڈ کو اس نے دیوار پہ لگے سوئچ میں پھنسایا تو کمرہ روشن ہو گیا۔

"تم یہاں آرام سے بیٹھو' میں ابھی آتی ہوں۔" سحرش اسے اس کمرے میں بٹھا کر واپس جا رہی تھی۔

"یہ کس کا کمرہ ہے سحرش؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ پائی تھی۔

"میری فرینڈ کا کمرہ ہے' آج ہی بنکاک سے آئی ہے چند دن گھومنے پھرنے' پچھلی بار آئی تھی تو ہماری اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ خود اس وقت نیچے کلب میں ہے' تم بے فکر ہو کر یہاں بیٹھو میں جمی کا پتا کرتی ہوں۔" اسے مطمئن کرنے کے بعد سحرش اپنے فون پہ کوئی نمبر ملاتی کمرے سے نکل گئی تھی۔

وہ خاموشی سے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے ایک اچٹتی نگاہ کمرے پر ڈالی۔ یہ کمرہ نہیں ایک سویٹ تھا۔ جہازی سائز جس میں قیمتی بیڈ اور میچنگ کاؤچ' قیمتی لیمپ سے چھلکتی دودھیا لائٹ' وہاں منی بار بھی تھا۔

اچانک لاک کھلنے کی آواز پہ اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ وہ بہت ہینڈسم اور خوش شکل تھا۔ اس کی عمر تیس اکتیس سال کے قریب تھی۔ گندمی رنگت اور پرکشش ذہین آنکھیں اس کی شخصیت کو اور بھی متاثر کن بنا رہی تھیں۔ اس کی شخصیت اتنی پرکشش تھی کہ اسے دیکھ کر کوئی بھی عشق میں گرفتار ہو سکتا تھا' لیکن وہ اسے دیکھ کر بری طرح ڈر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہوٹل لابی سے پارکنگ ہال تک آتے شاید صدیاں بیت گئی تھیں۔ قدم بوجھل تھے یا وقت تھم گیا تھا' یہ راز وہ جان نہیں پایا تھا۔

آج کا پورا دن خوشگوار گزرا تھا اس لیے وہ بہترین موڈ میں تھا۔ صبح گیارہ بجے وہ لاہور آیا تھا اور پھر اس نے اپنی زندگی کی بہترین شاپنگ کی تھی اور آج ہی اس نے اپنے بزنس کی سب سے بڑی ڈیل سائن کی تھی۔

سردیوں کی پہلی بارش کے بعد اس کا موڈ اور بھی اچھا ہو گیا تھا۔ ویسے بھی کچھ عرصے سے موسموں کا تغیر اس کے دل پہ اثر انداز ہونے لگا تھا۔ اپنے امریکی دوست کو ساتھ لے کر وہ اس مقامی فائیو اسٹار ہوٹل میں آیا تھا اور اب وہ دونوں ڈنر کے بعد بہت ہی اچھے موڈ میں ہوٹل سے باہر نکل رہے تھے کہ سامنے کے منظر نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔

"نہیں۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" اس نے خود کلامی کی۔

جانسن اس کی بات نہیں سمجھا تھا۔ اس نے چونک کر اپنے ساتھ کھڑے سفید فام کو دیکھا۔

"مجھے لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے وقار!" اس کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر کوئی بھی سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس وقت اپ سیٹ ہے۔

"آئی تھنک سو۔ صبح ملوں گا۔" رچرڈ جانسن کا قیام اسی ہوٹل میں تھا' اس لیے اسے لابی سے رخصت کر کے وہ اب پارکنگ کی طرف جا رہا تھا جہاں اس کا ڈرائیور انتظار کر رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر ایک بار پھر ابھر آیا تھا۔ ڈنر ٹائم کی وجہ سے ہوٹل میں معمول کا رش تھا۔ وہ اوپر والی منزل پہ بنے ریسٹورنٹ سے نکلا تھا اس لیے شاید وہ اسے پہلے نہیں دیکھ پایا تھا' یا پھر وہ ابھی کچھ دیر پہلے وہاں آئی تھی۔ اس کی تیاری ہمیشہ متاثر کن ہوتی تھی لیکن وہ آج غیر معمولی حسین لگ رہی تھی۔ یوں تو اس پہ ہر رنگ جچتا تھا لیکن اس سفید لباس میں وہ کسی دیومالائی داستان کا حصہ لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دمکتے جگنو دیکھ کر اسے اپنا دل ہاتھوں سے پھسلتا معلوم ہوتا تھا۔ وہ جب بھی اس سے ملتا اس کے

چہرے سے نظریں نہیں ہٹا پاتا تھا اور شاید آج بھی اس کے سامنے بیٹھا اکرم مسعود اس سے آنکھیں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ اس کا نازک ہاتھ تھامے وہ اسے ایک انگوٹھی پہنا رہا تھا اور وہ جانتا تھا اس میں جڑے پتھر ہیرے ہیں۔ ایسی ہی ایک ہیروں جڑی انگوٹھی وقار نے بھی اس کے لیے خریدی تھی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے سیاہ ڈنر سوٹ کی دائیں جیب میں گیا تھا جس میں اس وقت بھی وہ قسمت کی ڈبیا رکھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں ایک خوشی کی خبر سنانی تھی بیٹا!" صابہ بہت خوش نظر آرہی تھیں۔

"جلدی بتائیں امی! مجھ سے انتظار نہیں ہو رہا ہے۔"

"آمنہ کا نام ایم بی اے کی میرٹ لسٹ میں آگیا ہے۔"

"کیا امی؟" وہ بے اختیار چیخی تو اس کی روم میٹ نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ اسے معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھتی وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

"اگلے ہفتے داخلہ فیس جمع کروانی ہے۔ تم تو جانتی ہو نا روشنی تمہاری بہن کو اس یونیورسٹی میں داخلے کی کتنی خواہش تھی۔ اپنا نام میرٹ لسٹ میں دیکھ کر تو اس کے پاؤں زمین پہ نہیں ٹک رہے ہیں۔"

"ہاں امی! اس نے محنت بھی تو بہت کی تھی اور پھر اسے پڑھائی کا شوق بھی ہے۔ آپ بس جلدی سے اس کا داخلہ یونیورسٹی میں کروا دیں۔" وہ آمنہ کی کامیابی پہ بہت خوش تھی۔

اس کے ابو کی کتنی خواہش تھی کہ ان کی دونوں بیٹیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کریں لیکن ان کی طویل بیماری اور پھر وفات کے بعد گھر کا سارا بوجھ کم عمری میں ہی اس کے کندھوں پہ آگیا تھا۔ صابہ خود محض آٹھویں پاس تھیں اور زندگی میں پہلا وقت آنے پر وہ اپنی بیٹیوں کے لیے کچھ نہیں کرپائی تھیں سو وہ خود کو بہت بے بس محسوس کرتی تھیں۔ ان کے خاوند ایک معمولی تنخواہ دار ملازم تھے۔ ان کی وفات کے وقت روشنی ایف اے کر رہی تھی۔ وہ پڑھائی میں بہت اچھی نہیں تھی لیکن آگے پڑھنے کی خواہش رکھتی تھی۔ گھر کے حالات کی وجہ سے وہ بی اے میں داخلہ نہیں لے سکی تھی کیونکہ اسے اپنی چھوٹی بہن اور بیوہ ماں کی ذمہ داری سنبھالنی تھی۔ اس کے والد کے ایک پرانے دوست کی وجہ سے اسے ایک پرائیوٹ کمپنی میں ٹیلیفون آپریٹر کی ملازمت مل گئی تھی۔ اگر انوار انکل کا حوالہ نہ ہوتا تو اسے یہ نوکری بھی نہ مل پاتی کیونکہ اس معمولی سی جاب کے لیے بھی اس سے زیادہ تعلیمی قابلیت رکھنے والے امیدواروں کی بھی لائن لگی تھی۔ دو سال بعد اس کی تنخواہ آٹھ سے دس ہزار ہوگئی تھی۔ جو ان کی زندگی میں کوئی بڑا بدلاؤ نہیں لائی تھی مگر وہ مطمئن تھی کیونکہ اس کے گھر والے عزت کی زندگی گزار رہے تھے اور انہیں اپنے نام نہاد رشتے داروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑتا تھا۔ روکھی سوکھی کھا کر اور موٹا جھوٹا پہن کر بھی وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتی تھی۔

آمنہ انٹر کر چکی تھی جب روشنی کو کسی نے دبئی میں کنٹریکٹ پہ ہونے والی بھرتیوں کا بتایا۔ اس کمپنی کو ایک بہت بڑے گروپ کے دبئی میں واقع سپر اسٹورز کے لیے سیلز گرل اور سیلز بوائے چاہیے تھے۔ اسی طرز کے اسٹور اس کمپنی نے پاکستان میں بھی بنائے تھے۔ روشنی کو اس ملازمت میں دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔ پچھلے دو سال میں اس کی شخصیت میں بہت اعتماد آچکا تھا۔ مہینے کے دس ہزار روپے کوئی اتنی بڑی رقم نہیں تھی جس پہ تین لوگ اپنی تمام عمر کی پلاننگ کر لیتے اور پھر وہ نہیں چاہتی تھی کہ آمنہ اس کی طرح اپنی پڑھائی مکمل نہ کرپائی۔ اس نے اس ملازمت سے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل کرلی تھیں۔ سلمانہ تنخواہ کے ساتھ رہائش اور ٹرانسپورٹ بھی شامل تھی اور یہ ایک پرکشش پیکج تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے یہ ملازمت مل گئی تھی۔ دو سال کے کنٹریکٹ پہ دو ہزار درہم ماہانہ تنخواہ اس کی زندگی کے

کتنے مسائل حل کر سکتی تھی۔ ورنہ میڈیکل اور بتایا۔
ٹریننگ کے ساتھ اگر وہ چاہتی تو یہ دو سال کا کنٹریکٹ
ری نیو ہو سکتا تھا۔

صابرہ نے اسے منع کیا تھا' وہ اسے پردیس نہیں بھیجنا چاہتی تھیں' لیکن اس نے انہیں سمجھایا کہ دبئی کچھ معاملات میں لاہور سے زیادہ محفوظ شہر ہے۔

"تم وہاں اکیلی کیسے رہو گی؟"

"میں اکیلی تھوڑی ہوں گی امی! میرے ساتھ اور بھی بہت سی لڑکیاں ہوں گی۔"

"لیکن روشنی...!"

"آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا ہو گا امی!" اور بادل نخواستہ صابرہ نے اسے دبئی جانے کی اجازت دے دی تھی۔

وہ دبئی آ گئی تھی۔ دو سال سے وہ ان کے لیے مشقت کر رہی تھی۔ آئمہ کنیئرڈ کالج سے بی اے کر چکی تھی اور اب ایم بی اے کرنے لگی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک ذہین اسٹوڈنٹ تھی۔ اس کے ہاتھ سے لگا ننھا سا پودا ایک مضبوط درخت بننے والا تھا۔ کچھ عرصے میں وہ پھل دینے لگے گا۔ بس دو سال اور۔ پھر آئمہ کا ایم بی اے ہو جائے گا تو وہ پاکستان واپس چلی جائے گی۔ آئمہ کو تو پاکستان میں بھی بہت اچھی نوکری مل سکتی تھی اور ان دو سالوں میں اس کی امی نے بھی خوب بچت کر لی ہو گی۔ وہ تو دس ہزار میں بھی گھر بہت اچھے سے چلایا کرتی تھیں۔ اس وقت وہ تین لوگ تھے اور اب تو وہ ہر ماہ انہیں چالیس ہزار بھیجتی تھی۔ صابرہ سے باتیں کرتے وہ آنے والے اچھے وقت کے خواب دیکھنے لگی تھی۔

"روشنی! آئمہ کے داخلہ کے لیے پچاس ہزار روپے بھیج دو بیٹا!" صابرہ کی آواز سن کر وہ اپنے خواب سے باہر آئی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں امی آپ؟" اسے لگا اس نے کچھ غلط سنا ہے۔

"کیا ہو گیا ہے روشنی! ابھی بتایا تو ہے تمہیں" آئمہ کی داخلہ فیس اگلے ہفتے جمع کروانی ہے' پھر اگلی فیس وہ کہہ رہی تھی چھ ماہ بعد جائے گی۔" صابرہ نے تفصیلاً

"امی میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ میں تو اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ آپ کو بھیج دیتی ہوں۔ میرے پاس جتنے پیسے ہوتے ہیں ان میں پورا مہینہ کس مصیبت سے گزرتا ہے' وہ میں جانتی ہوں۔"

"تمہارا وہاں خرچا ہی کتنا ہوتا ہے روشنی! رہائش' ٹرانسپورٹ سب تو مفت میں ملتا ہے تمہیں۔" صابرہ نے منہ بنایا۔

"دبئی بہت مہنگا شہر ہے امی! پانی بھی پیسوں سے خرید کے پینا پڑتا ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولی' لیکن اس نے انہیں اس رہائش کا نہیں بتایا جو آٹھ بائے دس فٹ کا ایک کمرہ تھی اور جسے وہ پانچ لڑکیوں کے ساتھ شیئر کرتی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے روشنی! ہم تمہارے بھیجے ہوئے پیسوں سے عیش کر رہے ہیں۔ اس مہنگائی کے دور میں چالیس ہزار کی اوقات ہی کیا ہے۔ گھر کا کرایہ' آئمہ کے اور میرے اخراجات کے بعد اگر کوئی مہمان آ جائے تو ہزار پانچ سو تو ایسے ہی نکل جاتا ہے۔" وہ دس ہزار ماہانہ ملنے پہ دن میں دس بار شکر ادا کرنے والی اپنی ماں کے منہ سے یہ الفاظ سن کر حیران رہ گئی تھی۔

"کون مہمان امی؟" اسے مہمانوں کے نام پہ بھی شاک لگا تھا۔

"کیا ہم لاوارث ہیں؟ تمہارے ابا کے اور میرے کتنے رشتے دار ہیں۔ باہر جا کر اپنوں کو بھول گئی ہو۔"

"امی! آپ ان رشتے داروں کی بات کر رہی ہیں جو ابا کی موت کے بعد اس لیے ہمارے گھر نہیں آتے تھے کہ کہیں ہم ان سے کوئی مدد نہ مانگ لیں۔"

"تم پیسے بھیج رہی ہو یا نہیں؟ اس فون کا بھی بل آتا ہے جو تمہارے بھیجے چالیس ہزار میں سے ہی ادا کرنا ہوتا ہے۔" صابرہ نے طنز سے کہا۔

"امی! میرے پاس اس وقت فقط اتنے پیسے ہیں کہ میں مہینے کے باقی دس دن دو ٹائم کھانا کھا سکوں۔ میں نے آج تک اپنی ضرورت کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا ہے اور یہاں سب میری طرح محنت

مزدوری کر کے تھوڑی سی تنخواہ میں گزارہ کرتے ہیں۔ ایسے میں کسی سے ادھار مانگ کر میں نہ خود شرمندہ ہو سکتی ہوں اور نہ انہیں شرمندہ کر سکتی ہوں۔" دھیمے اور دھیمے لہجے میں اس نے بات ختم کی اور فون بند کر دیا تھا۔ اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اس نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے اور کمرے میں آ گئی۔ اندر اس وقت پانچ غیر ملکی لڑکیاں تھیں، جن کے اپنے مسائل تھے۔ ان کے سامنے کیا آنسو بہاتی۔

موبائل فون ہاتھوں میں تھامے وہ پچھلے دو گھنٹے سے گم صم بیٹھی تھی۔ ذہن دو سال پرانی گلیوں میں بھٹک رہا تھا جب وہ پہلی بار دبئی آئی تھی۔ بظاہر بہت خود اعتماد اور بہادر دکھائی دینے والی روشنی نے جب پردیس میں پہلا قدم رکھا تو اس کا دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ صابرہ کو دیے جانے والے سارے دلاسے وہ اس وقت بھول گئی تھی۔ وسوسے اور خوف کا سانپ پھن اٹھائے اسے ڈرا رہا تھا۔ لیکن اس کا اللہ پہ یقین اس سب پہ حاوی ہو گیا تھا۔ اس نے مستحکم قدم اپنی ماں اور بہن کی بہتر زندگی کے لیے اٹھایا تھا۔

ایئرپورٹ سے کمپنی کی بس اسے اور چند دوسرے ملازمین کو لے کر ایک گنجان علاقے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ زیادہ تعداد مردوں کی تھی اور ان کے حلیے اور گفتگو کے انداز سے اس نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ سب مزدور طبقہ تھا۔ سڑک کے دونوں طرف اونچی عالیشان اسکائی اسکریپر عمارتیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ یہ دیرہ کا علاقہ تھا۔ بس اب اندرونی سڑک سے ہوتی ہوئی ایک بلڈنگ کے سامنے رک گئی تھی۔ دوسری عمارات کے برعکس یہ ایک پرانی تین منزلہ عمارت تھی۔ اس بلڈنگ کی تیسری منزل پہ واقع ایک چھوٹے فلیٹ میں اس کا قیام تھا جس میں ایک بیڈ روم اور ایک ہال تھا۔ کچن اور لانڈری کا انتظام بھی تھا۔ کمرے میں جابجا کھونٹیوں پہ زنانہ کپڑے لٹکے تھے اور بنک بیڈ رکھنے کے بعد وہاں چلنے پھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اس ایک کمرے میں مزید پانچ لڑکیاں رہتی تھیں اور باہر ہال میں بھی چھ لڑکیوں کا قیام تھا۔ اسے بعد میں پتا چلا کہ اس قسم کی رہائش کو یہاں بیڈ اسپیس کہتے ہیں۔ اس کے کمرے میں ایک انڈین، دو فلپائنی اور دو چینی نژاد لڑکیاں رہتی تھیں۔ اس بلڈنگ اور اس سے ملحقہ قومیتوں اور رنگ و نسل کے لوگوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ اس کے برعکس وہ سب لڑکیاں بہت بولڈ اور پراعتماد تھیں۔

وہ سب یہاں اس سے پہلے سے رہ رہی تھیں اور ان کے پاس اپنے ملکوں سے زیادہ دبئی کی معلومات تھیں۔ شروع شروع میں اسے ان کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں کچھ پریشانی ہوئی اور ان کے رویوں سے وہ الجھن محسوس کرتی تھی لیکن آہستہ آہستہ اس نے خود کو وہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ اس نے ان کے طور طریقوں اور بول چال پہ بھی اختلاف اور ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا اور یہی ایک واحد طریقہ تھا جو کسی بھی نئی کلچر سوسائٹی میں ضم ہونے کی پہلی اور آخری کنجی ہے۔ وہ کام میں بے تحاشا مصروف ہو گئی تھی۔ ہفتے میں ایک چھٹی ملتی اور وہ دن اس کا لانڈری اور اگلے ہفتے کی تیاری میں گزر جاتا۔ اسی دن وہ تھوڑا بہت کھانا بھی بنا لیتی تھی۔ اس کی روم میٹس زیادہ تر فن فوڈ پہ انحصار کرتی تھیں جو اکثر سی فوڈ ہوتا تھا اور اسے اس کھانے سے گھن آتی تھی۔ انڈین لڑکیاں کیرالہ کی تھیں اور انہوں نے بیسن لگوایا ہوا تھا۔ یہاں آ کر اس نے سب سے پہلے اپنے لیے ایک موبائل فون خریدا تھا۔ یہ عیاشی نہیں ضرورت تھی اور اس کی یہ ضرورت صرف دو سو درہم میں پوری ہو گئی تھی۔ اگلے چند ماہ اس نے کم آدھی تنخواہ بھجوائی تھی کیونکہ تو بچے پیسوں سے اس کو وہ رقم واپس کرنی تھی جو ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنی سہیلی کے والد سے قرض لی تھی۔

یہاں اسے سپرمارکیٹ کے عملے کی طرح سیاہ پینٹ اور سفید شرٹ پہننی تھی، چند لڑکیاں اسکرٹ بھی پہنتی تھیں، لیکن وہ تو خود کو پینٹ میں بھی بے آرام محسوس کرتی تھی کیونکہ اس سے پہلے وہ کبھی چادر کے بغیر گھر سے نہیں نکلی تھی۔ اسکارف اوڑھ کر وہ چادر کی

کمی کو پورا کر لیتی تھی۔ پچھلے دو سالوں میں روپے کی گھٹتی قدر نے پاکستان بھیجے والے روپوں میں اضافہ کر دیا تھا لیکن دبئی جیسے مہنگے شہر میں روزمرہ اخراجات کے لیے اسے تھوڑی بہت رقم کی ضرورت تھی۔ اس کی ڈیوٹی بہت سخت اور شفٹوں میں ہوا کرتی تھی۔ یہاں کا موسم شدید تھا اور سال بھر گرمی ہی رہتی تھی۔ اس شہر کی ہائی لائف دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ دکانوں پہ بجی مہنگی برانڈڈ اشیا اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ اس کے ساتھ رہنے والی لڑکیاں بھی ہر ماہ کے آغاز میں اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ اپنی فیملیز کو بھیج دیتی تھیں۔ لنڈا اپنے دو بچے اپنی ماں کے پاس فلپائن چھوڑ کر آئی ہوئی تھی۔ جینی کا شوہر فلپائن سے دبئی آنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ جوہی کو اپنے جہیز کے لیے دس لاکھ روپے چاہیے تھے ورنہ اس کی منگنی ختم ہو جاتی اور باقی کی لڑکیاں بھی ایسی ہی کسی نہ کسی مجبوری میں وہاں رہتی تھیں۔ ان کی باتیں سن کر اسے اندازہ ہوتا تھا کہ اپنے لائف اسٹائل کو بہتر بنانے کے لیے وہ کسی حد تک بھی جاسکتی تھیں۔ اس کی طرح ان کے پاس بھی بہت معمولی رقم ہی بچتی تھی لیکن پھر بھی ان کا رہن سہن روشنی سے بہت بہتر تھا۔ جتنے پیسوں میں روشنی مہینے کی گروسری کر کے اپنے کھانے کا انتظام کرتی تھی، اتنے پیسے تو لنڈا ایک دن میں بیوٹی پارلر میں اڑا آتی تھی۔

میٹرو کے پانچ درہم بچانے کے لیے کبھی کبھی وہ پیدل چلتی تھی ایسے میں اس کے سستے جوتوں سے اس کے پاؤں میں چھالے بن جاتے تھے۔ دو ماہ پہلے اس نے صابرہ اور آئمہ کو بہت سے تحائف بھیجے تھے جو اس نے یہاں کی سستی دکانوں سے خریدے تھے۔ اس کی ایک ملنے والی پاکستان جارہی تھی اسی لیے اس نے ایک ماہ اوور ٹائم کر کے اس کے ہاتھ اپنی ماں اور بہن کے لیے وہ سارا سامان بھجوایا تھا اور ایک ماہ تک وہ بغیر کسی چھٹی کے کام کرتی رہی تھی۔ اس نے پچھلے دو سال میں کبھی کسی اچھے ریسٹورنٹ سے کھانا نہیں کھایا تھا جبکہ اس کے ساتھ کام کرنے والی اکثر لڑکیاں ویک

اینڈ پہ خوب انجوائے کرتی تھیں اور ان میں صرف فلپائنی اور چائنیز نہیں پاکستانی اور انڈین بھی شامل تھیں۔ شروع شروع میں اسے حیرت ہوئی لیکن جلد ہی وہ اس کی وجہ بھی جان گئی تھی۔ کئی بار اس نے لنڈا اور جینی کو مختلف لڑکوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ ویک اینڈ پہ اگر ان کی ڈیوٹی نہ ہوتی تو وہ پوری رات کمرے میں واپس نہیں آتی تھیں۔ اس دن وہ صبح چھ بجے اپنی ڈیوٹی ختم کر کے واپس آرہی تھی جب اس نے لنڈا کو لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کا لباس دیکھ کر اس کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔

یہاں آکر اس نے دنیا کا جو روپ دیکھا اور جن مسائل کا وہ شکار رہی ان سب کا ذکر اس نے صابرہ سے نہیں کیا تھا۔ وہ انہیں تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے تو انہیں یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ اسے کھٹملوں کے کاٹنے سے ایک بار کتنی بری الرجی ہو گئی تھی اور بخار میں بھی وہ کبھی چھٹی نہیں کر سکی تھی۔ اس کے لیے یہ اتنے بڑے مسائل نہیں تھے۔ اس نے بہت کم عمری سے محنت کرنا شروع کی تھی اور جلد ہی اس تلف روٹین کی عادی ہو گئی تھی۔ فون کی بیل بہت دیر سے بج رہی تھی۔ اس نے اسکرین پہ نظر دوڑائی تو پاکستان کا نمبر دیکھ کر جلدی سے فون ریسیو کیا۔ شاید امی کو اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا تھا اس لیے وہ اسے دوبارہ کال کر رہی تھیں۔ ہتھیلی سے آنکھوں کی نمی صاف کرتے اس نے سوچا اور کال ریسیو کی۔

"ہیلو آپی!" دوسری طرف آئمہ تھی۔

"ہاں آئمہ! کیسی ہو؟" اس نے اپنی چھوٹی بہن کی آواز سن کر محبت سے کہا۔

"اگر تم نے اگلے ہفتے تک میرے ایڈمیشن کے پیسے نہیں بھجوائے تو میں قسم کھا کر کہتی ہوں میں خود کشی کرلوں گی۔" وہ چیختے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تم ہوش میں تو ہو آئمہ؟" وہ آئمہ کی بات سن کر بے تحاشا پریشان ہو گئی تھی۔

"میں اس وقت پورے ہوش و حواس میں ہوں۔"

جانتی ہوں کتنے احسان کیے ہیں تم نے مجھ پر لیکن اس وقت تم میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نہیں کھینچ سکتیں آپی۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے میں نے اس یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے دن رات ایک کیا ہے اور اب جب میرا خواب پورا ہونے کا وقت آیا ہے تو تم خود کو مکھن میں سے بال کی طرح نہیں نکال سکتی ہو۔ اگر تم نے یہی سب کرنا تھا تو پھر چند سال پہلے ہی کر لیتیں۔ اس وقت لوگوں کو اپنا بڑا پن دکھا کر عظمت کا میڈل گلے میں سجا لیا اور آج جب میرے مستقبل کی سمت کا تعین ہونے لگا ہے تو تم نے ہاتھ اٹھا لیے ہیں۔" آئمہ کی باتیں اس کے دل میں نشتر کی طرح لگی تھیں۔

"لیکن آئمہ! میرے پاس اس وقت اتنے پیسے نہیں ہیں۔ میں تو..." آئمہ نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

"میں یہ سب نہیں جانتی۔ مجھے اتنا پتا ہے اگر میری فیس ادا نہ ہوئی تو میرا سال ضائع ہو جائے گا اور میں یہ برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ اس ذلت اور رسوائی سے اچھا ہے میں اپنی جان دے دوں۔" اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر آئمہ نے کال ڈسکنیکٹ کر دی تھی۔

اس نے شکست خوردگی سے فون اپنے سائیڈ پہ رکھا۔ آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگ چکا تھا۔ کمرے میں اب کوئی نہیں تھا اس لیے وہ دل بھر کر رو سکتی تھی لیکن اچانک باتھ روم کا دروازہ کھلا اور جینی باہر نکلی۔ اس نے سرخ رنگ کا انتہائی مختصر سلیولیس لباس پہن رکھا تھا۔ اسے یاد آیا آج ویک اینڈ نائٹ ہے۔ شاید وہ کلب جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

٭ ٭ ٭

"دیکھنا کیسے انتظام ہوتا ہے اب پیسوں کا۔" فون رکھ کر آئمہ نے فاتحانہ نظروں سے صابرہ کی طرف دیکھا۔

"آپی کے پاس سب پیسے ہوتے ہیں امی آپ کو کیا لگتا ہے وہ اتنی اچھی ہیں کہ ساری تنخواہیں بھجوا کر اتنے سالوں سے خالی ہاتھ بیٹھی ہیں۔ آپ کو یاد نہیں، جب ایک دفعہ پہلے ان کی کوئی ملنے والی پاکستان چھٹیوں پہ آئی تھی تو کتنا سامان بھجوایا تھا انہوں نے اس کے پیسے کہاں سے آئے تھے۔"

"میں بھی تو یہی حیران ہوں۔ آخر دو سال میں اس نے کیا اتنی تھوڑی بچت بھی نہ کی ہو گی کہ بہن کے داخلے کے لیے چالیس پچاس ہزار ہی بھجوا دے۔" صابرہ نے منہ بنایا۔

"آپ کو تو بات کرنا ہی نہیں آتی، دیکھنا اب دباؤ ڈالا ہے تو کیسے پیسے بھجوائیں گی۔" آئمہ نے فریج سے ڈبہ نکال کر جوس گلاس میں انڈیلا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ چند سال پہلے ان کے گھر کے حالات مختلف تھے، لیکن اب حالات بدل چکے تھے اور ان کے مزاج بھی۔

٭ ٭ ٭

کل رات سے وہ اپنے کمرے میں بند تھا، پچھلے کئی گھنٹوں میں اس نے بے تحاشا سگریٹ پھونک ڈالی تھی۔ سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے جا بجا کارپٹ پہ بکھرے ہوئے تھے۔ نیند سے اس کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ وہ سونا چاہتا تھا لیکن اس وقت صرف خود کو اذیت دے رہا تھا۔ یادیں کسی فلم کی ریل کی طرح ذہن کے پردے پہ چلتی جا رہی تھیں۔ وہ شاید اس دن بی بی سی کی بلڈنگ سے نکل رہا تھا جب اس نے پہلی بار اس کو دیکھا تھا۔

"ٹرسٹ می روبی! میں نے اس سے پہلے اتنا شاندار لائیو کانسرٹ نہیں دیکھا۔" زندگی سے بھرپور شوخ اور چنچل آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں تو خود عاطف کو فل فارم میں دیکھ کر حیران رہ گئی ہوں۔" دوسری لڑکی نے تبصرہ کیا۔

وہ دونوں شاید کوئی کانسرٹ دیکھ کر باہر نکلی تھیں۔ اس نے گھڑی کو دیکھا جہاں اس وقت بارہ بج رہے تھے۔

"عاطف کو اتنے قریب سے دیکھنا میرا کتنا بڑا خواب

تھا۔ مجھے تو اب تک یقین نہیں آرہا ہے۔"

اس بار اس نے ذرا غور سے ان دونوں کو دیکھا۔ سفید لباس میں وہ کسی ویلز فس کی طرح حسین لگ رہی تھی۔ اس کے خوب صورت کھلے بال اس کی شخصیت کو اور بھی دلکش بنارہے تھے۔ اس کی مغرور ناک اور کاجل سے بھری آنکھیں دیکھ کر وہ نظر ہٹانا بھول گیا تھا۔

"ڈرائیور کہاں رہ گیا ہے؟" اس کے انداز میں بیزاری تھی۔

"میں کال کرکے پتا کرتی ہوں۔" دوسری لڑکی جس کا نام ربابی تھا وہ اب اپنے موبائل سے کال ملا رہی تھی۔

"ہیلو بشیر! تم آئے نہیں اب تک ہم کب سے تمہارا انتظار کررہے ہیں۔"

"اچھا۔ کتنا وقت لگے گا۔"

"اوہو اس وقت تو کوئی ٹیکسی بھی نہیں ملے گی۔"

"چلو ہم یہیں انتظار کرتے ہیں تم جلدی آؤ۔"

"کیا ہوا؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔

"وہ کہہ رہا ہے گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا ہے اور اس کے پاس جیک نہیں ہے۔ گھر جارہا تھا کسی سے لفٹ لے کر۔ آنے میں شاید گھنٹہ لگ جائے۔" اس کے چہرے پہ پریشانی تھی۔

"کیا میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں؟" ان کی گفتگو سن کر وہ آگے بڑھا تھا۔ مغرور ناک والی نے ناک سکوڑ کر اسے دیکھا۔

"معاف کیجئے گا میں آپ کی گفتگو سن چکا ہوں اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو ڈراپ کردیتا ہوں۔" اس نے خوش اخلاقی سے آفر کی۔

"یقین جانیے میں ایک شریف آدمی ہوں اور ابھی ایک بزنس ڈنر سے فارغ ہوا ہوں۔ یہ میرا کارڈ ہے۔" اس نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"وقار حسن!" ربابی نے با آواز بلند پڑھا۔ وہ ظالم حسینہ ابھی تک خاموش تھی۔

"اگر آپ کوئی فیصلہ نہیں کرپارہی ہیں تو میں چلتا ہوں۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے قدم آگے بڑھایا۔

"ہمیں شادمان جانا ہے۔" ربابی کی آواز پہ اس نے رک کر انہیں دیکھا۔ دوسری لڑکی اسے گھور رہی تھی۔

ربابی نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور ساتھ ہولی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس سنگ مرمر کے صنم کو دیکھا جو ناراض ناراض سی ربابی کے ساتھ چل پڑی تھی۔ اپنی سیاہ مرسڈیز میں اس نے انہیں بحفاظت شادمان کی ایک کوٹھی کے باہر اتارا تھا۔ ربابی نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور پھر وہ دونوں اس گھر میں داخل ہوگئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اگلی بار ان سے اس کی ملاقات جیل روڈ کے سیکنڈ وننگ میں ہوئی تھی' جہاں وہ دونوں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ ارد گرد سے بے نیاز وہ اس وقت برگر انجوائے کررہی تھیں۔

"ہیلو گرلز!" خوش اخلاقی سے کہتا ان کی ٹیبل کے پاس کھڑا تھا۔ ان دونوں نے ہی اسے چونک کے دیکھا اور پھر ربابی کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی۔ البتہ اس کے چہرے پہ آج بھی نولفٹ کا بورڈ لگا تھا۔

"آپ ہمیشہ اتنے غصے میں ہوتی ہیں یا مجھے دیکھ کر ایسی کیفیت بیدار ہوجاتی ہے۔" ربابی کی آفر پہ وہ اب ان کے ساتھ ہی ٹیبل پہ بیٹھ چکا تھا۔

"میں اجنبیوں سے بے تکلف نہیں ہوتی۔" اس نے ٹکا سا جواب دیا تھا۔

"اجنبی پہلی ملاقات میں ہوتے ہیں اور ہم پہلے بھی مل چکے ہیں' لگتا ہے آپ کی یادداشت بہت بری ہے مس۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مسٹر وقار حسن! آپ کی مدد کے لیے ربابی اس دن آپ کا شکریہ ادا کرچکی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن مدد تو میں نے آپ کی بھی کی تھی۔" دوسری

طرف وصال کے تمام ریکارڈ ٹوٹ چکے تھے۔

"تو آپ چاہتے ہیں اس احسان کے لیے میں تا عمر آپ کی ممنون رہوں اور جہاں بھی آپ کو دیکھوں۔ کورنش بجا لاؤں۔" وہ بگڑے ہوئے تیوروں سے بولی۔

اتنی حسین آواز اور اتنا روڈ انداز۔ وہ بھی اپنی قسم کا ایک ہی تھا۔ اس بار سامنے شکست کے آثار نمایاں تھے۔ سب لڑکیوں کی طرح تعریف، بہرحال اس کی بھی کمزوری تھی۔

دن گزر رہے تھے اور ان دونوں کے درمیان فاصلے کم ہو رہے تھے۔ آنے والے دنوں میں ان کی ملاقاتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"وائٹ کلر تم پہ بہت اچھا لگتا ہے۔" کاٹن نیٹ کے سفید لباس میں اسے دیکھ کر اس نے سراہا۔ "تم سے ملنا میری زندگی کا سب سے حسین اتفاق ہے۔ ان چند دنوں میں تمہیں بہت چاہنے لگا ہوں۔" اور گردوپیش سے بے نیازی لیے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا۔ "میں نے کبھی نہیں سوچا تھا میں زندگی میں کسی لڑکی سے ایسی جذباتی باتیں کروں گا لیکن میں خود پہ اپنا اختیار کھونے لگا ہوں۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے، تمہیں جانا ہے دل میرے بس میں نہیں رہا۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا۔

"سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا وقار کہ کوئی اتنی آسانی سے مجھے فتح کر لے گا۔" وہ ادا سے مسکرائی تھی۔

وہ بلا کی پراعتماد تھی۔ ذہین اور دلکش ------ وہ دل بہ جان سے اس پر فدا تھا۔

اس دن لانگ ڈرائیو پہ اس کا چاندی رنگ کا ہاتھ تھامے وہ بہت خوش تھا۔ "شادی کرو گی مجھ سے؟"

"ہمیں ملے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ابھی تو ٹھیک سے ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں ہیں اور تم شادی تک پہنچ گئے ہو۔" اس نے بے نیازی سے ناک سکیڑی۔ اس کی عادت پہ وہ اور بھی وارفتہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"خیر اب اتنا تھوڑا وقت بھی نہیں ہوا ہمیں ملتے مجھے تو لگتا ہے، میں تمہیں برسوں سے جانتا ہوں۔ اب تو دل کرتا ہے جلدی سے تم میری زندگی میں آجاؤ۔ مجھ سے اب اور صبر نہیں ہوتا ہے۔"

"لیکن اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ ابھی میری اسٹڈیز مکمل نہیں ہوئی ہیں۔"

"تم شادی کے بعد بھی اپنی تعلیم مکمل کر سکتی ہو۔"

"لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی، ممی میری تعلیم کو لے کر بہت پوزیسو ہیں۔ شادی جیسی ذمہ داری اور پڑھائی میں اکٹھے مینج نہیں کر سکتی۔ ابھی تو میں لائف کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔" دھیرے سے اپنا ہاتھ نکال کر وہ صاف گوئی سے بولی تھی۔

"شادی نہ سہی منگنی تو کر سکتے ہیں۔" وقار نے تجویز دی۔

"اس کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اس کی سالگرہ پہ وقار نے اسے سیاہ شیفون کا قیمتی لباس تحفے میں دیا تھا۔ اس کی خواہش کے مطابق وہ ڈریس اس نے اس کے ساتھ ڈنر پہ آتے ہوئے پہنا تھا۔ سیاہ مخمل کی ڈبیہ میں بند ایک قیمتی بریسلٹ اس کو دیتے ہوئے اس نے محبت سے اپنے سامنے بیٹھے اس ساحرہ کو دیکھا جو بن پلائے مدہوش کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وقار کے دل میں اس کی محبت اور بھی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ محبت چیز ہی ایسی ہے یہ آکٹوپس کی طرح وجود کو جکڑ کر بے بس کر دیتی ہے پھر اس کے شکنجے سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔

"تم نے اپنی والدہ کو میرے بارے میں بتایا؟" وہ فون پر اس سے پوچھ رہا تھا۔

"ممی ابھی لندن گئی ہوئی ہیں۔ ان کی کزن کی بیٹی کی شادی ہے ایک مہینہ تو لگ ہی جائے گا۔ آئیں گی تو انہیں تمہارے بارے میں بتاؤں گی۔"

وہ آج کل بہت خوش رہنے لگا تھا اور اس کی خوشی

اس وقت دوبالا ہو گئی تھی جب اس نے وقار کو یہ بتایا کہ وہ اپنی والدہ سے اس کے بارے میں بات کر چکی ہے اور جلد ہی وہ دونوں منگنی کرلیں گے۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی ہے اور انہیں اس کی خوشی ہر حال میں عزیز ہے۔ اگلے چند دن میں اس کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی سارے دن ہی جاتا تھا۔

اس کا موبائل کافی دیر سے بج رہا تھا۔ عائشہ کی کال دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے کال اٹینڈ کی۔

"آپی کیسی ہیں آپ؟" وہ اس کی بڑی بہن تھیں جو شادی کے بعد کینیڈا میں مقیم تھیں۔ ان کی شادی ان کے ماموں کے بیٹے خرم سے ہوئی تھی۔ وقار اور عائشہ کے والدین کا چند سال پہلے ایک ٹریفک حادثے میں انتقال ہو چکا تھا۔ وہ وقار سے آٹھ سال بڑی تھیں وہ ہمیشہ سے ان سے بہت اٹیچ تھا۔ ان کے والد حسن منیر کا تعلق سینٹرل پنجاب کے ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ بہت تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ان کا خاندان بڑا قدامت پسند اور روایتی تھا۔ خاندانی اقدار اور حسب نسب کی آج بھی وہ مذہب کی طرح پیروی کرتے تھے۔ ان کی ذاتی کنسٹرکشن کمپنی تھی۔ وقار کی ابتدائی تعلیم کانونٹ کی تھی۔ وہ بیس سال کا تھا جب ان کے والدین کی وفات ہو گئی۔ ان دنوں وقار امریکہ میں تھا۔ حسن منیر کی وفات کے بعد وقار عائشہ کے اور بھی قریب آگیا تھا۔ اپنی تعلیم ختم کرکے چند سال پہلے وقار پاکستان آگیا تھا اور اب اپنے والد کی کنسٹرکشن کمپنی کو دوبارہ اسٹیبلش کر رہا تھا۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور عائشہ کی تو جیسے اس میں جان تھی۔ سال میں ایک بار وہ وقار سے ملنے ضرور آتی تھیں۔

"میں نے کنزیٰ سے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔" رسمی سلام دعا کے بعد وہ اسے زبیر ماموں کی بیٹی سے اس کا رشتہ طے ہونے کے متعلق بتا رہی تھیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپی! آپ نے مجھ سے پوچھا تک نہیں۔" وہ ان کی بات سن کے حیران رہ گیا تھا۔

"لیکن تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم میری پسند سے شادی کرنا چاہتے ہو۔" انہوں نے اسے چند ماہ پہلے کی بات کا حوالہ دیا۔ ویسے بھی زبیر ماموں سے اس رشتے کی بات ممی ڈیڈی کی زندگی میں ہی ہو گئی تھی۔ اور یہ تو ایک رسمی سی کارروائی ہے۔"

"پھر بھی آپ کو ایک بار مجھ سے تو پوچھنا چاہیے تھا یہ میری زندگی کا سوال ہے۔"

"ہم تو دو ماہ بعد تم دونوں کی شادی پلان کر رہے ہیں۔" وہ قدرے خائف تھیں۔ وقار نے کبھی ان کی بات کو رد نہیں کیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ ان سے اس لہجے میں بات کر رہا تھا۔ وہ اس کے رویے سے نالاں تھیں۔

"تو آپ ان کو منع کر دیں کیونکہ میں کنزیٰ سے شادی نہیں کر سکتا۔"

"لیکن کیوں؟ آخر کیا برائی ہے کنزیٰ میں؟"

"آپی! کوئی برائی نہیں ہے بلکہ وہ تو بہت اچھی اور سمجھ دار لڑکی ہے لیکن میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔"

"کیا تمہیں اس بات کی بھی پروا نہیں کہ تمہارے اس فیصلے سے میری زندگی پہ کیا اثر پڑے گا میرے سسرال میں میری کتنی آکورڈ پوزیشن ہو جائے گی اور پھر یہ ہمارے بڑوں کا فیصلہ ہے۔"

"آپی! وہ ہمارے ماموں کی فیملی ہے اور میری کنزیٰ کے ساتھ شادی سے آپ کی ذاتی زندگی کا کیا تعلق؟ وہ لوگ آپ کو اس طرح ایسے استعمال نہیں کر سکتے ہیں۔"

"ماموں کی فیملی تھی لیکن اب وہ میرے سسرال والے ہیں اور تم اگر بڑوں کا طے کیا ہوا یہ رشتہ ختم کرو گے تو اس کے نتائج مجھے بھی تو بھگتنے ہوں گے۔"

"میری اس سے کوئی انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے میں ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا جہاں صرف بزرگوں کو خوش کرنے کے لیے اپنی ساری زندگی ایک ایسے انسان کے ساتھ گزار دوں، جس کی میرے ساتھ ہم آہنگی ہی نہ ہو۔ یہ کوئی پندرہویں صدی نہیں ہے۔"

"تو میری شادی بھی تو ممی ڈیڈی اور ماموں نے ہی طے کی تھی کیا میری خرم کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ

نہیں ہے۔ کیا ہم ایک اچھی زندگی نہیں گزار رہے ہیں؟ تم نے سوچا ہے تمہارے اس طرح اس رشتے کو ختم کرنے سے خرم اور میرے درمیان کتنا مسئلہ ہو جائے گا۔"

"آپ ابھی خود ہی مجھے اپنی خرم بھائی کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ کے متعلق بتا رہی تھیں اگر آپ دونوں کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ہے تو پھر تو انہیں آپ کے ساتھ اس موضوع پہ بات کرنی ہی نہیں چاہیے۔"

"تم اتنے خود غرض کب سے ہو گئے وقار؟"

"میں اپنی زندگی اگر اپنے طریقے سے گزارنا چاہوں تو کیا یہ خود غرضی ہے؟" وہ جانتا تھا کہ اس کا رویہ عائشہ کو دکھی کر رہا ہے۔ اس نے آج تک ان کی کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا لیکن وہ کسی صورت ان کی بات نہیں مان سکتا تھا۔ اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"اگر آج ممی ڈیڈی زندہ ہوتے تو تم کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کرتے۔ اپنے سسرال والوں کے سامنے کتنے فخر سے میں نے تمہاری اور کنزیٰ کی شادی کے حوالے سے بات کی ہے اور اب میں کتنا شرمندہ ہوں گی ان سب کے سامنے۔" وہ اسے اب ایموشنلی بلیک میل کر رہی تھیں، وقار جانتا تھا وہ کچھ معاملات میں بہت روایتی عورت ہیں۔ وہ وقار کی زندگی میں بہت اہم تھیں اور وہ جانتا تھا کسی نہ کسی طرح وہ وقار کو اس شادی کے لیے قائل کر لیں گی۔

"لیکن میں شادی کر چکا ہوں۔" وقار کے پاس جھوٹ بولنے کے سوا دوسرا کوئی آپشن نہیں تھا۔ اس جھوٹ کی صورت میں کم سے کم وہ اس متوقع شادی سے بچ گیا تھا۔ حالانکہ اسے اندازہ تھا کہ اس بات کو سن کر عائشہ کو شدید دکھ پہنچا ہوگا لیکن یہ سب وقتی ہوگا اور جب وہ اپنی محبت سے اسے ملوائے گا تو وہ بھی اس کی پسند کی داد دیں گی۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ اسے معاف کر دیں گی۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا اور دل کے فیصلے دماغ پہ حاوی ہوتے ہیں۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم نے شادی کر لی ہے اور مجھے بتایا تک نہیں۔"

"میں آپ کو بتانے والا تھا بس حالات ہی کچھ ایسے ہوئے کہ مجھے شادی کرنی پڑ گئی۔" وہ جھوٹ پہ جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اس بات کے بعد کنزیٰ والا باب ختم ہو جائے گا۔ وہ ٹھیک سوچ رہا تھا، عائشہ نے اس وقت غصے سے فون بند کر دیا تھا، لیکن اب وہ اپنی چند دن پہلے کی بات پہ بری طرح پچھتا رہا تھا۔

ماضی سے نکل کر وہ حال میں لوٹ آیا تھا۔ اس کا فون بہت دیر سے بج رہا تھا۔ بے دلی سے اس نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹینڈ کیا۔ آفس سے بار بار کال آ رہی تھی۔

"سر! آپ کی کل دوپہر کی سیٹ کنفرم کرا دی ہے۔" اس کی سیکریٹری اسے اطلاع دے رہی تھی۔

"کہاں کی سیٹ؟" اس نے غائب دماغی سے کہا اور پھر اسے یاد آیا کہ اسے کل دبئی جانا تھا۔

"مجھے ساری شیڈولز ای میل کر دو میں آج اور کل آفس نہیں آؤں گا۔" اس نے کال کٹ دی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا وہ صحیح معنوں میں کس بات سے اپ سیٹ ہے۔ کل رات اسے مقامی ایم این اے کے اوباش بیٹے اعظم مسعود کے ساتھ دیکھ کر یا پھر اپنی بہن سے بولے اس جھوٹ کی وجہ سے۔

پچھلے ایک ماہ سے ان دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ دبئی میں تھا اور اگر پاکستان آتا بھی تو اس کی مصروفیت عروج پہ ہوتی۔ لیکن فون پہ کئی بار بات ہو چکی تھی اور کل اس سے مل کر وہ اسے زندگی کا بہترین تحفہ دینا چاہتا تھا۔ عائشہ سے اس نے جو کچھ کہا وہ اسے پہلے ہی بتا چکا تھا اور اب بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی دے کر وہ اسے باقاعدہ پرپوز کرنے کا ارادہ رکھتا تھا جو اس نے کل ہی خریدی تھی۔ اگلے چند دن میں وہ دونوں شادی کر لیں گے اور پھر وہ عائشہ کو بھی منا لے گا۔ وہ آفس سے رچرڈ کے ساتھ نکلا تھا اور ڈنر کے لیے اسے آواری لے آیا تھا، یہیں رچرڈ کا قیام بھی تھا لیکن جو کچھ اس نے دیکھا اس نے صحیح معنوں میں اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال دی تھی۔

وہ جو پچھلے ایک سال سے اس حسن کی دیوی کے

عشق میں دیوانہ ہوا پھر رہا تھا اپنی بہن سے اتنا بڑا جھوٹ بول کر اس نے اس کا دل دکھایا تھا اور اس وقت وہ جیب میں منگنی کی انگوٹھی ڈالے اس سے اگلے چند دن میں شادی کے پروگرام بنا رہا تھا وہ اس کی آنکھوں کے سامنے احسان مسعود کے بد دماغ اور کرپٹ بیٹے اعظم مسعود کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اسسٹنٹ کمشنر اعظم مسعود کو وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی پوسٹنگ آج کل وقار کے آبائی علاقے میں تھی اور چند بار اس سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ صرف اتنا ہی نہیں وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اعظم کتنا بڑا فلرٹ ہے اور اس کے چند معاشقوں کی خبر تو وقار کو بھی تھی۔ اعظم کے ساتھ بیٹھے اس کی آنکھوں میں وہی چمک اور وارفتگی تھی جو کبھی وہ اپنے لیے دیکھتا تھا۔ اس کا نازک ہاتھ اس وقت اعظم کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے بہت محبت سے ایک بیش قیمت انگوٹھی پہنا رہا تھا۔ یہ لمس کبھی وقار کا نصیب تھا۔ اس سے پہلے کوئی رات وقار پہ اتنی بھاری نہیں گزری تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے کئی بار شینہ کے پرانے نمبر پہ رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی اس امید کے ساتھ کہ شاید وہ اس بار بھی اس کی کچھ مالی مدد کر دے حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے لیے اس بار رقم کی ادائیگی آسان نہیں ہوگی، لیکن پھر بھی وہ اور ٹائم کر کے اس کو روپے واپس کر دیتی لیکن اس کی بات نہ ہو سکی تھی۔ اور پھر اچانک اسے سحرش کا خیال آیا۔ اس نے جلدی سے اپنا موبائل فون اٹھایا اور اس کے نمبر پہ کال ملانے لگی۔ تیسری بیل پہ اس کی کال اٹھالی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح کے دس بج چکے تھے فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ اپنا بیگ اٹھائے اب وہ ایئر برج کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پہ کافی ڈسٹرب تھا۔ اس مسئلے کو کس طرح حل کرے۔ کیا وہ عائشہ کو بتا دے کہ اس نے اس سے جھوٹ کہا تھا۔ تم سے کم سچ بول کر وہ اپنی بہن کی ناراضی ختم کر سکتا تھا جس نے پچھلے پورے ایک ہفتے سے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، لیکن اگر عائشہ نے یہ سب جان کر شادی کرنے کی بات دوبارہ شروع کر دی پھر وہ کیا کرے گا؟

ان حالات میں وہ شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ شاید اسے کچھ وقت خاموشی سے گزارنا چاہیے۔ دبئی سے واپسی پہ وہ خود جا کر عائشہ کو سب کچھ بتا دے گا اور اس سے ریکویسٹ کرے کہ وہ اسے شادی کے لیے فی الحال مجبور مت کرے۔ تمام راستہ وہ یہی سوچتا رہا تھا۔ ایئرپورٹ سے اس نے ہمیشہ کی طرح گاڑی پک کی اور اب اس کا رخ ہوٹل حیات کیلوریا کی طرف تھا۔ دبئی اس کے لیے اجنبی شہر نہ تھا بلکہ شاید یہ اس کے لیے سیکنڈ ہوم کی حیثیت رکھتا تھا۔ آج وقار دبئی پہنچ گیا تھا جہاں کل شیخ زائد روڈ پہ بنے ان کے دفتر میں وہ معاہدہ دستخط ہونا تھا۔ کپڑے بدل کر وہ سونے کے لیے لیٹ گیا تھا جب اس کے فون پہ عائشہ کی کال آئی۔

"تم نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے بوکی!" رسمی سلام دعا کے بعد وہ اب اس سے کہہ رہی تھیں۔

"آپی! میں شرمندہ ہوں۔" وہ مزید کچھ نہیں کہہ پایا تھا۔

"تم جانتے ہو میں نے تمہیں بھائی نہیں بیٹا سمجھا ہے، ممی ڈیڈی کی وفات کے بعد میں یہ اپنا حق سمجھتی تھی کہ تمہاری شادی میں خود کروں گی لیکن تم نے مجھ سے یہ حق چھین کر ثابت کر دیا ہے کہ تمہاری نظر میں میری کوئی اہمیت نہیں ہے۔" وہ بہت اپ سیٹ تھیں۔

"آپی پلیز! ایسے مت کہیں۔ آپ میرے لیے کیا اہمیت رکھتی ہیں یہ آپ بھی جانتی ہیں میں آپ کو تکلیف پہنچانے کا تو سوچ بھی نہیں سکتا اور مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا۔" وہ ان کی آواز سن کر مزید ڈسٹرب ہو گیا تھا اور ان سے کہنے ہی والا تھا کہ اس نے سب کچھ جھوٹ کہا ہے، لیکن اس سے پہلے عائشہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"چھوڑو یہ سب باتیں۔ میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ مجھے تم سے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے۔ میری زبیر ماموں اور خیریت ہو گئی ہے اور ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ ہمیں تمہاری خوشی میں خوش ہونا چاہیے اور پھر شاید اسی میں اللہ کی بہتری ہو۔ زبردستی کے رشتے دیرپا نہیں ہوتے ہیں۔ حالانکہ سحر بہت اپ سیٹ ہے لیکن میں نے اس سے بھی معافی مانگ لی ہے۔ بس اب میں جلد سے جلد پاکستان آ کر تمہاری بیوی سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس مہینے کے آخر میں میرا ارادہ ہے پاکستان آنے کا۔ سحر اور اسامہ کا ونٹر بریک بھی شروع ہونے والا ہے اور پھر تمہارا ولیمہ بھی کرلیں گے۔"

انہوں نے اپنے دونوں بچوں کے نام لیے۔ وہ ان کی بات سن کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عائشہ اس سے ناراض رہ ہی نہیں سکتیں اور وہ جلد اسے فون کریں گی اسی لیے اس نے فوری شادی کا فیصلہ کیا تھا' لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ اس کا جھوٹ بری طرح اس کے گلے پڑ گیا تھا۔ ان کو اپنی شادی کی جھوٹی خبر سنا کر دو دن بعد اس نے اپنی بات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک قیمتی انگوٹھی بھی خریدی تھی۔ وہ اس کی والدہ سے مل کر انہیں اس رشتے کے لیے راضی کرلے گا اور پھر جلد ہی اس سے شادی کرلے گا۔ سب پلاننگ کر کے وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا لیکن یہاں تو بازی ہی پلٹ گئی تھی۔ عائشہ اسے معاف کر کے اس کی وہ شادی قبول کر چکی تھیں جو ابھی ہوئی نہیں تھی اور اب وہ اس کی اس بیوی سے ملنے آ رہی تھیں جس کا وجود بھی نہیں تھا۔ وہ سر پکڑ کر نہ بیٹھتا تو اور کیا کرتا۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو سحرش! میں روشنی بول رہی ہوں۔" فون پہ اس کی آواز سن کر فوراً بولی تھی۔

"روشنی۔۔۔ ارے ہاں روشنی بولو' سب ٹھیک تو ہے؟ مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ تم نے مجھے کال کیا ہے۔" سحرش کی آواز میں حیرت اور بے یقینی کا ملا جلا تاثر تھا۔

سحرش روشنی کے ساتھ اسی سپر مارکیٹ میں کام کرتی تھی' اس کا تعلق بھی پاکستان سے تھا اور وہ روشنی سے سینیئر تھی۔ روشنی کی اس کے ساتھ معمول کی بات چیت تو تھی' لیکن دوستی ہرگز نہیں تھی اور اس کی بنیادی وجہ اس کا وہی لائف اسٹائل تھا جو جینی اور لنڈا کا تھا۔ روشنی کو وہ ان دونوں سے زیادہ بری لگتی تھی اور اس کا برملا اظہار وہ کئی بار باتوں میں کر چکی تھی۔ جینی اور لنڈا کو نہ مذہب روکتا تھا نہ تہذیب' لیکن سحرش اس حدود سے مستثنیٰ نہیں تھی۔ وہ چاہ کر بھی سحرش سے اپنی ناپسندیدگی چھپا نہیں پاتی تھی اور اس دن کے بعد تو اس کی فیلنگز کھل کر اس کے سامنے آ گئی تھیں جب روشنی نے سحرش کے ڈنر کی آفر یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ وہ حرام پیسے سے خریدا ہوا کھانا نہیں کھا سکتی۔

"سحرش! میں اس وقت بہت پریشانی میں ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" دھیمی آواز میں اس نے کہا۔

"یہ تو میری خوش نصیبی ہے جو روشنی نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں اس کی کوئی مدد کر سکوں۔" اس کے لہجے کی کاٹ کو نظر انداز کرتے روشنی نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"سحرش! مجھے پچاس ہزار روپے کی اشد ضرورت ہے اور صرف تم ہی ہو جو اس وقت میری مدد کر سکتی ہو۔" اس کی بے بسی پہ ایک قہقہہ لگاتے سحرش نے اس کی شرمندگی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

"ڈیئر روشنی' تم مجھے اپنا دوست سمجھو یا نہ سمجھو' لیکن میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا دوست ہی سمجھا ہے اور مجھے بہت خوشی ہوگی تمہاری مدد کر کے' کم سے کم تم نے میرے حرام کے پیسے کو نہ استعمال کرنے کی اپنی قسم کو تو توڑا۔" وہ جتاتے ہوئے بولی۔

"سحرش! یہ میری بہن کی زندگی کا سوال ہے۔ اس کے داخلے کے لیے مجھے اسے پچاس ہزار بھجوانے ہیں

اگر میں نے جلد سے جلد اس رقم کا بندوبست نہیں کیا تو وہ خودکشی کر لے گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں جلد سے جلد تمہارے پیسے واپس کر دوں گی۔" اس نے التجائیہ کہا۔

"واپسی کی کون بات کر رہا ہے سوئٹی! لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت میرے پاس تمہیں دینے کے لیے اتنے پیسے نہیں ہیں۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتیں، آج رات کو کلب آجاؤ، ابھی کی طرف میرا کچھ حساب نکلتا ہے۔ اس سے پیسے لے کر میں تمہیں دے دوں گی، اور کل صبح تم اپنی بہن کو وہ پیسے ٹرانسفر کر دینا۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس کے لیے مجھے کلب آنے کی کیا ضرورت ہے، میں تم سے کل پیسے لے لوں گی۔" روشنی نے قدرے تامل سے کہا۔

"میں تو آج مڈنائیٹ کے بعد فرینڈز کے ساتھ فجیرہ چلی جاؤں گی۔ میرا یہ پورا ویک آف ہے تو میں نے سوچا کچھ دن آرام کر آؤں۔ اگر تم کلب نہیں آنا چاہتیں تو پھر پیسے اگلے ہفتے لے لینا۔ ہم لوگ تو کلب سے ہی آگے چلے جائیں گے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"نہیں نہیں... میں کلب آجاؤں گی۔"

وہ رات دس بجے کے قریب وہاں پہنچی تھی اور اب وہ اس کمرے میں بیٹھی تھی جہاں سحرش اسے بٹھا کر گئی تھی۔

"کون ہیں آپ اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟" اسے دیکھتے ساتھ وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ روشنی کی بات پہ کسی قسم کا ردعمل ظاہر کیے بغیر وہ بہت اطمینان کے ساتھ کمرے کا دروازہ بند کرتا اس کے سامنے بیڈ پہ جا کر بیٹھ گیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ!" شائستہ اور دھیمے لہجے میں کہتا وہ مسلسل اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خوف سے کانپتے وہ واپس اسی صوفہ پہ بیٹھ گئی تھی۔ سینٹرل اے سی کمرے میں بھی اسے پسینہ آرہا تھا۔

"آپ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں۔" روشنی نے خود پہ قابو پاتے اس سے پوچھا۔

"میرا نام وقار حسن ہے اور میں ایک آرکیٹیکٹ ہوں۔ کیا اتنا تعارف کافی ہے؟" اس لہجے میں کچھ تھا جو روشنی سمجھ نہ پائی۔

"ویسے یہ کمرہ میں نے بک کیا تھا۔" وہ مزید بولا۔

"لیکن سحرش تو کہہ رہی تھی، یہ کمرہ اس کی دوست کا ہے۔" اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے اس نے ہمت کر کے کہا۔

"اس لڑکی نے مجھ سے ایک ہزار درہم کمیشن لیا ہے تمہیں یہاں پہنچانے کے لیے۔ کیا یہ بات تم نہیں جانتیں؟" اس کی بات پہ حیران ہو کر وہ اسے بتا رہا تھا۔

"کون لڑکی؟... سحرش؟ وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے میرے ساتھ۔" اسے شاک لگا تھا۔

"اس نے مجھے کہا تھا کہ وہ رات گزارنے کے لیے مجھے ایک لڑکی فراہم کر سکتی ہے اور بدلے میں اسے کم سے کم ایک ہزار کمیشن چاہیے۔" وہ اسے تفصیلات بتا رہا تھا۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔" روشنی ہذیانی کیفیت میں چلائی تھی۔ "میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔"

"دیکھو اگر تمہیں کچھ زیادہ رقم چاہیے تو میں تمہیں زیادہ بھی دینے کو تیار ہوں۔" وہ شائستہ اور مہذب لہجے میں بولا تھا۔ "وہ لڑکی کہہ رہی تھی تمہیں پیسوں کی ضرورت ہے۔ کیا میں جان سکتا ہوں تمہیں ایسی کیا مجبوری ہے؟"

اس کے نرم لہجے میں پوچھے گئے سوال پہ بہت دیر کے رکے آنسو بہہ نکلے تھے۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ وقار اسے کافی دیر تک اپنے سامنے روتے دیکھتا رہا۔ پھر بیڈ روم کے فریج سے پانی کی بوتل نکال کر اسے پانی دیا جو وہ ایک ہی گھونٹ میں پی گئی تھی۔ پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ بے دردی سے لبوں کو کاٹتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔

"مجھے اس وقت پچاس ہزار روپے کی اشد ضرورت ہے۔ اپنی بہن کے داخلے کے لیے مجھے پاکستان پیسے بھجوانے ہیں۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو میری بہن اپنی جان دے دے گی۔" اور پھر مختصر لفظوں میں اس نے وقار کو اپنی کہانی سنادی تھی۔

ساری بات سننے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی۔

"تمہیں نہیں لگتا تمہارے گھر والے تمہارے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے ایک لڑکی ہو کر تم انہیں سپورٹ کر رہی ہو۔ ان کی ضرورتوں کے لیے دن رات خود کو ہلکان کر رہی ہو اور وہ تمہیں ایکسپلائٹ کر رہے ہیں۔ تمہاری والدہ کا فرض بنتا تھا کہ وہ تمہاری مجبوری کو سمجھتیں اور تمہاری بہن کو سمجھاتیں' الٹا وہ اس کی بے وقوفی کا ساتھ دے رہی ہیں۔" وقار اس کی بات سن کر غیر جانب دار تجزیہ کر رہا تھا۔

"میری بہن بہت ضدی ہے' ہم سب اس سے بہت پیار کرتے ہیں اور اسے پڑھنے کا بھی بہت شوق ہے۔ میں تو انٹر کے بعد آگے پڑھ نہیں پائی' لیکن اس نے دن رات محنت کی ہے۔ ایم بی اے کرنا اس کا خواب ہے' بس اسی لیے وہ اس طرح ری ایکٹ کر رہی ہے۔"

"تم فضول ان کی سائیڈ لے رہی ہو حالانکہ مجھے تو وہ لوگ بہت بے حس لگے ہیں۔ تم کہہ رہی ہو تم پہلے ہی اپنی تمام کمائی انہیں بھجوا دیتی ہو' فیس تو ہر چھ ماہ بعد ادا کرنی ہوگی' اگلے دو سال تم مزید پیسے کہاں سے لاؤ گی؟"

"میں اوور ٹائم کرلوں گی۔ چھ ماہ میں میرے پاس اتنے پیسے با آسانی ہو جائیں گے کہ میں اپنی بہن کی فیس دے پاؤں۔"

"پھر تو یہ سمسٹر ڈراپ کرسکتی تھی۔"

"اس طرح اس کا سال ضائع ہو جاتا۔"

"یہ اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں تھا۔ خیر میں تمہیں پچاس ہزار روپے دینے کو تیار ہوں۔"

"آپ پچاس ہزار تو کیا پچاس لاکھ بھی دیں تو میں آپ کے ساتھ یہاں رات نہیں گزار سکتی۔"

"میرا تمہارے ساتھ رات گزارنے کا ارادہ بھی نہیں ہے۔" اس کی بات سن کر روشنی نے شرمندگی سے سر جھکا لیا تھا۔ اس نے اگلی بات نرمی سے کہی۔

"میں تمہیں یہ پیسے ادھار دے رہا ہوں۔ جب ہوں مجھے واپس کر دینا۔"

"لیکن میں کیسے آپ سے ادھار لے لوں میں تو آپ کو جانتی بھی نہیں ہوں اور اگر واپس نہ لوٹا پائی۔"

"تو مت واپس کرنا۔ میں شکایت نہیں کروں گا۔"

"یہ بہت بڑی رقم ہے۔ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے میری بات سنی اور مجھے گناہ میں ملوث نہیں کیا۔ آپ کا مجھ پر احسان ہے' لیکن میں آپ سے مالی معاونت نہیں چاہتی ہوں۔"

"میں نے تمہیں یہاں کسی گناہ کے ارادے سے بلایا بھی نہیں تھا روشنی' میرے اپنے چند مسائل ہیں جو میری زندگی کو بری طرح الجھا رہے ہیں۔ میں عورتوں کی عزت کا خریدار نہیں ہوں بلکہ ایک شریف انسان ہوں' اس کمرے میں کسی لڑکی کو بلانے کا مقصد عیاشی نہیں بلکہ مجبوری سے جڑا ہے۔ اگر تم چاہو تو میری مدد کر کے مجھے اس پریشانی سے نکال سکتی ہو۔" وہ بہت الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

"آپ کو ایسی کیا پریشانی ہے۔" روشنی کو اب اس شخص سے خوف نہیں آرہا تھا۔ اس لمحے وہ اسے بہت مایوس اور بکھرا ہوا لگا تھا۔

"میں نے اپنی بہن سے جھوٹ بولا تھا کہ میں شادی کر چکا ہوں اور اس ماہ کے آخر میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ میری بیوی سے ملنے آرہی ہے۔"

"آپ نے ان سے یہ جھوٹ کیوں بولا؟"

"بس سچویشن ہی کچھ ایسی ہوگئی تھی۔"

"تو اب آپ ان کو سچ بتادیں۔"

"یہ سب اتنا آسان نہیں ہے اگر تم چاہو تو میری ایک مدد کر سکتی ہو۔ تمہیں میرے ساتھ میرے گھر چند دن میری بیوی بن کے رہنا ہوگا۔"

"جی۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"تمہیں پاکستان میں میری بہن کے سامنے میری بیوی بننے کا ڈرامہ کرنا ہوگا۔ میں ایک شریف آدمی ہوں اور تم وہاں اتنی ہی محفوظ رہو گی جتنی اس وقت میرے ساتھ ہو۔ میں اس وقت ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں اور میری مدد کر کے تم مجھے اس مشکل سے نکال سکتی ہو۔ وہ بھی پندرہ بیس دن سے زیادہ نہیں رکتی' وہ جیسے ہی جائے تم واپس آجانا۔ تمہیں آنے جانے کا ٹکٹ بھی میں ہی دوں گا۔"

"لیکن اس کے بعد آپ ان سے کیا کہیں گے وہ پوچھیں گی نہیں آپ کی بیوی کہاں گئی۔"

"کچھ عرصے بعد کہہ دوں گا رشتہ ختم ہو گیا' لیکن فی الوقت میں اسے کچھ نہیں بتا سکتا۔ مجھے اپنے اس جھوٹ کو نبھانا ہی پڑے گا کیا تم میری مدد کرو گی؟"

وہ اس کی بات کسی صورت نہیں مان سکتی تھی۔ یہ بندہ جو ابھی کچھ دیر پہلے اس کا خریدار ہونے کا دعوا کر رہا تھا اچانک اسے اپنے گھر میں بیوی بنا کر رکھنے کی بات کر رہا ہے۔ اسے خاموش دیکھ کر وقار جیسے اس کی دلی کیفیت سمجھ چکا تھا۔

"میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا' اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو اس بات کو جانے دو اور یہ پیسے رکھ لو۔ میں جانتا ہوں تمہیں پیسوں کی ضرورت ہے' جب ہوں واپس کر دینا۔" اس نے زبردستی اسے پیسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھ پر اتنی بڑی رقم کا اعتبار کر رہے ہیں۔ اگر میں بھاگ گئی تو۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"تھوڑے سے پیسے ضائع ہو جائیں گے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ تو چند نوٹ ہیں یہاں تو لوگ جذبوں کا خون کروا لیتے ہیں۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تم اس بارے میں مت سوچو' میں بندہ دیکھ کے بات کرتا ہوں اور پھر یہاں میرے بہت سے لوگ ہیں۔ تم بھاگ گئیں تو میرے لیے تمہیں ٹریک کرنا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔" بہت پرسکون انداز میں وہ لب

مسکراتے ہوئے اسے بتا رہا تھا۔

"میری ایک ماہ کی چھٹی باقی ہے۔ امی نے منع کر دیا تھا کہ خوامخواہ خرچا ہو جائے گا۔ اس لیے پاکستان نہیں جا سکی۔ میں اگر اپلائی کروں تو ایک ہفتے تک مجھے چھٹی مل جائے گی۔" اس کی زبان سے بے اختیار نکلا تھا۔ یہ شخص اس کا محسن تھا' اسے نہ جانتے ہوئے بھی اس کی مدد کر رہا تھا اور پھر وہ کہہ رہا ہے' وہ یہ سب اپنی بہن کی وجہ سے کر رہا ہے۔ اسے وقار کی مدد کرنی چاہیے۔ اس نے ایک دم فیصلہ کیا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر میں تمہارے ٹریول کی ڈیٹ کچھ دن میں کنفرم کروں گا۔ میرا آدمی یہاں تمہارے سفر کا انتظام کر دے گا۔" روشنی کی بات سن کر اسے حیرت ہوئی تھی لیکن خود پہ قابو پاتے اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"چلو' میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔" وہ بیڈ سے اٹھ کر دروازے کی طرف جا رہا تھا۔

"نہیں' میں خود چلی جاؤں گی۔" روشنی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"رات کافی ہو چکی ہے۔ میں چھوڑ آتا ہوں۔" پختہ لہجے میں کہتا وہ بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مزید کچھ نہیں کہہ پائی۔

"سنو! وہاں سامنے واش روم ہے منہ دھو آؤ۔" اشارے سے کہتا وہ خود کمرے سے باہر جا رہا تھا۔

وہ سر ہلاتی ہوئی واش روم میں چلی گئی۔ کئی گھنٹوں بعد اس نے اپنا چہرہ شیشے میں دیکھا تھا۔ خوب صورت تو وہ خیر کبھی نہیں تھی لیکن اس وقت جو لگ رہی تھی وہ خود ہی اپنا آپ دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ میک اپ کے نام پہ وہ صرف کاجل لگاتی تھی جو رونے کے باعث بہہ کر چہرے پہ عجیب و غریب نقش و نگار بنا رہا تھا' رہی سہی کسر سحرش کی لگائی اس شوخ سرخ لپ اسٹک نے پوری کر دی تھی۔ خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھونے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنے چہرے کو شیشے میں دیکھا۔ اس بار اسے تسلی ہوئی تھی۔ اپنے کھلے ہوئے لمبے بالوں کو سمیٹتی وہ کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

وقار نے روشنی کو اس کی بلڈنگ کے باہر ڈراپ کیا تھا۔ اس کا کانٹیکٹ نمبر اور پتا وہ اپنے پاس محفوظ کر چکا تھا۔

اپنے کمرے میں جا کر روشنی نے سب سے پہلے وضو کیا اور دو نفل شکرانے کے ادا کیے۔ اللہ نے اسے کتنی بڑی پریشانی سے بچا لیا تھا' اسے معجزوں پہ یقین آ گیا تھا۔ یہ معجزہ ہی تو تھا جو وقار کی صورت میں ایک فرشتہ بھیج کر اللہ نے اس کی عزت کی حفاظت کی تھی' وہ کوئی شیطان بھی ہو سکتا تھا اور آج رات کے بعد وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔ بہت دیر تک سجدے میں گری وہ اللہ کا شکر ادا کرتی رہی تھی۔

آئمہ کو فیس کے پیسے وہ بھجوا چکی تھی۔ صابرہ اور آئمہ کے رویوں نے اسے ایک بڑا سبق دیا تھا۔ وہ لوگ اس کی محنت کی کمائی کو بہت آسانی سے خرچ کر رہے تھے۔ اس نے اس دوران ان سے کوئی رابطہ بھی نہ کیا تھا کیونکہ وہ دل ہی دل میں ان سے ناراض تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی' وہ ان سے بہت دن تک ناراض نہیں رہ پائے گی۔

سحرش سے اس کی ملاقات نہیں ہو پائی تھی' اس کو کال کرنے پر بار بار اسے اس کا نمبر بند ملتا تھا۔ وہ روشنی کے ساتھ اتنا گھٹیا کھیل کھیل سکتی تھی' یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

سحرش اچھی طرح جانتی تھی کہ روشنی ایک مضبوط کردار کی لڑکی ہے اور روپوں کے عوض خود کو بازار میں کبھی نہیں لائے گی۔ اس نے پچھلے دو سال میں روشنی کو بہت قناعت اور استقامت کا مظاہرہ کرتے دیکھا تھا۔ اندر ہی اندر وہ روشنی کی اس خوبی سے بری طرح خائف تھی اور یہ رقابت اس وقت اور بھی بڑھ گئی تھی' جب روشنی نے اس کے پیسوں سے کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اب جو روشنی نے اس سے مالی مدد مانگی تو اسے قدرت کی طرف سے روشنی کو نیچا دکھانے کا ایک موقع مل گیا تھا۔ اس کو بازار میں لا کر وہ اسے ٹھیک اسی مقام پہ لے آئی تھی جہاں وہ خود کھڑی تھی۔

"تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ تم جانتی ہو'

"تمہاری اس حرکت کے بدلے میں تم پہ کیس کر سکتی ہوں۔" روشنی سے ایک ہفتے بعد سحرش کی ملاقات ہوئی تو بہت غصے میں اس نے کہا تھا۔

"ایک تو میں نے تمہاری مدد کی ہے اور تم الٹا مجھے پولیس کی دھمکی دے رہی ہو۔ یہ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی کہ یہاں کی پولیس غیر ملکیوں کے تمام معاملات میں کتنی غیر جانب دار رہتی ہے۔" وہ اس کی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے اطمینان سے بولی تھی۔

"سحرش! میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے میرا اس شخص کے ساتھ سودا کر دیا۔" وہ دھیمی آواز میں بولی تھی۔

"یہ تو تم اپنے آپ سے پوچھو کہ تم نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ کتنی ذلت نظر آتی تھی مجھے تمہاری نگاہوں میں اپنے لیے اس دن جب تم نے میری ڈنر کی آفر کو ٹھکرا کر حرام کی کمائی کا طعنہ مارا تھا اس دن سے میں نفرت کرنے لگی تھی تم سے۔ اپنی پارسائی اور مضبوط کردار پہ بڑا ناز تھا تمہیں، میں نے سوچا کیوں نہ تمہیں بھی اس ذلت کا مزا چکھاؤں۔ ویسے تمہارا کام تو ہو گیا ہو گا۔ کافی مال دار آدمی تھا میں نے اسے بتا دیا تھا کہ تمہیں بڑی رقم چاہیے پھر بھی اس نے کمیشن کے طور پہ مجھے پورا ایک ہزار درہم دے دیا۔" وہ بے شرمی سے کہہ رہی تھی۔

اس کی بات سن کر وہ شاک رہ گئی تھی۔

"لعنت ہے تم پر سحرش! ایک عورت تو کیا تم تو انسان کہلانے کے بھی لائق نہیں ہو، تمہیں اگر یہ خوش فہمی ہے کہ اس دن میں نے اپنی عزت کا سودا کر کے اپنی بہن کے ایڈمیشن کی فیس کے پیسے حاصل کیے ہیں تو میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کر دیتی ہوں۔ اللہ نے تمہارا ناپاک منصوبہ ناکام بنا کر نہ صرف میری عزت کو محفوظ رکھا ہے، بلکہ مجھے اس حرام کمائی کے استعمال سے بھی بچا لیا ہے جو میں تم سے ادھار لینے والی تھی۔" اپنی بات ختم کر کے اس کے چہرے پہ تاسف کی نگاہ ڈالتے روشنی وہاں سے چلی گئی تھی۔ سحرش ناقابلِ یقین حیرت سے اسے اسٹور سے نکلتے دیکھتی رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلے چند دنوں میں اس نے اپنی سالانہ چھٹی کے لیے اپلائی کر دیا تھا جو منظور بھی ہو چکی تھی۔ وقار کی طرف سے اسے ٹکٹ مل چکا تھا اسے ایک ماہ پاکستان میں رہنا تھا اور یہ بات وہ صابرہ کو بتا نہیں سکتی تھی اس لیے اس نے اپنے فون کی رومنگ آن کرا لی تھی۔ اب وہ آسانی سے اپنے فون کے ذریعے ان سے رابطے میں رہ سکتی تھی اور اگر وہ لوگ اسے کال کرتے تو ان کی کال ریسیو بھی کر سکتی تھی۔

ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھی وہ اس وقت بورڈنگ کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دو سال بعد پاکستان جا رہی تھی، لیکن اس دوران وہ اپنی ماں اور بہن سے مل نہیں سکتی تھی۔ دو ماہ پہلے جب اس نے صابرہ سے یہ کہا تھا کہ اس کے نئے کانٹریکٹ کے آغاز سے پہلے اسے ایک ماہ کی چھٹی ملے گی اور وہ پاکستان آئے گی تو صابرہ نے اسے منع کر دیا تھا۔ ان کے خیال میں یہ پیسوں کا ضیاع تھا، وہ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ اس کا ٹکٹ کمپنی کے ذمے ہے لیکن ان کے رویے سے حیران ہو کر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ صابرہ نے ایک بار بھی یہ اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے بے چین ہیں اور پھر اس نے ایک ماہ سے اکٹھے کیے ہوئے اوور ٹائم کے پیسوں سے کچھ تحائف خرید کر ان دونوں کو بھجوا دیے تھے۔

فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ وہ اب ڈیپارچر گیٹ کے اندر جا رہی تھی۔

ارائیول لاؤنج میں وقار اسے کچھ فاصلے پہ کھڑا نظر آ گیا تھا۔ اس دن کی طرح بہترین لباس میں اور اتنا ہی جاذب نظر۔ اس دن کے برعکس روشنی نے آج مسٹرڈ شلوار قمیص پہ سیاہ جرسی کی چادر لوڑھی ہوئی تھی کیا نہیں اس نے اسے دیکھ کر پہچانا بھی تھا کہ نہیں۔ روشنی اپنا ٹرالی بیگ گھسیٹتی اس کے پاس چلی آئی تھی۔ وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دھلے منہ کے ساتھ وہ بہت خوب صورت تو نہیں، لیکن بہت معصوم

لگ رہی تھی۔
"السلام علیکم۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔
"وعلیکم السلام' سفر میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"
لہجہ سنجیدہ تھا۔
"نہیں۔" جواب مختصر آیا تھا۔
"چلیں۔" یہ کہہ کر وہ اب پارکنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سورج ابھی کچھ دیر پہلے ہی طلوع ہوا تھا اور آسمان پہ سورج کی کرنیں ابھی پوری طرح نہیں پھیلی تھیں۔ دونوں کے درمیان اس رسمی علیک سلیک کے بعد مزید کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسے تھکا ہوا لگا تھا شاید اتنی صبح فلائیٹ کی وجہ سے وہ ٹھیک سے سو نہ پایا ہو۔ روشنی نے خود ہی وجہ سوچ لی تھی۔ وہ خود بھی تمام رات کی جاگی ہوئی تھی۔ وہ آج بھی بہت انہماک سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ یہ شہر روشنی کے لیے اجنبی نہیں تھا وقار نہ بھی بتاتا پھر بھی وہ جانتی تھی کہ گاڑی اس وقت کس علاقے میں جا رہی ہے۔ لیکن اسے حیرت ہوئی جب وقار نے گاڑی کسی گھر کے بجائے ایک بلڈنگ کے سامنے روکی اور اسے ایک فلیٹ میں لے گیا۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر وہ خود اندر گھس گیا تھا۔

"تمہیں چند دن یہاں رہنا ہو گا۔ اندر ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہیں اور اگر مجھ سے کوئی بات کرنی ہو تو اس موبائل میں میرا نمبر سیو ہے۔" ایک موبائل فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے اسے چند ضروری ہدایات دیں جو آج کے دن کے حوالے سے تھیں اور پھر تیزی سے واپس چلا گیا۔ روشنی فلیٹ کا دروازہ لاک کرتی اندر آگئی۔ یہ ایک لگژری اپارٹمنٹ تھا جو بہت خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ اگلے چند منٹ اس نے اس جگہ کا جائزہ لیا' کچن اور فریج میں بہت سا کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ وہ جہاز میں تھوڑا بہت کھا چکی تھی اس لیے اسے کسی چیز کی طلب نہیں تھی سوائے نیند کے۔ وہ بیڈ روم میں آگئی تھی۔ وہ بے تحاشا تھکی ہوئی تھی اور اسے نیند آرہی تھی۔ وہ بہت گہری نیند سوئی تھی اور اس کی آنکھ موبائل کی بیل سے کھلی تھی۔ اسے چند لمحے لگے تھے یہ سمجھنے میں کہ وہ اس وقت کہاں ہے اور یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ یہ اس کے موبائل فون کی آواز ـــ تھی۔ اگلے سیکنڈ میں اس نے کال اٹینڈ کی تھی۔
"ہیلو!" اس نے بوجھل آواز سے کہا۔
"تم سو رہی تھیں؟" اس نے اس کی آواز سن کر اندازہ لگایا تھا۔
"اب جاگ چکی ہوں۔"
"لنچ کے بعد تیار ہو جانا تمہیں آج نتاشا سے ملنا ہے۔ میں تمہیں ایک بجے کے بعد پک کر لوں گا۔" وقار جلدی جلدی بتا رہا تھا۔ اسے لگا وہ اس وقت اس سے بات کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی کر رہا ہے یا شاید کہیں جا رہا ہے۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی یہ نتاشا کون ہے اور اسے کہاں جانا ہے' لیکن وقار نے اپنی بات ختم کر کے دوسری طرف سے جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔

ڈیڑھ بجے کے قریب وہ اسے لینے آگیا تھا۔ وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی' لیکن اس کی سنجیدگی کی وجہ سے کچھ بھی کہنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا بیوٹی سیلون کم اسٹوڈیو تھا جہاں ایک ماڈرن اور خوش مزاج لڑکی نے اسے نتاشا کے نام سے اپنا تعارف کرایا تھا۔ وقار کے ساتھ اس کی بات چیت سے روشنی کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ دونوں کافی بے تکلف ہیں۔
"فری ہو کر مجھے کال کر لینا میں تمہیں پک کر لوں گا۔" نتاشا سے بات کرنے کے بعد وہ اب اس سے مخاطب تھا۔
اگلے کچھ گھنٹے وہاں کی بیوٹیشن اس کے چہرے اور بالوں کو مختلف ٹریٹمنٹ دیتی رہی تھیں اور وہ خاموشی اور بے دلی سے انہیں ان کا کام کرنے دے رہی تھی۔ ایک طرف بہت سے قیمتی کپڑوں اور جوتوں کا ڈھیر تھا ان میں ایک لباس کو نتاشا نے اس کے لیے سلیکٹ کیا تھا۔ بیوٹیشن اس کا میک اپ کر رہی تھی اور روشنی آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چہرے پہ ایک بھرپور نگاہ ڈالی تھی

لگ رہی تھی' لیکن یہ بہت حیرانگی کی بات تھی کہ میک اپ سے اس کا چہرہ یکدم بدلا نہیں تھا بلکہ کافی نیچرل لگ رہی تھی۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو تم۔" ہیئر اسٹائلسٹ اس کے بال بنا چکی تھی اس کے لمبے بالوں کو بہت معمولی سی کٹنگ سے ایک خوب صورت سٹائل دیا گیا تھا۔

"اینڈ یو آر ریڈی۔" نتاشا نے اسے دیکھ کر کہا تھا۔ اب اس کا دوپٹہ ٹھیک کر رہی تھی۔

"لپ کلر تھوڑا لائٹ نہیں؟" اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔ میک اپ کے نام پہ ایک ڈارک لپ اسٹک تو ہونی چاہیے تھی۔ اسے تھوڑی مایوسی ہوئی تھی۔

"وقار کی اسپیشل ہدایت ہے کہ میک اپ لائٹ رکھا جائے۔ اسی لیے ہم نے نیوڈ شیڈز استعمال کیے ہیں۔" وہ لاپروائی سے کہہ رہی تھی' لیکن اس کی بات سن کر روشنی کافی شرمندہ ہوئی تھی۔

"وقار نے سختی سے منع کیا تھا کہ تمہارے بالوں کو ہرگز کاٹا نہ جائے۔" وہ اب اس کے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سیٹ کر رہی تھی۔ "یہ سارے ڈریسز تمہارے ساتھ جائیں گے اور اگلے تین دن میری بیوٹیشن تمہیں میک اپ کا ٹیوٹوریل دینے گھر آئے گی۔ پھر تم خود بھی ایسا ہی میک اپ کرنے لگو گی۔"

روشنی جانتی تھی کہ اتنا تردد کیوں ہو رہا ہے۔ وہ وقار حسین کی بیوی کی حیثیت سے اس کی بہن سے ملنے والی تھی' وہ کسی بھی راہ چلتی لڑکی کو اپنی بہن سے نہیں ملوا سکتا تھا۔ ایک عام سی لڑکی کو خاص بنا کر اپنی بہن کے سامنے بولے جھوٹ کا بھرم رکھنے کی خاطر وقار کو اتنا تو کرنا ہی تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

"اپنی شادی پہ بلانا مت بھولنا۔" وہ اب دوستانہ لہجے میں اس سے کہہ رہی تھی۔

"میری شادی۔" اسے حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں تمہاری شادی ہے نا اگلے مہینے' مجھے وقار نے بتایا تھا امریکہ جا کر ہمیں بھول مت جانا۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس کی بات کا روشنی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا کیونکہ وہ نہیں جانتی تھی وقار نے اسے کیا بتایا تھا وقار اسے لینے آیا تھا اور اس پہ ایک سرسری نگاہ ڈال کر وہ اب نتاشا سے بات کر رہا تھا۔

اگلے تین دن میں نتاشا کی طرف سے بھیجی گئی بیوٹیشن نے اسے کافی کچھ سکھا دیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ خود بھی اپنا مناسب سا میک اپ کر ہی سکتی ہے۔ ان تمام دنوں میں وقار سے اس کی ایک بار بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ دن میں ایک دو بار خیریت پوچھنے کے لیے اسے کال کرتا تھا۔

"تمہیں کچھ چاہیے تو نہیں۔" کال بند کرنے سے پہلے وہ اس سے پوچھتا۔

اور اس کا جواب ہر بار نہ میں ہوتا۔ وقار سے اس کی ملاقات چار دن بعد ہوئی تھی۔ وہ اسے لینے آیا تھا۔ گاڑی ایک شاندار گھر کے سامنے رکی تھی اور چوکیدار اس کے ہارن دینے پہ اب سیاہ آہنی دروازہ کھول رہا تھا۔ اس کا سامان ڈگی سے نکال کر وہ خود گھر کے داخلی دروازے سے اندر چلا گیا تھا۔ اس کی تقلید میں روشنی اس عالیشان گھر میں داخل ہوئی۔ باہر کی طرح گھر کا اندرونی حصہ بھی قابل ستائش تھا۔ ہال کمرہ بہت خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ فرش پہ بچھے بیش قیمت قالین اور دیواروں پہ لگی قیمتی تصاویر مکین کی امارت سے زیادہ اس کے باذوق ہونے کی ترجمانی کر رہی تھیں۔

حیران نظروں سے وہ اس جگہ کو دیکھ رہی تھی اور قدم آگے نہیں بڑھا سکی تھی۔ شاید وقار نے اس کا رکنا محسوس کر لیا تھا۔ پیچھے مڑ کر اب اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ تیزی سے قدم بڑھاتی اس کے پاس چلی آئی تھی۔ کاریڈور سے بائیں طرف وہ ایک کمرے کے سامنے رک کر اس کا دروازہ کھول رہا تھا۔

"یہ تمہارا کمرہ ہے۔" ملازم اس کا سامان اب کمرے میں رکھ رہا تھا۔ "تمہیں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو تم ملازم سے کہہ سکتی ہو۔" کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے روشنی سے کہا تھا۔

"کل رات کو عائشہ آپی پاکستان پہنچ رہی ہیں۔"

اگلے پندرہ دن تمہیں یہاں اس کمرے میں ہی رہنا ہو گا۔" وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"مجھے ایسی نظروں سے مت دیکھو روشنی! تم یہاں پوری طرح محفوظ ہو۔ تمہیں مجھ پہ ٹرسٹ کرنا ہو گا۔" وہ جیسے اس کے ان کہے لفظوں کو بھی سمجھ گیا تھا۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی اور آپ کی بہن کو سب کچھ پتا چل گیا تو۔" "اگر انہوں نے مجھ سے پوچھا ہماری شادی کب اور کہاں ہوئی، میں کس فیملی سے ہوں اور میرے والدین کون ہیں تو میں انہیں کیا بتاؤں گی؟" وہ بہت سارے سوال جو کئی دن سے اس کے ذہن کو الجھا رہے تھے اس نے ایک ہی سانس میں پوچھ ڈالے تھے۔

اگر وہ تم سے پوچھیں تو تم یہی کہنا کہ ہم دبئی میں ملے تھے اور تمہاری فیملی بھی دبئی میں ہے۔ باقی سب تم مجھ پہ چھوڑ دو۔ وہ یہاں میری بیوی سے ملنے آ رہی ہیں کوئی انویسٹی گیشن کرنے نہیں۔ اس لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ انہیں سب سچ بتا کیوں نہیں دیتے۔ اتنے سارے جھوٹ بولنے کے بجائے ایک سچ بول کر آپ اس ساری مشکل سے نکل سکتے تھے۔"

"یہ سب کہنا جتنا آسان ہے اس پہ عمل کرنا اتنا ہی دشوار۔ سچ بتانے کی صورت میں مجھے ان کی نند سے شادی کرنا پڑے گی جو میں کسی قیمت پہ نہیں کر سکتا اور ویسے بھی ابھی شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ اس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ شادی نہ کرنے کا فیصلہ اس نے چند ہفتے پہلے کیا تھا۔ وہ بھی اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھوکا کھانے کے بعد۔

اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا وہ اب ڈریسنگ روم میں گھس گیا تھا۔ اس کا کوٹ بیڈ پہ پڑا تھا۔ روشنی نے ایک نظر اس خوب صورتی سے سجے کمرے پہ ڈالی اور پھر اس کی نظر سامنے پڑے کاؤچ پہ جا ٹکی۔ اس کے رات کو سونے کا انتظام ہو چکا تھا۔ وہ رات اور اس سے اگلی تمام راتیں اس نے اسی صوفے پہ سو کر گزاری تھیں۔

اگلی صبح اس کی آنکھ دروازے پہ ہونے والی دستک سے کھلی تھی۔ وہ رات صوفے پہ سوئی تھی اور وقار نے اس کے وہاں سونے پہ کوئی کمنٹ نہیں کیا تھا نہ ہی اس نے اس کی جگہ خود صوفے پہ سونے کی آفر کی تھی۔ دستک کی آواز پہ وہ دونوں ایک ساتھ جاگے تھے۔

"ملازمہ کافی لائی ہے، تم باہر آجاؤ۔" وقار نے جلدی سے کہا۔

اپنا تکیہ بیڈ پہ رکھ کر وہ اب کمرے کا دروازہ کھول کر کھڑی تھی۔

"السلام علیکم روشنی بیٹا!" یہ عفت بی تھیں، کل رات ہی وقار نے ان سے اس کا تعارف کروایا تھا اور انہوں نے وقار کی دلہن کو ڈھیروں دعائیں دی تھیں۔ وقار نے کہا تھا "یہ خاتون اس کے گھر میں کافی لمبے عرصے سے ہیں اور اس کے آبائی گاؤں سے ہیں۔ ویسے تو گھر کے باقی ملازمین کو بھی یہی بتایا گیا تھا کہ وہ مسز وقار حسن ہے۔

"وعلیکم السلام عفت بی۔" اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ان سے کافی کی ٹرے لے کر وہ اب دوبارہ کمرے کا دروازہ بند کر چکی تھی۔ ناشتے کی میز پہ وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے ہی لاتعلق تھے جتنا کل رات اس کمرے میں۔ ملازمہ انہیں مختلف چیزیں سرو کر رہی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے اس کی بہانی ڈشز چکھ رہی تھی۔ وقار کے آفس جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ جہازی سائز کھڑکی پہ دبیز پردے ڈلے تھے۔ اس نے کھڑکی کے پردے کی ڈوری کھینچی۔ سامنے کا منظر دیکھ کر وہ فریز ہو گئی تھی۔ کمرے کے باہر ایک خوب صورت سوئمنگ پول تھا۔ اس کے دونوں طرف سبزے کی کیاریاں تھیں۔ پول کے اطراف بہت قیمتی پتھر لگا تھا۔ سامنے دیوار پہ قد آدم آئینہ لگا تھا اور چھت کی جگہ لکڑی کی قیمتی آرچز بنی ہوئی تھیں۔ گلاس ڈور کو کھول کر وہ باہر آگئی تھی۔ سوئمنگ پول

کے پیالے میں بھرا پانی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم وہ کتنی دیر اس پول کے کنارے بیٹھی رہی تھی۔ اسے وہاں بہت سکون مل رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا اس نے نہیں کھایا تھا۔ گھر میں آج رات کے کھانے کا خاص اہتمام تھا' یہ وہ کچن میں جائے بغیر بھی جانتی تھی۔ اسے اس گھر کے کسی بھی مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے یہاں اگلے چند دن گزار کر واپس چلے جانا تھا۔

رات کے نو بجے عائشہ اور اس کے بچوں کو لے کر وقار گھر پہنچا۔ عائشہ سے ملتے ہوئے وہ جتنا جھجک رہی تھی' ان کی خوش اخلاقی اور محبت دیکھ کر وہ اتنی ہی پرسکون ہو چلی تھی۔ وقار ٹھیک کہہ رہا تھا۔ انہوں نے اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ جو پوچھنا تھا وہ اپنے بھائی سے پوچھ چکی تھیں۔ ایمرلڈ گرین کلر کے تھریڈ ورک والے سوٹ میں میچنگ اسٹول کے ساتھ وہ کافی اچھی لگ رہی تھیں۔ عائشہ کو اس کی کم گوئی اور معصومیت پسند آئی تھی۔ وقار سے ان کے شکوے گلے ختم ہو گئے تھے۔

"تم سے مل کر تو مجھے تسلی ہو گئی ہے کہ اس نے کسی ٹھیک بندی کا انتخاب کیا ہے شادی کے لیے' ورنہ تو آج کل کی لڑکیاں اف... نہ کوئی فیملی ویلیوز ہوتی ہیں اور نہ اپنائیت۔ اسی لیے تو میں اتنی بھاگم بھاگ پاکستان آگئی' ورنہ اسے اس طرح مجھے بتائے بغیر شادی کرنے پہ اتنی جلدی معاف کرنے والی نہیں تھی میں۔" وہ اسے ہنستے ہوئے بتا رہی تھیں۔

"آپ کی بہن بہت اچھی ہیں اور آپ سے پیار بھی بہت کرتی ہیں۔ مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے ان سے سچ چھپاتے ہوئے۔"

وہ اس سے کہے بغیر نہیں رہ پائی تھی۔ اگر عائشہ کو وہ اچھی لگی تھی تو اسے بھی عائشہ بہت پسند آئی تھیں۔ اتنے بڑے خاندان سے تعلق ہونے کے باوجود وہ اسے بہت شائستہ لگی تھیں۔ ان کی باتوں میں اونچے خاندان اور اسٹیٹس کانشس ہونے کی جھلک نہیں تھی۔

"یہ بات تو مجھے بھی ڈسٹرب کر رہی ہے' لیکن میرے پاس اس کے سوائے کوئی حل نہیں تھا۔" وہ لیپ ٹاپ کھولے بیڈ پہ بیٹھا تھا۔ پتا نہیں وہ سچ میں اتنا مصروف تھا یا روشنی کو نظر انداز کرنے کے لیے یہ سب کر رہا تھا۔ اگلی صبح گھر میں خوب گہما گہمی تھی۔ وقار تو صبح ہی آفس چلا گیا تھا۔ عائشہ کے بچے اس کے ساتھ بہت بے تکلف ہو گئے تھے۔ وہ لوگ کہیں گھومنے جانا چاہتے تھے اور ان کے اصرار پہ وہ بھی ان کے ساتھ ہی گئی تھی۔ وقار کا ڈرائیور انہیں ان کی مطلوبہ جگہوں پہ گھماتا رہا تھا۔ سہ پہر میں وہ چاروں گھر واپس آئے تھے۔ عائشہ اسے لے کر کافی شاپنگ کرتی رہی تھیں۔

"یہ میں تمہارے لیے لے رہی ہوں۔" ایک گولڈ کے سیٹ کو خریدتے ہوئے انہوں نے روشنی سے کہا۔ وہ سیٹ بہت قیمتی تھا۔ گولڈ اور کندن سے بنا وہ نیکلس کسی کے بھی ہوش اڑا سکتا تھا۔

"یہ تو بہت مہنگا ہے۔" روشنی نے حیرت سے کہا۔

"تو کیا ہوا' اب اپنی پیاری سی بھابی کو کوئی معمولی تحفہ تھوڑی دوں گی۔" وہ بہت محبت سے بولی تھیں۔

اس کی شرمندگی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ یہ لوگ مجھے کیا سمجھ رہے ہیں اور میں کیا ہوں۔ دو ہزار درہم کے عوض کسی کے ساتھ اس کی بیوی ہونے کا ڈرامہ کر رہی ہوں۔ اگر یہ لوگ سچ جان لیں تو یہ سب مجھ سے نفرت کریں گے اور میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہیں گے۔

ان کی واپسی سہ پہر میں ہوئی تھی اور روشنی اس کے بعد سے سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھی یہی سوچ رہی تھی۔ اس کا ضمیر اسے بار بار ملامت کر رہا تھا اور یہ سب سوچتے ہوئے اس کی اپنی ماں اور بہن سے شکایتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ جن کی بے حسی اسے اس مقام پہ لے آئی تھی۔

"تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟" وقار کی آواز سن کر وہ ٹھٹک گئی تھی۔ وہ کافی دیر پہلے آفس سے آیا تھا اور کمرے میں آ کر اس نے روشنی کو پول کے کنارے بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ کپڑے بدلنے کے بعد بھی وہ اسے اسی پوزیشن میں بیٹھی نظر آئی۔ اس کے لمبے خوب

صورت حال کر رہے پھیلے ہوئے تھے۔ بہت دیر تک جب وہ کمرے میں نہیں آئی تو وقار خود اس کے پاس چلا آیا تھا۔

"نہیں۔ میں ایسے ہی یہاں بیٹھی تھی۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"عائشہ آپی تمہارا پوچھ رہی تھیں۔" کمرے میں آکر اس نے کہا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔"

"بولو۔" کمرے کا دروازہ کھولتے کھولتے وہ واپس مڑا۔

روشنی نے الماری میں سے ایک جیولری باکس نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ عائشہ آپی نے مجھے دیا ہے۔ شادی کا گفٹ۔" وہ اسے ڈبا پکڑانا چاہ رہی تھی۔

"اچھا ہے۔" اس نے سرسری سی نگاہ ڈال کر تبصرہ کیا لیکن ڈبے کو ہاتھ نہیں لگایا۔

"یہ آپ رکھ لیں۔" روشنی نے اگلی بات کہی۔

"میں اس کا کیا کروں گا۔ آپی نے یہ تمہیں دیا ہے۔"

"انہوں نے یہ آپ کی بیوی کو دیا ہے۔" اس کی بات سن کر وقار خاموش ہو گیا تھا۔

"آپی تمہیں بلا رہی ہیں۔" اسے کوئی بھی جواب دیے بغیر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔

وہ کمرے میں اکیلی تھی۔ رات کو وقار ان سب کو ڈنر پہ باہر لے گیا تھا۔ اس کے بعد کپڑے بدل کر وہ باہر نکل گیا تھا۔ روشنی کو بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی وقار کب تک واپس آئے گا۔ کافی پینے کا دل چاہ رہا تھا، لیکن اس وقت کسی ملازم کو کہنا اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ یہی سوچ کر وہ خود کچن میں آگئی تھی۔ اپنے لیے کافی بناتے ہوئے اسے انٹرکام بجنے کی آواز آئی۔ اس وقت کچن میں اس کے علاوہ کوئی ملازم نہیں تھا۔ اس نے انٹرکام اٹھایا۔

"ایک کپ کافی اسٹڈی میں لے آؤ۔" یہ جانے بغیر کہ دوسری طرف کون ہے۔ وقار نے مختصراً کہا تھا۔ اسے اس کے اتنی دیر تک کمرے میں نہ آنے کی وجہ اب سمجھ میں آئی تھی۔ اپنی کافی کا کپ اٹھا کر وہ اسے اسٹڈی میں دینے چلی گئی تھی۔

"بڑی جلدی بن گئی کافی۔" اپنی ٹیبل پہ رکھا کافی کا کپ اٹھاتے اس نے کافی لانے والے کی طرف دیکھا۔ وہ کمپیوٹر پہ مصروف تھا۔ مختلف کاغذ اور نقشے پھیلے ہوئے تھے۔

"تم کیوں کافی لائیں، میں نے تو عشرت سے کہا تھا۔"

"کچن میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میں اپنے لیے کافی بنا رہی تھی تو آپ کے لیے بھی بنالی۔" اس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اپنا کافی کا کپ اس کے لیے لے آئی ہے۔

"تھینک یو۔" وہ تکلف سے بولا تھا۔

آنے والے دنوں میں روشنی اس گھر کا ایک اہم رکن بن چکی تھی۔ وہ نہ صرف عائشہ کی پسندیدگی حاصل کر چکی تھی بلکہ اس گھر کے ملازموں کے دل میں بھی اس کے لیے بہت عزت اور احترام تھا۔ آٹھ دس دنوں میں کبھی اس نے ان پہ حکم نہیں چلایا تھا۔ ان کے ساتھ بہت مہذب اور شائستہ لہجے میں بات کرنے والی اپنی بیگم صاحبہ کو وہ کیوں نہ پسند کرتے۔ اس رات کے بعد اگر وہ اسٹڈی میں ہوتا تو روشنی اس کے بغیر کہے اسے کافی کا کپ دے آتی تھی۔ وقار کے متعلق اس نے جب جب سوچا وہ اسے بہت کم گو اور بے ضرر سا انسان لگا۔ کبھی کبھی وہ اسے بہت اداس لگتا تھا۔ بہت بار اس نے اسے ڈسٹرب دیکھا، وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ ایسی کون سی تکلیف اور دکھ ہے، جو اس کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔ روشنی کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ غربت تھی۔ وہ آج بھی اپنے گھر والوں کی بے انتہائی کا ذمہ دار اپنے معاشی حالات کو سمجھتی تھی۔ وہ دکھی تھی اور یہی دکھ اسے وقار کی آنکھوں میں بھی نظر آتا تھا، لیکن وقار کے پاس تو سب کچھ تھا، ہر وہ چیز جو سب کچھ خرید سکتی تھی پھر اسے کیا پریشانی تھی۔ وہ غلط تھی، دولت سے وفاداری اور خلوص نہیں خریدا

جاسکتا تھا۔ محبت نہیں خریدی جاسکتی تھی۔

عائشہ اس دوران حاصل پور کا چکر بھی لگا آئی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ روشنی بھی ان کے ساتھ چلے' جہاں ان کے چند ددھیالی رشتے دار رہتے تھے' لیکن وقار نے کہا تھا کہ وہ آج کل مصروف ہے اور وہ چاہتا ہے کہ روشنی اس کے ساتھ ہی جائے' عائشہ نے اس کی خواہش کا احترام کیا تھا اور دوبارہ اسے چلنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ ولیمہ کی بات کو بھی وقار نے اسی طرح ٹالا تھا۔ عائشہ خود بھی وقار کے نئے پروجیکٹ سے واقف تھیں اور اس کی مصروفیت کے پیش نظر وہ اسے مجبور نہیں کر سکتی تھیں۔

"ولیمہ ہم آپ کے اگلے وزٹ پہ رکھ لیں گے۔ ابھی تو مجھے اتنے کام ہیں کہ یہ تو آپ کی وجہ سے میں آج کل پاکستان میں ہوں' ورنہ دبئی میں ہوتا۔"

اور وہ اتنا غلط کہہ بھی نہیں رہا تھا۔ اس دوران نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ایک دن کے لیے دبئی جانا پڑا تھا۔

"ماموں کا ولیمہ سرپرائز میں کرلیں گے ممی! اس وقت پاپا بھی ہمارے ساتھ آئیں گے۔" سحر نے کہا تھا۔

وہ سب اس کی بات سن کر مسکرائے تھے سوائے روشنی کے۔ چند دن میں وہ ان ہنستے مسکراتے کچھ پرفیکٹ سین سے غائب ہو جائے گی اور دوبارہ کبھی ان سے مل نہیں پائے گی۔

اس گھر میں اس کی پسندیدہ ترین جگہ وہ سوئمنگ پول تھا۔ پانی کے پاس بیٹھے اسے وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ وقار نے اسے کئی بار اس جگہ بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ کیا سوچ رہی ہے۔ وہ اس کے حالات سے واقف تھا۔ اس کی زندگی کے ایک تاریک گوشہ کا چشم دید گواہ تھا۔ اسے اس معصوم لڑکی پہ ترس آتا تھا جو مطلبی رشتوں کی بھینٹ چڑھی ہوئی ہے۔

عائشہ کے جانے کے دو دن بعد روشنی کی دبئی کی فلائٹ کنفرم تھی۔ جانے سے پہلے وہ وقار کو وہ سارے زیور' رقم واپس کر رہی تھی جو وقار اور عائشہ نے اسے دیے تھے۔

"یہ بھی آپ کا ہے۔" اس کا موبائل فون واپس کرتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"یہ کچھ پیسے رکھ لو روشنی۔" چند نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وقار نے نظریں چرائیں۔

"آپ اگر اس سب کا معاوضہ ادا کرنا چاہتے ہیں تو وہ آپ پہلے ہی مجھے دے چکے ہیں۔"

"یہ قیمت نہیں بلکہ اس احسان کے لیے ہے جو تم نے مجھ پہ کیا۔"

"احسان تو آپ نے کیا ہے مجھ پر' میں نے تو صرف بدلہ چکایا ہے۔ میرا خیال ہے فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے' ہمیں چلنا چاہیے۔" مسکراتے ہوئے اس نے اپنا سامان اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔ وہ آج واپس جارہی تھی وہ جانے کے لیے ہی آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبح کے چار بج رہے تھے۔ ایک چوکیدار کے سوا کسی نے اسے وہاں سے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ باہر جانے سے پہلے اس نے ایک نظر اس گھر کو دیکھا جہاں اسے دوبارہ کبھی نہیں آنا تھا۔ اس گھر اور یہاں کے مکینوں نے اسے بہت عزت دی تھی۔ یہاں رک کر وہ زندگی کے اس خوب صورت رنگ سے آشنا ہوئی تھی' جس سے پہلے وہ انجان تھی۔ اس کا تعارف محبت سے ہوا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی اس محبت کا کوئی انجام نہیں ہے۔ یہ یک طرفہ جذبہ ہے وہ اپنے دل کو روک نہیں پائی تھی۔ وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ جانے سے پہلے وہ اس سے آنکھیں نہیں ملا پائی تھی۔ اسے لگتا تھا وہ اس کی طرف دیکھے گی تو وقار ضرور جان جائے گا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ وہ اس کی دی ہوئی ہر چیز وہاں چھوڑ آئی تھی۔ اس کے سارے کپڑے اسی وارڈروب میں لٹکے تھے۔ جاتے ہوئے وہ اپنے دو سال پرانے کاٹن کے سوٹ اور کالی چادر میں تھی' لیکن وہ وہاں سے خالی ہاتھ نہیں آئی تھی۔

* * *

وہ چیک کرنے اپنی جاب میں مصروف ہو گئی تھی۔

وقار نہ دل سے نکلتا تھا نہ دماغ سے اور جب یاد آتا تھا تو بہت یاد آتا تھا۔ آج کل وہ اوور ٹائم بھی کر رہی تھی اور بغیر کسی چھٹی کے لگاتار کام کرتے اسے تیسرا ہفتہ تھا۔ آمنہ کی فیس کے پیسے اکٹھے کرنے کے لیے اسے یہ سب کرنا تھا۔ رات کو تھک کر بستر پہ لیٹتی تو سونے سے پہلے جو آخری شبیہہ ذہن کے پردے پہ بنتی وہ وقار کی ہوتی۔ صبح اٹھ کر جو پہلا شخص یاد آتا وہ وقار ہوتا۔ اس شخص نے اس کے دل و دماغ کو کچھ ایسے اپنی گرفت میں لیا تھا کہ وہ اس شکنجے سے خود کو چھڑا ہی نہیں سکی تھی یا وہ چھڑانا چاہتی بھی نہیں تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے وقار سے محبت کیوں ہوئی۔

وہ پرکشش شخصیت رکھتا تھا۔ خوب صورت تھا' شائستہ تھا' دولت مند اور پڑھا لکھا تھا۔ اس میں بہت سی خوبیاں تھیں' لیکن ایسی خوبیاں تو اس نے پہلے بہت سے مردوں میں دیکھی تھیں۔ اس کے اسٹور پہ آنے والے بے شمار کسٹمرز جو نہ صرف اچھی شخصیت کے مالک تھے' بلکہ شائستہ اور دوستانہ تھے۔ اسے ان سب سے مسکرا کر بات کرنا ہوتی تھی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے ذہن پر اپنا نقش نہیں چھوڑ پایا تھا۔ وہ اگلے پل انہیں بھول جاتی تھی۔ شاید وہ وقار کے ساتھ کافی دن گزار کر آئی ہے۔ اس لیے اسے اس کی عادت ہو گئی ہے اور آہستہ آہستہ وہ اسے بھول جائے گی۔ شروع شروع میں اس نے اپنے آپ کو یہی کہہ کر تسلی دی تھی' لیکن دو ماہ بعد بھی وہ شخص اس کے حواسوں پہ اسی طرح سوار تھا۔ وہ آج بھی آنکھیں بند کرتی تو اسے اس کا چہرہ سوچنا نہیں پڑتا تھا' بلکہ وہ خود بخود سامنے آجاتا تھا۔

آج اسے اسٹور سے واپس آتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ وہ جلدی گھر آجاتی اگر راستے میں بائیک خراب ہونے کی وجہ سے ٹریفک جام نہ ہوتا۔ بس سے اتر کر وہ بلڈنگ کے اندر جا چکی ہوتی' اگر اسے بلڈنگ کی بائیں طرف

دھند دکھائی دیتا۔ ایک بار پھر اس کے ساتھ وہی ہو رہا تھا جو پچھلے دو ماہ میں کئی بار ہو چکا تھا۔ یہ اسے دوبارہ دیکھنے کی امید تھی جو وہ بار بار اسے اپنے ارد گرد پھرتے لوگوں میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس دن وہ مال سے نکل رہی تھی جب اسے لگا وہ اس کے پاس سے تیزی سے گزرا ہے۔ وہ دراز قد تھا۔ اس نے وہی چیک شرٹ پہن رکھی تھی۔ جیسی اس نے وقار کو پہنے دیکھی تھی' وہ بے تحاشا اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ اس کے ساتھ اسٹور سے اپنی شفٹ ختم کرکے نکلنے والا عملہ اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

"وقار! رکیں۔" اس کے قریب پہنچ کر وہ چلائی تھی۔ اس شخص نے مڑ کر اسے دیکھا' لیکن وہ کوئی اور تھا۔

"معاف کیجئے گا' مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔" معذرت کرتی وہ واپس اپنے کولیگز کے پاس آگئی تھی اور یہ ایک بار نہیں بار بار ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اپنے کام کے سلسلے میں وہ آئے دن دبئی آتا رہتا ہے اور یہ کوئی حیرانی والی بات نہ ہوتی' اگر وہ اسے اس چھوٹے سے شہر میں مل بھی جاتا' لیکن وہ اسے کبھی نہیں ملا تھا۔ سر کو جھٹک کر اس نے بلڈنگ کے اسٹیپ پہ پاؤں رکھا۔

"روشنی!" وقار کی آواز پہ روشنی کے بڑھتے قدم رک گئے تھے۔ بے یقینی سے مڑ کر اس نے اندھیرے میں کھڑے شخص کو دیکھا۔ وہ بے اختیار اس کی طرف آئی تھی۔ آنکھوں میں ناقابل یقین حیرت لیے وہ اسے یک ٹک دیکھ رہی تھی۔

"آپ یہاں؟" چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے خوشی چھپاتے ہوئے کہا۔

وہ اس کی بات سن کر مسکرا دیا تھا۔ اپنی ہی چھا جانے والی شخصیت کے ساتھ وہ گرے شرٹ اور بلیک پینٹ میں پورے دو مہینے بعد اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"اگر تم فری ہو تو کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ چل سکتی ہو؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

بے اختیاری میں اس کا سر اثبات میں ہلا تھا۔ وہ اسے انکار کر ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ آج بھی گاڑی اتنی ہی خاموشی اور انہماک سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ دونوں اب ساحل پہ آگئے تھے۔ آسمان پہ چودھویں کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ سمندر کی تیز ہوا اور اس سے اٹھتی لہروں کا شور یہ سب کتنا بھلا لگ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک بینچ پہ بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ "ایک دوسرے کے دل کے حال سے بے نیاز۔

"مجھ سے شادی کرو گی روشنی؟" اس نے کرنٹ کھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے ہر بات کی امید کر سکتی تھی سوائے اس بات کے۔

"کیا۔ کیا کہا آپ نے؟"

"شادی کرو گی مجھ سے؟ چند دنوں کے لیے نہیں بلکہ عمر بھر کے لیے تمہیں اپنے گھر لے کر جانا چاہتا ہوں۔ چلو گی میرے ساتھ؟"

"اچانک اس فیصلے کی وجہ؟" اس کے منہ سے نکلا تھا حالانکہ کہنا تو چاہتی تھی بسر و چشم، لیکن یہ انا بھی انسان کو کیسے امتحان میں ڈال دیتی ہے۔

"میرے اس فیصلے کی اصل وجہ تو میں بھی نہیں جانتا اور یہاں آنے سے پہلے تک میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ میں تمہیں شادی کا پرپوزل دوں گا" خود کو بہت تسلیاں دے چکا ہوں کہ مجھے تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، لیکن جتنا تمہیں بھولنے کی کوشش کرتا ہوں تم اتنا یاد آتی ہو، بری طرح میرے حواس پہ چھا گئی ہو۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے روشنی۔"

"عائشہ آپی کی وجہ سے؟"

"نہیں۔ اپنے لیے۔" اس کی بات سن کر وہ مسکرا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی! میں شادی کر رہی ہوں۔ وہ مجھے یہاں دبئی میں ملا تھا اور اس نے مجھے پرپوز کیا ہے۔ میں اسے آپ سے ملوانا چاہتی ہوں۔"

"تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو روشنی؟ اسی دن کا خوف تھا مجھے شروع سے اس لیے میں نہیں چاہتی تھی تم دبئی جاؤ کیا کہوں گی میں لوگوں سے کہ میری بیٹی نے دبئی میں شادی کے لیے لڑکا پسند کر لیا ہے۔"

"لیکن امی! میں آپ کی مرضی اور پسند سے اس سے شادی کی بات کر رہی ہوں اور یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔"

"تمہارے لیے نہیں ہے، لیکن میرے لیے ہے۔ ویسے تو تم بڑا کہتی تھیں۔ ساری زندگی ماں اور بہن کا خیال رکھنے کے دعوے کرتی تھیں، لیکن ایک لڑکا پسند آتے ہی تمہیں ماں اور بہن بھول گئی ہیں۔ سوچا ہے میرا اور آمنہ کا کیا ہوگا۔ کس طرح گزر بسر ہوگی ہماری۔ تم اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہو روشنی۔"

ان کی بات سن کر اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر ایک آخری بات کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

"امی! میں کل صبح نکاح کر رہی ہوں۔" چند لمحے صابرہ اور آمنہ کے رویے کی تکلیف کو وہ زہر کا گھونٹ سمجھ کر پی گئی تھی، لیکن آج اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ دونوں اس کا استعمال کر رہی ہیں۔ اپنی ضروریات کی وجہ سے اس کی ماں اس کی شادی کے فیصلے سے ناخوش تھی۔ انہیں خوف تھا کہ روشنی شادی کے بعد انہیں سپورٹ نہیں کرے گی اور وہ انہیں یہ نہیں بتا پائی تھی کہ وقار نے اس سے خود کہا تھا کہ وہ آمنہ کی تعلیم مکمل ہونے تک اس کے گھر والوں کی ذمہ داری اٹھائے گا۔ وہ ان کی بے حسی اور لالچ کو مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنی ماں کی مرضی اور شمولیت کے بغیر شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، لیکن کبھی کبھی جو ہم سوچ نہیں پاتے وہ قدرت کا فیصلہ ہوتا ہے۔

ان کا نکاح دبئی میں ہوا تھا اور اپنی جاب سے ریزائن کر کے وہ اس کے ساتھ ایک بار پھر اپنی گھر میں واپس آگئی تھی۔ کنٹریکٹ ختم کیے بغیر اور کسی پیشگی نوٹس کے بغیر نوکری سے اس طرح ریزائن کرنے کا مطلب بہت سے لیگل ایشوز کی صورت میں سامنے آتا ہے جس میں سب سے بڑا مسئلہ دبئی کورٹ سے نا اہل ہونا تھا اور یہ سب ہو بھی جاتا اگر اس کا شوہر وقار

حسن نہ ہوتا تو خود وہاں ایک بہت بڑی کنسٹرکشن کمپنی کا مالک تھا اور ساری لیگل کمپلیکیشنز کا حل اس کے پاس تھا۔ اس گھر میں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ عفت بی اسے دیکھ کر نہال ہو گئی تھیں۔ باقی کے ملازموں نے بھی اس کا پرجوش استقبال کیا تھا۔ وہ سب یہ ہی جانتے تھے کہ روشنی اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے ایمرجنسی میں دبئی گئی ہے۔ عائشہ اور اس کے بچوں کی طرح گھر کے ملازم بھی اس سے مانوس ہو گئے تھے اور اس کی واپسی پہ بہت خوش تھے۔ اس کی ہر چیز کمرے میں اسی جگہ پڑی تھی، جہاں وہ چھوڑ کے گئی تھی۔

"جانتی ہو، تمہیں میرے علاوہ اس گھر میں سب سے زیادہ کس نے مس کیا ہے؟" وقار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ سلور کرنے ساڑھی میں وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ وقار نے ایک قیمتی ہیروں جڑی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی۔

"اچھی لگ رہی ہے۔" اس کے ہاتھ کی پشت کو چومتے ہوئے بولا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں مجھے گھر میں اور کس نے مس کیا۔" وہ تجسس سے پوچھ رہی تھی۔

"سوئمنگ پول نے، جہاں تم گھنٹوں بیٹھی پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی تھیں۔" وہ مسکرا دی تھی۔

"مجھے وہ جگہ بہت پسند ہے، پرسکون ملتا تھا وہاں بیٹھ کر۔ زندگی میں اتنی الجھنیں تھیں جنہیں سوچتے ہوئے میں خود الجھ جاتی تھی۔ ایسے میں دنیا سے ڈسکنیکٹ ہو کر بڑا ریلیکس فیل کرتی تھی میں۔" وہ اداسی سے بولی۔

"تم بہت سادہ اور معصوم ہو روشنی تمہارا دل بہت شفاف ہے، میں جانتا ہوں تم اپنی امی اور بہن کی ناراضی سے اپ سیٹ ہو، لیکن ڈونٹ وری، ہم کل جا کر انہیں منالیں گے۔" اس نے اسے بہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا اب بھی کوئی الجھن باقی ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"لیکن مجھے ایک الجھن ہے۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"آپ کو کیا الجھن ہے؟" وقار کی بات نے اسے حیران کر دیا تھا۔

"کیا تم آج رات بھی اسی صوفے پہ سونے والی ہو؟" وہ شرارت سے بولا۔

"نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے سر جھکا لیا۔

☆ ☆ ☆

"امی پلیز۔ مجھے معاف کردیں۔ میں جانتی ہوں، میں نے آپ کا دل دکھایا ہے، یقین جانیں میں ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی، لیکن مجھے لگا آپ کی تشویش اور بدگمانی میرے ساتھ زیادتی ہے۔ میں بھی آپ کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ میں کیسے آپ سے اور اپنی بہن سے رشتہ ختم کر سکتی ہوں، مجھے احساس ہے کہ آپ کو میری کتنی ضرورت ہے، لیکن آپ کو بھی سوچنا چاہیے تھا کہ میں اپنی زندگی جینے کے لیے آپ کو بے آسرا نہیں چھوڑوں گی۔"

وہ وقار کے ساتھ آج صبح ہی اپنے گھر پہنچی تھی اور صابرہ سے معافی مانگ رہی تھی۔ شروع میں صابرہ اس کے ساتھ کافی تلخ رہی تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کا دل موم پڑنا شروع ہوا۔ وقار انہیں پہلی نظر میں ہی بہت اچھا لگا تھا۔ روشنی کو دیکھ کر تو وہ اسے پہچان ہی نہیں سکی تھیں۔ وہ اس کے قیمتی لباس اور مہنگے زیورات دیکھ کر دنگ رہ گئی تھیں اور اس کے ساتھ ہی صابرہ کی یہ تشویش بھی ختم ہو گئی تھی کہ روشنی شادی کے بعد انہیں خرچا نہیں دے گی، بلکہ اب تو انہیں یقین تھا کہ روشنی انہیں پہلے سے زیادہ سپورٹ کرے گی اور یہ ان کی خام خیالی ہی تھی۔

"آئمہ کہاں ہے؟" وہ اپنی بہن کا پوچھ رہی تھی۔

وقار آفس چلا گیا تھا، اسے چند ضروری کام تھے اور روشنی دو سال بعد اپنے گھر والوں سے مل کر اتنی خوش تھی کہ وہ اسے چاہ کر بھی اپنے ساتھ نہیں لا پایا تھا۔

"آئمہ یونی ورسٹی گئی ہوئی ہے۔ دو بجے تک آجائے گی۔" صابرہ نے اسے بتایا۔ لیکن جب چار بجے تک بھی آئمہ کی واپسی نہیں ہوئی تو مجبوراً" روشنی کو واپس جانا پڑا۔ وقار کا ڈرائیور کافی دیر سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"میں اس سے اگلی بار مل لوں گی امی!" صابرہ کو تسلی دیتی وہ وہاں سے چلی آئی تھی۔ صابرہ نے اس کے سامنے ہی اسے دو بار کال کی تھی اور روشنی کی آمد کا بتایا تھا' لیکن وہ کہہ رہی تھی کہ اسے یونی ورسٹی میں کچھ کام ہے اور اسے دیر ہو جائے گی۔

☆ ☆ ☆

کافی کا کپ برابر والی میز پہ رکھنے کے لیے وہ جھکی' اس کے لیے بال اس کی پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ ذرا آگے بڑھ کر اس نے روشنی کے بالوں کو چوم لیا۔

"مجھے تمہارے بال بہت پسند ہیں۔"

"مجھے پتا ہے۔" مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا؟" اس کے بالوں میں انگلیاں گھماتے اس نے پوچھا۔

"نتاشا نے بتایا تھا۔" اس نے شرارت سے کہا۔

"کیا بتایا تھا نتاشا نے؟" اسے کچھ حیرت ہوئی۔

"یہی کہ آپ نے اسے میرے بالوں سے متعلق ہدایت دی تھی کہ وہ انہیں کاٹنے یا خراب کرنے کی کوشش نہ کرے۔"

"ویل!" اس نے مطمئن انداز میں کہا۔

"اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ مجھ پہ ڈارک میک اپ بالکل اچھا نہیں لگتا ہے۔" یہ اسے شرمندہ کرنے کی ایک کوشش تھی' لیکن وہ اس سے ہرگز متاثر نظر نہیں آیا۔

"بالکل ٹھیک۔" اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ ہنس پڑی۔

"نتاشا کو آپ نے میرے بارے میں کیا بتایا تھا؟ وہ کہہ رہی تھی اپنی شادی پہ ضرور بلانا۔" اسے اچانک یاد آیا تھا۔

"کچھ نہیں' بس یہی کہ تم میری دور کی کزن ہو اور حاصل پور میں رہ کر تمہاری گرومنگ نہیں ہو سکی' اب شادی کے بعد امریکا جانا ہے۔ اس لیے تمہارا میک اوور کروانا ہے۔" کافی کے گھونٹ بھرتے وہ اسے بتا رہا تھا۔

"ایک اور جھوٹ' اسٹوریاں بنانے میں کافی مہارت ہے آپ کو۔" وہ ہنس پڑا تھا۔

"اچھا میری امی اور چھوٹی بہن آپ سے ملنے آنا چاہتی ہیں۔" اسے صابرہ کے فون کا خیال آیا جو انہوں نے کل کیا تھا اور آئمہ بھی اس کے گھر آنے کی خواہش رکھتی تھی۔

"آج رات تو میں کراچی جا رہا ہوں' اور پھر وہاں سے واپسی پہ کل ایک میٹنگ ہے اور پرسوں رچرڈ آ رہا ہے' اس کے ساتھ مجھے اگلے دن دبئی جانا ہے۔ اگلے ویک بلا لو۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"پھر دبئی جا رہے ہیں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ڈارلنگ! وہاں میرا آفس ہے اور آدھا مہینہ میرا وہاں گزرتا ہے' ویسے بھی آج کل جو پروجیکٹ شروع کیا ہوا ہے اس کی وجہ سے پاکستان سے زیادہ وہاں میری ضرورت ہے۔ تمہیں لے کے جاؤں گا وہاں پھر دیکھنا کتنا بڑا پروجیکٹ ہے' وہ لوور میں مصروف ہونے کا ڈراما نہیں کر رہا ——" اس کی ٹھوڑی کو چوستے ہوئے وہ اب بستر سے اٹھ بیٹھا تھا۔

☆ ☆ ☆

کراچی سے واپسی پہ وہ اسے ڈنر کے لیے باہر لے گیا تھا۔

"عائشہ آپی کی کال آ رہی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"السلام علیکم آپی۔ کیسی ہیں آپ؟"

"وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں' یہ بتاؤ' روشنی کیسی ہے' اس کی دبئی سے واپسی ہو گئی یا ابھی وہیں ہے؟ تم نے تو اسے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔" ان کی بات سن کر وہ ہنسا تھا۔

"روشنی میرے ساتھ ہی ہے اور ٹھیک بھی ہے'

آپ خود بات کرلیں۔" عون اس کو تھما کر خود کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

عائشہ اس سے کافی دیر باتیں کرتی رہی۔ اتنے ماہ بعد اس کی عائشہ سے بات ہو رہی تھی۔ کئی بار عائشہ نے اس کا نمبر مانگا تھا اور وقار کسی نہ کسی طرح اس کی بات ٹال جاتا تھا۔ اس سے بات کرتے ہوئے روشنی مسلسل مسکرا رہی تھی۔ عائشہ کے علاوہ اس کے دونوں بچوں نے بھی اپنی سوئٹ ماں سے بات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ وہ دونوں اسے کتنا مس کر رہے ہیں۔

☆ ☆ ☆

اگلے ہفتے اس نے صابرہ اور آئمہ کو ڈنر پہ بلایا تھا۔ وہ دونوں اس وقت لاؤنج میں بیٹھی تھیں، جب وقار گھر میں داخل ہوا۔ ان دونوں کو دیکھ کر انہیں سلام کرتے ہوئے وہ اپنے بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ روشنی کے لیے وقار کا ان دونوں کو اس طرح نظر انداز کرنا حیران کن تھا۔ جبکہ پچھلی بار صابرہ سے بہت خلوص اور اپنائیت سے ملا تھا۔

"میں ابھی آتی ہوں۔" ان سے معذرت کرتی وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

وہ فرنچ ونڈو سے سوئمنگ پول کو دیکھ رہا تھا۔ روشنی کی طرف اس کی پشت تھی۔ زندگی میں اگر وہ کسی چہرے کو دوبارہ نہ دیکھنے کی خواہش کرتا تھا تو وہ ایک چہرہ تھا۔ اگر وقار کا بس چلتا تو ایک لمحہ بھی اسے اپنے گھر میں برداشت نہ کرتا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ غصہ دبانے کی کوشش میں اس کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ لیکن اچانک روشنی کے نرم بازوؤں کی محبت بھری گرفت نے اس کے تنے ہوئے وجود کو موم کی طرح پگھلا دیا تھا۔

"لگتا ہے آپ کافی تھکے ہوئے ہیں۔ امی اور آئمہ آپ سے ملنے آئی ہیں۔" اس کی کمر میں اپنے بازوؤں کا گھیراؤ لیے وہ اسے بتا رہی تھی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"آئمہ آپ سے ملنے کے لیے بہت ایکسائیٹڈ تھی۔ امی نے بہت تعریف کی ہے اس سے آپ کی۔"

وہ اس کی خاموشی سے کوئی نتیجہ اخذ کیے بغیر بولی۔ وہ اب بھی اس کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی۔

"تم چلو، میں بس آرہا تھا۔" خود کو پرسکون کرتے اس نے سنجیدگی سے کہا۔ روشنی اس کی بات سن کر اب کمرے سے باہر جا چکی تھی۔ کتنا فرق تھا ان دونوں بہنوں میں۔ ایک اتنی سادہ اور معصوم، دنیا کے ہر فریب سے پاک، جس کا خلوص اس کے لہجے سے جھلکتا تھا۔ جس کی بے ریا آنکھوں میں اسے صرف سچ نظر آتا تھا اور آئمہ۔ دھوکے باز، لالچی، فلرٹ، جھوٹ کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا اس کا وجود اور آج اس نے اس لڑکی کو اس کے ایک اور جھوٹ کے ساتھ پکڑا تھا۔

اسے اتنے دنوں میں ایک بار بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ آئمہ اور روشنی کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ جس آئمہ کو ایک سال سے جانتا تھا۔ اس نے تو اپنا تعارف ایک امیر خاندان کی اکلوتی بیٹی کی حیثیت سے کرایا تھا۔ اسے وہ دن یاد آیا تھا جب اسے رات کو اعظم کے ساتھ دیکھنے کے بعد اگلے دن وہ اس سے ملنے گیا تھا۔

"تم میری کال کیوں نہیں ریسیو کر رہی تھیں آئمہ؟" پچھلی رات سے کئی بار وہ اسے کال کر چکا تھا اور بہت مشکل سے اس سے ملنے پہ آمادہ ہوئی تھی۔

"میں مصروف تھی۔" اس نے لاپروائی سے کہا تھا۔

"اور غالباً" اس مصروفیت کا نام اعظم مسعود ہے۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مجھے یہ جان کر حیرت نہیں ہوئی کہ تم یہ سب جانتے ہو۔" وہ اس کی ڈھٹائی پہ حیران ہوا تھا۔

"تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہو آئمہ، کسی سے چند دن پہلے ملنے کے بعد تم میرے ساتھ اپنی ایک سال پرانی کمٹمنٹ کیسے ختم کر سکتی ہو۔"

"میں اعظم مسعود کو پچھلے دو سال سے جانتی ہوں، میری فرینڈ کا کزن ہے وہ۔ کافی پرانی دوستی ہے اس کے ساتھ میری۔ تمہارا نمبر تو اس کے بعد آتا ہے۔ یاد ہے

کیسے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ میں نے سوچا چلو تھوڑے دن انجوائے کر لیتے ہیں۔ ورنہ کہاں تم اور کہاں اعظم مسعود۔" وہ تنفر سے بول رہی تھی۔

"یہ تم کہہ رہی ہو آئمہ! حالانکہ تم جانتی ہو' تمہاری وجہ سے میں نے آپی سے کتنا بڑا جھوٹ بولا ہے' تم راضی تھیں مجھ سے شادی کرنے کے لیے' اپنی والدہ سے بات کر چکی تھیں اور اب تم کہہ رہی ہو کہ تمہارے لیے وہ سب ٹائم پاس تھا۔ میں محبت کرتا ہوں تم سے اور یہ بات تم بھی جانتی ہو۔" وہ اس کی باتوں سے چکرا گیا تھا۔

"تو میں کیا کروں' یہ تمہارا مسئلہ ہے اور تمہیں ایسا جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ مجھ سے بہت سے لوگ شادی کے خواہش مند ہیں' کب ہر کسی سے تو میں شادی نہیں کر سکتی ہوں۔"

وہ طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اپنی یہ بے عزتی وہ مر کر بھی بھول نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنے سامنے بیٹھی اس حسن کی دیوی سے اس لمحے شدید نفرت ہوئی تھی۔ دکھ محبت میں ٹھکرائے جانے کا نہیں تھا' بلکہ شاک اس ذلت نے دیا تھا جو کسی کے ہاتھوں بے وقوف بننے سے ملتی ہے۔

وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ ضدی' اسے وہ سب چاہیے ہوتا تھا جو ایک بار منہ سے نکل پڑتی تھی۔ وہ ذہین بھی تھی اور اسی وجہ سے سب گھر والوں کے دلوں میں اس کا نمایاں مقام تھا۔ روشنی اس کے برعکس پڑھائی میں بھی اتنی اچھی نہیں تھی۔ میٹرک تک اس کے گھر کے حالات دگرگوں تھے اور اس کی دنیا محدود۔ ایک سرکاری اسکول میں پڑھتے ہوئے اس کا باہر کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس نے روشنی کو جان مارتے دیکھا تھا۔ چند ہزار کی نوکری کے لیے جوتیاں چٹخاتے دیکھا تھا۔ اسے روشنی نہیں بننا تھا۔ وہ آئمہ تھی۔ اسے بہت کچھ حاصل کرنا تھا اور وہ بھی بغیر جدوجہد کے۔ روشنی کی قناعت پہ اسے غصہ آتا تھا۔ اس کی ماں بھی روشنی کی طرح تھوڑے سے پیسوں پہ صبر شکر کرتی اور وہ اندر ہی اندر ان کی اس حماقت پہ ہنستی تھی۔

روشنی وہاں چلی گئی تو گھر میں اچانک کھلا پیسہ آنے لگا۔ روشنی کے جانے کے بعد صابرہ مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں تھیں۔ حالات بدلے تو صابرہ کی سوچ بھی بدل گئی تھی۔ کالج میں آ کر اس کا ملنا جلنا جس کلاس کی لڑکیوں سے ہوا' اس نے اسے اپنے موجودہ حالات سے اور بھی شاکی کر دیا تھا۔ وہ ان جیسی بننا چاہتی تھی۔ لڑکوں سے اس کی پہلی دوستی تھرڈ ایئر میں شروع ہوئی۔ وہ اس کی کلاس فیلو کا بھائی تھا اور اس پہ بری طرح فریفتہ تھا۔ اس کے ساتھ باتیں کر کے' گھوم پھر کر اسے اچھا لگتا تھا' لیکن وہ اس سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں رکھتی تھی۔ وہ خود ابھی اسٹوڈنٹ تھا اور اس کی مالی حالت بھی مستحکم نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اس پہ کافی خرچا کرتا تھا۔ وہ جلد ہی اس سے بور ہو گئی تھی' کیونکہ وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے وہ چند اور لڑکوں سے دوستیاں کرتی رہی اور پہلے کی طرح ان کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی' لیکن یہ دوستیاں محض ہوٹلنگ اور سینما کے حد تک تھیں۔ اس وقت وہ صابرہ سے سہیلی کے ساتھ جانے کا یا کالج میں ایکسٹرا کلاسوں کا بہانا کر لیا کرتی تھی۔"

اعظم مسعود وہ پہلا شخص تھا جس سے ملاقات کے بعد وہ خود اس سے رابطے کی کوششوں میں لگ گئی تھی۔ وہ ایک ایم این اے کا بیٹا تھا۔ اسسٹنٹ کمشنر تھا اور بے تحاشا امیر اور مضبوط خاندانی بیک گراؤنڈ رکھتا تھا۔ اس سے روشنی کی ملاقات روبی کے گھر ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ وہ اس کا دور کا کزن تھا۔ اگلی بار وہ اسے ایک ہوٹل میں ملا تھا جہاں وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ ہائی ٹی کے لیے گئی ہوئی تھی۔ اس بار اعظم مسعود کو بھی اس میں دلچسپی پیدا ہوئی تھی اور اس سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ وہ اسے ایک اور دنیا سے متعارف کروا رہا تھا۔ آزادی اور بے تحاشا دولت سے اس کا تعارف اعظم مسعود کی بدولت ہوا تھا۔ وہ اسے مہنگی مہنگی چیزیں خرید کر دیتا' پرفیوم' قیمتی سوٹ' فائیو اسٹار ہوٹلوں میں کھانے اور نئے نئے موبائل فون

لے اعظم کی سمت سے چلے تھے۔

اس میں ایسی کوشش تھی کہ اعظم جیسا گھاگ اور فطرت شناس شخص بھی پوری طرح اس کے قبضے میں تھا۔ اس میوزیکل کنسرٹ کے ٹکٹ بھی اسے اعظم مسعود نے ہی بھجوائے تھے، کیونکہ اس نے وہاں جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ خود ایسی جگہوں پہ نہیں جاتا تھا اور وہیں اسے وقار ملا تھا۔ اسے وقار سے دوستی میں دلچسپی نہیں تھی کیونکہ وہ اعظم مسعود جیسا شخص کا اکھوانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن وقار اس میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ اعظم کی پوسٹنگ حاصل پور میں تھی کون سا وہ اس کی نگرانی کروا تا تھا۔ اس لیے وقار کے ساتھ وقت گزاری میں کیا حرج تھا اور پھر وقار سے بھی اسے فائدہ ہی مل رہا تھا۔ وقار کو اس نے اپنی حقیقت نہیں بتائی تھی اسے ضرورت بھی نہیں تھی اعظم اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں سب جانتا تھا وہی کی وجہ سے اسے پتا چل جاتا؟ اس لیے اس سے چھپانے کا فائدہ نہیں تھا۔ شروع میں صابرہ اس سے ان مہنگے تحائف کی وجہ سے سوال جواب کرتی تھیں۔ آہستہ آہستہ انہیں بھی یہ سب قابل قبول ہو گیا تھا۔ یہ ضروری تو نہیں تھا وہ لوگ تمام عمر ایک سے معاشی حالات کے ساتھ گزر بسر کرتے۔ وقار کو آئمہ نے ایک آپشن کے طور پہ رکھا ہوا تھا۔ لیکن جس دن اعظم مسعود نے اسے شادی کے لیے پرپوز کیا اس نے وقار سے پیچھا چھڑا لیا۔

☼ ☼ ☼

کھانے کی میز پہ بھی وہ خاموشی سے بیٹھا تھا۔ وہ باہر آنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن وہ روشنی کو دکھ نہیں دے سکتا تھا۔ صابرہ کے ساتھ وہ معمول کے انداز میں بات چیت کرتا رہا تھا۔ آئمہ کی معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر بھی وہ جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ روشنی یہ ہی سمجھ رہی تھی کہ وقار کا اسے نظر انداز کرنا اس لیے ہے کیونکہ اس کی ضد اور دباؤ کی وجہ سے روشنی کو کلب جانا پڑا۔ وہ وقار کی ذہنی کیفیت سے انجان تھی جو اس وقت صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کن الفاظ میں روشنی کو اپنے اور آئمہ کے بارے میں بتانا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا اس سے پہلے آئمہ روشنی کو کوئی بات بتائے۔ وہ آئمہ سے کچھ بھی امید کر سکتا تھا۔

"روشنی کو لے کر آنا بیٹا۔" صابرہ جانے سے پہلے اس سے کہہ رہی تھیں۔ روشنی جانتی تھی کہ وہ بہت مصروف ہے اور پھر وقار کے اور ان کے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ اسے وہاں لے کر جانے کے لیے اصرار نہیں کر سکتی تھی۔

"امی! وقار بہت مصروف ہیں آج کل اپنے کام کے سلسلے میں، آپ فکر نہ کریں کچھ دن تک میں خود آجاؤں گی آپ سے ملنے۔" وہ وقار کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

"میں جتنا بھی مصروف ہوں، تمہارے لیے وقت نکال سکتا ہوں۔" اس کی طرف پیار سے دیکھتے وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے بے اختیار روشنی نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پہ رکھا تھا۔ یہ اظہار تشکر تھا جو وہ خود کو ملنے والے اس مان کے بدلے اس وقت کرنا چاہتی تھی۔

"آپ فکر نہ کریں آنٹی ہم جلد ہی آپ کی طرف چکر لگائیں گے۔" وہ اب صابرہ سے کہہ رہا تھا۔ آئمہ چپ چاپ کھڑی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ تھا جسے روشنی سمجھ نہیں پائی تھی۔

ان لوگوں کو ڈرائیور کے ذریعے گھر بھجوا کر وہ دونوں اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔

"روشنی! مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی۔" وہ شیشے کے سامنے کھڑی اپنی جیولری اتار رہی تھی جب وقار نے کچھ سوچتے ہوئے اپنی بات شروع کی لیکن اسی پل اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا۔ رچرڈ کی کال آ رہی تھی۔ اس سے بات کرتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسٹڈی میں آ کر اسے کچھ ڈاکومنٹس دیکھنے تھے جو رچرڈ اسے ای میل کر چکا تھا۔ ان فائلز کو چیک کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر رچرڈ کو کال کرنے بیٹھ گیا تھا۔ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر وہ جب تک کمرے

میں آیا۔ روشنی تقریباً سو چکی تھی۔ ویسے بھی کافی رات ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا وہ اسے پہلی فرصت میں کل سب کچھ بتا دے گا۔ وہ صبح جلدی آفس آگیا تھا اور کافی مصروف تھا۔

"آپ لنچ پہ گھر آجائیں وقار۔ آپ کی فیورٹ ڈش بنا رہی ہوں میں۔" روشنی اسے فون پہ کہہ رہی تھی۔

اس کی بات سن کر وہ مسکرا دیا تھا۔ وہ آفس میں کافی بزی تھا۔ اپنے سامنے پڑی فائلوں سے سر اٹھا کر اس نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے سر کرسی کی پشت پہ ٹکا دیا۔

"ابھی ایک میٹنگ شروع ہونے والی ہے اس کے بعد گھر آؤں گا' پھر لنچ کے بعد دوبارہ آفس آنے میں کافی وقت ضائع ہو جائے گا۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"اوہ مطلب آپ نہیں آسکتے ہیں۔" اس نے مرجھائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ آپ میرے آفس آجائیں' آج میں آپ کو اپنی فیورٹ جگہ پہ لنچ کراؤں گا۔" وہ اسی کے لہجے میں اسے کہہ رہا تھا۔

"اور میرے بنائے کھانے کا کیا ہوگا؟" وہ مصنوعی ناراضی سے بولی تھی۔

"وہ میں ڈنر میں کھالوں گا۔" جواب فوراً آیا تھا۔

"ٹھیک ہے' پھر میں آپ کے آفس آجاتی ہوں۔"

وہ بخوشی راضی ہو گئی تھی۔ اس سے فون پہ بات کر کے وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس لڑکی میں جادو تھا۔ کتنی بھی تھکن اور مصروفیت ہوتی' وہ اسے منٹوں میں اپنی باتوں سے پرسکون کر دیتی تھی۔ میٹنگ سے فارغ ہو کر وہ اپنے آفس میں داخل ہوا تھا' جب اس کی سیکرٹری نے اسے ایک لڑکی کے بارے میں بتایا تھا' جو اس سے ملنا چاہتی تھی۔

"تم میرے آفس میں کیا کر رہی ہو؟" اپنے دفتر میں آئمہ کو دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ وہ اس کی ہٹ دھرمی پہ حیران رہ گیا تھا۔

"میں تمہیں اتنا بے وقوف نہیں سمجھتی تھی وقار حسن! تم مجھ سے بدلہ لینے کے لیے میری اس کم عقل بہن سے شادی کرو گے۔"

"سنو آئمہ! یہ میرا دفتر ہے اور میں یہاں کوئی تماشا کھڑا نہیں کرنا چاہتا' تم یہاں سے فوراً چلی جاؤ۔"

☆ ☆ ☆

وقار اسے لنچ پہ بلا رہا تھا۔ اس لیے وہ ایک بجے اس کے آفس پہنچی تھی۔ وہ یہاں پہلے بھی آچکی تھی۔ اس لیے کسی کی معاونت کے بغیر وہ وقار کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ شیشے کی کیبن میں بیٹھی وقار کی سیکرٹری کو دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا تھا جو اسے دیکھ کر اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ اب وقار کے کمرے کا دروازہ کھول رہی تھی' جب اپنے کانوں میں پڑتی آئمہ کی آواز سن کر وہ ٹھٹک گئی تھی۔

"مجھے اسے دیکھ کر ترس آتا ہے' کیسے بچوں کی طرح وہ اس لالی پاپ سے بہلی ہوئی ہے' جسے تم نے محبت کا نام دیا ہے۔ بے چاری یہ بھی نہیں جانتی کہ چند ماہ پہلے تک اس کا محبت کرنے والا شوہر مجھ سے شادی کرنے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ میرے لیے دیوانہ تھا' میں دن کہتی تو وہ دن دوپہر کہتا تھا اور میرے رشتہ کرنے پہ اس کی ذلت ہوئی تھی۔ اب میں یہ کیسے مان لوں کہ اچانک تمہیں میری بہن سے محبت ہو گئی ہے' جو نہ صورت میں مجھ سے بہتر ہے اور نہ اس کے پاس میرے جیسی تعلیم ہے۔ یقیناً یہ سب کچھ مجھے جیلس کرنے کے لیے ہی کیا گیا ہوگا۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی تھی۔

"آئمہ تم۔" اس سے آگے وہ کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔ دروازے کے بند ہونے کی آواز پہ اس نے چونک کر دیکھا۔

"میرے کمرے کے باہر کون تھا؟" انٹرکام پہ وہ اپنی سیکرٹری سے معلوم کر رہا تھا۔

"سر! آپ کی مسز تھیں۔" وقار کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ وہ اسے سچ بتانا چاہتا تھا' لیکن یہ سب اس

اندازمیں اس تک پہنچے گا۔

یہ وہ آخری بات تھی جو اس نے سوچی تھی۔ اپنے موبائل سے اس کا نمبر ڈائل کرتے وہ باہر کی طرف بھاگا تھا۔ آئمہ اس کے آفس میں ہے اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ گھر جا رہا تھا اپنی شادی کے پہلے چند ہفتوں میں اپنے رشتے میں آئی اس غلط فہمی کو اسے فوراً" دور کرنا تھا۔ اس کا موبائل بند تھا۔ اس کا اس طرح وقار سے بغیر ملے چلے جانا اسے اپ سیٹ کر رہا تھا۔ پتا نہیں اس نے کتنی بات سنی تھی اور اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا تھا، لیکن وہ حیران تھا چند منٹ میں وہ غائب کہاں ہو گئی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے بھی پوچھا، لیکن اس نے بھی اسے آفس ڈراپ کرنے کے بعد دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ گھر پہنچ چکا تھا، لیکن روشنی گھر پہ نہیں تھی۔ چند بار اس کے موبائل پہ کال کرنے کے بعد وہ صابرہ کی طرف چلا گیا۔ وہ اگر گھر نہیں آئی تو اپنی والدہ کے پاس گئی ہوگی۔ یہی سوچ کر وہ صابرہ کی طرف چلا گیا۔ روشنی وہاں بھی نہیں تھی۔ صابرہ اس کو دیکھ کر کافی پریشان ہوگئی تھیں۔ وہ حیران تھیں کہ آخر ان دونوں کے درمیان ایسا کیا ہوا ہے کہ روشنی اسے بغیر بتائے کہیں چلی گئی ہے۔ بوجھل دل سے وہ وہاں سے نکلا تھا۔ بے مقصد سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتے اس نے کئی بار گھر کال کرکے ملازمہ سے روشنی کے بارے میں پوچھا۔

"روشنی بی بی ابھی تک نہیں آئی ہیں۔" ہر بار کا دہرایا یہ جملہ اس کے کانوں سے ٹکرا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ہر جگہ اسے تلاش کر چکا تھا۔ سوائے اپنے دفتر کی پچھلی طرف کے جہاں وہ بہت دیر اکیلی بیٹھی رہی تھی اور پھر وہاں سے نکل کر ایک نزدیکی پارک میں آگئی تھی۔

"تم وقار کو کب سے جانتی ہو؟" چند جملے جو اس کے کانوں تک پہنچے تھے۔ ان سے وہ اتنا تو سمجھ گئی تھی کہ آئمہ اور وقار ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں۔ وہ شاک کی کیفیت میں تھی۔ اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ بہت دیر تک قریبی پارک میں بیٹھے رہنے کے بعد وہ آئمہ کے پاس گئی تھی۔

"ایک سال سے زیادہ ہو چکا ہے۔"

"کیا رشتہ تھا تم دونوں کے درمیان؟"

"کیا یہ تمہیں وقار نے نہیں بتایا کہ اس کا اور میرا کیا رشتہ تھا۔ محبت کرتا تھا وہ مجھ سے، مرتا تھا وہ جان سے مجھ پر، شادی کرنا چاہتا تھا مجھ سے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"میں تم سے کیوں جھوٹ بولوں گی آپی؟"

"وقار بہت سی لڑکیوں سے ملتے ہیں اپنے پروفیشن اور دوستانہ طبیعت کی وجہ سے ان کی کافی بے تکلفی ہے لڑکیوں کے ساتھ، ہو سکتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔" اسے صباشا یاد آئی تھی۔

"آپی! تم اگر بے وقوفوں کی جنت میں رہنا چاہتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن میں کم سے کم تم سے یہ جھوٹ نہیں بولوں گی کہ وہاں اس کے دوستانہ رویے کی وجہ سے مجھے یہ غلط فہمی ہوگئی تھی۔ ایک سال میرے پیچھے پھرتا رہا ہے وہ اپنی بہن سے یہاں تک کہہ چکا تھا کہ اس نے مجھ سے شادی کرلی ہے، کیونکہ وہ اس کی شادی اپنی نند کے ساتھ کروانے میں انٹرسٹڈ تھی۔ میرے اور اس کے درمیان تھوڑی سی مس انڈراسٹینڈنگ کیا ہوئی اس نے تم سے شادی کرلی۔ وہ جانتا تھا میں اسے اپنی بہن کے ساتھ دیکھوں گی تو جیلس ہو جاؤں گی۔ اس سے پیچ اپ کرنے کی کوشش کروں گی۔ میں تو پہلے ہی اس کے ساتھ جھگڑے کے بعد کافی شرمندہ تھی۔ تمہیں اس کے ساتھ دیکھا تو مجھے اس پہ اور بھی ترس آیا۔ اب کہاں تم اور کہاں میں۔ یہ وقار کا اسٹینڈرڈ تو نہیں ہے۔ تم جیسی سیدھی سادی اور معمولی شکل و صورت کی انٹر پاس بیوی اس کے اسٹیٹس سے کہاں میچ کرتی ہے۔ لیکن مجھے تمہارے لیے بھی بہت افسوس ہوتا ہے۔ اسے کم سے کم میری بہن کو ہتھیار نہیں بنانا چاہیے تھا اور اسی بات پہ اس سے جھگڑا کرنے میں آج اس کے

آفس گئی تھی۔"

آئمہ کے انکشاف پہ اس نے ایک گہری سانس لی تھی۔ تو یہ تھی وہ وجہ جو وقار کو بازار میں بکتی ایک لڑکی کو اپنی بیوی بنا کر اپنے گھر لانا تھا' کتنی حقیر تھی آئمہ کی نگاہوں میں اس کے لیے' یہ وہی آئمہ تھی جس کے روشن مستقبل کے لیے اس نے اپنی زندگی مختص کر دی تھی۔ جس کی خوشیوں پہ وہ اپنا آپ قربان کر سکتی تھی' آج وہ اسے احساس دلا رہی تھی کہ اس کی بہن معمولی صورت اور کم تعلیم یافتہ ہے' لیکن اس نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا۔ آئمہ ان تمام خصوصیات کی مالک تھی جو کسی بھی قابل اور کامیاب شخص کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ وہ سچ میں بے وقوفوں کی جنت میں ہی تو رہتی تھی' جو یہ نہیں جان پائی کہ اس کا اور وقار کا کیا مقابلہ۔ وہ زمین تھی اور وقار آسمان' ان دونوں کا ملاپ کیسے ممکن تھا۔ زمین کتنی بھی خوب صورت ہو اس کا آسمان سے کیا مقابلہ۔ آئمہ کی باتوں سے وہ ڈھے گئی تھی۔ بوجھل قدموں سے چلتی وہ وہاں سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"تم اس وقت کہاں ہو' میں تم سے ابھی اور اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔"

فون پہ اسے جگہ بتا کر وہ خود بھی آفس سے نکل گیا تھا۔ اس سے بھی پہلے وہ وہاں موجود تھی۔ ہمیشہ کی طرح متاثر کن' خوب صورت اور مغرور' اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ مسکرائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وقار اسے ضرور کال کرے گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ حیرت سے مر جاتی۔

اب تک جتنی بھی لڑکوں سے اس نے دوستی کی تھی۔ وہ سب اس کے لیے اتنے ہی بے چین تھے۔ اس کے ایک اشارے پہ کھنچے چلے آتے تھے اور یہ شخص تو اس پہ دل و جان سے فریفتہ تھا۔ اس کے ساتھ گزرا ہوا وقت وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ حالانکہ وہ بھی ان ہی بے وقوف مردوں کے قبیلے سے تھا جو لڑکیوں کی خوب صورتی اور ان کی اداؤں کے دیوانے ہوتے ہیں اور اسے مردوں کو بے وقوف بنانا آتا تھا۔ شروع میں وہ اسے ایک اچھا ٹائم پاس لگا تھا اور اسے اس سے شادی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اعظم مسعود بھلے فلرٹ تھا' لیکن اس جیسا اسٹیٹس اور مضبوط بیک گراؤنڈ وقار کے پاس ہرگز نہیں تھا اور پھر اعظم مسعود نے اسے شادی کی پیش کش کی تو وہ وقار سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبیں سوچنے لگی' لیکن اس کا یہ کام اتنی آسانی سے ہو جائے گا' اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

وقار نے اسے اعظم کے ساتھ دیکھ لیا تھا ورنہ خود ہی اس کی جان چھوڑ چکا تھا۔ اعظم کے ساتھ وہ بہت خوش تھی اور یہ خوشی قائم بھی رہتی اگر وہ وقار کے ساتھ روشنی کو نہ دیکھتی۔ ہتک سی محسوس کی تھی اس نے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وقار اسے چھوڑنے کے بعد اس کی معمولی شکل و صورت کی کم تعلیم یافتہ بہن سے شادی کرے گا۔ تھا کیا اس میں نہ شکل نہ تعلیم' ساری زندگی بسوں کے دھکے کھانے والی گر چند ہزار روپے کے لیے خود کو ہلکان کرنے والی اس بے وقوف سی روشنی کو وہ وقار کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ کتنے مان سے وہ اس کا ذکر کر رہی تھی' کس غرور سے وہ اس کے بازو پہ اپنا ہاتھ رکھے بیٹھی تھی' یہ منظر دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کے مہنگے کپڑے' قیمتی ڈائمنڈ اور وہ گھر جہاں وہ کسی ملکہ کی طرح بیٹھی تھی۔

حسد اور غصے میں وہ اس گھر سے نکلی تھی۔ جس روشنی کو ساری زندگی اس نے ایثار اور قربانی دیتے دیکھا تھا۔ آئمہ کو خوش کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔

روشنی کو پریشان کر کے اسے مزا آتا تھا۔ تسکین ملتی تھی۔ پچاس ہزار کیا حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے لیے وہ کسی سے نہ بھی کہتی تب بھی اس کے پاس اتنے بے شمار قیمتی تحائف موجود تھے جنہیں بیچ کر وہ اپنی فیس ادا کر سکتی تھی' لیکن وہ ایسا کیوں کرتی۔ اسے لوگوں کو آزمانے میں مزا آتا تھا اور اگر روشنی نے اس

کی ذمہ داری اضافی تھی تو یہ اس کو پوری کرنی تھی۔ وہ نہیں جانتی کہ روشنی نے چیزوں کا انتظام کہاں سے کیا تھا۔ لیکن اس کی سوچ کے مطابق اس نے روپے بچولیے تھے۔ لیکن اب مجھے ایسا ہو گیا تھا جو وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ وہ کسی صورت روشنی کو وقار کے ساتھ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اچانک اسے وقار میں دلچسپی دوبارہ پیدا ہو گئی تھی اور اب اسے وقار چاہیے تھا۔ وقار کی ناراضی اس کی توقع کے عین مطابق تھی لیکن وہ جلد اسے منالے گی وہ اس سے اتنی محبت کرتا تھا کہ زیادہ دن ناراض نہیں رہ سکتا تھا اور روشنی کو تو وہ سمجھا چکی تھی اس کے بعد اگر وقار اسے نہ بھی چھوڑتا تو روشنی اسے خود چھوڑ دے گی۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کے ساری پلاننگ کی تھی۔

وہ کرسی کھینچ کر اس کے بالکل سامنے بیٹھا بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں جانتی تھی تم مجھے ضرور کال کرو گے۔" اس نے ایک ادا سے کہا۔

"تم نے ٹھیک سوچا تھا۔ کال تو مجھے کرنی ہی تھی تم سے ایک ملاقات تو ضروری تھی۔" وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"میں 'ایک ملاقات' میں تو بھی تھی تمہیں مجھ سے بار بار ملنے میں دلچسپی ہے۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"تم نے غلط سوچا۔ آج کے بعد نہ مجھے تم سے ملاقات میں دلچسپی ہے اور نہ ہی تمہاری شکل دیکھنے میں کوئی انٹرسٹ ہے۔ میں نے تمہیں یہاں صرف یہ کہنے کے لیے بلایا ہے کہ اگر تم نے میرے یا روشنی کے درمیان آنے کی کوشش کی تو اپنے انجام کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔ آج جو کچھ ہوا اس سے تم میرے اور روشنی کے درمیان دراڑ نہیں ڈال سکتی ہو۔ لیکن پھر بھی تمہیں وارننگ ہے، روشنی کو مجھ سے بدگمان کرنے کی کوشش کرو گی تو میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔" وہ بہت سخت اور ہموار لہجے میں اسے کہہ رہا تھا۔

"تم اس بے وقوف، جذباتی اور معمولی سی لڑکی کے لیے مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے رہے ہو؟" وہ شاک کے عالم میں تھی۔

"معمولی وہ نہیں، بلکہ معمولی تم ہو۔ جس صورت پہ اتنا غرور ہے تمہیں اس میں تمہارا اپنا کوئی کمال نہیں ہے۔ اس صورت کے پیچھے چھپے اپنے گھناؤنے چہرے کو بھی میری نظروں سے دیکھو" تمہیں خود سے نفرت ہو جائے گی۔ تم اسی دن میرے دل سے اتر گئی تھیں۔ آئمہ! جس دن تم میری نظروں سے گری تھیں، میں نے زندگی میں اگر کوئی دعا سچے دل سے کی ہے تو وہ یہی تھی کہ مجھے تمہاری شکل بھی دیکھنی نہ پڑے۔ تم ہو کیا؟ تم جیسی لڑکیاں کسی عزت دار کی بیوی تو کیا دوست بننے کے قابل بھی نہیں ہیں۔" وہ بہت تلخی سے کہہ رہا تھا اور آئمہ کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔

"کیا کہا تم نے۔ میں تمہاری دوست بننے کے بھی قابل نہیں؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے ایسی بات کرنے کی۔ تم کیا سمجھتے ہو جس روشنی کی وجہ سے تم مجھے دھتکار رہے ہو وہ اب تمہارے ساتھ رہے گی۔ سب بتا چکی ہوں میں اسے اپنے اور تمہارے بارے میں، میں جانتی ہوں اسے، وہ بہن ہے میری اور کتنی جذباتی اور بے وقوف ہے اس کا شاید تمہیں اندازہ بھی نہیں۔ آج جو اسے پتا چلا ہے اس کے بعد وہ خود تمہیں چھوڑ دے گی۔ اسے مجھ سے زیادہ تم پہ اعتبار نہیں ہے۔" وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی، یہ سوچے بغیر کہ ارد گرد کتنے لوگ اسے دیکھ رہے ہیں، وہ ہذیانی کیفیت میں بولے جا رہی تھی۔

"روشنی میرے ساتھ رہے یا نہ رہے، لیکن تم یہ بھول جاؤ کہ میں دوبارہ کبھی تمہیں اپنی زندگی میں شامل کروں گا۔" اپنی بات ختم کر کے وہ کرسی پرے دھکیلتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ غصے میں اپنی انگلیوں کو موڑتی وہ اسے وہاں سے جاتے دیکھتی رہی تھی۔

وقار گھر میں داخل ہوا تو وہ بری طرح ڈسٹرب تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر بے دلی سے ٹائی کی ناٹ

کھولتے اس نے اپنا کوٹ بیڈ پہ پھینکا تھا۔ پچھلا دروازہ کھلا تھا اور وہ سوئمنگ پول کے کنارے گم صم بیٹھی تھی۔ دھیمے قدموں سے چلتا وہ اس کے قریب آیا، لیکن اس نے ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ کچھ کہے بغیر وہ اس کے برابر بیٹھ گیا تھا۔

"تم یہاں بیٹھی ہو اور میں تمہیں کب سے کال کر رہا تھا۔"

"زندگی ایک بار پھر بہت الجھ گئی ہے۔ جتنا سلجھانے کی کوشش کر رہی ہوں، سرا ہاتھ ہی نہیں آتا۔" اس کا لہجہ بہت ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر بھی جانتا تھا کہ اس کی آواز میں لرزش کا سبب اس کے آنسو ہیں۔

"روشنی! تم مجھ پہ اعتبار کرتی ہو؟"

یہ سوال تھا یا شکایت وہ جان نہیں پائی تھی۔ اس نے منہ اٹھا کر پہلی بار وقار کی طرف دیکھا۔ وہ اسے بہت تھکا اور بکھرا ہوا لگا تھا۔ کیا یہ شخص ناقابل اعتبار ہو سکتا ہے؟ کیا یہ شخص اس کی بہن سے بدلہ لینے کے لیے اس کا استعمال کر سکتا ہے؟ کیا یہ شخص اس کی بہن کے کہنے پہ اسے چھوڑ سکتا ہے؟ بہت سارے سوال تھے جو اس وقت سانپ کی طرح پھن اٹھائے اس کے دل میں اٹھے تھے اور ان ـــــ سب کا صرف ایک جواب تھا۔

"نہیں ـــ یہ دھوکے باز نہیں ہے۔" اس کے ہر لفظ پہ اسے آنکھیں بند کر کے یقین تھا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں روشنی!" اس کی آنکھوں میں دیکھتے وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے تم سے محبت کب اور کیسے ہوئی میں نہیں جانتا، لیکن میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم ان لوگوں میں سے نہیں، جو آپ کو پہلی نظر میں اپنا بنا لیتے ہیں، بلکہ تم اوس کی طرح قطرہ قطرہ دل میں اترتی ہو۔ جب تم یہاں تھیں میں ایک بار بھی اس احساس سے نہیں گزرا، اپنے کمرے میں تمہاری موجودگی مجھے پریشان کرتی تھی، مجھے اپنی پرائیویسی میں خلل محسوس ہوتا تھا، لیکن جس دن تم یہاں سے گئیں میں تمام رات سو نہیں پایا۔ بار بار میری نظر اس خالی صوفے پہ جاتی اور میں اٹھ جاتا۔ اس سوئمنگ پول کے کنارے تمہیں بیٹھے دیکھنے کی جیسے عادت سی ہو گئی تھی مجھے۔ یہ خالی جگہ پریشان کرتی۔ چند بار تمہارے ہاتھوں کی بنی کافی کا ذائقہ میں عفت بی کی بنائی کافی میں کھوجتا اور ہر بار مایوسی ہوتی۔ عائشہ آپی کو چاہ کر بھی میں یہ نہیں کہہ پایا کہ تمہیں چھوڑ چکا ہوں، جیسا کہ میں نے پلان کیا تھا، تمہاری ہر چیز اس کمرے میں تمہاری امانت کی طرح رکھی رہی۔ میری الماری میں رکھے تمہارے کپڑوں سے لے کر میری ڈریسنگ ٹیبل پہ پڑا تمہارا پرفیوم اور کاسمیٹکس بھی میں وہاں سے ہٹا نہیں پایا۔ تمہارے جانے کے بعد میں کئی بار یہیں آیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم وہاں نہیں ہو گی میں دو بار اس کلب میں گیا۔ میں تمہارا پتا جانتا تھا، چاہتا تو تم سے مل سکتا تھا، لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں یہ لگے کہ میں تم

سے لپھٹلی ملنے آیا ہوں۔ بے مقصد مال میں گھومتے ہوئے کسی سڑک پہ چلتے تم کہیں اچانک میرے سامنے آجاؤ اور میں تمہیں ایک نظر دیکھ سکوں۔ یہ بہت بچگانہ خواہش تھی لیکن میں اپنی اس خواہش کو پورا کرنا چاہتا تھا اور پھر مجھ پہ یہ انکشاف ہوا کہ میں تمہیں بے پناہ چاہنے لگا ہوں اور تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تم سے پہلے کسی اور لڑکی کو پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات میں نے تمہیں صرف اس لیے نہیں بتائی کیونکہ میں تمہیں اس بات سے تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں خود اس دھوکے اور بے عزتی کو بھولنا چاہتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آئمہ تمہاری کزن ہے، لیکن جب مجھے یہ پتا چلا تو میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا۔ جہاں تک آئمہ سے میری وابستگی کا تعلق ہے میں اسے جھٹلا نہیں سکتا۔ میں نے اس سے سچے دل سے محبت کی تھی۔ لیکن وہ اسی دن میرے دل میں اپنا مقام کھو چکی تھی، جب میں نے اسے اعظم مسعود کے ساتھ دیکھا تھا۔ تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرتے وقت وہ نہ میری زندگی میں تھی اور نہ میرے دل میں۔"

"آئمہ کہتی ہے میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ میں خوب صورت نہیں ہوں اور نہ ہی آپ کی طرح اعلا تعلیم یافتہ، میں کسی بھی طرح آپ کے معیار پہ پوری نہیں اترتی۔"

"وہ غلط کہتی ہے۔ تم اس دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہو کیونکہ تمہارا دل صاف ہے۔ اس میں دنیا کا سب سے حسین جذبہ محبت بھرا ہوا ہے۔ تم ہر طرح سے وقار حسن کی بیوی بننے کے لائق ہو۔ تم میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو کوئی بھی شخص اپنی بیوی میں دیکھنا چاہتا ہے اور یہ صرف میں نہیں کہتا، یہ عائشہ آپا بھی کہتی ہیں۔ تم سے چند دن کی ملاقات میں وہ تمہیں مجھ سے زیادہ پیار کرنے لگیں، ان کے بچے تمہارے فین ہو گئے۔ خود کو آئمہ کی نہیں میری نظروں سے دیکھو روشنی! پھر تمہیں پتا چلے گا کہ تم کیا ہو۔ خود کو اس احساس کمتری سے نکالو کہ تم آئمہ سے کسی طور کم ہو، بلکہ آئمہ کا تم سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ وہ جھوٹ اور دھوکے کا پلندہ ہے۔ اس کا ہر لفظ جھوٹ ہے، اس کی ہر ادا فریب، میں آئمہ سے نہیں تم سے محبت کرتا ہوں روشنی۔"

"میں بھی آپ سے محبت کرتی ہوں وقار!" اس کے کندھے پہ سر ٹکائے وہ کہہ رہی تھی۔ وقار نے نرمی سے اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آدھی رات کو اس کا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ پڑا اپنا فون اٹھا کر اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے جلتی بجھتی اسکرین کو دیکھا۔ صابرہ کی کال آرہی تھی۔

"امی اس وقت کیوں فون کر رہی ہیں۔" اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ وقار نے پاس پڑا لیمپ آن کیا۔ اس بے وقت کی کال سے وہ بھی جاگ گیا تھا۔

"ہیلو امی۔!" روشنی نے کہا۔ دوسری طرف صابرہ بے تحاشا رو رہی تھیں۔

"امی! آپ رو کیوں رہی ہیں؟ سب خیریت تو ہے؟" وہ پریشانی اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں ان سے پوچھ رہی تھی۔

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے روشنی! تم جلدی سے آجاؤ۔" وہ روتے ہوئے اسے بتا رہی تھیں۔

"لیکن ہوا کیا ہے امی؟ آئمہ تو ٹھیک ہے نا؟"

"اعظم مسعود نے آئمہ کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا ہے۔" اسے لگا صابرہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔

وہ دونوں ان کی کال آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ان کے پاس آگئے تھے۔ وہ روتے ہوئے انہیں بتا رہی تھی کہ وہ آئمہ کو کئی دن سے ملنے کے لیے بلا رہا تھا۔ آئمہ اس سے بات کرنے کو بھی تیار نہیں تھی۔ ایک ہی

دھن سوار تھی اس کے سر پہ کہ اسے صرف وقار سے شادی کرنی ہے۔ جس دن سے اس نے وقار کو تمہارے ساتھ دیکھا تھا' وہ غصے سے پاگل ہوگئی تھی۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ وقار تمہارا نہیں روشنی کا نصیب ہے۔ اپنی بہن کا گھر مت برباد کرو' لیکن اس پہ تو جیسے جنون سوار تھا۔ حسد اور غرور اس پر حاوی ہو گیا تھا۔ وقار کو چھوڑنے کے بعد اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اعظم مسعود سے اس کا بہت جھگڑا ہوا تھا۔ شدید غصے کے عالم میں وہ یہاں آیا تھا اور پھر آئمہ کے یہ کہنے پہ کہ وہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی ہے' وہ غصے اور جنون میں آگیا تھا۔"

اس واقعے کے بعد اعظم مسعود فرار ہو چکا تھا۔ آئمہ کی حالت تشویش ناک تھی۔ وہ ہسپتال میں تھی' بچ گئی تھی' لیکن اس کا چہرہ بری طرح مسخ ہو چکا تھا۔ صابرہ کے گھر کہرام برپا تھا۔ جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ روشنی' صابرہ کو سنبھال رہی تھی' لیکن وہ تو جیسے ڈھے گئی تھیں۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں اس کی اچھی تربیت نہیں کرپائی۔ اس کی ضد کے آگے ہار مان گئی' اس کے دکھائے سبز باغ کے لالچ میں آکر میں نے اسے کھلی چھوٹ دے دی۔ وہ کیا کررہی ہے۔ کس کس سے ملتی ہے' میں سب جانتی تھی' لیکن خاموش رہی۔ وہ پہلی سیڑھی پہ پاؤں رکھے بغیر آخری سیڑھی پہ پہنچ جانا چاہتی تھی اور میں اسے یہ نہیں بتا پائی کہ آخری سیڑھی سے گرنے والوں کو چوٹ بھی زیادہ لگتی ہے۔ سب میرا قصور ہے' اپنی ایک بیٹی کو تو میں نے محنت کی بھٹی میں جھونک دیا اور دوسری کے لیے اپنا معیار بدل دیا۔"

وہ اپنے بال نوچ رہی تھیں۔ "سب میری غلطی ہے۔ میں نے اسے امیر اور آزاد خیال لڑکیوں سے دوستی کرنے سے روکا نہیں۔" وہ یہ باتیں پچھلے تین دن میں دسیوں بار دہرا چکی تھیں۔ روشنی تین دن سے ان کے پاس تھی۔ ان تین دنوں میں ان پر وہ سب انکشاف ہوئے تھے جن سے پچھلے ڈھائی سال سے وہ بے خبر تھی۔ اسے صابرہ سے شکایت تھی' لیکن وہ اس کی ماں تھیں اور غم سے نڈھال تھیں۔ وہ ان سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ اس دکھ میں شریک تھی۔

"خود کو سنبھالیں امی! جو ہوگیا' اس پہ افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔ کچھ باتیں اپنے وقت پر نہ ہوں تو شخص پچھتاوا رہ جاتا ہے۔ غلط رستوں پہ چلنے کا انجام صحیح کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ صابرہ سے کہے بغیر نہیں رہ پائی تھی۔

"آئمہ کو معاف کردینا روشنی!" صابرہ کے لفظ اس کے دل میں نشتر کی طرح چبھے تھے۔ وہ اب بھی اسی کی حمایت کررہی تھیں۔ لیکن وہ آئمہ کو کیسے معاف کردے' جس نے اسے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اپنا انجام بھگت چکی تھی' لیکن اس کا دل شاید اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ اسے معاف کرپاتی۔ کچھ وقت لگے گا اسے بھولنے میں کہ اس کی سگی بہن نے اس کے ساتھ کتنا برا کرنے کی کوشش کی۔

وقار! آج اسے لینے آیا تھا۔ پچھلے دنوں وقار نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ ایف آئی آر درج ہونے کے بعد پولیس ابھی تک اعظم مسعود کو ڈھونڈ نہیں پائی تھی اور یہ وقار تھا جس کی بدولت وہ دونوں ماں' بیٹی پولیس کے چبھتے ہوئے سوالات سے بچ پائی تھیں۔ ہسپتال میں آئمہ کا بہترین علاج بھی اسی کی بدولت ہو رہا تھا اور وہ یہ سب روشنی کی وجہ سے کررہا تھا۔

"چلیں روشنی!" وقار دروازے پہ اس کا انتظار کررہا تھا۔ اسے اپنے گھر واپس جانا تھا' وہ گھر جس کی بنیاد اس نے خلوص اور محبت سے رکھی تھی۔

ثمرہ شکور

عشق نیاز سے

"پاپا۔" وہ اسٹڈی ٹیبل کے پاس آکے بولی۔
"جی بیٹا۔" انہوں نے اسلامک انسائیکلوپیڈیا سے نظر اٹھا کے اسے جواب دیا اور دوبارہ نظریں کتاب پر جمادیں۔
"کوئی بھی میری بات نہیں سنتا میں چلی جاتی ہوں یہاں سے۔" اس کی جھنجلائی ہوئی سی آواز کانوں میں پڑی تو وہ مسکرا دیے۔
"کہیں نہیں جارہیں تم۔ ادھر بیٹھ کے میری بات سنو۔" وہ جو دروازے کے پاس کھڑی تھی وہیں سے پلٹ آئی۔
"کوئی میری بات نہیں سنتا کسی کے پاس وقت ہی نہیں کہ مجھے اور کچھ نہیں تو اچھا سا مشورہ ہی دے دے۔" وہ جھنجلا کر بولی۔ پونی جھلاتی' آنکھیں گھماتی' ناک چڑاتی وہ پریشان سی لگ رہی تھی۔
"تو کہاں ہے وہ تمہاری ملیحہ۔ اسے کہو سب کچھ چھوڑ کے آجائے کچھ دن تمہارے پاس رہنے۔" انہوں نے مشورہ دیا۔
"اس کے ایگزام چل رہے ہیں پاپا' بالکل ٹائم نہیں اس کے پاس' ورنہ آپ جانتے ہیں مجھ سے زیادہ وہ ایکسائٹڈ ہے۔" وہ اپنی عزیز ترین دوست کی حمایت کرتے ہوئے بولی۔
"اچھا چلیں آپ بتائیں کہ میرے لیے کیا حکم ہے۔" وہ مسکرا کر گویا ہوئے۔
"مجھے پہلے ان کے ڈریس کا فکر سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس طرح کا لوں' نہ ہی مجھے سعد کی پسند کا کوئی اندازہ ہے۔"
"آج کل جو فیشن ہے اسی طرح کا کوئی لے لو۔" انہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق کہا۔
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔ وہ بغور اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔
"خیر چھوڑیں' میں کل شمزا کو ساتھ لے جاؤں گی اور جو شاپنگ رہ گئی ہے وہ بھی کرلوں گی۔"
"ٹھیک ہے اس کام کو اب ختم کرو' چند دن تو باقی ہیں بس۔" انہوں نے کہا تو اس نے سر ہلا دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ گہری سوچ میں گم ہوگئے۔

☼ ☼ ☼

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو زبیدہ' پچھلے کئی سالوں سے میں اور فلزا یہ بات جانتے ہیں کہ سعد کی شادی فلزا سے ہی ہوگی اور آج تم کہہ رہی ہو کہ سعد کو سمجھانا پڑے گا۔ سارا خاندان یہ بات جانتا ہے' تم میری بیٹی کو سارے خاندان میں رسوا کرنا چاہتی ہو۔" وہ غصے سے چیخ سے گئے۔
"نہیں بھائی جان' خدا کے لیے ایسا مت کہیں۔ فلزا میری بھی بیٹی ہے' ماں بن کے پالا ہے میں نے اسے۔"
"اگر ماں بن کے پالا ہے تو ماں بن کے سوچنا بھی چاہیے تھا۔ تم جانتی ہو وہ کس قدر حساس ہے' کتنے عرصے سے وہ سعد کو اسی خیال کے ساتھ سوچتی رہی ہے۔ سعد اور ملیحہ کے علاوہ اس کا کوئی دوست نہیں' ان کے علاوہ وہ کسی پر اعتماد تک نہیں کرتی۔" وہ صوفے پر ڈھے سے گئے۔ زبیدہ شرمندہ سی بیٹھی رہ

گئیں۔

وہ سعد کو جانتی تھیں جو فلزا کا بہت اچھا دوست تھا۔ اس کا بہت خیال رکھتا تھا' لیکن یہ سب کچھ وہ صرف اس کا کزن ہونے کے ناتے کرتا تھا۔ اس سے شادی کے ذکر پر وہ تڑپ اٹھتا تھا کہ کبھی اس سے شادی نہیں کرے گا۔

ہر دفعہ وہ بھائی سے بات کرنے کا سوچتیں اور پھر رک جاتیں' لیکن آج رات سعد کے دوٹوک انکار نے اور پھر صبح ہی صبح بھائی کے بات کرنے پر انہوں نے بھی ہمت کر ہی لی' لیکن ان کے ردعمل پر پھر پریشان ہوگئیں۔

"بات کرو اس سے اور پھر مجھے بتانا کیا کہتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

زبیدہ نے سعد سے کیا بات کی' اسے کیسے سمجھایا' ان کے گھر میں کیا ہوا یہ تو وہ نہیں جانتے تھے' لیکن زبیدہ نے تاریخ طے کردی تھی۔ اس دن سے سعد کا رویہ ان کے ساتھ اور فلزا کے ساتھ بھی بدل سا گیا تھا۔

وہ فلزا کے چہرے کو بآسانی پڑھ سکتے تھے' وہ جو ایک نیا سوٹ لینے کے لیے اتنی پُرجوش ہوتی تھی' وہ اپنی شادی کی ڈھیروں شاپنگ بددلی سے کررہی تھی۔ ایسے شخص کے ساتھ وہ کبھی بھی اپنی بیٹی کی شادی کرنے کو تیار نہ ہوتے جو بددلی سے ان کی بیٹی کو اپنا رہا تھا' لیکن بیٹی کی محبت نے انہیں چپ رہنے پر مجبور کردیا تھا کہ شاید سعد بعد میں فلزا کی طرف پلٹ آئے۔

"پاپا! آپ چائے پئیں گے۔" وہ اخبار پکڑے بیٹھے تھے جب فلزا نے ان سے پوچھا۔

"نہیں بیٹا! دل نہیں کررہا۔" کہہ کر وہ اٹھ گئے۔

"میں ذرا اشفاق کی طرف جارہا ہوں' تھوڑی دیر تک آجاؤں گا۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئے۔

اس نے اپنے لیے چائے کا ایک کپ بنایا اور لے کر لاؤنج میں آگئی۔

"سعد ایسا کیوں کررہا ہے میرے ساتھ۔" بہت دنوں سے مچلتا ہوا سوال پھر ذہن میں ابھرا۔

"نہ میری کال پک کرتا ہے' نہ ہی اتنے دنوں سے گھر آیا' نہ مجھ سے ملا' اس نے مجھ سے بالکل بھی شادی کے فنکشن کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ شہزا کا رویہ بھی کچھ عجیب سا ہے جیسے وہ یہ شاپنگ زبردستی کررہی ہو۔

اور سعد مجھے اگنور کیوں کررہا تھا اس کی آنکھیں اتنی سرخ کیوں تھیں' جیسے وہ کئی دنوں سے سو نہ سکا ہو' اس کے بال جو ہر وقت جیل کی تہہ میں سمٹے ہوتے تھے' وہ بکھرے بکھرے سے کیوں تھے۔ کیا۔ کیا سعد مجھ سے شادی کرنے پر خوش نہیں ہے۔" خود سے کیے آخری سوال نے اس پر کپکپی طاری کردی۔

"اگر یہ واقعی سچ ہوا تو؟" اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے' ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے تب ہی گیٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔

"سعد!" بلیک پینٹ شرٹ میں لمبا چوڑا وجود سعد کا



علی تھا۔

"کیسے ہو تم اور ساتھ کون آیا ہے۔" اپنے ذہن میں ابھرتے سوالوں سے بچنے کے لیے وہ جلدی جلدی بولنے لگی۔

"کوئی بھی نہیں میں اکیلا ہوں۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"چائے لاؤں۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔ اس کا رویہ اسے ڈرا رہا تھا۔ یوں جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہو۔

"نہیں!" وہ تھکے سے بولا۔ اس نے سر دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔

"تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔" جانے اسے کیسے پتا چل گیا کہ وہ کچھ بہت اہم بات کرنے آیا ہے۔

"ٹھہرو میں چائے بنا لاتی ہوں تمہارے لیے۔" وہ ایسے اٹھی جیسے یہاں سے غائب ہو کے بچ جائے گی۔

"عفوا!" وہ تھکے سے بولا تو وہ رک گئی۔

"بیٹھ جاؤ۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" وہ بیٹھ گئی اور ہزاروں سوال آنکھوں میں لیے اسے دیکھنے لگی۔

"تم عفوا!" وہ پاؤں کو غیر ارادی طور پر گھاس پر گھسیٹنے لگا۔

"عفوا تم شادی سے انکار کر دو۔"

"کیوں؟"

"میں علیزے سے پیار کرتا ہوں۔"

"اور میں تم سے کرتی ہوں۔"

"میں اس کے علاوہ کسی اور سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ میری کمٹمنٹ اور خواہش ہے۔"

"میں بھی تمہارے علاوہ کسی اور سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی یہ میری زندگی کا سوال ہے۔"

"تم بہت جذباتی ہو رہی ہو عفوا۔"

"اور تم بہت ظالم بن رہے ہو سعد۔"

"پلیز عفوا مان جاؤ۔ میں کبھی تمہیں وہ خوشی نہیں دے پاؤں گا جو تم ڈیزرو کرتی ہو۔"

"دوست تو ہوتا، دوستی کا رشتہ تو رہے گا نا۔ پیار نہ بھی دے پائے تو کوئی بات نہیں۔"

"نہیں، دوستی کا رشتہ بھی پھر ختم ہی سمجھو۔" اس نے سر جھٹکا وہ بس دیکھ کے رہ گئی۔

"میں علیزے کے بغیر نہیں رہ سکتا، پلیز تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، وہ مر جائے گی میرے بغیر۔ پھر میں کیا کروں گا تم پلیز! ماموں سے کہہ دو کہ تم یہ شادی نہیں کرنا چاہتیں، میں نے انکار کیا تو ماموں ہم سے مکمل طور پر کٹ جائیں گے اور تم جانتی ہو امی، ماموں سے کتنی اٹیچڈ ہیں۔ پھر تم بھی تو امی کی اور ہماری سب کی کتنی لاڈلی ہو۔ شادی کے بعد تمہارے ساتھ کچھ بھی برا ہوا تو سب مجھ سے ناراض ہو جایا کریں گے۔ تو کیا اس سب سے بہتر یہ نہیں کہ ہم دونوں شادی ہی نہ کریں۔" وہ ساکت سی بس اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"تم کسی اور سے شادی کرنا جو تمہیں خوش رکھ سکے پلیز۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں آج ہی بات کرتا ہوں ماموں سے کیونکہ دن تو بہت ہی کم رہ گئے ہیں۔" وہ اپنی سنانے آیا تھا اور اپنی سنا کے چلا گیا۔

وہ کرسی سے اٹھ کر نیچے گھاس پر بیٹھ گئی، سر کرسی کی ایک ٹانگ سے ٹکا دیا۔ وہ بالکل ایسے بے یار و مددگار بیٹھی تھی جیسے کسی بیوہ کو اس کی عدت ختم ہونے سے پہلے ہی گھر سے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہو۔

سچ کہتے ہیں ہمیشہ ساتھ رہنے کا، ہنسنے بولنے کا، دوستی کا یہ مطلب کب ہوتا ہے کہ دو روحوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی ہے، جو رشتہ چند لمحوں میں نہ بن پائے اسے بننے کے لیے پھر صدیاں بھی کم پڑ جاتی ہیں۔ وہ یہ بات سمجھ گئی تھی اور جانتی تھی پاپا کو بھی یہ بات سمجھا لے گی، یہ الگ بات کہ یہ محبت اس کی زندگی کی داستان بن گئی تھی۔

ایمل رضا

دُرِّ نایاب

گھر سے نکلتے وقت وہ دونوں چابیاں اپنے ساتھ ہی لیتی آئی تھی۔ اس کا پتا دینے والا یا اس سے سروکار کسی چیز کی گھر میں موجودگی سے اب کسی کو کوئی فرق نہیں پڑنا تھا۔

کم از کم درنایاب ایسا ہی سوچتی تھی۔

"ٹھیک ہے یا آخر ایسا ہی ہونا تھا۔ مجھے وہ گھر چھوڑنا ہی تھا۔" لندن میں "سب سے" نامی ریسٹورنٹ میں بیٹھے گرم کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ گزشتہ کئی دنوں سے وہ یہ ہی تو سوچ رہی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ لوگ گھروں سے ناشتے کر کے نکلے تھے اس لیے ریسٹورنٹ بھی تقریباً خالی ہی تھا۔ اس نے گھر سے نکلنے کے لیے صبح کا وقت منتخب کیا تھا اور اب جب وہ اپنے سوچے سمجھے اقدام کو عملی شکل دے چکی تھی تو نجانے کیوں دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔

"درنایاب۔" بے قرار دل کو سنبھالتے اپنی ہی یادوں کے گزرے طویل سال سے اسے دادی کی پکار سنائی دی تھی۔ نرم پیار بھری پکار۔

یہ پکار بھی بہت سی کڑوی کسیلی اور سمجھ بوجھ والی باتوں کی طرح نجانے کب سے اس کے تعاقب میں تھی۔ اس نے اس پکار سمیت کسی نصیحت کو سمجھنے اور اس پر کاربند رہنے کے قابل نہیں سمجھا تھا۔

"درنایاب۔" دادی کی پکار پھر کہیں فضا میں گونج کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر گم ہو گئی۔

"نہیں دادی۔ اب تو بالکل نہیں۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"جب واپس جانے کا کوئی دروازہ نہیں بچا۔ پیچھے مڑنے والے سارے راستے ختم ہو گئے ہیں۔"

"ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا بیٹی!"

"نہیں دادی! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں راحیل کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور میں اس کے ساتھ خوش گوار زندگی گزار کر ممی پاپا پر یہ واضح کر دوں گی کہ خوشیوں بھری زندگی دولت کے بغیر بھی گزاری جا سکتی ہے۔"

"سن بیٹی۔"

"آج آپ مجھے سنیے دادی۔ ممی پاپا پیار جیسے جذبے کو کیسے جان سکتے ہیں بھلا۔ ساری زندگی دونوں نے دولت کے علاوہ کسی چیز کو پرکھا ہی کب ہے۔ ٹھیک ہے ان کے سارے اعتراضات درست ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میری محبت بے معنی ہے۔ محض اسٹیٹس میچ نہ ہونے کی وجہ سے میں راحیل کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ یہ کوئی ٹھوس جواز تو نہیں۔ نہ ممی پاپا کے لیے۔ اور نہ میرے دل کے لیے۔"

"ماں باپ نے جو کچھ کمایا وہ تیرے لیے ہی تو کمایا۔ تو اتنی ناسمجھ کب سے ہو گئی میری جان۔ تو ایسی تو نہ تھی۔ ایسے تو نہ سوچتی تھی۔" دادی کی یاد اسے سمجھانے لگی اور اس کی گرم کافی ٹھنڈی ہونے لگی۔ بہر کر کھانے کو اس کا دل ویسے ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ کل سے اسے بھوک لگ ہی کہاں رہی تھی۔

"تو تو درنایاب ہے چندا۔ جانتی ہے اپنے نام کا مطلب۔" بچپن میں دادی اکثر اسے اپنی گود میں بٹھا کر پوچھا کرتی تھیں۔

"جی دادی!" ان کی گود میں مچل کر بیٹھی ایک طرح سے قابض ہوتے ہوئے بڑے پیار سے کہتی۔ "کیا۔۔۔"

"قیمتی موتی۔۔۔ بے مثل نایاب موتی۔"

"شاباش۔۔۔ میرے گھر کا یہ قیمتی موتی قیمتی دھات میں جڑے گا۔ ان شاء اللہ۔۔۔"

دادی ہر بار اسے یہ ہی دعا دیتیں اور جس کی سمجھ اسے بہت بعد میں آئی تھی۔ اب وہ گود میں چڑھ کر قابض ہو جانے والی بچی نہیں رہی تھی۔ بڑی ہو گئی تھی۔ ذہین۔۔۔ اتنی کہ اسے اب ان دعاؤں کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔

ریسٹورنٹ میں دادی کی پرچھائیں اس سے پھر وہی سوال کر رہی تھی۔ وہ جھنجلائی۔

"ٹھیک ہے دادی۔۔۔ میں مانتی ہوں کہ راحیل قیمتی دھات نہیں ہے۔۔۔ لیکن وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں اس کی محبت میں خود کو بھلا سکتی ہوں۔"



اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔ پھر جلدی سے ٹھنڈی کافی کا آخری گھونٹ لے کر اپنا بیگ اٹھایا تھا اور تیزی سے ریسٹورنٹ سے باہر نکل گئی تھی۔ وہ دادی کے ساتھ مزید سوال جواب نہیں کر سکتی تھی۔ یہ سوال جواب اب اس کے ارادے تو نہیں بدل سکتے تھے۔ لیکن اسے پریشان ضرور کر رہے تھے۔

زرین کی سیٹ سے پشت لگا کر اس نے گہرا سانس لیا تھا اور اپنے تھکے ہوئے حواسوں کو نارمل حالت میں لانے کی کوشش کی تھی۔

دادی اگر باطنی طور پر اس دنیا میں موجود ہوتیں تو واقعی اس کی اس پھرتی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ لیکن وہ تو نایاب کے دل و دماغ میں گھر کر چکی تھیں۔ اب چاہے وہ نشست بدلتی یا جگہ۔ دادی سے کیسے بچ سکتی تھی۔

"ٹرین چلنے والی ہے بیٹی۔" دادی نے اندیشے سے گھرے لہجے میں کہا۔

"زندگی کی ضروریات بھی اور کی محبت پر بھی حاوی ہو جاتی ہیں۔ جو خلا پیدا کر دیتی ہیں اندر تک۔ ہر جذبہ بے بس کر جاتا ہے۔ بچھڑنے کی اداسی ہی رہ جاتی ہے پیچھے پھر۔"

دادی پیار سے بولتی چلی گئیں۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

ایسے ہی پیار سے اسے ممی اور ڈیڈی نے بھی سمجھایا تھا۔ جب نایاب نے ان دونوں کے آگے راحیل کا نام لیا تھا۔ حالانکہ غیر ضروری پیار سے اپنی بات منوانا یا سمجھانا دونوں کا ہی خاصا نہیں تھا۔ خاص طور پر ممی کا۔ ان کی ہدایت میں حکم کا عنصر نمایاں ہوتا تھا۔ راحیل کے نام پر انہوں نے نایاب کو ایسے دیکھا جیسے ان کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ وہ اس پر ہنسیں یا اس کی عقل پر ماتم کریں۔

ڈیڈی نے غصے سے گلاس فرش پر دے مارا تھا۔

یہ نایاب کی زندگی کا اس گھر میں ہونے والا کسی بھی فرد کا سب سے شدید رد عمل تھا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔" ڈیڈی تقریباً چلائے۔

"جسے میں اپنی فیکٹری میں آفس بوائے کے طور پر نہ رکھوں۔ اور تم اسے اس گھر کا داماد بنانا چاہتی ہو۔"

وہ جانتی تھی راحیل کا نام لیتے ہی اس طرح کی باتیں کی جائیں گی۔ وہ ان ساری باتوں اور رویوں کے لیے تیار تھی۔ پھر بھی ڈیڈی کے اس روپ سے وہ لمحے بھر کے لیے ساکت ہو گئی۔

"دنیا میں ہر شخص آپ کے جتنا امیر نہیں ہوتا ڈیڈی۔"

"جو ہمارے اسٹیٹس کے ہیں، تم ان میں سے چوائس کر لو۔"

"یہ اب ممکن نہیں۔"

"تم فیصلہ کر چکی ہو؟"

"جی۔"

"تو پھر ہمیں کیوں بتا رہی ہو۔"

"اس بارے میں آپ کا فیصلہ جاننا چاہتی ہوں۔"

"ہماری طرف سے انکار ہے۔ حتمی۔" اب کے ممی بولی تھیں۔ موضوع کی شروعات سے ہی نایاب کی اس گستاخی کو جیسے برداشت کیے بیٹھی تھیں۔

بحث ختم ہو گئی۔ بے نتیجہ ہی۔ اور اگلے ایک ہفتے تک وہ "تقریباً" بیمار رہی تھی۔ راحیل سے اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ یہ تعلق ایسا تھا جس میں ایک فریق بہت سے مرحلوں کو چھپا رہا تھا۔ اگلی زندگی کو بہتر کرنے کے لیے۔

"تو یہ صلہ دے رہی ہو تم ہمارے پیار کا۔" ممی، ڈیڈی دونوں ایک دن خود اس کے کمرے میں آگئے۔ نایاب نے کئی دنوں سے خود کو اپنے کمرے میں قید کر رکھا تھا۔

"بچپن میں تم اپنی کلاس کی غریب لڑکیوں کی مدد کیا کرتی تھیں۔ آج یہ جذبہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ تم خود کو ہی خیرات کر رہی ہو۔"

وہ خاموش لبوں اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ دونوں کی گفتگو سنتی رہی۔

"آپ نے دوسرے ان بھائیوں کے سامنے کیا مثل قائم کر دی ہو گی۔ کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں۔ ہماری تربیت کی اور خود اپنی بھی۔"

"چھوڑیں ایک خوبی۔ کوئی ایک خوبی بتاؤ اس لڑکے کی۔"

"سوائے محبت اور شاعری کرنے کے۔"

وہ کوئی خوبی نہ بتا سکی۔ راحیل میں جتنی خوبیاں نایاب کو نظر آئی تھیں، وہ ساری محبت کی پیدا کردہ تھیں۔ ممی، ڈیڈی فزکس اینڈ فگر سے ہر چیز کو جانچنے والے۔ ان کے سامنے ان باتوں کا ذکر کرنا ہی لاحاصل ثابت ہوتا۔ پر اس نے ہمت کر کے ایک حل ضرور بتا دیا تھا۔ اور دونوں اسے مزید حیرت سے دیکھنے لگے۔ جیسے اب تو نایاب واقعی ہی پاگل ہو گئی ہو۔

"او گاڈ!" ڈیڈ نے ایک طنز بھرا قہقہہ لگایا۔

"یعنی اب ہماری محنت سے لگائی گئی فیکٹری میں وہ لوگ کام کریں گے۔ جو شعر و شاعری سے رغبت رکھتے ہیں۔"

اسے ڈیڈ کا راحیل کی اس طرح بے عزتی کرنا بے حد برا لگا۔

"میں گارمنٹس کا کام کرتا ہوں نایاب۔ میرا ارادہ کبھی بھی کوئی بیلی کیٹس ہاؤس کھولنے کا نہیں ہے۔"

"متراتوں میں مزید جڑنے شامل نہ ہوں تو آخر میں بنجر زمین بھی اپنی نہیں رہتی۔ اور ہم اسے کیوں مینٹل کروائیں۔ جب ایک سے بڑھ کر ایک سیٹلڈ لڑکا تمہارے امیدوار کے طور پر موجود ہے۔"

ممی نے جھوٹ تو نہیں کہا تھا۔ تقریباً ہر پارٹی، ہر گیدرنگ میں وہ نایاب کو فلاں، فلاں اور فلاں ہو کھاتی رہتی تھیں۔ ان کی اعلیٰ قابلیت اور کاروباری صلاحیتوں کا بائیوڈیٹا فراہم کرتی تھیں۔ خود وہ نایاب کے ایک اشارے کی منتظر تھیں۔

"صرف تمہارے ہاں کرنے کی دیر ہے میری جان۔ مسز درانی میری بات کبھی نہیں ٹالیں گی۔ راحت تو میری بہنوں کی طرح ہے۔ باتوں باتوں میں تمہارا ذکر بھی کر چکی ہے۔

عدیل ملٹی نیشنل میں جانے کا ارادہ بھی رکھتا ہے۔ اسے دیکھ کر تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ اس کے اندر سلک بچھا دینے کے سارے وصف موجود ہیں۔"

ممی اسے اپنی نظروں میں پرفیکٹ لڑکے دکھاتی رہیں۔ ان کے بارے میں بتاتی رہیں۔ لیکن جو نایاب کی نظر میں سما چکا تھا اس کے لیے وہ دونوں ہی نہیں بھر رہے تھے۔

اس لیے وہ آج چلی آئی تھی۔ گھر چھوڑ کر۔ ہمیشہ کے لیے۔ رات ہی اس نے اپنا چھوٹا سا بیگ تیار کر لیا تھا اور صبح ناشتے سے پہلے نکل آئی تھی۔ دبے پاؤں یا چوری چھپے نہیں۔ نہ ہی اپنے کمرے میں کوئی خط چھوڑ کر۔ جس وقت وہ گھر سے نکلی، ممی اٹھ چکی تھیں۔ اگر نایاب نے ان کے پیار کے بدلے ان کی بات نہیں مانی تھی تو انہوں نے بھی نایاب سے پیار کے ناتے نایاب کی ضد کو پورا نہیں کیا تھا۔

ٹرین سے اتر کر وہ تقریباً اپنے وجود کو گھسیٹتی ہوئی اپارٹمنٹ بلڈنگ تک آئی تھی۔ لفٹ تو حسب معمول خراب ہی تھی۔ ساری بلڈنگ ناقص اور سستے فلیٹس سے پُر تھی۔ کوئی ایک آدھ چیز خراب ہو جاتی تو مہینوں ٹھیک ہونے کا نام نہ لیتی۔ نہ مکینوں کے پاس اتنی گنجائش ہوتی کہ ٹھیک کروانے کے فنڈ میں بڑھ چڑھ کر حصہ ڈال سکتے۔

دسویں فلور تک کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اور چھوٹے سے بیگ کو سنبھالتے سنبھالتے وہ جیسے صدیوں کا سفر کر کے آئی تھی۔ دو بیل دینے پر بھی جب دروازہ نہ کھلا تو اسے احساس ہوا کہ راحیل اس وقت اپنی جاب پر گیا ہو گا۔ ہینڈ بیگ سے چابی نکال کر اس نے خود ہی دروازہ کھولا تھا۔

گھر سے نکلتے وقت وہ دونوں چابیاں اپنے ساتھ ہی لیتی نکلی تھی۔ یہ دونوں ایکسٹرا چابیاں ہمیشہ اس کے پاس ہی رہتی تھیں اور راحیل کے پاس ایک واحد اور آخری چابی ہوتی تھی۔

اندر داخل ہو کر اس نے فلیٹ کو روشن نہیں کیا

تھا۔ باہر سے جتنی روشنی آ رہی تھی وہ اس کے لیے کافی تھی۔

اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے یہ کمرہ بہت پیارا لگا۔ نیا نیا۔ اجلا سا۔ ہر چیز صرف مہینہ پہلے ہی تو خریدی گئی تھی۔ نئی مہنگی اور نفیس۔ ڈیڈی پر رعب ڈالنے کے لیے۔

ڈیڈی نے راحیل کو دو سال کا ٹائم دیا تھا۔ ایک طرح کا نایاب کو بھی۔ اس کی ذہنی حالت پر ترس کھا کے۔

"اگر وہ تم سے محبت کرتا ہے تو دو سال کے اندر اندر کچھ ثابت کر کے دکھائے۔ میری سوچ میرے مشاہدے کو غلط ثابت کرے۔ وہ ثابت کرے گا کہ اس میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہے۔" ڈیڈی نے کہا تھا اور سارا معاملہ دو سال کی محنت اور جدوجہد کے سپرد ہو گیا تھا۔

دو سال کیسے گزر گئے پتا ہی نہیں چلا۔ بے تحاشا کوششوں کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ سارے حالات جوں کے توں ہی رہے۔ بلکہ ٹھہرے پانی میں مزید کائی لگنا شروع ہو گئی۔ اور دونوں نے سوچا تھا کہ وہ نفیس مہنگی ڈیڈی کو بیوقوف بنالیں گے۔

جتنی دیر ڈیڈی راحیل کے فلیٹ میں بیٹھے رہے۔ خاموش رہے۔ اور کچھ جھوٹ اور کچھ سچائی پر مبنی راحیل کی گفتگو سنتے رہے۔

نایاب نے اپنی دو سالوں کی اکٹھی ہوئی سیونگ کے پیسے بھی راحیل کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیے تھے اور فلیٹ کو بہتر کرنے کے لیے بھی دونوں نے بہت کچھ کیا تھا۔

اور ڈیڈی۔ سب کچھ صرف دیکھ نہیں رہے تھے بلکہ یاد کر رہے تھے۔

گھر آ کر انہوں نے نایاب کو ایک ایک چیز کی تفصیل دی تھی۔ خریدی گئی ہر چیز کی رقم اور خریدار کے اکاؤنٹ نمبر کے ساتھ بتایا تھا۔ وہ نایاب ہی تو تھی اور راحیل کے سارے جھوٹ جو دونوں نے مل کر گھڑے تھے۔

نایاب شرمندہ نہیں ہوئی تھی۔ اس نے یہ سب راحیل کی محبت میں ہی کیا تھا اور جو قدم اس نے آج اٹھایا تھا وہ بھی صرف راحیل کی محبت میں ہی اٹھایا تھا۔

فلیٹ میں داخل ہو کر اس نے راحیل کو کال کی۔

"راحیل! میں آ گئی ہوں۔ اپنا گھر چھوڑ کے ہمیشہ کے لیے۔ پلیز اس وقت کوئی سوال جواب مت کرنا۔ باقی بات شام میں کرتے ہیں۔"

راحیل نے گہرا سانس لیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اتنا ہی کہہ پایا۔

فون بند کر کے وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ دل جو صبح سے بری طرح سے دھڑک رہا تھا اس کی رفتار بھی نارمل ہوئی۔ کچھ وہ کل رات سے جاگ رہی تھی اس وجہ سے بھی بیڈ پر بیٹھتے ہی سکون کی ایک گہری لہر نے اس کے پورے وجود کو اپنے احاطے میں گھیر لیا تھا۔

"میں محبت کے سہارے جی لوں گی۔"

اس نے ایک بار پھر خود کو یقین دلایا۔

☆ ☆ ☆

"بکس کہاں ہیں میری؟" کمرے میں تیزی سے داخل ہو کر راحیل نے ہانپتے ہوئے پوچھا تھا۔ جیسے وہ دو کمروں کے فلیٹ کا کونا کونا چیک کر چکا ہو۔

نایاب کپڑے استری کر رہی تھی۔ سوال جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔

"میں پوچھ رہا ہوں بکس کہاں ہیں میری۔" وہ تیز ترین تو انتظار کر رہا ہوا۔

"کون سی؟" منہ کو قدرے انوکھے زاویے پر لے جاتے ہوئے نایاب نے پوچھا تھا۔

"پوئٹری کی۔" وہ نظریں چرانے لگا۔

"پھینک دیں۔" نایاب کو جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑ رہا تھا۔

"کیا۔" وہ چلایا۔ "پھینک دیں۔" حیرانگی اس کی آنکھوں میں بھر گئی تھی۔

"نہیں۔ یاد آیا۔ پھینکی نہیں۔ جلا دی تھیں۔" طنز دار لہجے میں بولتی وہ جیسے اس کا تمسخر

اڑا رہی تھی۔ راحیل کا دماغ سن ہونے لگا۔
"کیا بکواس کر رہی ہو۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔"
"ہاں۔ بالکل۔ پاگل ہو گئی ہوں میں۔"
"تم ایک نفسیاتی مریضہ ہو۔"
"چلاؤ۔ اور چلاؤ مجھ پر۔ تم چلانے کے سوا اور کام ہی کیا کر سکتے ہو۔" اب کے بار وہ بھی چیخی تھی۔
"تمہیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔ تم مجھے تنگ کرنا چاہتی ہو نا۔ ہر وقت ستاتے رہنا چاہتی ہو۔ یہ بتانا چاہتی ہو کہ میرا تم سے شادی کرنے کا فیصلہ ہی غلط تھا۔"
"فیصلہ تو میرا غلط تھا مسٹر راحیل۔ تم خود کو کیوں دوش دیتے ہو۔ دماغ تو میرا خراب تھا۔ جو میں اپنا گھر چھوڑ کر تمہارے پاس چلی آئی۔"
"تو نہ آتیں۔ کیا میں نے تم سے کہا تھا کہ گھر چھوڑ آؤ اپنا میری خاطر۔ یہ قدم تم نے خود اٹھایا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود بھی۔"
"پھر تم نے اس فیصلے میں میرا ساتھ کیوں دیا۔ فلیٹ سے نکال دیتے مجھے۔ شاید میں اپنی غلطی کو سدھار لیتی۔ واپس چلی جاتی۔"
"تو اب چلی جاؤ۔ کس نے روکا ہے۔"
"جو غلطی کی ہے اس کی سزا تو بھگت لوں پہلے۔"
"تم تو کہتی تھیں کہ تم دولت اور آسائشوں کے بغیر بھی گزارا کر لو گی۔ کبھی شکوہ نہیں کرو گی۔ میری محبت تمہارے لیے کافی ہے۔"
"ایسی ہی غلط فہمی مجھے بھی تو تھی تمہارے بارے میں۔"
"میں جیسا تھا ویسا ہی ہوں۔ تم بدل گئی ہو۔ میرے ساتھ جینا تمہارے لیے دوبھر ہو گیا ہے۔"
"ٹھیک کہا۔ تم جیسے تھے ویسے ہی ہو۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جہاں تھے وہاں پر ہو۔ میں نے سوچا تھا زیادہ۔ بہت سارا نہ سہی۔ تھوڑا بہت کچھ بہتری تو ہو ہی جائے گی۔ لیکن بالکل ٹھیک کہتے تھے ڈیڈی کہ راحیل کی ریڑھ کی ہڈی ہی نہیں ہے۔ اور وہ تمہیں اپنی بیک بون بنانا چاہتا ہے۔"
"تمہیں اپنے ڈیڈی کی باتیں اتنی ہی سچی لگتی تھیں تو مان کیوں نہ لیں ان کی بات۔"
"اسی غلطی کو تو کوستی ہوں جب میں۔ اس بھیانک دن کو تو یاد بھی نہیں کرنا چاہتی۔" اس نے اپنا سوٹ ہینگر میں ڈالا تھا اور الماری میں لٹکانے کے لیے آگے بڑھی تھی۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اس نے صاف کیا تھا۔ راحیل اس کی شکل دیکھتا رہ گیا تھا۔
"بہت سمجھایا تھا میرے دوستوں نے بھی مجھے کہ یہ امیر گھرانے کی لڑکی چار دن بعد تیری زندگی کو جہنم بنا دے گی۔"
"کیا تم نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ وہ امیر گھرانے کی لڑکی آج اپنے سمیت تمہیں بھی پال رہی ہے۔" وہ طنز سے بولی تھی۔ راحیل لمحے بھر کے لیے لاجواب ہو گیا تھا۔
"احسان جتا رہی ہو؟"
"اب تو وہ بھی جتا جتا کر تھک گئی ہوں۔"
"کیا میں کوشش نہیں کرتا تمہارے اس لائف اسٹائل کو بدلنے کے لیے اور تمہارے اس لائف اسٹائل جس کی تم عادی رہی ہو کے لیے جدوجہد نہیں کرتا۔"
"تمہاری ہر کوشش، ہر جدوجہد سطحی ہے راحیل۔ بڑی کامیابی کبھی تمہارے قدم نہیں چھو سکے گی۔ کیونکہ تم ایک سطحی سوچ کے آدمی ہو۔ اوسط درجے کے۔ تم چاہے شاعری کرو چاہے پینٹنگ بناؤ یا کچھ بھی لو۔ درمیانہ درجہ تمہاری فطرت میں رچ بس گیا ہے۔ تم کبھی اول درجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس اوسط درجے کے حصار کو نہیں توڑ سکتے۔ اوسط درجے کے آدمی کی سوچ ایک خاص رفتار سے آگے کا سفر نہیں کر سکتی۔ ہرن چاہے جتنا مرضی صحت مند ہو جائے زرافے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ گدھا جتنا مرضی طاقت ور ہو گھوڑے کو ریس میں نہیں ہرا سکتا۔ افسوس کہ مجھے ان باتوں کا احساس بڑی دیر سے ہوا۔ ان چیزوں کی سمجھ بڑی دیر سے آئی۔ میری

دلوی۔"

"بس چپ کرو۔ بند کرو اپنی بکواس۔ بہت ہوگیا۔ دلوی بھی ڈیڈی کی فرینڈز۔ میں ان سب کے بیان سن سن کر تنگ آچکا ہوں۔ نہیں جی سکتا میں ایسی زندگی۔ نہیں جینا چاہتا۔"

"میں بھی کوئی خواہش مند نہیں رہی اب ایسی زندگی جینے کی۔"

"تو پھر ایسا کرو تم مجھ سے طلاق لے لو۔" نایاب کی طرف دیکھتے ہوئے وہ چلایا تھا۔ معاملہ ختم کرنے کا آسان طریقہ بتایا تھا اس نے۔

"میری زندگی تمہارے آنے سے پہلے بھی بہتر تھی۔ تمہارے جانے کے بعد بھی یقیناً" بہت بہتر ہو جائے گی۔ طلاق لے لو مجھ سے۔ خدا کے لیے۔ چلی جاؤ یہاں سے۔ سکون لینے دو مجھے۔"

نایاب سن سی ہو کر راحیل کی صورت دیکھنے لگی تھی۔ جو اپنا سر پکڑے بیڈ پر بیٹھا تھا۔ نایاب کی آنکھیں اس کی حالت دیکھ کر اور اس کی بات سن کر آنسوؤں سے بھیگ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ لیٹتے لیٹتے ہی اسے نیند آگئی تھی کہ اب اٹھی تو چاروں طرف انجان نظروں سے دیکھنے لگی۔ جیسے نجانے کتنے آگے کے سالوں کا سفر کر کے واپس پہنچی ہو۔ کمرے میں دلوی کی گود کی گرمائش پھیلی ہوئی تھی۔

"در نایاب!" یادوں سے دلوی کی پکار پھر گونجی۔ ہمیشہ کی طرح مدھم اور پیار بھری۔ وہ حیرانگی کی مجسم صورت بن گئی۔

"در نایاب۔" پھر پکارا گیا۔

"دلوی!" اور سرہانے میں منہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں دلوی۔ بہت زیادہ۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔"

"میں جانتی ہوں۔ تیری محبت پاکیزہ ہے۔ مقدس ہے' پرخلوص ہے' بے غرض ہے' بلاشک و شبہ کے سب۔ ایسی محبتیں جن دلوں میں ہوں' وہ دل ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں دادی اب؟"

"اس محبت کو وقت کی تمازت سے نفرت میں بدلنے سے روک لے۔ ابھی بھی وقت ہے۔ واپس چلی جا بیٹی۔"

"کیا میں راحیل کے بغیر جی پاؤں گی دلوی؟"

"کیا تو اس کے ساتھ خوش رہ پائے گی؟"

"نہیں۔ نہیں دادی! بہت مشکل ہوگی۔ میں بہت جلد ہی تھک جاؤں گی۔" وہ اعتراف جو وہ مہینوں سے خود سے کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اب بند کمرے میں پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کرنے لگی۔

"در نایاب! نہ رو میری بچی۔ تو رونے والی بچی تو نہیں ہے۔ تجھے پتا ہے تیرے نام کا کیا مطلب ہے۔"

"ہاں۔ دلوی پتا ہے اور یہ بھی کہ اس قیمتی موتی کے لیے قیمتی دھات کا ہونا ہی ضروری ہے۔ مٹی بھر بھرا جائے گی اور کانسی اس کی ملائمت پر تنگ نہیں پائے گی۔"

وہ بیڈ سے اٹھی۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ اسے گھر سے نکلے پورے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ اور اب وہ مزید دیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اپنا چھوٹا بیگ اس نے واپس اٹھایا اور گھر سے نکلنے کے لیے تیار ہوگئی۔

"مجھے تم سے بہت محبت ہے راحیل بہت زیادہ۔ اتنی کہ میں اس محبت کو نفرت' شکووں' پچھتاووں' دکھوں میں بدلتا نہیں دیکھ سکتی۔" باہر نکل کر دروازے کو لاک کرتے ہوئے اس نے خود سے کہا تھا۔

گھر سے نکلتے وقت وہ دونوں چابیاں اپنے ساتھ ہی لے آئی تھی اور راحیل کا فلیٹ چھوڑتے وقت اس نے دونوں چابیوں کو دروازے میں ہی لگا رہنے دیا تھا۔



صائمہ اکرم چوہدری

سیاہ حاشیہ

سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔ "پچھتاؤ گی۔" ایک ندا یہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔

☼ ☼ ☼

عریشہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔ عریشہ کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبداللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔



ناولٹ

- عبداللہ پابند صوم وصلوٰۃ وہ مسجد کا موذن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔
- عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔
- عدینہ عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔
- شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پر واک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔
- ڈاکٹر بینش نیلی کوٹھی میں اپنے بیٹے ارحم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل ڈاکٹر حماد کا انتقال ہو چکا ہے۔
- نیلی کوٹھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیران کے پاس لندن میں ہے۔
- اوریدا اور ارحم کی بہت دوستی ہے جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔
- عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر پھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔
- سرمد اپنے دوست کے برائڈ کشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔

شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو کسی مذہبی جنونی نے قتل کر دیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شوبز میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔

تایا صالح نے عدینہ کی عبداللہ سے منگنی توڑ دی ہے۔ عبداللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی ہے تو عبداللہ وہاں آجاتا ہے۔ تایا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔

اوریدا ارسم کے ساتھ پیپر دینے جاتی ہے۔ ارسم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اوریدا کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اوریدا اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی گاڑی خرید کر دے دیتے ہیں۔ آغاجی کو یہ بات بری لگتی ہے۔

ٹی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ تایا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے دوران ایک تصویر ملتی ہے جو کسی مولوی کی ہے۔

ارسم اوریدا کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اوریدا کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

مومنہ عدینہ کو بتاتی ہے کہ تایا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبداللہ عدینہ سے فوراً شادی کر لے۔ عبداللہ نے فوراً شادی سے انکار کر دیا تھا۔

عبداللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آجاتی ہے۔

عدینہ پر عبداللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔

شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔

ارسل، شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔

ارسم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں پاگل ہو رہی ہیں۔

عدینہ فیصلہ سناتی ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی تایا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

چھٹی قسط

عدینہ پاگلوں کی طرح بھاگتی ہوئی سیڑھیاں اتر رہی تھی اور ایک دفعہ تو سامنے سے آنے والی ایک خاتون سے بھی بری طرح ٹکرائی، جس نے اسے آنکھیں دکھانا تو ۔۔۔ بے نقط سنا دیں۔ عدینہ نے نرمی سے اس عورت کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف کیا اور بے ربط سانسوں کے ساتھ وہ گراؤنڈ فلور پر پہنچ گئی۔ اسپتال کے فرش پر ایک ملازم فنائل کا پوچا لگا رہا تھا، عدینہ کا پاؤں گیلے فرش پہ پھسلتے پھسلتے بچا۔

"بی بی! دھیان سے۔" اس ملازم نے پیچھے سے پکارا لیکن بی بی اپنے حواسوں میں ہی کہاں تھی۔

"عدینہ باجی! ٹھہریں تو سہی۔" مومنہ بھی اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔

"ارے رے۔ کیا ہو گیا تم لوگوں کو، کون سی آفت ٹوٹ پڑی۔" ایک خاتون نے ناگوار انداز سے انہیں بھاگتے دیکھ کر کہا۔

وہ لوگوں کو دھکیلتی۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ۔ پارکنگ میں پہنچی تو وہ شخص گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ عدینہ بے تابی سے اس کی گاڑی کے پاس پہنچی اور ساتھ ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ عبداللہ نہیں تھا، اس کی شباہت رکھنے والا کوئی اور نوجوان تھا۔ اس کو

روکنے کے لیے اٹھایا گیا عدینہ کا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا۔ وہ گاڑی بڑھا کر جا چکا تھا۔

عدینہ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔

دو منٹ کے بعد مونا اس کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچی تو وہ خود بھی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے عدینہ کے چہرے پر پھیلی مایوسی، افسردگی اور صدمے کی کیفیت سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کوئی اور تھا۔

"عدینہ باجی، وہ عبداللہ بھائی نہیں تھے۔" مونا نے ماتھے پر آئی پسینے کی ننھی ننھی بوندیں صاف کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"پتا نہیں کیوں میرا دل دھوکا کھا گیا۔" عدینہ کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

"اچھا اب اس طرح زمین پر کیوں بیٹھ گئی ہیں۔" مونا کو شرمندگی کا احساس ہوا، کیونکہ آس پاس سے گزرنے والے لوگ الجھن آمیز نگاہوں سے عدینہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جس کا چہرہ اس وقت دھواں دھواں سا تھا۔

"ہاں چلو۔" عدینہ نے ہتھیلی کی پشت سے اپنی آنکھیں بے دردی سے رگڑیں۔

"اچھا اب اپنا دل تو آرام کریں اللہ بہتر کرے گا۔" مونا اسے تسلی کے علاوہ اور کیا دے سکتی تھی۔

"مجھے پتا ہے اب میری زندگی میں کچھ بھی اچھا نہیں ہوگا۔" عدینہ اس وقت اپنے آپ سے بھی خفا لگ رہی تھی۔

"اچھا اچھا۔ بس کریں ناں..." مونا نے چلتے چلتے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ "خوامخواہ اپنا دل جلا رہی ہیں۔"

"دل تو کب کا جل کر راکھ ہو چکا۔ اب تو بس بچے کچھے تو کس اور یادوں کا دھواں اٹھتا ہے جو کسی پل چین لینے نہیں دیتا۔" وہ اب تیز تیز چل رہی تھی۔

"پتا نہیں کیوں، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے..." مونا نے بات ادھوری چھوڑی۔ عدینہ چلتے چلتے رک گئی اور ناراض نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اب یہ مت کہنا کہ وہ مر چکا ہے اور مجھے اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔" عدینہ نے اس کے ذہن میں ابھرنے والی سوچ کو پڑھا۔ مونا اچھی خاصی شرمندہ سی ہو گئی کیونکہ حقیقتاً وہ یہی سوچ رہی تھی۔ اس کا دل ماننے کو تیار نہیں تھا کہ عبداللہ زندہ ہے۔ اس نے جس طرح سے اس کی ماں کو اس کی یاد میں بلکتے ہوئے دیکھا تھا، وہ کتنا بھی عدینہ سے خفا ہو تاہم از کم اپنی ماں کو تو اپنی خیریت سے آگاہ کر سکتا تھا۔

عدینہ نے وہ سارا دن بہت اذیت میں گزارا تھا، وہ تایا صالحہ کے کمرے کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی اپنے پیروں کے ناخنوں کو گھورتی رہی، اس کے چہرے پر اتنا دکھ تھا کہ ایک دو دفعہ تو تایا صالحہ نے بھی ناراض ہونے کے باوجود اس پر ایک نظر ڈال ہی لی تھی۔ وہ کئی گھنٹے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔ تایا کو آج اسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ راولپنڈی سے گاؤں تک کا سفر بھی اس نے گونگے کا گڑ کھا کر ہی کیا تھا، اور گھر آ کر وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ



گئی۔ آج اسے ایک دفعہ پھر ماضی کی خوشگوار یادوں کے ساتھ ایک اذیت ناک سفر کرنا تھا۔

✿ ✿ ✿

بڑے ابا کا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے کمرے میں ٹہل رہے تھے اور وقتاً فوقتاً ایک بدگمان سی نگاہ بڑی اماں کے چہرے پر ڈال لیتے تھے جو اس وقت سخت بوکھلائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ خود ان کے ماتھے کے بل گہرے ہی ہوتے جا رہے تھے۔ ماہیر کی اچانک آمد کو انہوں نے ذہنی طور پر ابھی قبول نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے بڑی اماں سارے معاملات سے باخبر تھیں۔ یہی سوچ ان کے غصے میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔

"اچھا تو اس وجہ سے آج گھر میں تفصیلی صفائیوں کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔" انہوں نے فوراً ہی فرد جرم عائد کی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا۔" بڑی اماں کو دھچکا سا لگا۔

"آپ کو پتا تھا تیمور کا بیٹا آج پاکستان آرہا ہے اور آپ نے اس بات کو مجھ سے چھپایا۔" ان کے اس الزام پر بڑی اماں تڑپ اٹھیں۔

"تم خواہ مخواہ میرے اوپر الزام مت لگائیں' اس نے اور یدا کی دفعہ کون سا مجھ سے پوچھا تھا جو ماہیر کی دفعہ میری اجازت لے گا۔" انہوں نے بیزاری سے سر جھٹکا۔

"تو آخر آپ کے بیٹے کی ان حرکتوں کا مقصد کیا ہے؟" ان کا پارہ ایک دم ہی چڑھا تھا۔

"مجھے کیا پتا' ہو سکتا ہے ماہیر اپنی بہن سے ملنے آیا ہو' ظاہر ہے ہم اسے روک تھوڑی سکتے ہیں۔" بڑی اماں کا مزاج بھی برہم ہوا۔

"کیوں نہیں روک سکتے۔" وہ ایک دم بھڑک اٹھے۔ "اس کے باپ کا گھر ہے کیا؟" وہ غصے میں کافی غلط جملہ بول گئے تھے' بڑی اماں کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔ "ظاہر ہے اس کے باپ کا ہی گھر ہے۔" بڑی اماں نے ہنس کر انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔ جب کہ جلال صاحب کا موڈ ہنوز خراب تھا اور اب تو اس میں اور شدت آگئی تھی۔

"نہیں ہوں میں اس ناہنجار کا باپ' میری صرف ایک بیٹی ہے طلیبہ جلال اور کوئی نہیں ہے۔" انہوں نے بھی بے رخی کے سارے ریکارڈ توڑے۔

"آپ کے اس طرح کہنے سے خون کا رشتہ ختم تھوڑی ہو جائے گا۔" وہ محتاط انداز میں گویا ہوئیں۔

"ہونہہ۔" انہوں نے نفرت آمیز انداز سے ہنکارا بھرا۔ "پہلے بیٹی کو بھجوا دیا' اب بیٹا اٹھا کر آگیا ہے' کل کو خود تشریف لے آئے گا۔"

"آپ کچھ بھی کہیں لیکن میں آپ کو بتا رہی ہوں' مجھے ماہیر کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔" بڑی اماں نے اپنی طرف سے ان کا دل صاف کرنا چاہا۔

"دیکھو شائستہ بیگم! آج سے کئی سال پہلے بھی تم نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی اور مجھے اندھیرے میں رکھا تھا' جس کی بھاری قیمت مجھے خاندان کی عزت گنوا کے ادا کرنی پڑی' تم اب بھی۔" مارے اشتعال کے ان سے اپنا جملہ مکمل نہ ہوا۔

"ماضی کی باتوں پر پڑی گرد کو مت جھاڑیں جلال صاحب۔" وہ ناراضی سے کھڑی ہو گئیں۔ "ان میں سے کسی ایک آئینے میں آپ کو اپنا چہرہ بھی نظر آجائے گا۔" ان کے لہجے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی غصہ جھلکا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔" جلال صاحب تڑپ اٹھے۔

"مطلب وطلب آپ کو اچھی طرح سے پتا ہے' میں کبھی بھی اولاد کی غلطیوں کی چشم پوشی کی قائل نہیں' میں نے اسی رات آپ کو خبردار کر دیا تھا کہ ہوائیں کس رخ پر چل رہی ہیں۔" بڑی اماں کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی ابھری۔

"ہاں اس رات جب پلوں کے نیچے سے سارا پانی بہہ چکا تھا۔" جلال صاحب آج بھی اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں تھے۔

"تو ٹھیک ہے۔ آپ کو اتنا ہی غصہ ہے نا تیمور پر تو عاق کر دیں اسے گھر سے نکال باہر کریں اس کی اولاد کو، دل کی جگہ پتھر ہی تو رکھا ہوا ہے آپ نے۔"

بڑی اماں کا تو آج انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ جلال صاحب ہلکا سا ٹھٹکے، غور سے اپنی زوجہ کا چہرہ دیکھا ان کے چہرے کے ایک ایک نقش سے ناراضی اور غصہ مترشح تھا۔ وہ آج اپنی جون میں نہیں تھیں۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں اور غصے سے دروازہ کھولا اور چٹاخ کر کے بند کیا، ایک لمحے کو تو جلال صاحب بھی ہل سے گئے۔

بڑی اماں جیسے ہی جلال صاحب کے کمرے سے نکلیں، سامنے ماہیر لاؤنج میں اپنا بڑا سا بریف کیس کھولے اس میں سے اوریدا کو لائے ہوئے گفٹس نکال کر دے رہا تھا۔ اوریدا کے چہرے پر ایک بڑی بے ساختہ فطری خوشی چھلک رہی تھی۔ وہ ان دونوں کو نظر انداز کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں، ان کا ارادہ تیمور سے بات کرنے کا تھا۔

"کم از کم تم مجھے تو بتا دیتے کہ ماہیر پاکستان آ رہا ہے۔" بڑی اماں کے لہجے میں ایک دل کو دکھاتی ہوئی سنجیدگی تھی۔

"کیا ہوا اماں! ابا نے کچھ کہا ہے کیا؟" تیمور نے بالکل درست اندازہ لگایا۔

"تو اور کیا، گھر میں مارشل لاء لگائے بیٹھے ہیں، سارا غصہ مجھ پر نکل رہے ہیں۔" انہوں نے بھی صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

"انہیں تو لگتا ہے اس گھر میں دن رات ان کے خلاف سازشیں ہوتی ہیں، جن میں میرا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔" وہ تپی ہوئی تھیں۔

"ماہیر کا آنا ان کے نزدیک کوئی سازش ہے کیا؟" تیمور کو بھی اب بے تکی بات پر غصہ آ گیا۔

"تمہارے باوا کو تو یہی لگ رہا ہے نا۔" بڑی اماں نے بیزاری سے گردن کو جھٹکا دیا۔

"لیکن اماں، ماہیر کی تو طیبہ کے بیٹے سے گہری دوستی ہے، اور ابھی بھی وہ میرے کہنے پر نہیں، سعد کے کہنے پر پاکستان آیا ہے۔ دونوں مل کر کوئی بزنس کرنا چاہتے ہیں۔" تیمور نے جھنجلا کر صفائی دی۔

"میاں! مجھے تو یہ سبق مت پڑھاؤ، سب پتا ہے مجھے، جا کر اپنے باوا کے دماغ میں ڈالو، شام سے میرے پیچھے ہاتھ منہ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔" انہوں نے چڑ کر جواب دیا۔

"ابا کو پہلے بھی کوئی بات آسانی سے سمجھ آئی ہے، جو یہ آئے گی۔" تیمور نے بھی کئی گلے دل میں پال رکھے تھے۔

"جب بھی غصہ آتا ہے، پرانی کہانیاں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں، آج تو میں نے بھی لحاظ نہیں کیا، ٹھیک ٹھاک سنا کر آئی ہوں۔" بڑی اماں کی بات پر تیمور کا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔

"آپ کو پتا تو ہے ان کی عادت کا، کیوں بحث کرتی ہیں پھر۔" تیمور افسردہ سے انداز میں گویا ہوئے۔

"ہاں تو میں نے کوئی ٹھیکہ تھوڑی لے رکھا ہے ان کی جلی کٹی سننے کا۔" انہوں نے بھی بے رخی سے جواب دیا۔

"ان کی پہلے ہی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اوپر سے آپ۔" تیمور ناراضی کا اظہار کرتے کرتے چپ ہوا۔

"کچھ نہیں ہوا ان کی طبیعت کو، ابھی آ جائے ان کی چہیتی بیٹی اور تھوڑی ہی دیر بعد قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں گی۔" بڑی اماں کو آج ضرورت سے زیادہ ہی ان پر غصہ تھا اور کسی طور بھی ان کو بخشنے کو تیار نہیں تھیں۔

"ماہیر ملا ابا سے...؟" انہوں نے تھوڑا سا جھک کر پوچھا۔

"ارے کہاں ڈھنگ سے ملے ہیں اس بے چارے سے، دیکھتے ہی ایسا سکتہ ہوا، جو اپنے کمرے میں جا کر ہی ٹوٹا۔" بڑی اماں کے ماتھے کے بل گہرے

ہوئے تیمور ہزاروں میل دور بیٹھا بھی صورت حال کا اندازہ کرسکتا تھا۔

"ویسے کتنے دن کے لیے گیا ہے ماہیر۔" بڑی اماں کو آخر وہ سوال یاد آہی گیا' جس کے لیے انہوں نے فون کھڑکایا تھا۔

"دن وِن کا تو پتا نہیں' وہ تو مستقل رہنے کے ارادے سے ہی گیا ہے۔" تیمور کی بات پر بڑی اماں کا دل دھک سے رہ گیا۔

"مستقل۔۔۔؟" وہ آنے والے دنوں کا سوچ کر ہی چپ ہوگئیں۔

"ہاں اسٹڈیز تو اس کی کمپلیٹ ہوگئی' کوئی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھولنا چاہتا تھا سرمد کے ساتھ مل کر پاکستان میں۔" تیمور نے شرمندگی سے وضاحت کی۔

"پاکستان کے کون سے بزنس کے حوالے سے حالات اچھے ہیں۔" بڑی اماں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"وہ تو ماہیر جب یہاں رہے گا تو خود دیکھ لے گا' باقی اس کی مرضی۔"

تیمور نے بات کو لپیٹا تو بڑی اماں ایک دم ہی خاموش ہوگئیں۔ لگتا تو انہیں بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ ماہیر اور اوریدا کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق ہے' وہ اپنی بہن کے مقابلے میں کہیں زیادہ پُراعتماد' بے باک اور کسی حد تک منہ پھٹ بھی واقع ہوا تھا۔ وہ سوچ سکتی تھیں کہ مستقبل میں جلال صاحب اور ماہیر تیمور کے درمیان کون کون سی جنگیں ہونے والی ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی ٹکر کے تھے۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں بیٹھے بٹھائے پاکستان آنے کی کیا سوجھی؟" اوریدا اپنے گفٹس ہٹور کر اب بڑے آرام سے ماہیر سے پوچھ رہی تھی جو پھلوں کی ٹوکری سامنے رکھے اپنی بے تکلفی سے بیٹھے کھانے میں مگن تھا اور ساتھ ساتھ ایک نظر سامنے دیوار پر لگی ایل سی ڈی پر بھی ڈال لیتا تھا جہاں کسی اسپورٹس چینل پر ریسلنگ کا ایک دلچسپ مقابلہ دکھایا جارہا تھا۔

"پتا تو ہے تمہیں' مجھے ایڈونچر کا کتنا شوق ہے۔" اس نے ٹوکری سے سیب نکالا اور لاپروائی سے کھانے لگا۔

"بڑے ابا کا موڈ خاصا خراب ہے۔" اوریدا نے اپنے سے پانچ سال بڑے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"سو واٹ۔۔۔" وہ ناک چڑھا کر بولا۔ "ان کا اپنا موڈ ہے' چاہے خراب کریں یا اچھا رکھیں' ہم کیا کرسکتے ہیں۔" ماہیر کسی بھی چیز کو اپنے سر پر سوار کرنے کا قائل نہیں تھا۔

"مجھے لگتا ہے انہوں نے بڑی اماں سے بھی جھگڑا کیا ہے۔" اوریدا نے اسے ایک نئی اطلاع دی۔ جس کا کم از کم ماہیر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

"ایک بات تو بتاؤ اوریدا۔۔۔" وہ ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی کی آواز آہستہ کرتے ہوئے سنبھل کر بولا تو اوریدا نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا جس کے آنے سے کم از کم وہ خود کو بہت طاقتور سمجھنے لگی تھی۔

"تم نے بڑے ابا اور بڑی اماں کو ضرورت سے زیادہ کیوں اپنے حواسوں پر سوار کر رکھا ہے۔۔۔؟" ماہیر نے اس کی کلاس لینے کا ارادہ کیا۔

"ظاہر ہے میں ان کے گھر میں جو رہتی ہوں۔۔۔" اوریدا نے خفت زدہ انداز میں جواب دیا۔

"یہ ان کا ہی نہیں' ہمارے پاپا کا بھی گھر ہے اور قانون میں ہمارے پاپا ہی اس گھر کے والی وارث ہیں۔" ماہیر کی بات نے اوریدا کو حیران کیا۔ "مجھے تو سخت مایوسی ہورہی ہے تمہیں دیکھ کر' تم اپنا سارا کانفیڈنس لوز کرچکی ہو' اس سے کہیں زیادہ کانفیڈنٹ تم انگلینڈ میں تھیں۔"

"مجھے بڑے ابا اور آنٹی بینش کی ناراضی سے بہت ڈر لگتا ہے۔" اوریدا کے منہ سے پھسلا۔

"اب یہ آنٹی بینش درمیان میں کہاں سے آگئیں'

"وہ پاپا کی سیکنڈ کزن ہیں' ہمارا ان سے کیا لینا دینا۔" ماہیر کو غصہ آ گیا۔

"وہ ارحم کی ماما ہیں اور ارحم میرا بیسٹ فرینڈ ہے۔" اوریدا نے جھنجلا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو ارحم کی ماما ہونے کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ انہیں سب کو ڈی گریڈ کرنے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔" ماہیر کو دو ڈھائی سال بعد اپنی بہن سے ملنے کے بعد سخت مایوسی ہو رہی تھی' وہ دل ہی دل میں پاپا سے بھی لڑنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ جنہوں نے اسے پاکستان بھجوا کر سخت زیادتی کی تھی۔

"میں نے ایسا تھوڑی کہا ہے۔" اوریدا نے بوکھلا کر جواب دیا تو وہ خاموش ہو گیا' لیکن اس کے چہرے پر ناراضی کے رنگ نمایاں تھے۔ اسی لمحے بڑے مصروف انداز میں آنٹی بینش لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ اندر داخل ہوتے ہی ماہیر کو دیکھ کر انہیں جھٹکا سا لگا۔ وہ وہیں کھڑی ہو گئیں اور پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے ماہیر کو دیکھنے لگیں۔

"تیمور!" ان کے حلق سے دبی ہوئی سرگوشی کی صورت میں نکلا۔

"السلام علیکم' آئی ایم ماہیر تیمور۔" وہ ایک دم ہی کھڑا ہوا اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا تعارف کرواتا ہوا ایک لمحے کو تو بینش کے بھی چھکے چھڑا گیا۔

"وعلیکم۔" انہوں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا اور اس پر سے نظریں ہٹائیں' وہ اپنے باپ کی طرح ہینڈسم اور دراز قد تھا۔

"بڑے ابا کہاں ہیں۔؟" انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اوریدا کی طرف دیکھا' جس کا رنگ انہیں دیکھتے ہی حسب عادت فق ہو چکا تھا۔

"اسٹڈی میں۔" ماہیر نے پُراعتماد انداز میں جواب دیا۔ "چلیں میں آپ کو لے چلتا ہوں۔"

"نو تھینکس' مجھے معلوم ہے اسٹڈی کہاں ہے۔" ڈاکٹر بینش کے جتاتے ہوئے انداز پر وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "پھر بھی آپ گیسٹ ہیں اور اچھا نہیں لگتا۔" وہ ان کے بالکل پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹا گیسٹ میں نہیں۔ آپ ہیں' میں تو شروع سے ہی اسی گھر میں رہ رہی ہوں۔" بینش کو سامنے کھڑے لڑکے کی پُراعتماد نظروں سے الجھن ہو رہی تھی' جو ان کی بات پر باقاعدہ ہنسا تھا۔

"ارے آنٹی میں گیسٹ کہاں سے ہوا؟ یہ گھر میرے پاپا تیمور جلال کے نام پر ہے اور میں تیمور جلال کا اکلوتا بیٹا ہوں' اس حوالے سے اس گھر میں میری کیا حیثیت ہے' آپ خود اندازہ کر سکتی ہیں۔" اس نے پہلی ہی بال پر ڈاکٹر بینش کو بولڈ کیا تھا۔

"مطلب یہ کہ کوئی اس گھر میں ساری زندگی بھی گزار دے تو اس کی وہ حیثیت نہیں ہو سکتی' جو ماہیر تیمور کی ہے۔ سمپل سی بات ہے۔" بڑی اماں نے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ماہیر اور بینش کے درمیان ہونے والی اس بحث کو بڑے مزے سے سنا۔

شکستگی کے اس سخت ماحول میں بینش کے چہرے پر پھیلی خجالت نے بڑی اماں کے دل میں سکون کے کئی پھول کھلا دیے' انہیں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ ماہیر کی یہاں آمد میں قدرت کی طرف سے کوئی بھید چھپا ہے۔ انہیں اب سکون سے اس بھید کے کھلنے کا انتظار کرنا تھا۔ ڈاکٹر بینش نے ایک سرد سی نگاہ ماہیر پر ڈالی اور تیزی سے ڈاکٹر جلال کی اسٹڈی کی طرف بڑھ گئیں۔ اوریدا نے خوفزدہ نگاہوں سے پہلے ماہیر اور پھر بڑی اماں کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

"میں اپنے چاند کے لیے رات کے کھانے پر کیا بنواؤں۔؟" بڑی اماں کا شیرینی میں ڈوبا ہوا لہجہ اوریدا اور ماہیر دونوں کو چونکا گیا۔

"کھوئے والے چاول' گوبھی کا رائتہ اور چکن کباب۔" ماہیر بڑے مزے سے انہیں اپنا مینو بتانے لگا' اوریدا نے رشک بھری نگاہوں سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا' وہ مر کر بھی اس کے جیسی نہیں بن سکتی تھی۔

✡ ✡ ✡

"بس بھی کرو بیٹا' کیوں اپنا بی پی ہائی کر رہی ہو۔"

آغا جی نے اخبار سے نظر ہٹا کر بینش کی طرف دیکھا۔ ارصم بھی آج ویک اینڈ پر گھر پہنچا تھا اور پچھلے دس منٹ سے اپنی ماں کو کڑھتا، بڑبڑاتا دیکھ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی بڑے ابا کے پورشن سے لوٹی تھیں اور وہاں ماہیر سے ہونے والی ملاقات نے ان کے جذبات کو خاصا مجروح کیا تھا۔

"آپ سوچ نہیں سکتے آغا جی! کتنی لمبی زبان ہے تیمور کے بیٹے کی۔" وہ مسلسل ایک ہی بات کی گردان کیے جا رہی تھیں۔ ارصم نے الجھ کر اپنی ماں کا چہرہ دیکھا۔ بعض دفعہ وہ ان کے رویے کو خود بھی سمجھنے سے قاصر ہو جاتا اور کبھی کبھی تو اسے اپنی ماں کی ڈگریوں پر بھی شک ہونے لگتا کیونکہ ان میں اور کسی گھریلو سی ان پڑھ خاتون میں کوئی فرق ہی باقی نہیں رہتا تھا۔

"ظاہر ہے ساری زندگی اس کی یورپ میں گزری ہے، وہاں کے بہترین تعلیمی اداروں میں پڑھا ہے۔ کانفیڈنٹ تو ہو گا ہی۔" آغا جی کو ابھی تک ماہیر سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

"کانفیڈنٹ نہیں اوور کانفیڈنٹ کہیں، اور ویسے بھی زبان دراز، بدتمیز اور منہ پھٹ ہے۔" وہ ایک دفعہ پھر غصے سے کھولنے لگیں۔

"اور یہ اگر خیر میں نے کسی سے بھی بدتمیزی کرتے تو نہیں دیکھا اب تم غلط بات تو مت کرو بینش۔"

آغا جی بھی کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ ہی سچ بولنے لگتے۔ بینش نے کھا جانے والی نگاہوں سے سامنے بیٹھے اپنے والد اور اکلوتے بیٹے کو دیکھا ان میں سے کسی ایک نے بھی ان کی حمایت میں ایک بیان تک جاری نہیں کیا تھا اس لیے وہ دل ہی دل میں خوب تلملا رہی تھیں۔

"مجھے تیمور کے بیٹے کے ارادے کچھ اچھے نہیں لگ رہے۔" انہوں نے گوریدا کے متعلق مزید گل افشانی کرنے سے بہتر سمجھا کہ اپنی توجہ ایک جانب ہی رکھیں۔

"مثلاً۔" آغا جی کا سادہ سا انداز بھی انہیں چڑا گیا۔

"میں دیکھ رہی ہوں آغا جی! آپ مسلسل تیمور کے بچوں کو فیور کر رہے ہیں۔"

"میں تم سے صرف اتنا پوچھ رہا ہوں کہ کس بات پر تمہیں ماہیر کے ارادے مشکوک لگ رہے ہیں۔" آغا جی تھوڑا سنبھل کر نرمی سے بولے۔

"وہ بڑے ابا کے گھر پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔" بینش کی بات پر آغا جی ایسے مسکرائے جیسے کوئی بڑا کسی چھوٹے کی بچکانہ بات پر مسکراتا ہے۔

"یہ پورا گھر تو شروع سے ہی تیمور کے نام پر ہے، وہ اس پر مزید کیا قبضہ کرے گا؟" آغا جی نے انہیں لاجواب کیا۔

"وہ ہمیں یہاں سے بے دخل کرنا چاہتا ہو گا۔" وہ ایک نکتہ تلاش کر ہی لائیں۔

"ماما پلیز! بس کریں اب۔" ارصم سنبھل کر گویا ہوا۔ "میں ایک ہفتے بعد آیا ہوں اور آپ بجائے میرا حال پوچھنے کے، دوسروں کو فضول میں ڈسکس کیے جا رہی ہیں۔" ارصم کا موڈ ٹھیک ٹھاک خراب ہوا۔

"میں تمہیں بتا رہی ہوں ارصم! کوئی ضرورت نہیں ہے ماہیر کو زیادہ منہ لگانے کی۔" انہوں نے اس کی ناراضی کو خاطر میں لائے بغیر انگلی اٹھا کر وارننگ دی تو وہ جھنجلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"فی الحال تو آپ اس منہ میں ڈالنے کے لیے کچھ دے دیں، صبح سے سخت بھوک لگ رہی ہے، دوپہر میں ہاسٹل میں بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔" ارصم کی بات پر وہ تھوڑی سی شرمندہ ہوئیں۔

"ملازمہ سے کہتی ہوں وہ کھانا لگا دیتی ہے تم جا کر فریش ہو جاؤ۔" بینش نے خدا خدا کر کے موضوع بدلا اور کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ آغا جی اور ارصم دونوں نے ہی پرسکون ہو کر سانس لیا۔

"آغا جی! ویسے کیسا ہے ماہیر؟" ارصم نے بینش کے کمرے سے نکلتے ہی سرگوشی میں پوچھا تو وہ اس کی بے تابی پر ہنس پڑے۔

"سچ پوچھو تو برخوردار! ابھی تک ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا لیکن تمہاری ماں کی باتوں سے لگ رہا ہے' خاصی مزے کی چیز ہے۔ سوچ رہا ہوں' کل پینشن کے اپڈیٹ جانے کے بعد اس سے مل کر آؤں۔"

آغا جی نے دوستانہ انداز میں اپنے عزائم سے آگاہ کیا۔

"اور میں سوچ رہا ہوں کہ اوریدا کو فون کرکے اسے باہر کہیں کے ایف سی یا میکڈونلڈ پر بلوالوں۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں اپنا منصوبہ بھی بتایا۔

"دھیان سے بیٹا' تمہاری ماں کو پتا چل گیا تو جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔" آغا جی نے اپنے نواسے کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھا' کچھ بھی تھا انہیں اپنا یہ نواسا اپنی بیٹی سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ عادتاً" بالکل اپنے باپ اور نانا پر تھا' ماں کے مزاج سے اس نے کوئی چیز نہیں لی تھی۔

"ٹینشن مت لیں نانا جی' اب ماما کو قابو کرنے کے سارے طریقے آگئے ہیں مجھے۔" ارصم نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ان کی تسلی کروائی تو وہ مسکراتے ہوئے پھر اخبار پر جھک گئے۔

ارصم نے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی سامان ایک طرف رکھا اور سیل فون پر اوریدا کا نمبر ملا کر کاؤچ پر ڈھیر ہو گیا۔ دوسری طرف اوریدا نے فوراً" ہی اس کا فون اٹھالیا تھا۔ وہ اس سے بات کرنے کے لیے پہلے سے بے چین تھی۔

"تم سوچ نہیں سکتے ہو ارصم' بڑے ابا کا موڈ کتنا خراب ہے۔" اوریدا کے لہجے کی پریشانی سے وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ بڑے ابا کا پارہ کس ڈگری پر ہوگا۔

"انہوں نے ماہیر سے تو کچھ نہیں کہا نا۔" ارصم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اتنا تو اسے بھی اندازہ تھا کہ بڑے ابا اس کی والدہ کی طرح بدلحاظ ہونے میں بالکل بھی وقت نہیں لگاتے تھے۔

"نہیں۔" اوریدا کی بات پر ارصم کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔ "اور بڑی اماں کا مزاج کیسا ہے۔؟"

"وہ تو بہت خوش ہیں' مجھے تو لفٹ نہیں کروا رہیں اور ماہیر کے آگے پیچھے پھر رہی ہیں' ظاہر ہے وہ ان کا پوتا جو ہوا۔" ارصم کے سامنے آتے ہی اوریدا کو اپنے سارے دکھ یاد آگئے۔

"شرم کرو' اپنے سگے بھائی سے جیلس ہو رہی ہو۔" ارصم نے اسے جان بوجھ کر چھیڑا اور وہ چڑ بھی گئی۔

"میں ماہیر سے جیلس نہیں ہو رہی ہوں بلکہ مجھے بڑی اماں کی زیادتی پر افسوس ہو رہا ہے' بھلا کوئی ایسے بھی سگی اولاد کے بچوں کے درمیان فرق کرتا ہے۔"

اوریدا کے جل کر بولنے پر وہ ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔

"تم کبھی نہیں بدل سکتی ہو اوریدا۔" اس نے بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پا کر کہا۔

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو نا۔" اوریدا کو کافی دیر بعد احساس ہوا تو اس نے فوراً" تردید کی۔ "میں ایسی جرات کر سکتا ہوں بھلا' میں تو سوچ رہا تھا کہ تم اپنے سے پانچ سال بڑے ماہیر کو کیسے اس کا نام لے کر دھڑلے سے مخاطب کرتی ہو۔"

"تو اور کیا کہوں۔" اوریدا حیران ہوئی۔

"کم از کم اس کے نام کے آگے پیچھے بھائی کا لفظ ہی لگالو' بڑی اماں نے سن لیا تو پھر جھاڑ پڑ جائے گی تمہیں۔" ارصم نے مفت مشورہ دیا۔

"وہ تو پڑ بھی چکی۔" اوریدا نے مسکرا کر اطلاع دی' تو وہ ایک لمحہ پھر ہنس پڑا۔ اگلا ایک گھنٹہ ان دونوں نے بے شمار بے معنی قسم کی باتوں میں گزار دیا۔

ملازمہ ارصم کو بلانے آئی تو تب اس نے فون بند کیا تھا دوسری طرف اوریدا پورے ایک ہفتے کی روداد سنا کر بالکل ہلکی پھلکی ہو چکی تھی اور اب وہ ماہیر کے سامنے "ارصم نامہ" شروع کر چکی تھی۔

"اچھا دوست ہے تمہارا' ملنے تک تو آیا نہیں تم سے۔" ماہیر نے اپنے آئی پیڈ سے نظریں ہٹائے بغیر لے تنک کہا۔

"ابھی دو گھنٹے پہلے تو آیا ہے' کھانا وانا کھا کر ہی آئے گا نا۔" اوریدا نے فوراً" اس کی جانب سے صفائی

دی۔

"کھانا وانا کھا کر آئے گا یا اپنی ماما کو سلا کر اور اطمینان کر کے پھر چوری چھپے آئے گا۔" ماہیر کا لہجہ تو شرارتی تھا لیکن اس کے بالکل درست اندازے پر وہ ایک لمحے کو بالکل ہکا بکا رہ گئی۔ ماہیر کو پاکستان آئے ہوئے بمشکل چند ہی گھنٹے ہوئے تھے، لیکن وہ ان چند گھنٹوں میں بہت سی چیزوں کو سمجھ چکا تھا، جنہیں سمجھنے میں خود اوریدا نے کئی مہینے لگا لیے تھے۔

"ہاں اس کی ماما تو واقعی یہاں آنے پر بہت چڑتی ہیں۔" اس نے افسردگی سے بتایا۔

"ویسے ان کے ساتھ مسئلہ کیا ہے...؟ کیا دماغ کا اوپر والا پورشن خالی ہے ان کا۔" ماہیر ابھی بھی غیر سنجیدہ تھا۔

"تمہیں پتا ہے ماہیر، آنٹی بینش کی پاپا کے ساتھ انگیجمنٹ ہوئی تھی ماضی میں۔" اوریدا نے اپنی طرف سے بڑا انکشاف کرنے کی کوشش کی۔

"تھینکس گاڈ! پاپا کی ان کے ساتھ شادی نہیں ہوئی، کم از کم اتنی بد مزاج ماما میں تو افورڈ ہی نہیں کر سکتا تھا۔" ماہیر نے اس بات پر اتنی لاپروائی سے تبصرہ کیا کہ چند لمحے تک اوریدا کچھ بول ہی نہیں سکی۔ "تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟"

"ہرگز نہیں... اس میں حیرانی کی کیا بات ہے یہ تو عام سی بات ہے۔" ماہیر پر مغربی رنگ کافی حد تک چڑھ چکا تھا۔ اوریدا کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ دوسری طرف ماہیر نے جانچتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اوریدا! میں نوٹ کر رہا ہوں تم اس گھر کی پالیٹکس میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی دلچسپی لے رہی ہو۔"

"تو اور کیا کروں، میرے علاوہ یہاں کوئی اور لڑکی بھی تو نہیں ہے۔" اوریدا نے اپنی مجبوری بتائی۔

"اپنا ایف ایس سی کا زبردست سا میرٹ بناؤ، تم اتنی ڈفر تو نہیں تھیں، جتنی یہاں آکر ہو چکی ہو۔" ماہیر نے اس کی کلاس لی۔

"پڑھ تو رہی ہوں۔" وہ ہولے سے منمنائی۔

"وہ تو میں نے یہاں آکر دیکھ لیا ہے کہ تم کتنا پڑھ رہی ہو، اب روز میں خود تمہارے ٹیسٹ لیا کروں گا، میں دیکھتا ہوں، تم کیسے نہیں مارکس لیتی ہو۔" ماہیر کی بات پر اوریدا کا سانس حلق میں ہی اٹک گیا، اتنا تو وہ بھی جانتی تھی کہ وہ اسٹڈی کے معاملے میں بالکل ارسم کی طرح کریزی تھا۔

"پاکستان آکر کوئی لفٹ ہی نہیں..." سرمد اچانک ہی دروازہ کھول کر لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ اوریدا کے لیے اس کی آمد کسی بڑی خوشی سے کم نہیں تھی کیونکہ ماہیر کی توجہ اس کی جانب سے ہٹ کر سرمد کی طرف ہو چکی تھی۔ سرمد اور ماہیر دونوں گرمجوشی سے مل رہے تھے دونوں کی اسکائپ اور وائبر پر کافی فرینڈشپ ہو چکی تھی۔ دونوں تقریباً ہم عمر تھے۔

"اوریدا! اسٹرابیری کا اچھا سا شیک تو پلواؤ۔" ماہیر کی فرمائش پر اوریدا نے وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی، لیکن سرمد کی نگاہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

موسم بدل چکا تھا۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ تایا صالحہ کو ہسپتال سے گھر آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اور پچھلے ایک ہفتے سے عدینہ بالکل خاموش تھی۔ وہ سارا سارا دن قرآن پاک کھولے اسے حفظ کرنے میں مصروف رہتی۔ وہ تیزی سے اسے ختم کر رہی تھی۔ مدرسے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اکثر صحن میں لگے جامن کے درخت کے نیچے چارپائی بچھا کر لیٹ جاتی۔ آج اس کا ٹھکانہ مٹی کا چولہا تھا جو سب نے اپنی سہولت کے لیے بنا رکھا تھا۔ انہیں سوئی گیس کے چولہے پر کام کرنے میں بالکل مزا نہیں آتا تھا۔

"عدینہ باجی! ایک بات کہوں..." مونا اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"ہاں بولو۔" عدینہ جھاڑو کے تنکے سے راکھ کرید رہی تھی۔

"جو چیزیں صرف دکھ اور رنج کا باعث بنیں انسان

کو انہیں بھلا دینا چاہیے۔" مونا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہاں، تم بالکل ٹھیک کہتی ہو، میں بھی عبداللہ کو بھلانے کی کوشش کروں گی۔" اس کے متفق ہونے پر مونا ہکا بکا رہ گئی، اسے کہاں عدینہ سے اس جملے کی امید تھی، وہ تو ہر دفعہ اس بات کے جواب میں اسے محبت کے نام پر ایک لمبا سا لیکچر دینے لگتی تھی۔

"مجھے لگتا ہے وہ واقعی زندہ نہیں ہے۔" عدینہ بمشکل بولی تو مونا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر عبداللہ زندہ ہوتا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ مجھ سے رابطہ نہ کرتا۔" عدینہ کی خوش فہم محبت اعتماد بھرے انداز سے گویا ہوئی۔ مونا بالکل ہی لاجواب ہو گئی۔

"محبت میں اگر کشش نہ ہو تو دل کی بات دل تک ضرور جاتی ہے ورنہ ایسا کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص سے آپ کے دل کے تار جڑے ہوں اور اسے دوسرے دل کی پریشانی اور دکھ کا اندازہ نہ ہو سکے۔" عدینہ کے لہجے سے اداسی ٹپکی۔

"ہاں کہتی تو آپ ٹھیک ہیں۔" مونا نے فوراً ہی اس کی تائید کی۔ اسی لمحے آپا صالحہ ایک تکیہ اور چادر اٹھائے کمرے سے باہر نکلیں۔ انہوں نے صحن میں چارپائی بچھائی اور لیٹ گئیں۔ وہ کچھ عرصے سے بالکل ہی خاموش ہو گئی تھیں۔ انہوں نے خود کو نماز اور عبادات میں مگن کر لیا تھا۔ سبے نے ان سے باتیں کرتی جاتیں اور وہ ہوں ہاں سے زیادہ کسی بات کا جواب نہیں دیتی تھیں، تنگ آکر بے خودی ان کے پاس سے اٹھ کر آجاتیں۔

"آپا باہر تو خنکی بڑھ جائے گی، آپ یہاں آکر کیوں لیٹ گئی ہیں۔" مونا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سونے کے ارادے سے آئی ہیں۔

"اندر میرا دم گھٹ رہا تھا۔" انہوں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا، مونا نے گھبرا کر عدینہ کی طرف دیکھا، وہ بھی خاموشی سے آپا صالحہ کے سرہانے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

"لیکن رات کو تو شبنم گرتی ہے اور موسم سرد ہو جاتا ہے۔" مونا نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

"فکر نہ کرو، یہ چند شبنم کے قطرے میرے اندر جلتے آتش فشاں کو بجھانے کے لیے ناکافی ہیں۔" وہ تلخ انداز سے گویا ہوئیں۔

عدینہ نے بہت غور سے اپنی ماں کا اترا ہوا سا چہرہ دیکھا، وہ چند ہی دنوں میں بہت بوڑھی لگنے لگی تھیں۔ اس وقت وہ ایک ایسے کھنڈر کی مانند لگ رہی تھیں جو اپنے زمانے میں پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہو۔ ان کے چہرے پر کیا نہیں تھا، دکھ، غم، پچھتاوا اور رنجیدگی۔

عدینہ کا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔ اسے نہ جانے کیا ہوا، خاموشی سے آپا صالحہ کی چارپائی پر ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ آپا صالحہ کے سپاٹ چہرے پر کوئی تغیر رونما نہیں ہوا، عدینہ کے دل میں کوئی جوار بھاٹا اٹھا اور وہ ایک دم ہی آپا صالحہ سے چمٹ گئی۔ مونا کے ساتھ ساتھ آپا صالحہ بھی گھبرا سی گئیں۔ عدینہ ان کے وجود کے ساتھ لپٹے ہوئے بلند آواز میں رو رہی تھی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر سبے سے عشاء کی نماز ادھوری چھوڑ کر صحن کی طرف بھاگ کر آئیں۔ سامنے بڑا عجیب سا منظر تھا۔ رات کی چاندنی میں ایک جوان وجود ایک بوڑھے وجود سے لپٹا ہچکیوں میں رو رہا تھا۔

"امی! مجھے معاف کر دیں، پلیز... مجھے معاف کر دیں۔" عدینہ نے پتا نہیں کتنے سالوں کے بعد انہیں "آپا" کے بجائے "امی" کہا تھا۔ آپا صالحہ کے جلتے ہوئے وجود پر کوئی ٹھنڈی آبشار پوری قوت سے گری۔ ان کی آنکھوں سے بھی بے آواز آنسو بہنے لگے۔ مونا اور سبے بھی یہ جذباتی منظر دیکھ کر رونے لگیں۔ کئی سال سے جمی سرد مہری کی برف اس چاندنی رات میں ایک دم ہی پگھلی تھی۔ آسمان پر موجود چاند بھی اس ملاپ پر مسکرا اٹھا۔

آپا صالحہ کو لگا کہ جنت کی کسی کھڑکی کا پٹ ان کی

جانب کھلا ہے۔ ایک دلفریب ٹھنڈی ہوا نے انہیں اپنے حصار میں لیا۔ ذہن میں جھنجھلاہٹ ایک دم ہی سرد ہوا۔ وہ خواب نہیں دیکھ رہی تھیں لیکن خواب جیسی اس حقیقت پر یقین کرنا بھی تو مشکل تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کو زور سے میچا اور پھر کھولا، سامنے وہی منظر تھا۔ آپا صالحہ کو لگا اللہ کے کرم کی وسعت کو ناپنا انسان کے بس کی بات نہیں۔

"آپ میرا میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کروا دیں' مجھے آپ کا خواب پورا کرنا ہے۔" وہ ایک معصوم بچے کی طرح رو رہی تھی' جسے ایک دم ہی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔ اس درخواست کے بعد عدینہ کو اپنا وجود روئی کے گالے کی طرح ہلکا پھلکا سا محسوس ہوا۔

"پگلی نہ ہو تو بھلا ایسے بھی کوئی رات کو روتا ہے۔" بے بے نے آگے بڑھ کر آہستگی سے عدینہ کو آپا صالحہ سے علیحدہ کیا' وہ ہتھیلی کی پشت سے اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ آپا صالحہ نے ہاتھ کے اشارے سے بے بے کو منع کیا کہ وہ عدینہ کو علیحدہ نہ کریں' آج کتنے سالوں کے بعد ان کی ممتا کی تسکین ہوئی تھی' انہوں نے اپنی ذات پر جو خود ساختہ پہرے لگا رکھے تھے' وہ سارے ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئے تھے۔

"پہلے قرآن پاک تو پورا حفظ کر لو' میں انشاء اللہ اگلے سال تمہارا ایڈمیشن کروا دوں گی۔" عدینہ ان کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔ انہوں نے نرمی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ سوتا اور بے بے دونوں اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ آج کی رات دونوں ماں بیٹی کے درمیان آنے والے صدیوں کے فاصلے ختم ہو جائیں۔

وہ فاصلے جنہوں نے دلوں پر بدگمانی کی کائی جما دی تھی' جنہوں نے آنکھوں کے آگے دھند کی چادر تان دی تھی۔ وہ دونوں ریل کی پٹری کی طرح صرف ساتھ ساتھ چل رہی تھیں کوئی ایسا ٹریک نہیں تھا جہاں یہ دونوں پٹریاں یکجا ہو جاتیں' لیکن آج شاید قدرت کو ان پر رحم آ ہی گیا تھا۔

"آپ نے مجھے معاف کر دیا ناں۔" عدینہ نے آپا صالحہ کا سرد ہاتھ پکڑ کر التجائیہ انداز سے کہا۔ چاند کی دھیمی سی روشنی میں بھی وہ آپا صالحہ کے چہرے پر پھیلی چمک کو دیکھ سکتی تھی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے معلوم تھا کوئی بھی ماں' اپنی اولاد سے زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہ سکتی۔" عدینہ روتے روتے مسکرائی۔ اس کی اس بات پر آپا صالحہ کو جھٹکا سا لگا۔

"ایسا نہیں ہے عدینہ۔" آپا صالحہ اسے جتانا چاہتی تھیں۔ "کبھی کبھی مائیں بھی اپنے بچوں سے دل سے خفا ہو جاتی ہیں اور جب ماں کا دل دکھے تو اللہ بھی ان سے ناراض ہو جاتا ہے اور جس سے اللہ خفا ہو جائے' اسے دنیا کے کسی حصے میں امان نہیں ملتی۔ بدقسمتی' دکھ اور غم اس کے وجود کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں اور وہ زمانے کی ٹھوکروں کی زد میں آ جاتا ہے۔ اس کی حیثیت خزاں کی زد میں آئے ہوئے ایک ٹوٹے پتے سے زیادہ نہیں ہوتی۔" آپا صالحہ بالکل خاموش تھیں' اور ان کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ رہے تھے۔ جسے پہلی دفعہ انہوں نے عدینہ سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"آج آپ کو کیا ہوا عدینہ باجی۔" رُت کو سوتا اپنا تکیہ اٹھائے اس کے کمرے میں چلی آئی' عدینہ دیوار سے ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں تھی۔

"مجھے لگا' میں نے آپا کا دل دکھایا ہے اور اسی کی اللہ نے مجھے سزا دی ہے۔" عدینہ نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"کیسی سزا۔؟" سوتا حیران ہوئی۔

"جب اللہ کسی سے دل کا سکون چھین لیتا ہے تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ انسان کی بے قراری اور بے چینی بعض دفعہ بہت سے نادانستہ طور پر کیے گئے گناہوں کا بھی نتیجہ ہوتی ہے۔"

عدینہ خاموشی سے اٹھی اور وضو کرنے کے لیے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

"پتا ہے عدینہ باجی' مجھے ایسا لگا جیسے آپ نے شادی سے بچنے کے لیے دوبارہ ایڈمیشن لینے کا ارادہ کیا"

ہے۔" وہ جیسے ہی وضو کر کے کمرے میں آئی "مونا نے مسکراتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"اصل میں مجھے ایک بات سمجھ میں آگئی ہے۔"

عدینہ نے الماری کھول کر جائے نماز نکالی۔

"وہ کیا۔؟" مونا بے تابی سے بولی۔

"کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ انسان کی قسمت میں انمٹ سیاہی سے لکھ دیتا ہے۔ وہاں پر تدبیر بھی بے بس ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اللہ کی رضا میں راضی ہونے میں ہی آسانی اور سکون ہوتا ہے۔" عدینہ نے جائے نماز بچھائی۔

"کیا اسی لیے آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا؟" مونا فوراً" ہی اس کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ وہ جو نیت کے لیے ہاتھ اٹھانے ہی والی تھی ایک لمبی سانس لے کر رہ گئی۔ اس نے سنجیدہ نظروں سے اپنی کزن کا حیران چہرہ دیکھا۔

"پتا نہیں۔" عدینہ نے صاف گوئی سے کہا۔

"بعض فیصلے آپ سے صرف اللہ کرواتا ہے اور اللہ کے کیے گئے آسمانی فیصلوں کے جواز زمین پر نہیں ڈھونڈا کرتے۔"

عدینہ نے اپنی بات مکمل کرتے ہی نیت باندھ لی۔ مونا اس کی بات پر دل ہی دل میں متفق ہوتے ہوئے دوبارہ بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ بعض دفعہ اسے عدینہ اور آپا ایک دم ہی حیران کر دیتی تھیں جیسے آج ان دونوں نے پھر حیران کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شانزے اور رباب کے کمرے میں موت کا سا سکوت طاری تھا۔ پہلا موقع تھا کہ شانزے بالکل خاموش اور سپاٹ چہرے کے ساتھ اپنی روم میٹ کو اطلاع دے چکی تھی کہ اس کی فلم کا پروڈیوسر کچھ اختلافات کی وجہ سے ادھوری فلم چھوڑ کر ملک سے جا چکا ہے اور یہ فلم بھی بہت سی دوسری موویز کی طرح کسی ڈبے میں بڑی اپنی بدقسمتی کو رو رہی تھی۔ سعد نے بہت مشکل سے اسے یہ خبر دی تھی "اس کا خیال تھا کہ شانزے ہمیشہ کی طرح رونا دھونا شروع کر دے گی۔ لیکن اس پر تو لگتا تھا جیسے صدمے سے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

"آخر ہوا کیا۔؟" رباب پریشان سے انداز میں اس کے بالکل پاس آن بیٹھی۔ "تمہاری مووی کا تو سیونٹی پرسینٹ کام ہو چکا تھا۔"

"پروڈیوسر کا اس فلم کے ہیرو اور ڈائریکٹر کے ساتھ کوئی بڑا اختلاف ہو گیا ہے۔" شانزے نے سعد کے منہ سے سنی ہوئی بات یہاں بھی دہرا دی۔

"وہ لوگ پاگل تو نہیں ہو گئے' اتنا کام کر کے اور اتنا پیسہ لگا کر بیچ میں چھوڑ دیا۔" رباب کو ایک دم ہی غصہ آیا۔

"سعد بھائی بتا رہے تھے یہ انا کی جنگ ہے اور انا کی جنگ میں روپیہ پیسہ' وقت کچھ بھی نہیں دیکھا جاتا۔" رباب بیدردی سے اپنے ناخنوں پر لگی پرپل کلر کی نیل پالش کھرچنے لگی۔ جو صبح اس نے بڑی محنت سے لگائی تھی۔

"تم بات کر کے دیکھو۔" رباب سے اس کی پریشان شکل دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

"کس سے۔؟" شانزے نے الجھ کر اپنی مخلص دوست کا بے غرض سا چہرہ دیکھا۔

"بھئی پروڈیوسر سے پوچھو' تمہارا کیا قصور ہے۔ آخر وہ اپنی فضول جنگ میں تمہارا مستقبل کیوں داؤ پر لگا رہے ہیں؟" رباب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خود اس سے بات کرنے پہنچ جائے۔

"اپنے مفادات کی جنگ میں لوگ صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں' دوسروں کے بارے میں کوئی احمق ہی سوچتا ہو گا۔" شانزے ہلکا سا چڑ کر بولی۔

"بس ٹھیک ہے' تم بھی دفع کرو اسے اور اپنی اسٹڈی کی طرف دھیان دو۔" رباب نے اٹھ کر کمرے میں پھیلی چیزوں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔

"رباب' آج مجھے شدت سے ایک بات کا احساس ہوا ہے۔" شانزے دیوار سے ٹیک لگا کر سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"کس بات کا۔۔۔؟" ریاب حیران ہوئی۔

"میری پھپھو ہمیشہ کہتی تھیں کہ میری ماں ایک بدقسمت عورت تھی' مجھے لگتا ہے' مجھے بھی بدقسمتی جینز میں اس کی طرف سے ملی ہے۔"

"ایسی فضول باتیں نہیں کرتے۔" ریاب نے اس کے ہاتھ سے سینڈل اٹھا کر الماری میں رکھے۔

"ریاب! آئی ایم سیریس۔" وہ جھنجلا سی گئی۔

"تم میری زندگی کا جائزہ لو' تمہیں خود بخود احساس ہو جائے گا کہ کس طرح میرے بنے ہوئے کام بگڑ جاتے ہیں۔ میں سونے کو بھی ہاتھ لگاتی ہوں تو وہ مٹی بن جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے میں کسی سرسبز درخت کو بھی ہاتھ لگاؤں گی تو وہ سوکھ کر تباہ ہو جائے گا۔" وہ حد درجہ خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔

"زندگی میں بہت سارے لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بدقسمت ہیں بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ نے ان کے لیے اس سے بہتر چیز رکھی ہوتی ہے۔" ریاب نے نرمی سے اسے سمجھانا چاہا۔

"یہ محض دل بہلانے کی باتیں ہیں اور کچھ نہیں۔" وہ استہزائیہ انداز سے گویا ہوئی۔

"تم ان سب چیزوں کو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔" ریاب نے کچھ سا تعجب کر کہا۔

"تو پھر اور کیا کروں۔ ایم فل کر کے یونیورسٹی یا ورلڈ بینک میں جاب کر لوں۔" شانزے کو ایک دم ہی غصہ آ گیا۔

"تم بس وہ کرو' جو اللہ چاہتا ہے۔" ریاب نے ہمدردی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"مجھے کیسے پتا چلے گا کہ اللہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟" اس نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ "میں نہ تو کوئی ولی اللہ ہوں' نہ مجھے خواب آتے ہیں' نہ میرا وجدان اتنا پاورفل ہے جو مستقبل کی چیزوں کو جان سکے۔" وہ آہستہ آہستہ شدید ڈپریشن کی طرف جا رہی تھی۔

"تم بس وہ سب کام چھوڑ دو' جن میں اللہ کی طرف سے رکاوٹیں آ رہی ہیں۔" ریاب نے تحمل سے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ رکاوٹ نہ ہو بلکہ آزمائش ہو' جو میرے جذبے کی طاقت کو پرکھنے کے لیے کی جا رہی ہو۔"

شانزے سے بحث میں جیتنا آسان تھوڑی تھا۔ وہ آخری دم تک لڑنے کی قائل تھی۔

"ہر وہ کام جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہ ہو' اگر اس میں کوئی مسئلہ آ رہا ہے تو صاف بات ہے یہ آزمائش نہیں بلکہ رکاوٹ ہے' ایک تنبیہہ ہے جو اللہ اپنے کسی پیارے کو کسی کام سے بچانے کے لیے کر رہا ہے۔"

ریاب نے سنجیدگی سے اپنی بات کی وضاحت کی تو شانزے ایک دم لاجواب ہو گئی۔ اس نے کچھ دیر ریاب کا بے ریا چہرہ دیکھا اور پھر چادر اٹھائی اور سر پر تان لی' ریاب کو پتا چل گیا تھا وہ اب ساری رات خاموشی سے ان ناکامی کا سوگ منائے گی اور صبح ہوتے ہی وہ ایک نئے جذبے کے ساتھ پھر تازہ دم ہو چکی ہو گی۔ یہی شانزے کی سب سے بڑی خوبی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا کہا ہاشم نے۔" بختاور فون بند کر کے اپنے کمرے میں آئی تو نیلم بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے اور پورے ہاسٹل میں کافی حد تک خاموشی ڈیرے ڈال چکی تھی۔

"تمہیں کس نے کہا کہ ہاشم کی کال تھی۔" بختاور نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی روم میٹ کا چہرہ دیکھا۔ کچھ عرصے سے وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے دکھ سکھ کی ساتھی تھیں اور ایک دوسرے کی خوشیاں اور پریشانیاں الہام کی طرح ان کے دل پر اترتی تھیں۔

"ظاہر ہے' اس وقت تمہیں گھر سے تو کال آنے سے رہی۔" نیلم نے اپنا بستر جھاڑتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"ہاں ہاشم ہی تھا۔" وہ تھکے ہوئے انداز سے اپنے بستر پر بیٹھ گئی جو تھوڑی دیر پہلے ہی نیلم نے سیٹ کیا تھا۔

"کیا کہا اس نے؟ کب بھجوائے گا اپنے گھر والوں کو

تمہارے پاس؟" نیلم کی سوئی آج کل اسی ایک بات پہ اٹکی ہوئی تھی۔

"کبھی بھی نہیں۔۔۔" بختاور کے افسردہ سے انداز پر نیلم کو جھٹکا سا لگا۔ "کیوں؟ کیا پرابلم ہے اس کے ساتھ؟"

نیلم کا مزاج برہم ہوا۔

"اس کے اپنے والدین کے ساتھ کچھ اختلافات ہو گئے ہیں' جس کی وجہ سے ان سے رابطہ کرنا نہیں چاہتا' میں نے تمہیں بتایا تو تھا" بختاور سر جھکائے اسے حقیقت زدہ انداز میں بتا رہی تھی۔ سچ بات تو یہ تھی کہ اسے آج ہاشم نے خاصا مایوس کیا تھا۔

"تو اس طرح چھڑے چھانٹ کو کون رشتہ دے گا؟ اس سے کہو منہ دھو رکھے۔ کوئی ضرورت نہیں دوبارہ اس سے رابطہ کرنے کی۔" نیلم نے غصے سے اپنے بیڈ کی چادر زور زور سے جھاڑنا شروع کر دی۔ بختاور نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے۔۔۔؟" بختاور کو اس کی خاموشی سے کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا' ایسا لگتا ہے جیسے کسی بند گلی میں آکر کھڑی ہو گئی ہوں۔" بختاور بہت زیادہ دل گرفتہ تھی۔

"دیکھو بختاور! کوئی بھی ایسا فیصلہ مت کرنا' جس سے تمہیں کل کو پچھتانا پڑے۔" نیلم اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"میں ہاشم کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہوں' تمہیں اندازہ نہیں ہے نیلم اس شخص کی میری زندگی میں کیا اہمیت ہے۔" بختاور جذباتی انداز سے گویا ہوئی۔

"لیکن تمہارے والدین کبھی بھی نہیں مانیں گے۔" نیلم نے اسے یاد دلایا۔

"اگر ہاشم کے ساتھ میری شادی نہ ہوئی تو میں ساری زندگی شادی ہی نہیں کروں گی۔" بختاور دل ہی دل میں اپنے والدین سے ٹھیک ٹھاک خفا ہو چکی تھی۔

نیلم کو ایک دم ہی اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

"تم ہاشم سے کہو نا وہ تمہاری خاطر اپنے والدین کو منالے۔" نیلم نے اسے اکسایا۔

"وہ کہتا ہے کہ تم میری خاطر اپنے والدین کو منالو۔" بختاور زبردستی مسکرائی۔

"عجیب احمق شخص ہے' اسے نہیں معلوم محبت کے سفر میں اگر کوئی لڑکی کسی مرد کی ہاں میں ہاں ملالے تو یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہوتی' وہ ایک آگ کا دریا عبور کر کے اپنے خاندان کی روایتوں سے انحراف کر کے اسے قبولیت کا درجہ بخشتی ہے تو اس مرد کو کم از کم اس سے مزید قربانیوں کی توقع تو نہیں رکھنی چاہیے۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔۔۔" بختاور کی آج سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ہی ماؤف ہو چکی تھیں۔

اگلے دن اتوار تھا اور صبح صبح ہی بختاور کی گھر سے کال آگئی تھی اس کی بہن نے جھجکتے ہوئے اسے اطلاع دی تھی کہ بابا نے اس کا رشتہ طے کر دیا ہے اور اگلے ویک اینڈ پر اس کا نکاح ہے۔

"وہ مجھ سے پوچھے بغیر میرا رشتہ کیسے طے کر سکتے ہیں۔۔۔" غصے سے اس کی آواز بلند ہوئی تو کوریڈور سے گزرتی دو لڑکیوں نے بے اختیار مڑ کر اس کی طرف دیکھا' وہ ریسپشن پر پی سی او فون کان سے لگائے کھڑی تھی۔

"دیکھو آپی! مجھے تو انہوں نے سختی سے منع کیا تھا کہ آپ کو نہ بتاؤں' لیکن میں نے سوچا کہ آپ کو انفارم کرنا بہتر ہے تاکہ آپ ذہنی طور پر تیار ہو کر آئیں۔" اس کی بہن نے محتاط انداز سے اپنا نقطہ نظر بتایا۔

"کس کے ساتھ طے کیا ہے انہوں نے میرا رشتہ؟" بختاور نے انتہائی خراب موڈ کے ساتھ پوچھا۔

"انکل عباد کے بیٹے فیصل کے ساتھ' جو فرشتہ بن رہے ہیں۔" اس اطلاع نے بختاور کا مزاج مزید برہم کیا' انکل عباد کی پوری فیملی اسے سخت ناپسند تھی۔

"بابا کا تو لگتا ہے واقعی دماغ خراب ہو گیا ہے۔" اس نے پوری قوت سے ریسیور کریڈل پر رکھا اور دھپ دھپ کرتی ہوئی فرسٹ فلور پر واقع اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی تکیہ اٹھا کر زمین پر مارا تھا' الیکٹرک کیتل پر چائے

بتاتی نیلم نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔

"بختاور! کیا ہوا۔۔؟" وہ پریشان ہوئی۔

"بابا نے میری بات طے کر دی ہے اور نکاح کا پروگرام سیٹ کر رہے ہیں۔" نیلم کے ہاتھ میں پکڑے کپ سے تھوڑی سی چائے چھلکی۔

"کس کے ساتھ۔۔؟" نیلم کی پریشانی فطری تھی۔

"اپنے کسی فرینڈ کے بیٹے کے ساتھ۔۔" بختاور نے منہ بنا کر اطلاع دی۔

"لیکن اتنی جلدی۔۔"

"ہاں ڈر گئے ہوں گے کہیں ہاشم ان کے پاس رشتہ مانگنے نہ آجائے۔" بختاور ان سے حد درجہ بدگمان ہو چکی تھی۔

"تم اپنی امی سے بات کر کے دیکھو اور انہیں سمجھاؤ وہ یہ سب اتنی جلدی میں مت کریں' تم کون سا کہیں بھاگی جا رہی ہو۔"

نیلم کے آخری جملے پر بختاور ایک دم چونکی اور کچھ بھی کہے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ اس کے قدم اب ٹیلی فون بوتھ کی طرف تھے۔ اس نے کارڈ خریدا اور ابوبکر ہال کا نمبر ملایا' جو بزی جا رہا تھا۔ وہ آدھا گھنٹہ انتظار کرتی رہی' تب جا کر نمبر ملا اور اگلے پانچ منٹ کے بعد ہاشم ٹیلی فون پر تھا۔

"ہاشم! مجھے تم سے ابھی اور اسی وقت ملنا ہے۔۔" بختاور نے سلام دعا کیے بغیر اسے کہا تو وہ اس کے لہجے کی سنجیدگی پر تھوڑا سا پریشان ہوا۔

"تو ٹھیک ہے آجاؤ میں سینٹرل کینٹین کی طرف آ رہا ہوں۔" ہاشم کی بات پر اس نے فوراً" فون رکھا اور واش روم میں جا کر دو چار چھینٹے چہرے پہ مارے اور اپنے کمرے میں جا کر الماری کھول کر کھڑی ہو گئی۔

"کہیں جا رہی ہو کیا۔۔؟" نیلم نے اسے پریس شدہ سوٹ اٹھا کر واش روم کی طرف جاتے دیکھا تو پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ بختاور نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں ہاشم سے ملنے۔۔"

"کیمپس میں آ رہا ہے وہ۔۔!" نیلم حیران ہوئی کیونکہ وہ چھٹی والے دن بختاور سے ملنے نہیں آتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بختاور نے اسے فون کر کے بلایا تھا۔ یقیناً" وہ اس سے اپنے رشتے کی بات ڈسکس کرنے والی تھی۔ اگلے گھنٹے میں وہ ہاشم کے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔

"معاف کرنا بختاور' تمہارے گھر والوں کا رویہ مجھے بہت عجیب لگا ہے۔" ہاشم نے ساری بات سن کر بے تکلفانہ تبصرہ کیا۔ بختاور شرمندگی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس نے اس بات پر کوئی رائے نہیں دی۔

"تمہیں اتنی دور آکر پڑھنے کی اجازت تو دے دی لیکن اپنی مرضی سے جینے کا حق نہیں دے رہے۔" ہاشم ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہوا۔

"بابا کا مزاج شروع سے ہی ایسا ہے' انہوں نے میرے بھائی کی منگنی بھی زبردستی میرے چچا کے ہاں کر رکھی ہے۔" بختاور نے دھیمے سے انداز میں اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ دونوں اس وقت سینٹرل لائبریری کے لان میں بیٹھے تھے۔ ہاشم نے ہاتھ میں چائے کا کپ اٹھا رکھا تھا اور بختاور کے سامنے رکھی چائے بالکل ٹھنڈی ٹخ ہو چکی تھی۔

"کتنی زیادتی کی بات ہے' انہوں نے مجھ سے ایک دفعہ ملنا بھی گوارا نہیں کیا اور تمہاری زندگی کا فیصلہ کر دیا۔" ہاشم کا شکوہ بختاور کو بالکل جائز محسوس ہوا۔

"میں کیا کر سکتی ہوں ہاشم۔۔" اس نے بے بس نظروں سے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا جو اس وقت اسے پوری دنیا سے زیادہ عزیز ہو گیا تھا۔

"اگر وہ تمہاری خواہش کا احترام نہیں کر رہے تو کیا تم نے سب کی امیدوں پر پورا اترنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔" ہاشم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بختاور کے بابا کو اٹھا کر کسی گمنام جزیرے پر پھینک آتا جو ان دونوں کی زندگی میں ولن بن کر آ گئے تھے۔

"میں اگر کوئی ایسا ویسا قدم اٹھاؤں گی تو میرے خاندان کی باقی لڑکیوں پر تعلیم کے راستے بند کر دیے جائیں گے۔" بختاور حد درجہ حساس تھی۔

"تمہاری زندگی برباد کر دی جائے گی' ایک ناپسندیدہ

شخص تم پر مسلط کر دیا جائے گا تو خاندان کی باقی لڑکیاں تمہیں بچانے آئیں گی کیا۔" ہاشم کو ایک دم ہی غصہ آگیا۔

"لیکن ہاشم..." بختاور تذبذب کا شکار ہوئی۔

"لیکن ویکن کو چھوڑو بختاور' یہ تمہاری زندگی ہے اور زندگی بار بار نہیں ملتی' جب کوئی تمہارا خیال نہیں کر رہا تو تم اپنی زندگی کیوں داؤ پر لگا رہی ہو۔" ہاشم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں بابا کی مرضی کے بغیر اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتی ہوں..." بختاور نے جھجک کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا۔

"تو ٹھیک ہے پھر ان کی مرضی کے مطابق ڈاکٹر فیصل سے شادی کر لو..." وہ ناراضی سے کھڑا ہوا۔ بختاور کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

"تم کہاں جا رہے ہو...؟" وہ بوکھلا سی گئی۔

"ہاسٹل..." وہ خفا ہو چکا تھا۔

"تم مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو ہاشم' یہ مسئلہ حل کرو۔ میں اسی لیے تو تمہارے پاس آئی ہوں۔" بختاور کی آنکھیں ایک دم بھیگ گئیں۔ وہ تھوڑا سا نارمل پڑ گیا

"اگر میری بات نہیں مانی تو میرے سامنے رونا بھی مت۔ اوکے..." اس نے انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا' میں کیا کروں؟" بختاور کی آنکھوں سے نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو پھسل گئے۔ ہاشم بے بس انداز سے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور سامنے بیٹھی لڑکی کو غور سے دیکھنے لگا' وہ جز بز ہوئی۔ "ایسے کیوں دیکھ رہے ہو...؟"

"دیکھ رہا ہوں کہ لوگ کہتے ہیں محبت انسان کو بہادر بنا دیتی ہے لیکن تم پر تو اس کا الٹا ہی اثر ہوا ہے۔" اس نے برا سا منہ بنایا' وہ خاموشی سے روتی رہی۔

"یہ رونا دھونا بند کرو' پلیز۔ تمہیں پتا ہے نا' تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔" ہاشم کا محبت بھرا انداز بختاور کے دل کا چین اڑا کر لے گیا۔ اس کا یہی حق جتاتا انداز تو اسے بھا گیا تھا۔ اس کی گہری نظروں سے وہ کسی موم کی گڑیا کی طرح پگھلنے لگتی تھی۔

"میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا بختاور! میری بات مان لو ہم دونوں ایک نئی دنیا بساتے ہیں' اپنا ایک چھوٹا سا پیارا سا گھر بناتے ہیں۔" ہاشم نے ایک دفعہ پھر اسے دن میں خواب دکھانے شروع کر دیے' بختاور نے بے بس انداز سے سر جھکا لیا۔

"یہ ماں باپ اولاد سے زیادہ دیر تک ناراض رہ ہی نہیں سکتے اور پھر تمہیں اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی گزارتے دیکھ کر وہ خود اپنے فیصلے پر پچھتائیں گے۔" ابن آدم نے بنت حوا کی پلکوں پر ایک اور خوشنما خواب ٹانکا۔

"کیا واقعی ایسا ہو گا...؟" بختاور اس کے سحر میں آ چکی تھی' ہاشم نے سر ہلا کر فوراً اس کی تائید کی۔ "تم یہ بات اپنے ذہن میں بٹھا لو کہ تمہارے والدین تمہارے ساتھ اچھا نہیں کر رہے' وہ بس کسی طرح تم پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتے ہیں..."

"لیکن نیلم کہتی ہے والدین اولاد کے لیے کبھی غلط فیصلہ نہیں کرتے۔" بختاور جھجک کر بولی۔

"نیلم کو کیا پتا..." ہاشم استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "کبھی کبھی والدین صرف اپنی انا کو بچانے کے لیے اپنے بچوں کی زندگیاں برباد کر دیتے ہیں۔ جیسے میرے پیرنٹس نے کیا۔"

"پتا نہیں وہ ایسا کیوں کرتے ہیں..." بختاور افسردہ ہوئی۔

"تم چھوڑو ان سب باتوں کو' یہ بتاؤ کہ پھر کیا سوچا ہے تم نے۔" ہاشم نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اپنی محبت کی خاطر ساری کشتیاں جلا چکی ہوں ہاشم..."

اس کے لہجے میں چھپا اقرار ہاشم کو سمجھا گیا تھا کہ اس نے اب مزید کیا کرنا ہے۔ وہ اب سنجیدگی سے اگلا لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا۔ وہ دونوں بغاوت کا مکمل ارادہ کر چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

مارگلہ کی پہاڑیوں پر اترتی وہ ایک خوب صورت

صبح تھی۔ ابھی سورج طلوع ہونے میں کافی وقت تھا۔ ڈاکٹر جلال اپنے ٹریک سوٹ میں ملبوس لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ سامنے لان میں ماہیر بھی سفید ٹراؤزر پر سفید ہی ٹی شرٹ پہنے ایکسر سائز کر رہا تھا۔ جلال صاحب کی طرف دیکھ کر اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور بھاگتا ہوا ان کے پاس پہنچا۔

"بڑے ابا! جوگنگ کے لیے جا رہے ہیں کیا؟" وہ اس طرح بے تکلفی سے ان سے پوچھ رہا تھا جیسے دونوں کے درمیان بہت خوشگوار تعلقات رہے ہوں۔ بڑے ابا نے بمشکل سرہلا کر ہاں میں جواب دیا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں' یہاں گھر پر ایکسر سائز کا مزا نہیں آرہا۔" وہ ان کے ساتھ ہی چلنے لگا۔ بڑے ابا کے چہرے پر کوفت کا بڑا واضح تاثر ابھرا تھا' لیکن وہ اب بھی خاموش رہے۔ "پاپا کہتے تھے کہ میں فٹنس کے معاملے میں بالکل آپ کی طرح کریزی ہوں' وہاں انگلینڈ میں بھی موسم جیسا بھی ہو' میں ایکسر سائز کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ پاپا' میری اس عادت سے بہت چڑتے تھے۔" وہ بہت مزے سے ان کو بتا رہا تھا۔

"ظاہر ہے وہ خود جو دنیا جہاں کا سست انسان تھا اس معاملے میں۔" بڑے ابا کے منہ سے پھسلا' ماہیر قہقہہ لگا کر ہنسا۔ بڑے ابا نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا اس کے ہنسنے کا اسٹائل بالکل اپنے باپ پر تھا۔

"ویسے پاپا ابھی تک آپ سے بہت ڈرتے ہیں اور میں انجوائے کرتا ہوں اس چیز کو۔" وہ چلتے چلتے باؤنسنگ کے اسٹائل میں اپنا بازو فضا میں لہرا رہا تھا۔

"کیوں' تم نہیں ڈرتے ہو اس سے۔؟" بڑے ابا نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ گفتگو میں شریک ہو چکے تھے۔

"نو نیور۔۔۔ ہی از مائی بیسٹ فرینڈ۔" ماہیر کے لہجے میں چھپی محبت اس بات کی گواہ تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ وہ دونوں ایف نائن پارک میں داخل ہو چکے تھے۔ گھاس پر ہلکی ہلکی نمی تھی اور فضا میں جنگلی پھولوں کی مہک۔

"السلام علیکم جلال صاحب! کیسے ہیں۔" جوگنگ ٹریک پر بھاگتا ہوا بڑے ابا کی عمر کا ایک شخص ان کے پاس رکا' اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔

"وعلیکم السلام' حامد صاحب! کیسے ہیں آپ۔" بڑے ابا ایک دم ہی خوش ہوئے' شاید ان کے حامد صاحب سے اچھے تعلقات تھے۔

"یہ تیمور کا بیٹا ہے نا۔" حامد صاحب خوشگوار حیرت کا شکار ہوئے۔

"تمہیں کیسے پتا چلا۔؟" جلال صاحب نے حیرانگی سے پوچھا۔

"بھئی۔ چلتی پھرتی' تمہاری اور تیمور کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہے یہ' ابھی بھی پہچان چلے۔ ہاؤ آر یو جینٹل مین!" وہ بڑی خوش دلی سے ماہیر سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

"انکل! آپ کو اپنا اسٹیمنا امپروو کرنے کی ضرورت ہے' جوگنگ کے اسٹارٹ میں ہی سانس پھولنا اچھی علامت نہیں۔" ماہیر نے بے تکلفی سے ان کو مشورہ دیا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ میرا پہلا چکر ہے۔" وہ ایک دم حیران ہوئے۔

"جب میں اور بڑے ابا گھر سے نکلے تھے تو آپ کی گاڑی ہمارے پاس سے گزری تھی اس کا مطلب ہے کہ آپ پانچ دس منٹ پہلے ہی یہاں پہنچے ہوں گے۔" ماہیر نے تفصیلاً جواب دیا۔

"بھئی جلال! تمہارا پوتا بہت جینئس ہے' اس کا باپ تو اتنا کونفیڈنٹ نہیں تھا۔" حامد صاحب ان کے ساتھ ہی جوگنگ شروع کر چکے تھے۔ بڑے ابا نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"انکل حامد! آپ اسٹیمنا بڑھانے کے لیے کچھ عرصہ جم جوائن کر لیں۔" وہ ان کے ساتھ بھاگتا ہوا انہیں مفت مشورے دے رہا تھا۔ وہ اس کی باتوں پر مسلسل مسکرا رہے تھے۔ دو چکر تو اس نے ان دونوں کے ساتھ لگائے تھے اور پھر ان سے آگے نکل گیا۔ وہ ایک گھنٹہ جوگنگ کر کے گارڈن میں کھڑا ایکسر سائز کر رہا تھا جب بڑے ابا اپنے دوست کے ساتھ وہاں پہنچے۔

"ہاں بھئی، کیا ارادے ہیں تمہارے...؟ یہیں پاکستان میں رہو گے یا باپ کی طرح یورپ بھاگ جاؤ گے۔" انکل حامد نے دوبارہ انٹرویو کا سلسلہ جوڑا۔

"میں کسی بھی سچویشن میں بھاگنے کا قائل نہیں ہوں، بلکہ میدان جنگ میں کھڑے ہو کر آخری دم تک لڑنے پر یقین رکھتا ہوں۔" اس کی حاضر جوابی حامد صاحب کو لطف دے رہی تھی، جبکہ بڑے ابا ہنوز چہرے پر لاتعلقی کا بورڈ چپکائے کھڑے تھے۔

"یہ تو اچھی بات ہے، ویسے بھی جلال کو ضرورت تھی کوئی اس کے پاس رہے۔ تیمور نہ سہی اس کا بیٹا ہی سہی۔" حامد صاحب کی بات پر جلال صاحب کے ماتھے کا بل فورا" ہی گہرا ہوا۔

"معاف کرنا حامد! تمہاری بات کاٹ رہا ہوں، الحمد للہ، مجھے کسی کی ضرورت نہیں، میں اپنی زندگی میں سیٹ ہوں۔" جلال صاحب کے لہجے کی بے رخی پر حامد صاحب ایک دم گڑبڑا سے گئے۔

"وہ تو ٹھیک ہے یار! لیکن عمر کا تقاضا بھی تو ہوتا ہے۔"

"انکل! بری بات، آپ میرے بڑے ابا کو بوڑھا کہہ رہے ہیں۔" ماہیر کے شرارتی انداز پر حامد صاحب کا مزاج کچھ خوش گوار ہوا۔ ماہیر نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ بات کا رخ بدل دیا تھا۔ حامد صاحب مسکراتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے اور ماہیر، جلال صاحب کے ساتھ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ واپسی کے سفر میں وہ دونوں ہی چپ تھے۔

"ارے آپ دونوں اکٹھے جوگنگ کے لیے گئے تھے کیا؟" بڑی اماں کچن سے نکل رہی تھیں۔ ان دونوں کو اکٹھے دیکھ کر حیران ہوئیں۔

"کیوں، بڑی اماں! ہمارا ایک ساتھ جانا منع ہے کیا؟" وہ بے تکلفی سے ان کو اپنے بازوؤں میں لے کر ماتھے پر پیار کر رہا تھا۔ بڑے ابا نے چونک کر یہ منظر دیکھا، ایک لمحے کو تو بڑی اماں بھی ساکت رہ گئیں۔ ان کی بوڑھی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ آج کتنے سالوں کے بعد ان کو کسی نے تیمور کے اسٹائل میں بے ساختہ پیار کیا تھا۔

"اچھا اچھا پیچھے ہٹو، یہ تمہیں بھی اپنے باپ کی طرح چپکنے کی بیماری ہے، مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔" بڑی اماں کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

"پاپا بھی ایسے کرتے تھے کیا...؟" وہ لاپروائی سے ڈائننگ میز پر رکھی پھلوں کی ٹوکری سے سیب نکال کر کھانے لگا۔

"اور کیا... بہت چپکتی تھی میں اس کی عادت سے۔" بڑی اماں کے لہجے میں چھپی حسرت سے ماہیر کو اندازہ ہوا کہ وہ اب اسی عادت کے لیے کتنا ترسی ہوئی ہیں۔ بڑے ابا اپنے کمرے کی جانب بڑھ چکے تھے۔

"کتنے سال ہو گئے پاپا کو پاکستان سے گئے ہوئے؟" ماہیر نے یونہی پوچھا۔

"چوبیس سال..." بڑی اماں نے بے ساختہ جواب دیا۔

"اور میرا خیال ہے اتنے عرصے میں وہ ایک دفعہ بھی واپس نہیں آئے ہے نا؟" ماہیر نے ہلکا سا سوچ کر کہا۔

"ہوں..." بڑی اماں کے لہجے میں یاسیت تھی۔

"چلیں، اب میری شادی پر بلوا لیجئے گا انہیں۔" وہ مزے سے ان کے سامنے بیٹھا سیب کھا رہا تھا۔

"تمہاری شادی...؟" بڑے ابا نے ڈائننگ روم کی طرف آتے ہوئے اس کا جملہ بغور سنا تھا۔ جبکہ بڑی اماں حیرانی سے اپنے پوتے کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

"پاکستان میں کوئی لڑکی پسند کر لی ہے کیا...؟" وہ تجسس کے مارے بالکل اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

"نہیں تو..." وہ لاپروائی سے بولا۔ بڑے ابا تازہ جوس کا گلاس لے کر لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے تھے اور اخبار اٹھا لیا۔

"پھر شادی کس سے کرو گے...؟" بڑی اماں الجھن کا شکار ہوئیں۔

"جس سے آپ اور بڑے ابا کہیں گے۔" وہ ریموٹ کنٹرول سے کوئی اسپورٹس چینل تلاش کرتا ہوا بے تکلف انداز سے بولا۔

"لو ہمیں کیا پتا۔" بڑی اماں کو نہ جانے کیوں لگا تھا وہ ان کے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔

"کمال کرتی ہیں بڑی اماں! آپ کو کیسے نہیں پتا۔" وہ سیریس ہوا۔ بڑی اماں بھونچکا رہ گئیں۔ "شروع سے بابا نے ایک ہی بات مجھے حفظ کروادی تھی کہ میری شادی آپ لوگوں کی پسند سے ہوگی اس لیے مجھے ادھر ادھر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔" وہ لاپروا انداز سے انہیں بتا رہا تھا۔

بڑی اماں کے ساتھ ساتھ بڑے ابا کو بھی شاک سا لگا۔ بڑے ابا نے ہاتھ میں پکڑا اخبار غصے سے سائیڈ میز پر پٹخا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"ان کو کیا ہوا...؟" ماہیر ان کے انداز پر پریشان ہوا۔

"تم ایسی باتیں ان کے سامنے مت کیا کرو۔" بڑی اماں نے نظریں چرا کر آہستگی سے کہا اور اپنے میاں کے پیچھے ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ جہاں وہ آتش فشاں بنے گھوم رہے تھے۔

"بہت مکار ہے تیمور' سمجھتا ہے ایسی باتیں اپنی اولاد کو سکھا کر ہارا دل جیت لے گا' بتا دینا اسے گھاس نہیں کھودتے رہے ہم یہاں۔" انہوں نے ناراض نگاہوں سے اپنی زوجہ محترمہ کو دیکھا۔

"اب بس بھی کردیں اور کتنا خفا رہیں گے اس سے۔" بڑی اماں نے افسردگی سے جواب دیا۔

"ساری زندگی اس نابنجار کی شکل نہیں دیکھوں گا' قسم کھا رکھی ہے میں نے۔" وہ غصے بھرے انداز سے گویا ہوئے۔

"ہاں۔ اپنے ساتھ مجھے بھی خود ساختہ جدائی کی سزا دے رکھی ہے۔ میرا کیا قصور تھا...؟" بڑی اماں عمر کے اس حصے میں اب انہیں دوبدو جواب دینے لگی تھیں۔ ان کے اندر برداشت کا مادہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔

"میں نے منع تھوڑی کیا ہے' بتا میں کل ہی کٹوا دیتا ہوں انگلینڈ کا ٹکٹ۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا لائیٹر غصے سے بیڈ پر پھینکا۔

"مجھے جس دن جانا ہوگا' آپ سے پوچھوں گی بھی نہیں' لیکن خدارا ماہیر اور اریدا سے اپنا رویہ ٹھیک رکھیں۔ کسی اور کی سزا ان معصوم بچوں کو کیوں دے رہے ہیں۔" بڑی اماں کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا۔

"تو میں نے کون سا کلاشنکوف تان رکھی ہے ان پر۔" وہ بیزاری سے گویا ہوئے۔ "اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے رکھی ہے' یہ تھوڑا احسان ہے ان پر۔"

"اس میں احسان کی کیا بات ہے' اپنے باپ کے گھر میں رہ رہے ہیں وہ۔" بڑی اماں چڑ کر بولیں اور کمرے سے نکل گئیں۔ جلال صاحب ناراض سے انداز سے بیڈ پر بیٹھ گئے۔ انہیں نہ جانے کیوں بے تحاشا غصہ آئے ہی جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

بختاور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بڑے بے بس سے انداز سے اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ کھانے کی ٹرے لیے اندر داخل ہوتی نیلم چونک گئی۔

آج صبح سے بختاور کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے نیلم' وارڈن سے پوچھ کر کھانا اپنے روم میں لے آئی تھی۔ عام حالات میں میس سے باہر کھانا لے جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن خاص صورتوں میں وارڈن سے اجازت لینا لازمی ہوتی تھی۔

"نیلم! میرے سر میں شدید درد ہے یار...." وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبانے لگی۔ نیلم نے ٹرے میز پر رکھی اور پریشانی سے اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"لیکن تم تو اچھی بھلی سو رہی تھیں' پھر ایک دم کیا ہوا؟" نیلم نے فکرمند انداز سے اس کے ماتھے کو چھوا۔

"وہی عجیب منحوس قسم کا خواب شروع ہوگیا تھا۔" بختاور نے رنجیدہ سے انداز سے اطلاع دی۔

"وہی صحرا میں جھاڑیوں والا...." نیلم نے تصدیق چاہی۔ بختاور نے آہستگی سے ہاں میں سر ہلا دیا۔ پچھلے تین چار دن سے بختاور کو لگاتار ایک ہی خواب آرہا تھا کہ وہ کسی صحرا میں بھاگ رہی ہے اور کوئی شدید آواز

اسے روک رہی ہے۔

"ہمیں کسی سے اس خواب کی تعبیر پوچھنی چاہیے۔" نیلم کے مشورے پر وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔

"تم یہ منحوس قسم کے ٹائٹل والی کتاب سامنے سے ہٹاؤ مجھے لگتا ہے اسے دیکھ دیکھ کر ہی میرے ذہن میں یہ تصویر نقش ہو گئی ہے۔" بختاور کے توجہ دلانے پر نیلم اٹھی۔ سامنے ہی شیلف پر کتابیں اس طرح سے رکھی ہوئی تھیں کہ "سیاہ حاشیہ" کتاب کا سرورق بالکل سامنے تھا۔ نیلم نے خاموشی سے وہ کتاب اٹھا کر دراز میں رکھ دی۔ بختاور نے سکون کا سانس لیا۔

"تم نے لگتا ہے اپنے رشتے والی بات کی ٹینشن لے رکھی ہے۔" نیلم کھانے کی ٹرے لیے اس کے پاس آن بیٹھی۔

"ہاں' ذہن پر سوار ہو کر رہ گئی ہے وہ بات۔" بختاور نے بھی جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔

"اللہ بہتر کرے گا' کیوں اپنی حالت خراب کر رہی ہو۔ ذرا آئینے میں اپنی شکل دیکھو جاکر۔" نیلم کو اسے دیکھ دیکھ کر افسوس ہو رہا تھا۔

"اچھا' تم کھانا تو کھاؤ ناں۔" نیلم نے اس کے لیے چاول پلیٹ میں نکالے۔

"نہیں یار! میرا دل نہیں چاہ رہا۔" بختاور نے بے دلی سے پلیٹ دوبارہ ٹرے میں رکھ دی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"صبح میم شہناز کا ٹیسٹ بھی ہے۔" نیلم نے اسے یاد دلایا تو بختاور نے بے چینی سے پاس رکھی کتاب اٹھائی۔ سارے لفظ اور سارے ٹاپک اسے اجنبی سے لگ رہے تھے۔ کچھ عرصے سے اس کی توجہ کتابوں سے بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ وہ تو شکر تھا کہ اینول سسٹم تھا ورنہ اس کے لیے بہت بڑا مسئلہ بنتا۔

"اچھا۔ یہ دودھ تو پی لو ناں۔" نیلم کو اس کی بہت فکر تھی۔ بختاور نے کچھ سوچ کر گلاس پکڑ لیا اور خاموشی سے پی بھی گئی۔ دودھ پینے کے بعد ہی اسے احساس ہوا کہ وہ صبح سے بھوکی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے اس کی بھوک بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی' نیلم کے احساس دلانے پر وہ کچھ کھا پی لیتی' ورنہ سارا سارا دن سوچوں میں گم پریشان رہتی۔

"میں تو اپنی آنے والی سات نسلوں کو نصیحت کروں گی کہ وہ گھر میں بھینس پال لیں یا بکری' لیکن محبت نام کی کوئی چیز اپنے دل میں مت پالیں۔" نیلم کے جل کر بولنے پر اسے ہنسی آگئی۔

"وہ کیوں بھلا۔؟" وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگی جو برہم نگاہوں سے اسے ہی گھور رہی تھی۔

"محبت تو اچھے خاصے انسان کی مت مار دیتی ہے' اچھی بھلی تھیں تم' اپنا بالکل ہی بیڑا غرق کر لیا ہے تم نے ایک شخص کے پیچھے۔" نیلم جھنجلا سی گئی۔

"اس میں محبت کا تو کوئی قصور نہیں' یہ تو انسان کی اپنی کمزوری ہے کہ وہ اس کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔" بختاور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بس بس رہنے دو' زیادہ صفائیاں دینے کی ضرورت نہیں' میں سب جانتی ہوں۔" نیلم نے فوراً ہی اسے جھاڑ کر رکھ دیا۔ اسی لمحے ساتھ والے کمرے کی لڑکی نے بختاور کو اس کا فون آنے کی اطلاع دی۔

"ہاشم کی ہی کال ہو گی لیکن پلیز کال سن کر ہمیشہ کی طرح کوئی بھری ہو کر مت آجانا۔" نیلم کو آج کل ہاشم پر بھی غصہ آنے لگا تھا۔

"اچھا اچھا' اب زیادہ خناست ہو' اچھی سی چائے بناؤ' دونوں مل کر پیتے ہیں۔" وہ جاتے جاتے بھی اس سے فرمائش کرنا نہیں بھولی تھی۔

"تمہارا بخار کچھ کم ہوا کہ نہیں۔" بختاور نے جیسے ہی ریسیور کان سے لگایا' دوسری جانب ہاشم ہی تھا۔

"ہاں۔ اب تو پہلے سے بہت بہتر ہے۔" بختاور نے اس کی تسلی کروائی۔

"دو یقین مانو بختاور! تمہاری شکل دیکھ دیکھ کر مجھے بہت گلٹی فیل ہونے لگا ہے۔" ہاشم خفت زدہ انداز میں اسے بتا رہا تھا۔

"اچھی بھلی فریش لڑکی تھیں تم' کچھ ہی دنوں میں

محسوس کر رہی ہو۔" ہاشم کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی تو وہ چونک گیا۔

"تم میری بات پر ہنس کیوں رہی ہو۔؟"

"اس لیے کہ تھوڑی دیر پہلے نیلم بھی یہی بات کر رہی تھی۔" بختاور کے بتانے پر وہ مزید سنجیدہ ہوا۔

"اس کا مطلب ہے وہ مجھے بھی کوس رہی ہوگی۔"

"وہ کیوں بھلا۔؟" بختاور کو اس کے درست اندازے پر دل ہی دل میں تعجب ہوا۔

"ظاہر ہے میری ہی وجہ سے تو تمہاری یہ حالت ہوئی ہے۔" وہ دل گرفتہ انداز میں گویا ہوا۔

"ارے نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں میں تو بابا کے سخت رویے سے دل برداشتہ تھی۔ اسی چیز نے مجھے آج کل پریشان کر رکھا ہے۔" بختاور نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے۔؟" وہ اسی بات کی طرف آگیا تھا جس کی وجہ سے بختاور کا دن رات کا سکون غارت ہو چکا تھا۔

"ابھی تک کنفیوز ہوں۔" بختاور کی صاف گوئی اس کا دل دکھانے کا باعث بنی۔

"دیکھو بختاور! ہمارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے یہ بات تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ اس کے بعد اگر کچھ ہو گیا تو تم مجھے قصوروار نہیں ٹھہراؤ گی۔" وہ اب دو ٹوک انداز میں اس سے بات کر رہا تھا۔

"میں آج آخری دفعہ اپنے گھر بات کرنا چاہتی ہوں۔" بختاور نے کچھ سوچ کر کہا۔

"تو ٹھیک ہے تمہارا جو بھی فیصلہ ہو مجھے صبح نو بجے آکر بتا دینا یقین مانو تم انکار بھی کر دو گی تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا اور میرا وعدہ ہے کہ کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔" وہ ایک ایک لفظ سوچ سمجھ کر اس کی سماعتوں میں انڈیل رہا تھا۔ بختاور نے خاموشی سے ریسیور رکھ دیا۔

وہ نئی فون بوتھ کا کارڈ خرید کر لے آئی اور اب اپنے گھر کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ دوسری طرف اماں نے فون اٹھایا۔ اس کی آواز سنتے ہی وہ پرجوش انداز میں گویا ہوئیں۔

"اگلے جمعے پر گھر ضرور آجانا تمہارے باپ نے تمہارے نکاح کی تاریخ فکس کر دی ہے۔"

"لیکن مجھے فیصل سے شادی نہیں کرنی امی۔۔۔" اس نے اپنا کمزور سا احتجاج ریکارڈ کروانے کی کوشش کی۔

"فضول مت بولو بختاور! تمہارا باپ میری جان نکال لے گا۔ دوبارہ یہ بات کی تو اپنا دودھ نہیں بخشوں گی تمہیں۔" دوسری طرف اماں جذباتی انداز میں شروع ہو چکی تھیں۔ بختاور کا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔

"لیکن امی! بابا کو ایک دفعہ تو ہاشم سے ملنا چاہیے تھا۔" بختاور نے ناراض انداز میں گلہ کیا۔

"ارے بے وقوف لڑکی! مٹی ڈالو اس ہاشم پر۔ فیصل ایک پڑھا لکھا اسٹیبلش فیملی کا لڑکا ہے، تم عیش کرو گی وہاں پر۔" اماں نے اسے خواب دکھانے شروع کر دیے۔

"لیکن فیصل مجھے اچھا نہیں لگتا۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"نکاح کے دو بولوں میں بہت طاقت ہوتی ہے بیٹا! تم دیکھنا تو سہی کیسے تمہارا دل بدل جائے گا۔" امی اسے رضامند کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔

اس نے اگلے پانچ منٹ تک انہیں اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف انہوں نے بھی اس کی کوئی بات نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ ہاشم کا نام لیتی تو دوسری طرف "فیصل نامہ" شروع ہو جاتا۔ تنگ آکر بختاور نے فون بند کر دیا۔ وہ ان کی طرف سے سخت مایوس ہو چکی تھی۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے باپ نے اس کے پر کاٹنے کے لیے مکمل پروگرام ترتیب دے دیا ہے اور وہ ہاشم والی بات کے بعد بختاور کو کسی بھی قسم کی رعایت دینے کو تیار نہیں تھے اور ان کے نزدیک اس کا بہترین حل یہی تھا کہ بختاور کو کسی اور کے نکاح کے بندھن میں باندھ دیا

جائے۔ اس کا دل تاسف' رنج اور دکھ کے ملے جلے جذبات سے بھر گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کل اسے ہاشم کو کیا جواب دینا ہے۔ یہ سوچ کر وہ کچھ مطمئن ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"آپ تو بڑے مزے کی چیز ہیں۔" ارسم کی ماہیر کے ساتھ پہلی ملاقات تھی' اور یہ ملاقات خاصی دلچسپ تھی۔ اس وقت وہ' اوریدا اور ماہیر تینوں کے ایف سی میں موجود تھے اور ماہیر ان دونوں کو اپنے کالج کے واقعات مزے سے سنا رہا تھا۔

"یار ارسم ایک بات کہوں۔"

ماہیر کی بات پر ارسم چونکا۔ "جی' جی ضرور۔"

"یا تو تم مجھے "آپ" مت کہو یا پھر اوریدا سے کہو' مجھے تم' تم نہ کہے ہم سے پچھلے ایک گھنٹے سے مجھے لگ رہا ہے جیسے میں دنیا کی سب سے بدتمیز لڑکی کا بھائی ہوں۔" ماہیر کے شرارتی انداز پر دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔

"بھئی۔ اوریدا والے معاملے میں تو میں بے بس ہوں' البتہ میں' آپ' احترام والے رشتے سے دست بردار ہوتا ہوں۔" ارسم اپنے کزن کی کمپنی کو خوب انجوائے کر رہا تھا۔

"اب یار! اتنا بھی بڑا نہیں ہوں تم سے' صرف ڈھائی تین سال کا تو فرق ہے ہم دونوں میں۔" ماہیر زنگر پر کرنے سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے بولا۔ ارسم اور ماہیر کے درمیان خوب بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اس دن ان تینوں نے خوب انجوائے کیا۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے' پاکستان میں کیا کرو گے؟"

وہ تینوں اس وقت دامن کوہ پر موجود تھے۔ ارسم نے اچانک ہی ماہیر سے پوچھا۔ اوریدا ان دونوں سے ذرا فاصلے پر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی تھی۔

"سعد کے ساتھ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی بنانے پر غور و فکر ہو رہا ہے۔" ماہیر نے بے تکلفی سے اپنا ارادہ بتایا۔ آج کل ماہیر اور سعد دونوں سارا سارا دن اس منصوبے پر پلاننگ کر رہے تھے۔

"ہاں اچھا آئیڈیا ہے' سعد بھائی اس معاملے میں آپ کی کافی ہیلپ کر سکتے ہیں اور میڈیا سائنسز کی ڈگری تو ویسے ہی آپ کے پاس ہے۔" ارسم نے اسے سراہا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ماہیر خاصے تخلیقی مزاج کا بندہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے اپنے باپ کی مکمل سپورٹ حاصل تھی اور کوئی معاشی مسائل بھی نہیں تھے۔ وہ اور سعد پیپر ورک مکمل کر چکے تھے۔ اسی دن شام کو ارسم ایک دفعہ پھر اوریدا کے پورشن کی طرف چلا آیا۔

"ماہیر تم سے بہت مختلف ہے۔" ارسم اس وقت اوریدا کے کمرے میں موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑے سائز کا فریم تھا جس میں اوریدا' ماہیر اور اس کے ماما پاپا کی ایک یادگار تصویر تھی۔

"وہ کیسے بھلا۔؟" اوریدا نے اپنے کپڑوں کی الماری سیٹ کرتے ہوئے لاپروائی سے پوچھا۔

"وہ بہت زندہ دل' ذہین اور کونفیڈنٹ ہے۔" ارسم نے کھل کر ماہیر کی تعریف کی' اسی لیے اوریدا کو محسوس ہوا' لوگ ماہیر سے واقعی امپریس ہو جاتے تھے۔ اس نے دو چار دنوں میں ہی بڑی اماں کو بھی اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔

"ہاں' وہ واقعی مجھ سے بہت مختلف ہے' کسی بھی چیز کو ذہن پر سوار نہیں کرتا' چٹکیوں میں اڑا دیتا ہے۔" اوریدا نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

"تم ویسی کیوں نہیں بن جاتیں ہو یار۔" ارسم نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"کوئی انسان کسی دوسرے جیسا کیسے بن سکتا ہے' ہر انسان کی اپنی فطرت اور مزاج ہوتا ہے۔ ایک ہی والدین کے بچے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔" اوریدا کو ارسم کی فرمائش بہت عجیب سی لگی۔

"پھر بھی تم کوشش تو کر سکتی ہو نا۔" ارسم اپنی ہی بات پر اڑا ہوا تھا۔

"ہرگز نہیں ارسم۔ وہ میرا بھائی ضرور ہے لیکن مجھ سے بہت ڈفرنٹ۔ جب وہ میرے جیسا نہیں بن

سکتا تو میں کیسے اس کے جیسی ہو سکتی ہوں۔" وہ اب مکمل کرا پنا موقف بیان کر رہی تھی۔

"ہوں... شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔" ارصم نے ہار مان لی۔

"ہو سکتا ہے آنے والے وقتوں میں میرے اندر ماہیر جیسی نہ سہی اس سے ملتی جلتی کچھ خصوصیات پیدا ہو جائیں۔" لوریدا کو اسے مکمل مایوس کرنا اچھا نہیں لگا تھا اس لیے اس نے امید کی ڈور اس کے ہاتھ میں تھمادی تو وہ ایک دم خوش ہو گیا۔

"آنٹی بینش نے کچھ کہا تو نہیں ماہیر کے بارے میں؟"

لوریدا کو بڑے ہی غلط موقعے پر یہ بات یاد آئی۔

"کیوں...؟ کچھ کہنا ضروری تھا کیا۔" اس نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"اصل میں ماہیر کے ساتھ ان کی پہلی گفتگو کوئی خوش گوار نہیں ہوئی تھی' بلکہ میرا تو خیال تھا' آنٹی بینش خوب خفا ہوئی ہوں گی گھر جا کر۔" لوریدا اس کی ماما کے مزاج کو اب کافی سمجھنے لگی تھی۔

"تو کیا ہوا؟ کون سا ماہیر ان کے سامنے تھا...؟" وہ ہنسا' لوریدا ایک لمحے میں سمجھ گئی کہ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا اسے افسوس ہوا۔

"تمہاری شکل پر کیوں بارہ بج گئے ہیں...؟" ارصم اٹھ کر اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اسے ایک دم ہی احساس ہوا کہ لوریدا اب اس کی طرف دیکھ کر کم کم ہی بات کرتی تھی اور زیادہ تر اس سے فون پر ہی بات کرنے کو ترجیح دینے لگی تھی۔ ارصم کے دماغ میں گھنٹیاں سی بجیں۔

"تمہیں کیا ہوا ہے...؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"کچھ نہیں..." وہ پھیکے انداز سے مسکرادی۔

"تمہیں تو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا لوریدا..." وہ اس کے بالکل سامنے تن کر کھڑا ہوا۔ لوریدا بغور اس کی شکل دیکھنے لگی' وہ تھوڑی سی کنفیوز ہوئی۔

"مجھے کوئی بھی کام ڈھنگ سے کرنا نہیں آتا۔" اس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔

"پھر محبت جیسا مشکل کام کیوں کرنے لگی ہو...؟"

ارصم کی زبان پھسلی اور وہ بوکھلا سی گئی۔

"میں تو نہیں کر رہی' کچھ ایسا ویسا..." وہ نظریں جھکائے بولی۔ ارصم کی نظریں بے ساختہ اس کے رخساروں پر گرتی لمبی سیاہ پلکوں میں اٹک گئیں۔ اس کی پلکیں اس وقت مرتعش تھیں اور وجود سارا کسی زلزلے کی زد میں۔ ارصم کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا لیکن وہ خود بھی اس معاملے میں لوریدا کی طرح بے بس ہو چکا تھا۔ دونوں کے درمیان بے معنی سی گفتگو کا دورانیہ بڑھنے لگا تھا۔

"ہیلو... ہیلو۔" لوریدا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ماہیر بے تکلفی سے اندر داخل ہوا۔ لوریدا فوراً" ہی اپنی وارڈروب کھول کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اس چہرہ قوس قزح کے سارے رنگوں سے سجا ہوا تھا۔

"بھئی ارصم! تم یہاں ہو؟ لوحزہ بڑے ابا نے تمہاری تلاش میں کنوؤں میں بانس ڈلوا دیے ہیں..." وہ بے تکلفی سے لوریدا کے بیڈ پر لیٹ گیا۔

"کیوں کیا ہوا...؟" ارصم خود کو سنبھال چکا تھا۔

"پتا نہیں' ہارٹ سرجری کی ٹیکنکس پر کوئی نیا آرٹیکل آیا ہے' وہ تمہیں پڑھانا چاہ رہے ہیں۔ اس لیے بڑی اماں' تمہاری تلاش میں مجھے ادھر ادھر دوڑا رہی تھیں' شکر ہے ملازمہ نے بتادیا کہ تم یہاں ہو۔" ماہیر نے لوریدا کا سیل فون اٹھا کر گیم کھیلنا شروع کر دی۔

"ہارٹ سرجری پر..." وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"یہ ہارٹ پر اتنا زور کیوں دے رہے ہو' خیر تو ہے نا' کوئی چکر وکر تو نہیں..." ماہیر نے سیل فون بیڈ پر رکھا اور شرارت سے ارصم کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں یار! دل کے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں' میں شرارف اینڈ لف بندہ۔" وہ اتنی جلدی قابو آنے والا تھوڑی تھا۔

"اچھا' کوئی ایسا ایکسپرینس ہو جائے تو مجھ سے ضرور شیئر کرنا..."

ماہیر کی بات پر وہ خوشگوار حیرت کا شکار ہوا۔ "وہ کیوں؟"

"میں تمہیں لڑکیوں کو امپریس کرنے کے ایک سو ایک طریقے بتاؤں گا۔" ماہیر کے شرارتی انداز پر وہ ہنسا۔

"بھئی مجھے تو معاف ہی رکھو' میری ماما کنویں میں الٹا لٹکوا دیں گی۔" ارحم نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"بہت ہی بد ذوق ہوئے ہو تم' بہت مایوس کیا ہے تم نے۔" ماہیر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شوخ لہجے میں بولا۔

"آپ اسے الٹی سیدھی پٹیاں مت پڑھائیں۔" اوریدا جل کر بولی۔

"ارحم! تم نے کچھ سنا؟ اوریدا نے مجھے "آپ" کہا ہے یا میرے کانوں کو وہم ہوا ہے۔" ماہیر نے اسے اچھا خاصا شرمندہ کر دیا۔

"بڑی اماں کے ڈر سے کہہ رہی ہوں ورنہ۔" اوریدا نے خفت زدہ انداز میں صفائی دی اور ناراضی کے اظہار کے طور پر کمرے سے نکل آئی۔ وہ اب پچھلے صحن کے برآمدے میں رکھے لکڑی کے بڑے سارے جھولے پر بیٹھ گئی تھی۔

"ارحم کو کیسے پتا چلا کہ میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔" اس سوچ نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

"کہیں اس نے ہوا میں تیر تو نہیں چلا دیا۔" اس نے خود کو تسلی دینے کے لیے سوچا لیکن دل تھا کہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

اوریدا کو پہلی دفعہ احساس ہوا۔ انسان ساری دنیا کو بے وقوف بنا سکتا ہے لیکن اپنے دل کے سامنے اس کی ساری منطقیں' دلیلیں اور جواز بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دل کے اندر ایک آئینہ لگا ہوتا ہے اور اس آئینے میں وہی عکس نظر آتا ہے جسے آپ ساری دنیا سے اور خود اپنے آپ سے چھپانا چاہتے ہیں۔

"ہزار دفعہ کہا ہے مغرب کے وقت یہاں آ کر مت بیٹھا کرو۔" بڑی اماں نے جیسے ہی پچھلے لان کا دروازہ کھولا سامنے ہی اوریدا جھولے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"مغرب کے وقت یہاں کیا ہوتا ہے؟" اوریدا نے برا سا منہ بنایا۔

"کسی دن کوئی باہر کی چیز چمٹ گئی تو پتا لگ جائے گا۔" انہوں نے ناراضی سے اپنی اس پوتی کو گھورا جس پر کسی چیز کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔

"اچھا ناں بڑی اماں' جا رہی ہوں اندر۔" وہ سست سے انداز سے اٹھی۔ کوریڈور سے گزر کر جیسے ہی لاؤنج میں پہنچی' سامنے ارحم' ماہیر اور بڑے ابا شطرنج کی بازی بچھائے بیٹھے تھے۔ کھیل تو ارحم اور بڑے ابا کے درمیان ہو رہا تھا لیکن ماہیر کی فل سپورٹ بڑے ابا کے ساتھ تھی۔ بڑے ابا کو کچھ ہی دیر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ ماہیر بہت ذہین ہے اور سوچ سمجھ کر چال چلنے کا عادی بھی۔

"بس۔ اسٹاپ' اب تم نہیں بولو گے۔" ارحم اپنی مات پر جل کر بولا تھا' بڑے ابا کے لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ ابھری۔

"ہار کو تسلیم کرنا سیکھو جینٹل مین' جس دن یہ سوچ لو گے کہ تمہاری ہار کسی کی جیت کی وجہ بنی ہے' یقین مانو' زیادہ دکھ نہیں ہو گا۔" ماہیر بڑے سنجیدہ انداز سے ارحم کو مشورہ دے رہا تھا۔ اوریدا ان تینوں کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

"تو ٹھیک ہے تم کھیل لو' تمہیں بھی پتا چلے۔ بڑے ابا سے جیتنا آسان نہیں۔" ارحم نے فوراً ہی میدان چھوڑ دیا۔ ماہیر نے بڑی سرعت سے اس کی نشست سنبھالی تھی۔ کھیل تو دلچسپ انداز میں اب شروع ہوا تھا۔ بڑے ابا کو اگلے دس منٹ میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کھیل میں خاصی مہارت رکھتا ہے۔ جب اس کی جیت یقینی تھی' اس نے ایک دم ہی غلط چال چل دی۔ ارحم اور اوریدا کو مایوسی ہوئی۔

"تم جیسے انسان سے ایسی فضول چال کی توقع نہیں تھی مجھے۔" بڑے ابا جیت کر اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور اب کسی کام سے دوبارہ نکلے تو لاؤنج سے آتی ارحم کی ناراض آواز پر وہیں ٹھٹکے۔

"میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔" ماہیر بڑے مزے سے کہہ رہا تھا۔ بڑے ابا کو دھچکا سا لگا۔

"وہ کس خوشی میں...؟" اور وہ ایک دم چڑ سی گئی۔

"میں بڑے ابا کو کسی بھی میدان میں ہارتے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ میرے آئیڈیل ہیں اور مجھے ان سے سو دفعہ بھی ہارنا پڑا تو میں ہاروں گا۔" ماہیر کے لہجے کی سچائی اس بات کی گواہ تھی کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا۔ بڑے ابا کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف پلٹ گئے۔ ساری رات انہیں ماہیر کے ان جملوں نے سونے نہیں دیا۔ وہ جھنجلا کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ نیند ان کے کمرے کا رستہ بھول چکی تھی۔ انہیں اب ساری رات جاگ کر گزارنا تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم بدقسمت نہیں ہو شانزے۔" وہ پچھلے ایک گھنٹے سے اسے سمجھانے میں مصروف تھا۔ وہ دونوں اس وقت میریٹ ہوٹل میں موجود تھے۔ سرمد کو اس کی فلم کے ادھورے رہنے کا اس سے زیادہ افسوس تھا۔ یہی غم غلط کرنے کے لیے وہ اسے لنچ پر یہاں لے کر آیا تھا۔

"اگر ایسا نہیں ہے تو میرے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟" شانزے نے برا سا منہ بنایا۔

"کسی بہت اچھے کے لیے...۔" سرمد نے مسکرا کر اس کا معصوم چہرہ دیکھا۔ وہ کسی بچی کی طرح ہونٹ باہر نکالے خفا خفا سے انداز میں بیٹھی تھی۔ اس نے سامنے ٹیبل پر موجود کھانے کی کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

"مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ کوئی اچھی اور بہترین چیز کم از کم میری قسمت میں نہیں ہے۔" شانزے کا لہجہ تلخی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"بس لڑکی اسٹاپ اٹ۔ آج کے دن کے لیے اتنی ہی نکمی باتیں کافی ہیں۔" سرمد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا۔

"جب آپ کی کوئی پسندیدہ چیز چھنی ہو تو آپ

تو مزیدار ہوئے۔" وہ بچکانہ سے انداز پر منہ بنا کر بولی تو سرمد کو ہنسی آگئی۔

"تم اپنے بھائی کے لیے ایسا سوچتی ہو۔" سرمد نے مصنوعی ناراضی سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بوکھلا سی گئی۔

"نہیں میں آپ کو بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ آپ کو میرے جذبات کا اندازہ نہیں ہے۔"

"مجھے بہت اچھی طرح ہے۔ تم اب آرام سے کھانا کھاؤ میرے پاس تمہارے لیے ایک اور آپشن بھی ہے۔" سرمد نے اسے لالچ دیا لیکن اس دفعہ شانزے پر اس کی کسی بات کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ فلم والے واقعے نے واقعی اس کے جذبات کو مجروح کر کے رکھ دیا تھا۔

"میں نے سوچ لیا ہے مجھے اب شوبز میں کام نہیں کرنا۔" شانزے کی بات نے سرمد کو اتنا حیران کیا کہ اس کا چمچ منہ کی طرف لے جاتا ہوا ہاتھ فضا میں ہی معلق ہو گیا۔ سرمد کو محسوس ہوا وہ بہت ہی زیادہ دل برداشتہ تھی۔

"کیا کہا تم نے...؟" اس نے ہاتھ میں پکڑا چمچ پلیٹ میں رکھ کر شانزے کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے شوبز میں نہیں جانا۔" وہ اپنی بات پر قائم تھی۔

"پھر کیا کرو گی...؟"

"پتا نہیں...۔" وہ حد درجہ مایوس دل گرفتہ اور رنجیدہ سی تھی۔

"تم میڈیا میں کوئی جاب کیوں نہیں کر لیتی ہو۔" سرمد نے کچھ سوچ کر کہا تو ایک طنزیہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری۔

"کون دے گا مجھے جاب؟ ہر جگہ تو پرچی سسٹم ہے اور میرے پاس تو کوئی سفارش بھی نہیں۔ آج تک جتنے چانس ملے سارے آپ کی وجہ سے۔" وہ بیزاری اور مایوسی کی انتہا پر تھی۔

"ویسے تمہارے لیے ایک جاب بھی ہے میرے پاس۔" سرمد مسکرایا تو وہ چونک گئی۔

"جاب۔؟"

"میرا ماموں زاد کزن ماسیر انگلینڈ سے ایڈورٹائزنگ کی ڈگری لے کر آیا ہے اور اپنی کوئی ایجنسی بنانا چاہتا ہے۔" سرمد نے بھاری کباب اس کی پلیٹ میں ڈالے اور آہستہ آہستہ چیزیں اس کی طرف بڑھانے لگا۔

"اچھا' پھر۔؟" شانزے نے آخر کار اپنی دلچسپی کا اظہار کر ہی دیا۔

"لیکن میں نے اسے مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنی نیو ایجنسی بنانے کے بجائے کسی کے ساتھ پارٹنرشپ کر لے۔" سرمد نے سنجیدگی سے بتایا۔

"ہاں' یہ اچھا مشورہ ہے۔" شانزے نے فوراً" ہی اس کی تائید کی۔

"وہ اپنے ساتھ کچھ نئے بندے ہائر کرے گا تم بھی اس کے ساتھ شامل ہو جانا۔" سرمد نے بے تکلفی سے اسے مشورہ دیا۔

"پتا نہیں ان کی چوائس کیا ہو۔ آپ مجھے زبردستی ان پر مسلط کریں گے کیا؟" شانزے نے صاف گوئی سے کہا تو وہ ہنس دیا۔

"اب ایسے بھی حالات نہیں ہیں یار اب کزنز میں اتنی تو فرینک نس ہوتی ہے کہ بندہ اپنی بات زبردستی بھی منوالے تو کوئی حرج نہیں۔"

"چلیں' آپ بات کر کے دیکھ لیں۔" شانزے نے تھوڑا سا سوچ کر آمادگی ظاہر کر دی' سرمد کے لبوں سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی' وہ اب مزے سے لنچ کر رہا تھا۔

"آپ کی اس کزن کا کیا حال ہے؟ کوئی معاملہ آگے بڑھا۔" شانزے کو ایک دم ہی یاد آیا۔

"اوریدا۔۔؟" سرمد کی آنکھوں میں ایک ساتھ کئی جگنو چمکے۔ "ارے یار! ماسیر اسی کا ہی تو بھائی ہے۔"

"لیکن آپ والے معاملے کا کیا بنا۔۔۔؟" شانزے کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"بھئی۔ اس معاملے میں' میں اتنا خوش قسمت کہاں' وہ تو اپنا پری میڈیکل کا میرٹ بنانے کے چکر میں ہے' اس لیے وہ مجھے ذرا کم ہی دکھتی ہے۔" سرمد نے ہلکے پھلکے انداز سے چویشن بتائی۔

"ذرا دھیان سے' ایسا نہ ہو کہ آپ اس کے میرٹ کے چکر میں رہیں اور وہ کہیں اور کمٹمنٹ کر لے۔" شانزے نے اسے چھیڑا' کچھ بھی سہی اسے سرمد حقیقت میں بھائیوں کی طرح عزیز ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ اس کے ساتھ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ جاری رکھتی تھی۔

"ان شاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہو گا' میں امی کے کان میں یہ بات ڈال چکا ہوں' وہ موقع دیکھ کر بڑی اماں سے بھی بات کر لیں گی۔" سرمد بالکل مطمئن تھا۔

"آپ تو بہت تیز نکلے۔" شانزے ہنسی۔

"ظاہر ہے بھائی کس کا ہوں۔" سرمد نے شرارت سے اس کی طرف اشارہ کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ دونوں نے بہت اچھے ماحول میں کھانا کھایا۔

شانزے فلم والے صدمے سے کافی حد تک باہر نکل چکی تھی۔ اس لیے جب وہ ہوسٹل آئی تو اس کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔

"شکر ہے تمہارے چہرے پر بھی مسکراہٹ آئی۔" رباب نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھ کر شکر کا سانس لیا۔ وہ اب اپنے بستر پر بیٹھی اپنے اونچی ایڑی کے سینڈل اتار رہی تھی۔

"میں نے سوچا ہے رباب! میں شوبز چھوڑ کر کوئی جاب کر لوں۔" شانزے کی بات پر رباب مسکرائی۔

"یہ کم از کم بہت بہتر فیصلہ ہے۔"

"ویسے کہاں جاب کرنے کا ارادہ ہے۔۔۔؟" رباب نے اس کی پھیلائی ہوئی چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں۔

"سرمد بھائی کا ایک کزن کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں پارٹنرشپ کر رہا ہے۔" شانزے نے لاپروائی سے اطلاع دی۔

"یعنی کہ تم نے قسم کھائی ہے کہ شوبز کا پیچھا نہیں چھوڑنا' خیر یہ اس کام سے ہزار درجے بہتر ہے۔" رباب نے بے تکلفی سے تبصرہ کیا۔

"تم ہی تو دن رات منع کرتی تھیں مجھے۔ میں نے سوچا' بات مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔" شانزے کا

موڈ آج واقعی خوش گوار تھا۔

"بھئی شانزے! اب دن ہو سارے جھوٹ تو نہ بولو۔" رباب نے اسے شرارت سے گھورا۔ "وہ تو اللہ کی ہی مرضی تھیں تمہی ورنہ تم نے تو اپنی طرف سے کافی زور لگا لیا تھا۔" رباب کی صاف گوئی پر وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اس کی بات کوئی اتنی غلط بھی نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

پندرہ دن کے بعد ہی سرمد کی کال آ گئی تھی۔ اس کے کزن کے ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے مالک سے سارے معاملات طے ہو چکے تھے۔ وہ اب اپنا آفس سیٹ کر رہا تھا اور ایک ہفتے کے بعد شانزے انٹرویو کے لیے اس کے آفس میں موجود تھی۔ سیاہ رنگ کے جینز کے سوٹ میں وہ اس قدر دلکش لگ رہی تھی کہ ایجنسی کی ریسپشن پر موجود لڑکی سمجھی کہ وہ یہاں کسی کمرشل کے آڈیشن کے لیے آئی ہے۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ شانزے کے لبوں پر پھیل گئی۔ وہ سرمد کے کہنے پر یہاں آ تو گئی تھی لیکن وہ خود کسی قریبی سگنل پر ٹریفک جیم میں پھنسا ہوا تھا۔ جب کہ سرمد نے اسے ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھا رکھا تھا۔ شانزے وہاں بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔

"سرمد بھائی! وہ تو مجھے انٹرویو کے لیے ہی نہیں بلا رہے، میں ایک گھنٹے سے ویٹ کر رہی ہوں۔" اس نے تنگ آ کر سرمد کا نمبر ملایا۔

"ڈونٹ ٹیک ٹینشن، میں پہنچ رہا ہوں دو منٹ میں۔" سرمد نے اسے تسلی دے کر فون بند کر دیا۔ وہ ویٹنگ ایریا میں بیٹھی ہوئی تھی کہ کئی مشہور ماڈلز کو سیلے چل تو اس نے بہت شوق سے دیکھا اور پھر بیزار ہو کر اپنا یہ مشغلہ بھی ترک کر دیا۔

آخر کار ماہیر نے اسے اپنے آفس میں بلوا ہی لیا تھا۔ اسے اندر جا کر احساس ہوا کہ وہ واقعی بہت بڑی تھا۔ شانزے کی طرف دیکھ کر وہ بے تکلفی سے مسکرایا اور اسی وقت اس کے سیل فون پر کال آ گئی۔ دو منٹ بات کر کے اس نے فون بند کیا اور شانزے کو دلچسپ نظروں سے دیکھا۔ وہ اس وقت ساری دنیا سے بیزار لگ رہی تھی۔

"آپ جاب کے بجائے ماڈلنگ کیوں نہیں کرتیں؟" ماہیر نے اپنے سامنے بیٹھی دلکش خدوخال کی حامل لڑکی کو مزے سے مشورہ دیا۔ سرمد نے ماہیر کا یہ جملہ اس کے آفس میں داخل ہوتے ہوئے بغور سنا اور مسکرا دیا۔

"تم پلیز اس کا انٹرویو لو، اسے مشورے مت دو۔" وہ اپنے لیپ ٹاپ کا بیگ میز پر رکھتے ہوئے شانزے کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"کیسی ہو چھوٹی۔؟" سرمد کے بے تکلف انداز پر ماہیر چونکا۔

"فائن۔ اینڈ آپ۔" وہ ماہیر کی وجہ سے ذرا تکلف سے بات کر رہی تھی۔

"بس ٹریفک جیم میں پھنس گیا تھا یار! اس لیے دیر ہو گئی۔" اس نے ماہیر کے سامنے رکھے جگ سے پانی گلاس میں ڈالا اور ماہیر کی طرف متوجہ ہوا۔

"ایسا کرو یار! تم شانزے کا اپائنمنٹ لیٹر بنواؤ، انٹرویو بعد میں کرتے رہنا۔" سرمد کے دو ٹوک انداز پر ماہیر کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"لیکن۔" ماہیر کچھ کشمکش کا شکار ہوا۔

"دو بندے میں نے اپائنٹ کرنے تھے ناں، تم شانزے کا نام میری لسٹ میں ڈال دو۔" سرمد طے کر چکا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ شانزے نے چونک کر ماہیر کی طرف دیکھا جو الجھن کا شکار لگ رہا تھا۔ شانزے کو لگا جیسے اسے زبردستی یہاں پر ایڈجسٹ کیا جا رہا ہے۔ اس سوچ نے اس کا سارا موڈ غارت کر دیا۔ دوسری جانب ماہیر تو اس کے دلکش خدوخال میں الجھا ہوا تھا۔

"خیر ان کا نام تو میں تمہاری لسٹ میں نہیں ڈال سکتا۔" ماہیر کے معنی خیز انداز پر شانزے زبردست انداز میں چونکی۔ ٹھٹکا تو سرمد بھی تھا لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔

شانزے کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔ اس نے

میز پر رکھا پرنچ اٹھایا اور کھڑی ہو گئی۔
"کیا ہوا۔۔۔؟" سہد ایک دم ہی پریشان ہوا۔
"سہد بھائی! مجھے یہ جاب نہیں کرنی۔۔۔" شانزے اپنی بات کہہ کر تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ سہد اور ماہیر دونوں ہی ہکا بکا رہ گئے۔
دونوں کو ہی اس سے اس قدر شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ ماہیر کو لگا جیسے کمرے کی ساری ہی روشنیاں مدھم پڑ گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ ایک عجیب سا دن تھا۔ سورج گرہن نے کچھ لمحوں کے لیے پورے ملک کو تاریک کر دیا تھا اور ایسی ہی تاریکی بختاور کے دل و دماغ پر بھی طاری تھی۔ بدگمانی کی دھند نے اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا' وہ خود سر محبت کا ہاتھ تھام کر اتنی دور آ گئی تھی' جہاں سے پلٹنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔
"میرا آج کلاسز لینے کا کوئی موڈ نہیں۔۔۔" وہ سست انداز سے فارمیسی ڈیپارٹمنٹ کے پاس تن کر کھڑی ہو گئی۔
"لیکن آج تو بہت اہم لیکچرز ہیں بختاور۔۔۔" نیلم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"تو تم لے لو ناں جا کر۔۔۔" بختاور نے اسے مفت مشورہ دیا۔
"اور تم کیا کرو گی۔۔۔؟" نیلم نے سوالیہ انداز سے اپنی دوست کو دیکھا جس کے رنگ ڈھنگ آج بدلے ہوئے تھے۔
"میں ہاشم کے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا رہی ہوں' اس کا آج تھیسس کا وائیوا ہے۔۔۔" بختاور نے فوراً بہانا بنایا' ورنہ ہاشم کا وائیوا تو ہو چکا تھا۔
"چلو ٹھیک ہے' تم جاؤ' وہاں سے ہاسٹل جاؤ گی یا ڈیپارٹمنٹ۔۔۔" نیلم نے اس کا اگلا پروگرام جاننا چاہا۔
"ہاسٹل۔۔۔" بختاور آج ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھی۔
"چلو ٹھیک ہے' اپنا خیال رکھنا۔۔۔" نیلم نے فکر مند انداز سے اس کی طرف دیکھا اور کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کی طرف چل پڑی۔ راستے میں ایک دفعہ اس کا دل چاہا کہ وہ پلٹ جائے اور بختاور کے ساتھ ہی رہے' لیکن پھر اس نے سر جھٹک کر ڈیپارٹمنٹ میں قدم رکھ ہی دیا تھا۔
بختاور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمپیوٹر سائنس ڈیپارٹمنٹ کی طرف آ گئی' جہاں طے شدہ وقت کے مطابق ہاشم کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے رسٹ واچ پر ایک نظر ڈالی اور اس کی طرف چل پڑا۔
"اپنا آئی ڈی کارڈ لائی ہو ناں۔۔۔" ہاشم نے سلام دعا کے بغیر اس سے پوچھا۔ بختاور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"چلو پھر۔۔۔" وہ اسے ساتھ لیے پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔ بختاور کا دل بجھا بجھا سا تھا۔ وہ بالکل خاموشی سے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ ہاشم ایک سفید رنگ کی مہران گاڑی کے پاس رکا اور چابی سے اس کا دروازہ کھولنے لگا۔
"یہ گاڑی کس کی ہے۔۔۔؟" بختاور حیران ہوئی۔
"میرے دوست کی۔۔۔" اس نے سنجیدگی سے کہہ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"لیکن ہم اس میں کیوں جا رہے ہیں۔۔۔" بختاور نے الجھن آمیز نظروں سے ہاشم کی طرف دیکھا جو گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا۔
"بے وقوف لڑکی! میں صبح سویرے تمہیں کسی پبلک ٹرانسپورٹ پر تو کچہری میں نہیں لے جا سکتا تھا۔" ہاشم نے نرم لہجے میں جواب دیا۔
"پریشان کیوں ہو بختاور۔۔۔" وہ بہت دھیان سے گاڑی چلاتے ہوئے بولا۔
"پتا نہیں کیوں بہت عجیب لگ رہا ہے۔۔۔" بختاور نے صاف گوئی سے کہا تو وہ دھیمے سے انداز میں مسکرا دیا۔
"کچھ نہیں ہو گا' تم کسی بھی چیز کو ذہن پر سوار مت کرو۔۔۔" وہ دوستانہ انداز میں اسے تسلی دے رہا تھا۔
"ہاشم! ہم کچھ غلط تو نہیں کر رہے۔۔۔؟" بختاور نے

سردیوں کے موسم میں بھی اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے تھک کر پوچھا۔ ہاشم کا موڈ ایک دم ہی تبدیل ہوا۔ اس نے روشن روڈ پر اچانک ہی گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی۔

"کیا ہوا۔۔۔؟" بختاور۔۔۔

"دیکھو! اگر تمہیں لگ رہا ہے۔۔۔ یہ غلط کر رہے ہیں تو میں گاڑی واپس موڑ لیتا ہوں۔" وہ آج کل چھوٹی چھوٹی باتوں پر خفا ہو جاتا تھا۔

"میں نے ایسا تو نہیں کہا۔" اس کا یہ انداز بختاور کی جان نکال لیتا تھا۔ "آپ کو اندازہ تو ہے میں کس ذہنی کیفیت کا شکار ہوں' پلیز میری باتوں کا برا مت مانا کریں۔" وہ جذباتی ہوئی۔

"تمہاری ایسی باتوں سے مجھے لگتا ہے جیسے تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے' یقین مانو میں اپنی ہی نظروں میں گر جاتا ہوں۔"

ہاشم نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کی تھی اور پھر سارا راستہ دونوں کے درمیان میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ بختاور نے نکاح نامے پر بھی بڑی خاموشی سے دستخط کر دیے۔ وہ دونوں جب دوبارہ گاڑی میں بیٹھے' ایک ہو چکے تھے۔ بختاور جس مرحلے کو انتہائی دشوار گن سمجھ رہی تھی' وہ اتنے آرام سے گزر گیا کہ اسے احساس تک نہیں ہوا۔

"کیسا محسوس کر رہی ہو۔۔۔؟" ہاشم نے پہلی دفعہ اسے پورے استحقاق سے دیکھا۔

"سچ پوچھو تو ابھی کسی بھی قسم کی فیلنگز پیدا نہیں ہو رہیں' اپنا آپ خالی خالی سا محسوس ہو رہا ہے۔" بختاور نے صاف گوئی سے جواب دیا تو وہ مسکرا دیا۔

"آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاؤ گی۔۔۔" وہ دونوں دوبارہ کیمپس میں آ چکے تھے۔ ہاشم نے اس کے کہنے پر اسے بینک چوک پر چھوڑ دیا تھا' وہ بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف آ رہی تھی جب اس نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے نیلم کو بابا اور اسی کے ساتھ آتے دیکھا۔ بختاور کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے ان تینوں کو دیکھ رہی تھی اور وہ بھی اسی کی طرف متوجہ تھے۔ بختاور کو لگا جیسے وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ میں پکڑی فائل کو مضبوطی سے پکڑ لیا جس میں اس کے نکاح نامے کی ایک کاپی موجود تھی۔

☆ ☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قانتہ رابعہ

منصب والدہ

انیلا کو آج صبح سے چپ سی لگی ہوئی تھی۔
گو کہ اس کی شادی کو سات سال اور چار ماہ گزر چکے تھے اور وہ تین بچوں فلزا' عتیق اور فائز کی اماں تھی۔ سسرال میں بھی اتنے عرصہ میں اس نے جس جس کے دل میں جو مقام پیدا کرنا تھا وہ کر چکی تھی۔ جس جس کی نظر میں اس کی جو حیثیت تھی وہ واضح ہو چکی تھی۔ پھر بھی۔ اس کو بسا اوقات اپنے دل میں خالی پن سا محسوس ہوتا۔

کئی دفعہ اس نے وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اچھا' علمی گھرانہ' شستہ مزاج کے ساس سسر بیٹے' بیٹی کی نعمت اور رحمت۔ وسیع رزق' ہر چیز تو میسا تھی پھر اس کے دل سے شکر کے چشمے کیوں نہیں ابلتے تھے؟ عام طور پر عورتیں جن سسرالی مسائل کا شکار ہوتی ہیں وہ ان سے کوسوں نہیں کروڑوں میل دور تھی۔ سسرال کے بھرے پرے گھرانے میں محبت' اعتماد سب ہی میسر تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر اکثر ہی قفل لگ جاتا۔ وہ گھنٹوں کے نہیں' دنوں بلکہ ہفتوں کے حساب سے چپ رہتی۔ خالی خالی نظروں سے سب کو تکتی۔ اس کی گفتگو بس "ہوں"' "نہیں" تک محدود رہتی۔

کیا وہ ناشکری تھی؟ یہ سوچتے ہی وہ استغفار پڑھ کر ہے کہ اتنا بھاری ہے۔

یقینا" جو کچھ ملا تھا یہ اس کی شکر گزاری کو ہی شرف قبولیت بخشا گیا تھا۔

"اوپر والے" نے اپنی کتاب میں فارمولا تو صدیوں پہلے دے رکھا تھا۔ لیکن شکر تم ازید نکم۔ تم شکر کرو گے تو اور زیادہ دوں گا۔ ضرور دوں گا۔

اور وہ دیے جا رہا تھا۔ دیے جا رہا تھا۔ جیسے کوئی دونوں ہاتھوں سے تمام خزانے اس پر نچھاور کر رہا ہے۔ نہ مال و دولت کی کمی تھی نہ عزت' شہرت کی' پھر کمی کہاں تھی۔

ہاں ایک کمی تھی اگر اسے کمی کہا جا سکتا ہے تو۔ عدنان طارق۔ اس کے میاں کی طرف سے گو کہ وہ بہت ہی اچھا تھا۔ وہ سو روپے مانگتی تو عدنان پانچ سو سے کم ہتھیلی پر نہ رکھتا۔

وہ بچوں سے تھک تھکا کے سوئی ہوتی تو عدنان چوکیدار بنا اس کے بیڈ روم کے باہر پہرہ دیتا۔ امتحانات کے دوران امتحان گاہ کے باہر اتنا کڑا پہرہ نہیں ہوتا تھا جتنا انیلا کی آنکھ کھلنے تک وہ دھیان رکھتا۔ لینڈ لائن کا ریسیور ایک طرف رکھ دیا جاتا۔ سیل فون سائلنٹ پر ہوتا۔ کمرے کا دروازہ بند کر دیا جاتا اور بچے سامنے والے پارک میں بھیج دیے جاتے۔

عید بقر عید پر بیویاں عیدی مانگ کر لیتی ہیں' عدنان بن مانگے اسے نقدی کے علاوہ زیورات اور کپڑوں کے تحائف سے نوازتا۔ صرف اس کے لیے ہی نہیں وہ تو سات غیروں کے لیے بھی دل کا غنی تھا۔

خواتین کو عام طور پر ایک مسئلہ میکے جانے کی اجازت نہ ملنا ہوتا ہے۔ اچھے سے اچھے شوہر بیویوں کے جانے کے نام پر ماتھے پر بل لے آتے ہیں عدنان غیر یقینی حد تک اس کے ساتھ اس معاملہ میں تعاون کرتا تھا۔ انیلا کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدہ اپنے

اندر بیماریوں کا پورا اسپتال رکھتی تھی۔ معدہ ٹھیک کام کرتا تھا نہ جگر۔ ٹانگیں چلنے سے جواب دے چکی تھیں تو آنکھیں دیکھنے سے۔ ایسے میں جونہی عدنان کو پتا چلتا کہ بوڑھی ساس کی طبیعت ناساز ہے، وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے گاڑی نکال لیتا۔ شور مچاتا۔

"جلدی کرو جلدی۔" بچے منہ بسورتے، دس طرح کی سوکتیں اور چچازاد، تایازاد، بہن بھائیوں کو چھوڑ کر بیمار، اکلوتی نانی کے پرانے گھر میں جانے پر دل نہ مانتا تو عدنان انہیں طرح طرح کے لالچ دیتا۔

"او میرے شہزادو! نانی اماں کی خدمت کرو، واپسی پر جو مانگو گے ملے گا۔ آئس کریم کھلاؤں گا، پارک لے کر جاؤں گا، ریموٹ والی گاڑی لے کر دوں گا۔"

شروع شروع میں تو انیلا روایتی بیویوں کی طرح اسی غلط فہمی میں رہی کہ ہر شوہر کی طرح عدنان بھی "چھڑا چھانٹ" ہونے کے مزے لینے کے لیے میکے جانے



میں رکاوٹ نہیں بنتا" لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی جب عدنان نے ہنستے ہوئے بتایا کہ "فرش پر تلاوت کرو گی (ماں کی خدمت کرو گی) تو عرش پر آواز جائے گی۔"

"کیا مطلب؟" انیلا نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی مطلب صاف ظاہر ہے' شب معراج محبوب خدا کو جنت میں قرآن کی تلاوت کی آواز آئی تھی۔" حیرانی سے پوچھا۔

"جبرئیل امین یہ کس کی آواز آرہی ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "نعمان بن حارثہ کی۔ اللہ کو یہ اپنی ماں کی خدمت کی وجہ سے بے حد محبوب ہیں اس لیے فرش پر تلاوت کرتے ہیں آواز عرشوں پر سنی جاتی ہے۔"

انیلا یہ سن کر کتنے دن اپنے آپ سے روٹھی رہی تھی۔ کتنی بدگمان تھی وہ شوہر سے؟

پھر آخر مسئلہ کیا تھا؟ کمی کہاں تھی؟

عدنان کا مزاج۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ نوازنے پر آئے تو وال روٹی پر شاہی خلعت عطا کردے ڈانٹنے پر آئے تو دس لوازمات کی موجودگی میں سب کے سامنے ٹھکرا دے۔ جہاں وہ شاباشی کی توقع رکھتی وہاں کوتاہیاں گنوا دی جاتیں اور جہاں کوتاہی پر ڈر رہی ہوتی وہاں اعزاز و تکریم کے ساتھ بخشش دی جاتی۔

کوئی ایک واقعہ تھا جو انیلا دہراتی۔ کبھی پودوں کو دو دفعہ دن میں پانی دینے پر عدنان نے ہنگامہ کھڑا کیا تو اسی روز دس ہزار کی نئی پرفیوم ٹوٹنے پر "کوئی بات نہیں" کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ کبھی ہینڈ بیگ کی زپ کھول کر بھرے بازار میں اس کا پرس نکال لیا جائے تو ایک لفظ نہ کہے یہ بھی نہ پوچھے کہ "کدھر رکھا گیا۔" بس کہے تو صرف یہ کہ "شکر اللہ نے اس سے بڑے نقصان سے بچالیا اور کبھی دودھ ابل جانے پر بھی ہنگامہ کھڑا کردے۔ کبھی اظہار محبت سے 'خیال رکھنے کے نت نئے طور طریقوں سے دل موہ لے تو کبھی جلتے بلتے فقرے زہر کی طرح اگل کے چھوٹی سی رائی جتنی بات پر سلگا کے راکھ کردے۔

اس نے نوٹ کیا تھا اکثر تو اسے خوشیاں راس ہی نہیں آتی تھیں۔ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولا جھلاتے ایک دم کڑی دھوپ میں لا کھڑا کرتا۔ عجیب مزاج کا تھا اس کا شوہر ایسی پہیلی بوجھنے پر آئے تو صدیاں بیت جائیں۔ ایسی بجھارت کہ جواب دنیا میں کوئی بھی نہ دے سکے۔

☆☆☆

روتے ہنستے' جلتے کلستے اس نے زندگی کے سات سال جیسے گزارے اسے ہی پتا تھا گویا سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ شوہر نام ہے اک دیوانے کا۔ مذاق ہی مذاق میں وہ شوہر رے شوہر تیری کون سی کل سیدھی کہہ کر مزہ بھی خود ہی لیتی۔

لیکن کل جو ہوا۔ وہ بہت ہی اذیت ناک تھا۔ اس کا دل ہی دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ مر مر کے جیو۔ یا جی جی کے مرو۔! اپنے قرب و جوار میں بسنے والی تمام کزنز کے شوہر اس کی آنکھوں کے سامنے آگئے۔ کیا مثالی زندگی ہے ان کی بھی۔ یہاں تو کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ ہوا بھی وہ جس کی وہ توقع ہی نہیں کر پا رہی تھی۔

ناشتے کے بعد ایک دم آرڈر ملا۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تیاری اس نے کیا کرنا تھی' جلدی سے گھر میں پہننے والی چپل اتار کر سینڈل پہنی۔ چادر لی اور جہاں راہبر لے جائے۔ وہ جانے کو تیار۔ ڈولمن میں پہنچ کر جس چیز پر اس نے انگلی رکھی' میاں نے خرید کر لے دی۔ بالکل نئے انداز میں ڈیزائنر کا شاندار سوٹ' جوتا' میک اپ کا سامان' بچوں کے کپڑے لے کر گھر پہنچی تو وہ واقعی ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اپنی خوش قسمتی پر اسے رشک آرہا تھا۔ جلدی ہی یہ رشک' اشکوں میں بدل گیا۔ گھر پہنچتے ہی ریک پر بجلی فون کا بل نظر آیا۔

دو ہزار نو سو چھیانوے روپے۔

انیلا نے بھی اچک کر دیکھا۔ بل زیادہ تھا' لیکن عام

طور پر ہزار بارہ سو سے کم کبھی نہیں ہوا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو ہزار۔ اب چپ کا قفل عدنان کے ہونٹوں پر لگ گیا۔ عورت کو خوشی نئے سوٹ میں ملتی ہے سو انیلا بھی خوشیوں میں مگن تھی اس نے غور ہی نہ کیا کہ یہ

چپ کسی کسی طوفان کا ہی پیش خیمہ نہ ہو۔

سالن، رائتہ وہ بنا کے گئی تھی۔ تازہ چپاتی توے پر ڈالی ہی تھی کہ عدنان کے دھاڑنے کی آواز آگئی۔

"بل دیکھا ہے فون کا؟"

"جی۔!" نئے سوٹ کی خوشی کا مزہ ماند پڑتا دکھائی دیا۔

"کیا میں حرام کماتا ہوں یا درختوں سے پیسے توڑتا ہوں؟" اگلا جملہ آیا۔

انیلا نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس آنکھوں میں آنسو سے بھر گئے۔ ایک دم ہی جلن ہو گئی آنکھوں میں۔

"آئندہ ٹیلی فون کا بل ہزار گیارہ سو سے زیادہ ہوا تو فون کٹوا دوں گا۔ سمجھیں؟ یہ میری حق حلال اور محنت کی کمائی چغلیوں، غیبتوں کا ٹیکس دینے کے لیے نہیں ہے۔ حد ہو گئی، چسکے کھانے اور گھر والوں کی غیبتوں کے علاوہ کس چیز پر بات ہوتی ہے تمہاری اپنی چہیتیوں سے۔" اس نے ایک وار اور کیا۔

یہ انیلا کی دو سہیلیوں فرخندہ اور نمو کی طرف اشارہ تھا جن سے وہ ہر چھوٹی بڑی بات ڈسکس کرتی تھی۔

انیلا کے اندر طوفان اٹھ رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ بولنے کے بعد عدنان تن فن کرتا گھر سے نکل گیا، بچے اسکول سے آئے تو اس نے ان کو کھانا کھلایا اور چھوٹے بیٹے کی انگلی پکڑ کر گھر سے نکل گئی۔

بے مقصد پھرتے پھراتے اس نے میکے کا رخ کیا۔ ان سات سالوں میں شوہر سے پوچھے بغیر یہ پہلا میکے کا دورہ تھا۔ سیل فون وہ جان بوجھ کر ساتھ نہیں لے کر آئی تھی۔ نکلتے وقت بس غصہ بھرے جذبات تھے۔

اب ایک دم اسے پریشانی لاحق ہو گئی۔ شوہر سے رنجش تھی، بچوں کو تو کچھ بتا کر آنا چاہیے تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد نکلنے کو تھی کہ عدنان کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

اس نے لمبا سانس لے کر اپنے آپ کو نارمل کرنا چاہا۔ کتنا مشکل ہے اپنے آپ کو سنبھالنا اور سمیٹنا۔ اس نے بے بسی سے سوچا بلاشبہ وہ بہترین بیٹی بہترین بہو، بہترین نند اور بہترین بھابھی ہے۔ لیکن بیوی۔ بہترین تو کیا بہتر بھی بات نہ بن پائی۔

اندر ساس کے پاس دو چار منٹ بیٹھ کے عدنان نے ساس کو اللہ حافظ کہہ کر اجازت لی۔ گاڑی کی چابی اٹھائی، انیلا بھی خاموشی سے سوئے بچے کو گود میں اٹھائے پیچھے چل پڑی۔ سارا سفر خاموشی میں کٹا۔

گھر پہنچتے ہی بچوں نے "امی! بھوک لگی ہے" کا شور مچایا۔ اس نے دوپہر والا کھانا گرم کیا۔ چپاتیاں بنائیں اور میز پر کھانا لگا دیا۔

عدنان کو چائے کا کپ کھانے کے بعد لازمی چاہیے ہوتا تھا۔ ساس پین میں پانی ڈال کر اس نے دودھ لینے کے لیے فریج کا دروازہ کھولنا چاہا۔

اف۔ ایک اور بل۔ فریج کے ساتھ پڑی ٹرالی پہ سجا پڑا تھا۔ دودھ لینے کا اسے یاد نہ رہا اس نے بل اٹھایا۔ سوئی گیس کا بل تھا۔ "سات ہزار چار سو پچیس روپے۔"

اسے یقین نہ آیا اس نے دوبارہ بل پر نظر دوڑائی۔ "اف۔" وہ وہیں قریب پڑے صوفے پر دھم سے بیٹھ گئی۔ تین ہزار بل پر یہ حال تھا اب تو خدا جانے کیا معاملہ ہوگا۔ وہ بری طرح سہم گئی۔

کیا کرے اور کیا نہ کرے؟

بل پر نظر ڈالی۔ کل اتوار تھا۔ اور پیر آخری تاریخ تھی ادائیگی کی۔ اس کا مطلب ہے 'آج کا کام کل پر' ڈالنے کی حماقت نہیں کرنی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے۔ کیسے بتائے؟ کسی بچے کے ذریعے عدنان تک بھجوائے یا خود بات کرنے کا آغاز کرے۔ کس طرح پورا اسینہ بچوں کی وجہ سے گیزر ہیٹر اور موسم سرما کی سوغات کے لیے چولہا غریب کے دل کی طرح دھڑ دھڑ

چیختی رہا ہے۔"

"امی! چائے کا برتن جل رہا ہے۔" آواز آرہی ہے۔" اس کی بیٹی چلائی۔ وہ تیزی سے اٹھی۔ برتن میں موجود پانی خشک ہو کر جل چکا تھا۔ برتن سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

(کاش اس کے دل سے اٹھنے والا دھواں بھی کسی کو نظر آجائے۔)

بلا خر بیا سے کوے کی طرح اسے ترکیب سوجھی اس نے نئے سرے سے چائے کا پانی رکھا' چائے کا کپ طشتری میں رکھا۔ ساتھ ہی کسی ویٹرس کی طرح بل بھی رکھ کر چائے میاں کے آگے رکھ دی۔ برتن اٹھانے کے بہانے اسے وہاں سے کھسکنے میں عافیت ہی نظر آئی۔

کمرے سے نکلتے نکلتے اس نے اچٹتی سی نظر میاں کے چہرے پر ڈالی۔ کوئی تیوری نہ بل۔ بل دیکھ کر اس نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔

کھانا کھلانے کے بعد اس نے بچوں کا ہوم ورک چیک کیا۔ برتن سمیٹے۔ بچوں کے یونیفارم استری کرنے اور لوخر لوخر کے کاموں میں اس نے رات کے دس بجا دیے۔ کاش۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ آج رات میاں کے کمرے میں جانے کے پل صراط پر سے گزرنا پڑے۔

اے کاش!! وہ خوامخواہ بچوں کے کمرے میں مصروف دکھائی دیتی رہی۔ عدنان نے ایک دفعہ جھانک کر دیکھا۔ کہا کچھ نہیں۔

اور جب وہ بچوں کے ساتھ سونے کے لیے لیٹ چکی تھی' اس کے سیل فون پر میسج ٹون ہوئی۔ اس نے جلدی سے ان باکس چیک کیا۔ نمبر۔ عدنان کا تک نمبر۔ میسج میں ایک روتی کرلاتی' منہ بسورتی سمیل تھی۔ آگے لکھا تھا سوری آبگینے۔" اور کوئی وقت ہوتا تو اس "آبگینے" والے ٹائٹل پر وہ گردن اکڑاتی' اتراتی۔ خوشی سے بے حال ہو جاتی۔ یہ آبگینے کا ٹائٹل اسے پہلی دفعہ نہیں ملا تھا۔ کئی دفعہ مل چکا تھا۔

شروع میں اسے وہ ایک نام ہی کبھی جیسے اشکبار مشکبار۔ آبگینے' پھر اس کی نظروں سے رسول اللہ کی حدیث گزری' عورتیں تو نازک آبگینے ہیں' ان کی قدر کرو وہ حیران ہوئی۔ اف اس قدر احساس تھا' عدنان کو اس کی عزت نفس کا جب بھی وہ دل میں اس کے لیے خفگی' ملالی یا رنجش ہوتی' دور جسم سے آکر کہتا۔

"میری آبگینے۔"

وہ شانت ہو جاتی۔ ٹھیک ہے مردوں کی کھال موٹی ہوتی ہے مگر دل تو احساس رکھتا ہے۔ اور بات ہے ہی صرف احساس کی۔ لیکن آج وہ حالت اطمینان میں نہیں بحالت مجبوری اٹھی۔ اٹھنا ہی تھا ورنہ بخشنے کا سامان کہاں سے ہوتا ہائے ری عورت! اس نے نئی آزمائش کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا۔ پہلے بل نے رلایا تھا یہ والا بلبلائے گا یا کیا کرے گا!

آہستہ سے دروازہ کھول کر وہ بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ بیڈ پر جینیلی موتیا کے گجرے پڑے تھے۔

عدنان نے اسے دیکھا۔ اور گجرا اٹھایا۔

وہاں کھڑی تھی!! بے روح جسم کے ساتھ!!

"آؤ بیٹھو۔" عدنان نے اسے بازو سے پکڑ کر پاس بٹھایا۔

"مجھے پتا ہے تم بہت خفا ہو مجھ سے' ہونا بھی چاہیے۔" بہت نرم لہجے میں اس نے معذرت بھی پیش کر دی۔

دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر وہ بے اختیار رو پڑی۔ "میں تھک گئی ہوں۔ بہت مشکل ہے میرے لیے۔" اس کے آنسو رخسار بھگو رہے تھے۔ "کہہ لیں سوئی گیس کے بل پر جو کہنا ہے۔" وہ روتے روتے بولی۔

"کیوں کہوں؟" اس نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوئی؟ "ان سات سالوں میں میں آپ کو سمجھ نہیں سکی۔ کہاں تو بیوی کو ایک شاپنگ سینٹر سے پچیس ہزار کی شاپنگ کروا دی اور کہیں تین ہزار کے بل پر اس کی عزت نفس کے

پچھتر سے آزاد ہے۔"

"واقعی تم مجھے کبھی بھی نہیں ان سات سالوں میں۔" عدنان نے اس کے آنسو پونچھے۔ "تم اب تک یہ بھی نہیں سمجھ سکیں مجھے کیا اچھا لگتا ہے اور کیا اچھا نہیں لگتا۔؟" عدنان نے دکھ سے کہا۔

"میں چاہتا ہوں میں گھر سے نکلوں تو دنیا کی کوئی عورت کتنی ہی بن سنور کر سامنے کیوں نہ آئے میری توجہ نہ کھینچے اس لیے میں چاہتا ہوں میری

بیوی سب سے اچھی لگے جو پہننا اوڑھنا چاہے اسے کھلی آزادی ہے۔ ویسے بھی شوہر کے لیے زیب و زینت پسندیدہ ہے اور سوئی گیس کے بل پر بس اس لیے نہیں بگڑا کہ مجھے پتا ہے چولہا کھانے کے لیے جلا ہوگا۔ ہیٹر بھی کمرہ گرم کرنے کے لیے استعمال ہوا ہوگا۔ یہ تو میرے آقا کا بھی فرمان ہے انسان کہتا ہے میرا مال میرا مال حالانکہ مال بس اس کا وہی ہے جو کھالیا پہن اوڑھ لیا اور آگے بھیج دیا۔ باقی سب تو اس کے وارثوں کا ہے۔ اس لیے میری انیلا شہزادی! کھانے پینے پہننے اوڑھنے پر خرچا کرنا مجھے پسند ہے۔ ہاں اللہ قبول کرے اس کی توفیق سے آگے کا بھی کچھ نہ کچھ سامان کرتا ہی ہوں۔ باقی رہا ٹیلی فون کا بل وہ شاید تم نے نوٹ نہیں کیا دو ہزار پانچ سو روپے صرف لوکل کالز کے تھے۔ ان میں صرف اور صرف بے وقوفی باتیں ہوتی ہوں گی، موسم پر تبصرے ہوتے ہوں گے۔ کپڑوں کے ڈیزائن پرنٹ پر سیر حاصل گفتگو ہوتی ہوں گی۔ گھریلو حالات "ڈسکس" کرنے کا خوب صورت لیبل لگا کر غیبتیں، چغلیاں بھی ہوتی ہوں گی۔ تو میں نہیں چاہتا۔"

ایک دم ہی عدنان کی آواز بھرا گئی۔ انیلا نے اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں پانی جھلمل کر رہا تھا۔

"میں نہیں چاہتا۔" عدنان نے شہادت کی انگلی کی پور سے آنکھوں کا گیلا پانی صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں چاہتا کہ ان بے معنی لفظوں پر جن کی اللہ کے ہاں روز حشر کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔ میری

بیوی کی پکڑ میں آجائے۔ نہیں پتا ہے ناں تیلو! اس کی پکڑ کتنی شدید ہے "بتاؤ میں کیا جواب دوں گا جب وہ مجھ سے پوچھے گا کہ حلال کی کمائی فضول گناہ کے کاموں میں کیوں اڑائی؟؟"

عدنان کا لہجہ گمبھیر اور آواز میں بندش تھی۔ اس نے کہا۔ "انیلا اس لیے میں نا تو بلب نہیں جلنے دیتا پنکھا کمرے سے نکلتے ہوئے بند کر دیتا ہوں پانی کا ایک قطرہ ضائع کرنا مجھے گوارا نہیں۔ بات کم خرچے بچت یا بل کی زیادتی کی نہیں بات صرف اور صرف نعمتوں کی

بازپرس کی ہے۔ میں اس کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتا۔ تم تو پھر صنف نازک ہو تم جواب دے سکو گی؟"

عدنان نے انیلا سے سوال کیا۔

انیلا گم صم اسے دیکھ رہی تھی۔!!

واقعی سات سالوں میں اسے وہ سمجھ نہیں پائی تھی؟ اس نے سوچا۔ کاش اس کے بس میں ہو تو مخلوق میں سے کس کو ولی بنانا ہے تو اس لمحہ وہ اپنے شوہر کو منصب ولایت پر نامزد کردے۔ یہ عہدہ صرف جبہ و دستار کے لیے ہی تو مخصوص نہیں!! غلطی پر اور غلطی بھی کیا سخت لہجے میں چند کلمے پر اظہار ندامت گجروں کی صورت میں تلافی۔ دل جوئی۔ دنیا کا ہی نہیں آخرت کا بھی ساتھ چاہنے کے لیے ایک ایک پل اور ایک ایک عمل پر نظر رکھنا کیا ولایت اس سے بڑھ کر ہوتی ہے؟

اس کی تمام غلط فہمیاں دور ہو گئی تھیں۔ یہ عہد پایا تھا سرفرازی و نعم کی کیفیت میں سرشار اس نے اپنا سر اپنے شوہر کے شانے سے ٹکا دیا۔ چند لمحے قبل حد درجہ مغضوب اسے بے تحاشا محبوب لگ رہا تھا۔

مہوش افتخار

جائے آرزو

زمین پہ گرا اس کا وجود ٹھوکروں کی زد میں تھا۔ جو اس کے جسم پہ اندھا دھند اور انتہائی بے رحمی سے لگائی جا رہی تھیں۔ وہ تڑپ رہا تھا' چیخ رہا تھا' لیکن وہاں کوئی اس کا مددگار نہ تھا۔ درد کی شدت ہر ضرب پہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے برانڈڈ کپڑے خاک اور خون سے اٹے لگے تھے۔ جبکہ وجیہہ چہرے کے تیکھے اور مغرور خدوخال' آنسوؤں' خون اور گرد کے پیچھے چھپ گئے تھے۔

رفتہ رفتہ اس کا جسم شل ہونے لگا تھا۔ مزاحمت دم توڑتی جا رہی تھی۔ ان کے جوتے اب بھی اسے رگید رہے تھے' لیکن درد میں وہ شدت نہ رہی تھی۔ سوئی جاگی کیفیت میں اس نے اپنے بے وزن وجود کو ہوا میں اٹھتا محسوس کیا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ پوری طاقت سے کچرے کے ڈھیر پہ پھینک دیا گیا تھا۔

اس کا سر بڑی زور سے کسی چیز سے ٹکرایا تھا اور لبوں سے بے اختیار اک کراہ نکلی تھی۔ بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ ایک آخری احساس بڑی شدت سے اس کے اندر جاگا تھا۔ تعفن کا کریہہ احساس۔ تعفن۔ جو اس کے ناک اور منہ میں گھسنے لگا تھا اس کے شاندار وجود سے لپٹنے لگا تھا۔ مگر

مکمل ناول





سبز بیلوں سے ڈھکے خوب صورت سے بنگلے کے سیاہ گیٹ پر بے پرواہ سے چوکیدار نے جلنے بجھنے ہارن مستعدی سے آگے بڑھ کے گیٹ کھولا تھا اور باہر منتظر کھڑی گاڑی سبک رفتاری سے اندر داخل ہوئی۔
سیدھی سامنے پورچ میں جا کھڑی ہوئی تھی۔
"سلام بی بی۔" وہ بریف کیس لیپ ٹاپ اور دوائیں اٹھائے باہر نکلی تو گیٹ بند کرتے ولی شیر نے پلٹ کے اسے سلام کیا۔
"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو ولی شیر؟" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ لیے اپنے مخصوص نرم لہجے میں استفسار کیا۔
"اللہ کا شکر ہے بی بی۔" جواباً وہ مسکرا کر بولا تو وہ اثبات میں سر ہلاتی عمارت کے داخلی دروازے کی جانب چلی آئی لیکن اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ دروازے کو چھو جاتے دروازہ اندر سے کھل گیا۔
"السلام علیکم!" مما جان کے شفیق چہرے پہ نظر پڑتے ہی اس کے لب خود بہ خود مسکرا دیے۔
"وعلیکم السلام! آج اتنی دیر کیوں ہو گئی تمہیں؟" دروازہ بند کرتے وہ اس کے پیچھے چلی آئی تھیں۔ ان کے متفکر لہجے نے مہر کی مسکراہٹ گہری کر دی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا سامان کاؤچ پہ ڈھیر کرتے وہ خود بھی قریب ہی کرسی پر ٹک گئی تھی۔
"بس آج پرنسپل نے اچانک میٹنگ کے لیے بلایا تھا اس لیے دیر ہو گئی۔" اس نے جواب دیتے ہوئے پاس پڑا دواؤں والا شاپر اٹھا کر ان کی جانب بڑھایا۔
"آپ کی دوائیں۔"
"کیا ضرورت تھی آج لانے کی۔ کل آجاتیں۔" وہ شاپر لیتے ہوئے خفگی سے بولیں۔ مہر مسکراتے ہوئے جھک کر سینڈل اتارنے لگی۔
"کالج میں کچھ کھایا تھا یا نہیں؟" ان کے سوال پہ اس کا جھکا سر نفی میں ہل گیا۔
"صرف جوس پیا تھا۔"
"تو بیٹا لیو بھی نہ جاتیں۔ خواہ مخواہ زحمت کی۔" وہ سیدھی ہوئی تو نظریں ان کے خفا چہرے سے جا ٹکرائیں۔ ایسے ٹھنڈے میٹھے انداز میں کلاس لینا ان کا ہی خاصا تھا۔ مہر نے بے اختیار اپنی گہری ہوتی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا۔
"پاپا نے صبح اپنی شوگر چیک کی تھی؟" اس کے استفسار نے انجم بیگم کے چہرے پہ چھائی خفگی میں اضافہ کر دیا۔
"ایک سوائے اپنے، سب کی فکر ہے۔" ان کی فہمائشی نظروں پر اس نے ان کے کندھے پہ سر رکھ دیا۔
"میری فکر کرنے کے لیے آپ جو ہیں۔" وہ لاڈ سے بولی تو انجم بے اختیار اک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئیں۔
"میں کھانا لگواتی ہوں۔ تم فریش ہو جاؤ۔" وہ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے بولیں تو مہر ان کا گال چومتی اٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔
وہ کپڑے تبدیل کر کے منہ ہاتھ دھو کر ڈائننگ ٹیبل پہ آئی تو منتظر بیٹھی انجم بیگم نے اس کے آگے چاولوں کی ڈش بڑھائی۔
"ابھی تھوڑی دیر پہلے زیب کا فون آیا تھا۔ بتا رہی تھی کہ آج عائشہ کے سسرال والوں کا فون آیا تھا۔ وہ اس جمعے کو منگنی کا فنکشن رکھنا چاہ رہے ہیں۔" ان کی بات پہ مہر کا چاول نکالتا ہاتھ یک لخت ساکت ہو گیا۔
"میں وہاں نہیں جاؤں گی۔" وہ لمحے کا توقف کیے بنا سپاٹ لہجے میں بولی تو انجم بیگم کی نظریں اس کے چہرے پہ جا ٹھہریں۔
"بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ تم جانتی ہو کہ تمہارا وہاں جانا کتنا ضروری ہے۔" انہوں نے دھیمے لہجے میں اسے ٹوکا۔
"مگر مما جان! ابھی اس شخص۔۔۔"
"وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔" انہوں نے ان کی

بات کاٹی۔

"دلہن کی منگنی تک تو لازما" لوٹ آئے گا نا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا اسپون واپس ڈش میں پٹخا۔

"مشکل ہے۔ زیب بتا رہی تھی کہ کسی فارن کمپنی سے ڈیل ہو رہی ہے۔ اس لیے وہ شاید مہلت نہ کرسکے گا۔" اس کے برعکس وہ مکمل طور پہ پرسکون تھیں۔

"ڈور اگر آگیا تو؟"

"تو آجائے۔ ہم کیا اس سے ڈرتے ہیں؟" اب کے انہوں نے خفگی سے اسے دیکھا تو مہر کے چہرے پہ بے بسی پھیل گئی۔

"اگر مما جان۔"

"کوئی اگر مگر نہیں۔ تمہارا اس معاملے میں خود کو مضبوط کرنا بے حد ضروری ہے مہر! ورنہ زندگی بہت مشکل ہو جائے گی بیٹا!" انہوں نے دھیرے سے سمجھاتے ہوئے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا تو مہر بے اختیار اک بوجھل سانس کھینچ کے رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

نیویارک میں طلوع ہونے والی یہ ایک معمول کی صبح تھی۔ مارک نے اپنی بیوی جوزفین کو روز کی طرح اس کے دفتر کے باہر ڈراپ کیا تھا اور خود اپنے دفتر کی جانب گاڑی بڑھانے کو تھا کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ دھیان سے گاڑی ایک طرف کرتے ہوئے اس نے عجلت میں اپنا سیل فون جیب سے نکالا جس کی اسکرین پہ کوئی انجانا نمبر جگمگا رہا تھا۔

"ہیلو!" کال ریسیو کرتے ہوئے اس نے ایک نظر کلائی پہ بندھی گھڑی پہ ڈالی تھی۔

"مسٹر مارک بات کر رہے ہیں؟" دوسری طرف سے کسی خاتون کی آواز آئی تو وہ بے اختیار چونک گیا۔

"جی۔"

"میں کمیونٹی ہیلتھ کیئر سینٹر سے بات کر رہی ہوں۔ آپ کسی سیم نامی شخص کو جانتے ہیں؟" دوسری جانب سے سوال کیا گیا تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

"جی۔ وہ۔ وہ میرا دوست ہے۔ سب ٹھیک تو ہے نا؟" اس نے تشویش سے پوچھا۔

"معذرت، [illegible] ہم [illegible] نہیں ہیں۔ آپ پلیز [illegible] جا [illegible]"

"کیا؟" [illegible] سے والی اطلاع نے لحظہ بھر کو اس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے۔

"او کے۔ میں۔ میں پہنچ رہا ہوں۔ آپ کس کمیونٹی سینٹر سے بات کر رہی ہیں؟" خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے دریافت کیا اور پھر دوسری جانب کا جواب سن کر اس نے آنا" فانا" گاڑی مطلوبہ سینٹر کی جانب موڑ دی۔

☆ ☆ ☆

عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ زیب بیگم نماز ادا کر کے ملازمہ کو چائے رکھنے کی ہدایت دیتی لاؤنج میں داخل ہوئیں تو صوفے پر منہ بسورے بیٹھی عائشہ نے ان کی



جانب دیکھا۔

"یہ بھی بھلا کیا بات ہوئی بھلا' آپ لوگوں نے انہیں اگلے جمعے کے لیے کیوں نہیں کہا۔"

"بیٹا اگلے ہفتے [illegible] جا رہی ہے۔ تمہاری ساس [illegible] تین جو رن ہیں ان کے پاس۔ انہوں نے [illegible] نے والی نند کا حوالہ دیا تو جائشہ کو غصہ آگیا۔

"اور جو میرا بھائی یہاں نہیں ہے؟"

"جاشی ٹھیک کہہ رہی ہے امی! احسان بھائی کے بغیر بھلا کیا اچھا لگے گا۔" نورہ نے بڑی بہن کی تائید کی۔ زیب اک گہری سانس لیتے ہوئے بولیں۔

"مجبوری ہے بیٹا۔ اب ہم انہیں منع تو نہیں کر سکتے تھے نا اور پھر تمہارے ڈیڈی نے حسان کے مشورے سے ہی ہامی بھری ہے۔"

"بھائی نے تو ساری بات سن کے یہی کہنا تھا مگر میں ان کے بغیر یہ فنکشن نہیں کرنے والی۔" جائشہ قطعی لہجے میں بولی۔

"تم ایسا کرو بھائی سے کہو کہ وہ جمعرات میں منگنی کی شام تک یہاں پہنچ جائیں۔ فنکشن اٹینڈ کریں اور پھر اگلے دن واپس چلے جائیں۔" نورہ نے اسے دیکھتے ہوئے مشورہ دیا تو زیب بیگم کا مضطرب دل یک لخت پریشان ہوگیا۔

"کوئی ضرورت نہیں اسے پاگلوں کی طرح یہاں وہاں دوڑانے کی۔ ہم نے کون سا کوئی بہت بڑا فنکشن کرنا ہے۔ ایک چھوٹی سی تقریب ہوتی ہے اور بس۔"

"لیکن امی۔"

"فضول کی بحث مت کرو جائشہ۔ حسان اگر جمعے تک فارغ ہوگیا تو پہنچ جائے گا۔ وہ کہہ چکا ہے تمہارے ڈیڈی سے۔" زیب قطعیت سے بولیں تو دونوں بہنیں ایک دوسرے کو دیکھتی خاموش ہوگئیں۔

☆ ☆ ☆

حیران پریشان بیٹھے مارک نے نظریں اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر شیشے کی دیوار کے پار بینوں میں جکڑے اور مشینوں میں گھرے وجود کی جانب دیکھا اور اس کا ذہن نئے سرے سے ماؤف ہونے لگا۔ وہ یعنی سیم اور نیویارک کے ایک مخدوش' بدنام زمانہ علاقے کے کچرے کے ڈھیر پر! اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے [illegible] وہ کتنی ہی دیر خالی الذہنی کے عالم میں اسے تکتا رہا اور پھر اس نے تھک کر بے اختیار اپنا سر تھام لیا۔

کچھ دیر قبل اپنی گاڑی اسپتال کی جانب دوڑاتے ہوئے اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہاں اسے سیم اس درجہ بری حالت میں ملے گا۔ اسے آئی سی یو میں دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی' لیکن جب وہاں کی انتظامیہ کے ذریعے اسے وہاں پہنچانے والی خاتون کا بیان سننے کو ملا تھا تب تو وہ سچ میں مارے حیرت کے سکتے میں آگیا تھا اور اس کی یہ بے یقینی تاحال برقرار تھی۔

وہ جتنی بار نظر اٹھا کر اس کے بے سدھ وجود کی طرف دیکھتا' اتنی ہی بار نئے سرے سے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتا۔ اس وقت بھی اس کے کانوں میں ڈاکٹر کی آواز گونج رہی تھی۔ جب انہوں نے پہلے پہل پوری بات اس کے گوش گزار کی تھی۔

"انہیں یہاں ایک خاتون لے کر آئی تھیں۔ یہ انہیں آج صبح اپنے گھر کی پچھلی گلی میں موجود کچرے کے ڈرمز کے درمیان کوڑے کے ڈھیر پر انتہائی زخمی حالت میں ملے تھے۔ ان کا کافی سے زیادہ خون بہہ چکا تھا۔ اس لیے ان کی حالت خاصی نازک تھی۔ ہم نے انہیں ٹریٹمنٹ دینے کے بعد ان کے کپڑوں کی تلاش لی تھی۔ تب ہمیں ان کی جیب سے ایک واحد وزٹنگ کارڈ ملا تھا جس پہ "مارک اینڈ سیم" پرائیویٹ لمیٹڈ لکھا ہوا تھا۔ ان کے بازو پہ چونکہ سیم نام کا ایک ٹیٹو (TATOO) موجود تھا اس لیے ہم سمجھ گئے تھے کہ یہ کارڈ ان ہی کے آفس کا ہے۔ اس کارڈ پر لکھے نمبر سے ہی ہم نے آپ سے رابطہ کیا تھا اور صد شکر کہ آپ ہمیں وقت پر مل گئے۔ ورنہ تو یہ کیس مزید الجھ جاتا۔" اور آنکھیں پھاڑے بیٹھے مارک کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ اس تفصیل نے حقیقتاً" اس کی بولتی

کی صلاحیت سلب کرلی تھی۔

"ہم نے رولز کے مطابق ان کے بارے میں پولیس کو انفارم کردیا ہے۔ وہ یہاں کچھ ہی دیر میں پہنچنے والی ہے۔" ڈاکٹر کی اگلی اطلاع پہ وہ بامشکل تمام اپنے سر کو اثبات میں ہلا پایا تھا۔

"کیا آپ جانتے ہیں مسٹر مارک! کہ یہ اس علاقے میں کیا کرنے گئے تھے؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد ڈاکٹر نے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ تو اس کا سر میکانکی انداز میں نفی میں ہل گیا۔

"مجھے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔" اس کی بات پہ ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔

"اس کا مطلب ہے کہ اصل صورت حال ان کے ہوش میں آنے کے بعد ہی واضح ہوگی۔" انہوں نے پر سوچ لہجے میں کہا تو اس کے شل ہوتے ذہن میں سیم کی حالت کا احساس جاگا۔

"یہ کب تک ہوش میں آجائے گا ڈاکٹر؟"

"یہ کچھ کہہ نہیں سکتے۔ بلیڈنگ کی زیادتی کی وجہ سے اگلے چوبیس گھنٹے خاصے کریٹیکل (Critical) ہیں۔"

"کوئی اندرونی چوٹیں تو نہیں ہیں نا؟" اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

"سر کے پچھلے حصے میں خاصی گہری چوٹ آئی ہے، لیکن اسکیننگ کے ذریعے پتا چلا ہے کہ کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ زخم تو کافی ہیں، لیکن شکر ہے کہ اور کوئی سیریس انجری نہیں ہوئی۔" ڈاکٹر کی بات پہ اس کے دل کو تھوڑی تسلی ہوئی۔

"ان کا سیل فون، والٹ، ڈرائیونگ لائسنس؟"

"کچھ بھی ان کے پاس نہیں تھا۔" ڈاکٹر نے رسان سے جواب دیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا، ان کا شکریہ ادا کرکے کمرے سے نکل آیا۔ جوزفین کو اس کے آفس میں فون کرکے مطلع کرنے کے بعد اس نے آنے والے پولیس آفیسرز کو اپنا بیان دیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد لاتعداد سوچوں کا ایک سلسلہ تھا جس نے اس کے ذہن کو پراگندہ کردیا تھا۔

ان میں سب سے عجیب اور تلخ احساس اس کا کچرے کے ڈھیر پہ پایا جانا تھا۔ یہ سب کیسے ہوا تھا؟ کس نے کیا تھا؟ اور سب سے بڑی بات وہ کل رات اس علاقے میں کیا کر رہا تھا؟ یہ وہ سوالات تھے جنہوں نے اس کے اندر اودھم مچا رکھا تھا مگر فی الوقت اس کے پاس سوائے صبر اور انتظار کے دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

منگنی کی تقریب کو زیب بیگم اور صغیر صاحب نے محدود پیمانے تک رکھنے کی کافی کوشش کی تھی، مگر نہ نہ کرنے کے باوجود سب ہی لوازمات اکٹھے ہوتے چلے گئے تھے۔ نتیجتاً بدھ کی شام تک "قاضی ولا" میں رنگ و نور کی بھرپور تقریب منعقد ہوگئی تھی۔ جسے دیکھ دیکھ کر جائشہ کا موڈ مزید خراب ہوگیا تھا۔ وہ صبح سے کتنی بار حنان سے رابطے کی کوشش کرچکی تھی مگر نجانے ایسی کون سی مصروفیت تھی کہ وہ اس کا فون تک نہیں اٹھا رہا تھا۔

جائشہ کی فرمائش پہ اسے مرا اور لوبیہ نے پارلر کے بجائے گھر پر ہی تیار کیا تھا۔ وہ دھیا گلابی کامدانی سوٹ میں وہ کھلی کھلی سی بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی تیاری سے فراغت پاکے مرا اپنے کپڑے اٹھائے واش روم میں گھس گئی تھی۔

شاور لینے کے بعد اس نے اپنے اسٹیپ میں کٹے چمکدار بالوں کو بلو ڈرائی کرکے کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مناسب میک اپ اور نازک سی ڈائمنڈ جیولری پہننے کے بعد وہ شیفون کے رل آف وائٹ اور رائل گولڈن سوٹ میں نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔

مہمانوں کی آمد کے ساتھ ہر طرف پھیلی رونق میں اضافہ ہوگیا تھا۔ منگنی کی رسم کی ادائیگی کے لیے جائشہ کو لا کے اس کے ہونے والے منگیتر کے پہلو میں بٹھایا گیا تو محفل کو گویا چار چاند لگ گئے۔ رسم کی ادائیگی کے بعد تصویروں کا سلسلہ چل نکلا جس کے بعد مہمانوں کے لیے ارینج کیا گیا ڈنر لگا دیا گیا تھا۔

زیب بیگم کی ہدایت پہ مرہ اور نورہ جانشہ کو اندر لے گئی تھیں۔ جس اس کی فرینڈز اور خاندان کی دوسری لڑکیوں نے ڈیرہ جما لیا تھا۔ اندر باہر ہر طرف مسکراہٹوں اور خوش گپیوں کا سلسلہ تھا۔ مرہ بھی جانشہ کی دونوں نندوں کے ساتھ لان میں کھڑی باتوں میں مصروف تھی جب انجم اور زیب اس کے پاس چلی آئیں۔ انہیں آتا دیکھ کر مرہ دونوں لڑکیوں سے معذرت کرتی ماں اور خالہ کی جانب بڑھی۔

"بیٹا! تم ایسا کرو اندر جاؤ۔ اور نجیب سے کہہ کر میرے کمرے میں رکھے مہمانوں کے تحفے باہر لے آؤ۔" زیب بیگم کی بات پہ وہ اثبات میں سر ہلاتی اندر چل دی۔

نجیب (ملازم) سے سارے تحائف اٹھوانے کے بعد وہ اسے ساتھ لیے واپس لان میں پلٹی تو وہاں خوش گوار سی ہلچل دیکھ کے ایک پل کو الجھ سی گئی، لیکن جوں ہی اس کی نظر جانشہ کے سسرالیوں سے پرتپاک انداز میں ملتے حنان سے ٹکرائی اس کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا اور قدم غیرارادی طور پہ ساکت ہو گئے۔ وہ یوں بن بتائے پہنچ جائے گا اس بات کا کسی کو اندازہ نہ تھا۔

"بی بی جی! یہ کہاں رکھوں؟" اسے اپنی جگہ پہ جما دیکھ کے چیزیں اٹھائے کھڑے نجیب نے آہستگی سے سوال کیا تو وہ خود کو سنبھالتی، سامنے لگے صوفوں کے درمیان میں رکھی میز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"وہاں رکھ دو۔ اور امی کو بتا دینا۔" اپنی بات مکمل کرکے وہ ایک لمحے کا توقف کیے بنا پلٹ کر تیز قدموں سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

وہ اس شخص کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسی لیے جانشہ کے کمرے میں جانے کے بجائے سیدھا نورہ کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کرکے وہ غصے میں لب بھینچے بیڈ پہ آکے گر سی گئی تھی۔

یہ شخص اس کی زندگی کا وہ سیاہ باب تھا، جسے وہ چاہ کر بھی اپنی زندگی کی کتاب سے پھاڑ کر الگ نہیں کر سکی تھی۔ اس شخص نے رشتوں پہ اعتبار کے لائق نہ چھوڑا تھا۔

وہ اس پل ہمیشہ کی طرح خود کو بہت بے بس اور کمزور محسوس کر رہی تھی۔ جس کے پاس کوئی راہ فرار نہ تھی۔ ذہن تھا کہ الجھتا چلا جا رہا تھا۔ تب ہی باہر سے حنان کے ہنسنے اور نورہ اور جانشہ کی حیرت سے بھرپور خوش گوار چہکاریں سنائی دی تھیں۔ "یقیناً" وہ اندر جانشہ کے کمرے میں آ رکا تھا اور بھائی کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کے دونوں خوشی سے کھل اٹھی تھیں۔

باہر مچے ہنگامے نے اس کے اندر دکھ کی نئی لہر پیدا کر دی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے، جس کی نظروں سے خود کو چھپانے کے لیے وہ اس کمرے کی تنہائی میں آ بیٹھی تھی یا پھر ہر مرد ہی دوہرے معیار کا قائل ہوتا ہے۔ اپنی بہنوں، بیٹیوں کے لیے کچھ اور۔ اور دوسروں کی عزتوں کے لیے کچھ اور۔

موبائل کی اچانک بیل نے اس کی تلخ سوچوں کو بکھیر دیا تھا۔ گہری سانس لیتے ہوئے اس نے پرس میں رکھا فون نکالا۔ جس کی اسکرین پہ انجم بیگم کا نام دیکھ کے اس کے لبوں پہ زخم خوردہ مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔ گنتی کے چند ناموں کے سوا بھلا اس کی فکر کرنے والا تھا ہی کون؟

"کہاں ہو تم مرہ؟ میں اور زیب کب سے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔" اس کی "جی مما" کے جواب میں وہ پریشانی سے بولیں تو وہ دھیرے سے گویا ہوئی۔

"میں اندر نورہ کے کمرے میں ہوں۔"

"وہاں اکیلی کیا کر رہی ہو بیٹا۔ باہر آکے سب کے درمیان بیٹھو۔" ان کے رسان سے کہنے پہ وہ چڑ سی گئی۔

"پلیز مما جان! میں اس فضول شخص کی نظروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔" اس کی بات پہ انجم لمحے بھر کو خاموش ہو گئیں۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ وہ لازماً "پہنچے گا۔"" جھنجلاہٹ نے اسے غصے میں مبتلا کر دیا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں زیب سے کہتی ہوں کہ وہ تمہیں ڈرائیور کے ساتھ گھر بھجوا دے۔"

وہ لمحے بھر کے توقف کے بعد بولیں حالانکہ وہ چاہتی تھیں کہ مہر باہر آئے اور بالکل نارمل فنکشن اٹینڈ کرے، مگر بہرکیف وہ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتی تھیں۔

"زینی سے کہیے گا کہ وہ پورچ میں میرا انتظار کرے۔ میں دس، پندرہ منٹ تک باہر آتی ہوں۔"

اس نے ایک نظر دروازے کی جانب دیکھا۔

"ٹھیک ہے، لیکن نکلنے سے پہلے مجھے کال کر دینا۔"

"جی۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے پونے دس ہونے کو تھے۔ فون بند کر کے وہ دروازے کی جانب چلی آئی، جس کی دوسری طرف سے اب بھی چہنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تقریباً" دس منٹ بعد باہر سے آتے شور میں کمی واقع ہوئی تو مہر نے آہستگی سے دروازہ کھولتے ہوئے احتیاط سے باہر جھانکا اور راہداری خالی دیکھ کے بے اختیار اطمینان بھری سانس لیتی باہر نکل آئی۔

اپنے پیچھے دروازہ بند کرتی وہ تیز قدموں سے داخلی دروازے کے بجائے راہداری کے دوسرے سرے پر موجود دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ جو گھر کے عقبی لان میں کھلتا تھا۔ وہاں سے وہ باآسانی کسی کی نظروں میں آئے بنا گھوم کر پورچ تک پہنچ سکتی تھی۔ محتاط انداز میں دروازہ کھول کے اس نے باہر نکل کر انجم بیگم کو کال ملائی۔

"مما! میں جا رہی ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تمہارے پاپا سے میں نے کہہ دیا ہے کہ تمہارے سر میں شدید درد ہے۔ اس لیے زیب تمہیں ڈرائیور کے ساتھ گھر بھجوا رہی ہے۔"

ان کے سمجھانے پہ مہر نے ہنکارا بھرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اپنوں کے درمیان سے یوں چوری چھپے نکلنا اس کے اندر پژمردگی کے ساتھ غم و غصے کی شدید لہر پیدا کر گیا تھا۔ اسے خود پہ، اپنی بے بسی پہ اور سب سے بڑھ کے ان حالات تک پہنچانے والے پہ بے انتہا غصہ آ رہا تھا۔ لب بھینچے وہ اپنے دھیان میں آگے بڑھ رہی تھی لیکن جوں ہی اس کی نظر سامنے کو اٹھی تھی اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

اس کے مقابل عمارت کی دوسری جانب سے بلیک تو پیس میں ملبوس حنان، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اسی کی طرف آ رہا تھا۔

"جانتا تھا کہ مجھے اچانک سامنے پا کر تم یونہی فرار کی راہ اختیار کرو گی، لیکن جان حنان! تم ہمیشہ یہ بات بھول جاتی ہو کہ تمہارے معاملے میں، میں ایک تیسری آنکھ بھی رکھتا ہوں اور وہ آنکھ میں کبھی بند نہیں کرتا۔"

اس سے محض چند فٹ کے فاصلے پہ رکتے ہوئے وہ گمبھیر لہجے میں کہتا استہزائیہ انداز میں مسکرایا تو مہر کی ہتھیلیاں بھینچ گئیں۔ وہ اس سے اس درجہ چوکسی کی امید نہیں رکھتی تھی۔

"پھر کہو کیسا لگا میرا سرپرائز؟ آئی مین دونوں سرپرائز؟" اس کے اڑے اڑے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ حظ اٹھاتے ہوئے بولا۔ مہر نے کڑی نظروں سے اس کے تیور دیکھے اور بنا کوئی جواب دیے پلٹ کر واپس اندر جاتے دروازے کی جانب بڑھی ہی تھی کہ اس کی کلائی حنان کی مضبوط گرفت میں آ گئی۔

"ہاتھ چھوڑو میرا!" اشتعال سے پلٹتے ہوئے اس نے غصے سے حنان کی طرف دیکھا۔

"تمہیں معلوم ہے! تمہاری یہ ضد، یہ گریز، میری محبت کو اور بھی ہوا دیتا ہے۔ اتنی ہوا کہ مجھے تم سے ہی نفرت ہونے لگتی ہے۔ دل چاہتا ہے تمہیں توڑ موڑ کے وہاں پھینک دوں۔ جہاں سے تمہارا خیال تک واپس نہ آئے۔" لبوں پہ یہ زہرخند مسکراہٹ اور آنکھوں میں عجیب سی برودت لیے اس نے مہر کی کلائی پہ اچانک اتنا دباؤ بڑھایا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔

"حنان!"

"کیوں، درد ہوا جان حنان؟" اس کے چہرے سے جھلکتی تکلیف کو دیکھتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔

اور پھر اپنی گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے بے اختیار اس کا سرخ پڑتا ہاتھ لبوں سے لگا لیا۔
"تمسنت۔ بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" اس کی یہ حرکت اتنی اچانک اور اتنی غیر متوقع تھی کہ مہر کا پورا وجود سناٹے میں آگیا لیکن فقط لمحے بھر کے لیے۔
اگلے ہی پل اس کے اندر گویا وحشت سی بھر گئی۔ اس کا دایاں ہاتھ گھوما مگر اس سے پہلے کہ حنان کے چہرے پر اپنا نشان چھوڑتا اس نے ہوا میں ہی مہر کا ہاتھ روک لیا۔

"اوں ہوں۔ یہ غلطی کبھی مت کرنا۔ ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔" سرد لہجے میں کہتے ہوئے اس نے جھٹکے کے انداز میں اس کے دونوں ہاتھ چھوڑے تو وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتی تیزی سے پیچھے ہٹی۔

"حنان قاضی! اپنے اندر کی غلاظت کو اپنی ذات تک محدود رکھو۔"

"الفاظ وہ بولو جن کی چبھن کو بعد میں برداشت کر سکو۔ کیونکہ میں اپنی توہین کرنے والوں کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کیا کرتا۔" اس کی بات پہ مہر کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"توہین ان کی ہوا کرتی ہے جن کی کوئی عزت ہو۔ اپنے گھر میں نقب لگانے والے بے ایمان کو تو کوئی لٹیرا بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔"

"کیا شعلہ بیانی ہے۔ بہت خوب!" اس نے بھنویں اچکاتے ہوئے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔

"لگتا ہے خاصی اسٹڈی کی گئی ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا تم اور تمہاری یہ دونوں زمینیں تمہیں اگر چاہیں بھی تو تمہیں مجھ سے چھین نہیں سکتیں۔"

"تم نے مجھے بابا جی سے کس دن لیا تھا؟" مہر نے تمسخرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دوبدو جواب دیا۔ تو حنان ایک پل کو واقعی لاجواب ہو گیا۔ اس کے چہرے پہ پھیلی ناگواری مہر کو اندر تک پرسکون کر گئی۔

"حنان صاحب! حقیقت آپ کے نہ ماننے سے بدل نہیں جائے گی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میری زندگی میں کسی حنان قاضی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے عقل مندی اسی میں ہے کہ آپ اپنی ہار تسلیم کر لیں اور میرے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹ جائیں۔"

"حقیقت تو تمہارے نہ ماننے سے بھی نہیں بدلے گی جانِ حنان۔ کیونکہ ایک حقیقت تو یہ بھی ہے کہ بے نشان لوگوں کو اتنے بڑے بڑے دعوے زیب نہیں دیتے!" اتنی کاری ضرب پہ مہر کا سارا خون چہرے سمٹ آیا تھا۔ "اس لیے عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ خود کو خوش گمانی کی اس تصوراتی دنیا سے باہر نکال کر ہمیشہ کے لیے میرا ہاتھ تھام لو!" کٹ دار مسکراہٹ لبوں پہ سجائے اس نے اپنا ہاتھ مہر کی جانب پھیلایا۔ اس کا ایک ایک لفظ مہر کے اندر چنگاریاں سی بھر گیا۔

"یہ ہاتھ تھامنے سے بہتر ہے کہ میں تاعمر یوں ہی بے نشان کھڑی رہوں۔ کیونکہ تم میری زندگی کا وہ ناسور ہو حنان قاضی۔ جس نے میرا رشتوں پہ سے اعتبار ہی ختم کر دیا۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں شدید نفرت!" اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر اندر جاتے دروازے کی جانب بڑھی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کے قدم دہلیز پار کرتے حنان کی سرد آواز نے لحظہ بھر کو اس کی رفتار دھیمی کر دی تھی۔

"نفرت کا یہ اظہار تمہیں بہت مہنگا پڑے گا مس بی بی! اب دیکھنا میں تمہاری ہر خوش فہمی کی کیسے دھجیاں اڑاتا ہوں۔" اور مہر کا دل اس کی بات پہ تیزی سے ڈوب کر ابھرا تھا۔

مگر وہ بنا رکے دروازہ کھول کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

تاریک انجان گلیوں میں اندھا دھند بھاگتے ہوئے اس نے خوف زدہ نظروں سے پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔ اور ان خوفناک بھوکے کتوں کو اپنے پیچھے پوری رفتار سے آتا دیکھ کے اس کا سارا وجود کانپ اٹھا تھا۔ ایک جھٹکے سے رخ موڑتے ہوئے اس نے وحشت زدہ

نظروں سے اردگرد موجود بند دروازوں اور کھڑکیوں کو تکتے ہوئے چلا کر مدد کی استدعا کی تھی۔ لیکن اس کی صدا ان ویران گلیوں میں گونج کر واپس لوٹ آئی تھی۔
اس کی ٹانگیں بھاگ بھاگ کر شل ہونے لگی تھیں۔ بے تحاشا پھولتی سانس اور جلتا حلق اس کی برداشت کو آخری حد پہ لے آیا تھا۔ اس کی رفتار کم ہونے لگی تھی۔ رال ٹپکاتے غراتے ہوئے کتے قریب آنے لگے تھے۔ تب ہی اچانک سامنے ایک دروازہ نمودار ہوا تھا۔ جو اس کی مدد کے لیے کھول دیا گیا تھا۔

کھلا دروازہ دیکھ کے اس کے پست ہوتے وجود میں نئی جان پڑ گئی تھی۔ وہ دیوانہ وار اپنی پہلی اور شاید آخری پناہ گاہ کی جانب بھاگنے لگا تھا۔ اس کے قدموں نے دہلیز کو چھو لیا تھا۔ لیکن۔ اندر جانے کے بجائے وہ وہیں ساکت ہو گیا تھا۔ اگلے ہی پل وہ مڑا تھا اور اس نے دوسری جانب دوڑ لگا دی تھی۔ کھلا دروازہ کھلا ہی رہ گیا تھا۔

تاریکی بڑھنے لگی تھی۔ اچانک اس کا پاؤں کسی خاردار چیز میں الجھا تھا۔ اور وہ منہ کے بل کچرے کے ڈھیر میں جا گرا تھا۔ تیز بدبو اس کے ناک اور منہ میں گھسنے لگی تھی۔ اس کے روم روم پہ کتے قابض ہونے لگے تھے۔ درد، اذیت اور کراہیت سے وہ چلا اٹھا تھا۔

"بچاؤ!"

اٹھارہ گھنٹے سے بے سدھ پڑے سیم کی آنکھیں ایک جھٹکے سے کھل گئی تھیں۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ جبکہ ہونٹ بالکل سوکھے پڑے تھے۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے بے قراری سے اپنے سر کو جنبش دینا چاہی تھی۔ لیکن اس کوشش میں بے اختیار کراہ اس کے لبوں سے نکل گئی تھی۔

اس کی آواز پہ اپنے کام میں مصروف نرس نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ اور اسے ہوش میں دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے قریب چلی آئی تھی۔

"مجھے۔ مجھے نکالو یہاں سے۔ یہاں۔ یہاں بہت بدبو ہے۔" ہر طرح کی پہچان سے عاری، خالی نظریں اس کے چہرے پر جمائے وہ نحیف مگر خوف زدہ آواز میں بولا تو نرس نے تسلی آمیز انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ریلیکس مسٹر سیم۔"

"یہ غلاظت مجھے گندا کر رہی ہے۔ وہ دیکھو۔ وہ کتے مجھے نوچ کھائیں گے۔ ہم۔ مجھے۔ مجھے یہاں سے نکالو۔ بچاؤ! بچاؤ!" وہ اچانک بے قابو ہو کے زور زور سے چلانے لگا۔

اس کے ہسٹریائی انداز نے نرس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے اس نے سرعت سے آگے بڑھ کے ایمرجنسی بیل کا بٹن دبا دیا۔ چند ہی سیکنڈ میں ڈیوٹی پہ موجود ڈاکٹرز مع اسٹاف کے وہاں بھاگے چلے آئے تھے۔ اس کی بگڑتی حالت کے پیش نظر ڈاکٹرز نے اسے سکون آور انجکشن لگا دیا تھا۔ جس کے زیر اثر وہ تھوڑی ہی دیر میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اعصاب شکن تھکن مہر کے اندر اتر آئی تھی۔ وہ چپ چاپ آ کے گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ انجم اور زیب اس تمام واقعے سے لاعلم تھیں، سو اس نے انہیں لاعلم رکھنے کا ہی فیصلہ کیا تھا۔ کیا فائدہ تھا انہیں بھی اپنے ساتھ جلانے کا۔

گاڑی کی خاموش فضا میں اس کے بے آواز آنسو قطرہ قطرہ بہتے رہے تھے۔ لیکن اپنے کمرے کی چار دیواری میں پہنچ کر اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

حنان نے کچھ بھی تو غلط نہیں کہا تھا۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے سے بھلا حقیقت تھوڑی بدل جاتی ہے۔ اور وہ گزشتہ کئی سالوں سے یہی تو کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ ایسا کرتے ہوئے دنیا کی نظر میں وہ کتنی احمق، کتنی قابل رحم لگ رہی تھی۔ مگر وہ پھر بھی ایسا کر رہی تھی۔ زیب کے لیے۔ مما جان کے لیے۔ پاپا کے لیے۔ اور شاید اپنے لیے بھی۔ کہ اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

لیکن جان کے منہ سے یہ سچائی اس کے دل و دماغ پہ کوڑے کی طرح برسی تھی۔ کیونکہ یہ وہ شخص تھا جس کے سامنے وہ اپنا بھرم ہر حال میں قائم رکھنا چاہتی تھی۔ پھر چاہے ساری دنیا کتنی باتیں کیوں نہ بنا لیتی۔
لیکن یہ ایک شخص کبھی نہیں!

صابن سے اپنا ہاتھ مل مل کے دھوتے ہوئے اس کی آنکھوں سے نہ تو آنسو رک رہے تھے اور نہ ہی ہاتھ کی پشت پہ سے ان لبوں کا احساس مٹ رہا تھا۔ آنسو، پانی، جھاگ تینوں چیزیں اکٹھی سنک میں بہ رہی تھیں۔ ہاتھ کی جلد سرخ ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی بے قراری کو چین نہیں آ رہا تھا۔ اور آتا بھی کیونکر۔ اسے کوئی ایک نقصان نہیں بلکہ کئی نقصان مل کر رلا رہے تھے۔ وہ نقصان جن کا مجموعہ بن کر سارا خسارہ صرف اس کے حصے میں آیا تھا۔ اور وہ اس خسارے کو برداشت کرتے کرتے اب نڈھال ہو گئی تھی۔

اپنے تھکے ہوئے وجود کو گھسیٹتی وہ بیڈ پہ آ کے گر گئی تھی۔ اس کا دل شدت سے اس پل ان تمام اذیتوں سے فرار کا خواہش مند تھا۔ مگر چونکہ اسے بہلانے کا کوئی سامان اس کے پاس نہ تھا۔ اس لیے وہ ابراہیم صاحب کے کمرے سے جا کر نیند کی ایک گولی لے آئی تھی۔

پانی کے ساتھ اس گولی کو نگلتے ہوئے اسے مراحمہ کے اس انجام پہ بے اختیار رونا آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا آپ یقین سے کہہ رہے ہیں مسٹر سیم کہ یہی سب کچھ ہوا تھا؟" آفیسر نے اس کا بیان قلم بند کرنے کے بعد بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔ جو تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا۔

"جی۔" وہ بنا کسی تاثر کے دھیمے سے بولا تو آفیسر نے اس کے پاس کھڑے مارک کو دیکھتے ہوئے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی۔

"اس صورت میں تو کسی کے خلاف کوئی پرچہ نہیں بنتا۔" اور مارک جو اتنی دیر سے سیم کی کہانی سن رہا تھا، بے اختیار اپنا غصہ دبا کر رہ گیا۔ وہ ایک سو ایک فیصد جانتا تھا کہ سیم غلط بیانی کر رہا ہے۔

"آپ کی گاڑی انشورڈ تھی؟" پولیس آفیسر نے ایک بار پھر سیم کی جانب دیکھا۔

"جی۔"

"چلیں پھر۔ خدا آپ کو جلد صحت یاب کرے۔"
وہ اسے وش کرتا کمرے سے باہر نکل گیا مارک جیسے پھٹ پڑا۔

"تم نے آفیسر سے جھوٹ کیوں بولا۔"

"میری مرضی۔" اس کی طرف دیکھے بنا جواب دیا۔ مارک کا دماغ گھوم گیا۔

"سیم! مجھے مزید پاگل مت کرو۔ تم نہیں جانتے! میں نے یہ دو دن کس ذہنی اذیت میں مبتلا رہ کر تمہارے ہوش و حواس بحال ہو جانے کا انتظار کیا ہے۔"

"جانتا ہوں۔"

"تو پھر تم بتاتے کیوں نہیں کہ تم اس رات اس علاقے میں کیا کر رہے تھے؟" وہ جھنجلا کر بولا تو سیم کے وجود سے تعفن کا وہ کربناک احساس پھر سے لپٹنے لگا۔

بے اختیار مٹھیاں بھینچے اس نے اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

"پلیز مارک! مجھے پریشان مت کرو!" اور مارک اسے بے بس نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ تب ہی موبائل کی بیل نے اس کا دھیان اپنی جانب کھینچ لیا۔ اسکرین پہ جوزفین کا نام دیکھ کے اس نے فون کان سے لگا لیا۔

"سنا تم نے اس شخص کا کارنامہ۔ آفیسر کو بیان دیا ہے کہ میں ایک پرانے دوست کو ڈھونڈنے اس علاقے میں گیا تھا۔ جب اس گلی میں، مجھے کچھ غنڈوں نے گھیر لیا اور مار پیٹ کرنے کے بعد میری قیمتی چیزیں چھین لیں۔" اس کی "ہیلو" کے جواب میں وہ کھولتے لہجے میں بولا تو آنکھیں موندے سیم نے بے اختیار اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔ وہ اسے کیسے بتاتا

کہ یہ ذکر اس کے لیے کتنی ذہنی اذیت کا باعث بن رہا تھا۔

"کیا فضول بات کر رہی ہو۔ کیا میں نہیں جانتا کہ اس کے کتنے دوست اس کلاس سے بی لانگ کرتے ہیں؟ ویسے بھی میرے پوچھنے پہ بتا چکا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔" اس نے ایک تیز نگاہ سامنے لیٹے سیم پہ ڈالی۔

"آپ کو کیا معلوم ایسا کیوں کر رہا ہے' میں تو خود پریشان ہو کر رہ گیا ہوں۔" وہ لحظہ بھر کو رک کر جوزفین کی بات سننے کے بعد گویا ہوا۔

"اچھا یاد آیا۔ تم سیم کے لیے گیسٹ روم تیار کر دینا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ کل چیک اپ کے بعد۔"

"کل یا پرسوں۔ میں تمہاری طرف نہیں جاؤں گا۔" وہ آنکھیں بند کیے اس کی بات کاٹ کر بولا۔ تو مارک نے غصے سے اس کی جانب دیکھا۔

"تو کہاں جاؤ گے؟"

"اپنے گھر۔"

"بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ وہاں کون تمہارا خیال رکھے گا؟" مارک نے اب کے اپنے غصے کو ایک طرف رکھتے ہوئے تحمل سے کام لیا۔

"میں کر لوں گا مینیج۔ تم جانتے ہو' مجھے کسی کی پرسنل لائف ڈسٹرب کرنا پسند نہیں۔" اب کے وہ آنکھوں پر سے بازو ہٹاتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے کی قطعیت 'مارک کو اک گہری سانس لینے پہ مجبور کر گئی۔

"وہ نہیں مان رہا۔ تم ایسا کرنا آفس سے واپسی پہ سیم کے گھر کی ایکسٹرا چابی گھر جا کے اٹھا لینا اور وہاں جا کے گروسری وغیرہ چیک کر لینا۔" اس نے جوزفین سے کہتے ہوئے پرسوچ نظروں سے سیم کو دیکھا اور ایک آدھ مزید بات کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

"تم جانتے ہو! تم ضدی اور من مانی کرنے والے تو پہلے ہی تھے' لیکن اس ایکسیڈنٹ کے بعد سے تو تمہارا رویہ بہت عجیب ہو گیا ہے۔" اس پر نظریں جمائے وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا سیم کے سرہانے آکھڑا ہوا تو وہ اک بوجھل سانس لیتا چونک گیا۔

"کیا بات ہے سیم' سب ٹھیک تو ہے نا؟" اس کی خاموشی مارک کو تشویش میں مبتلا کر گئی تھی۔ یہ خاموشی اس کی آزاد' شوخ و شنگ اور سیمابی طبیعت کے بالکل برعکس تھی۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ سب ٹھیک ہے یا نہیں۔" وہ دل گرفتی سے فقط اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ اپنے اندر اتر آنے والے خوف کو فی الوقت زبان دینے کا اس میں حوصلہ نہ تھا۔

"کیا مطلب؟" مارک نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا۔

"کوئی مطلب نہیں۔ میں خود نہیں جانتا' مجھے کیا ہو رہا ہے۔" دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے پھر سے آنکھوں پہ بازو رکھ لیے۔ اس کے ناقابل فہم انداز نے مارک کو پریشان کر دیا۔ وہ کتنے ہی پل اسے الجھی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے ڈاکٹر سے ڈسکس کرنے کے ارادے سے باہر نکل گیا۔

اس کی غیر موجودگی کے احساس پہ سیم نے آہستگی سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بجھی بجھی سی خالی نگاہیں بے تاثر انداز میں سامنے دیوار پہ جا ٹھہری تھیں۔ سفید' سپید سی اور سپاٹ دیوار۔ نجانے کیوں اس کمرے اور اس بستر پہ آ کے زندگی یک لخت ساکت ہو گئی تھی۔ یوں جیسے وہ کسی "رولر کوسٹر" سے اچانک نیچے اتر آیا ہو' جو اسے لیے اوپر' نیچے' دائیں بائیں بھاگی چلی جا رہی تھی۔ تیز اور تیز بہت تیز!

اور اب جو یہ شور مچاتا غوطے کھاتا سفر ایک جھٹکے سے رکا تھا تو وہ خود بھی بھونچکا سا رہ گیا تھا۔ واہموں اور اندیشوں میں گھرا ایک دم اکیلا۔ حالانکہ اس کی زندگی کا محور و مرکز تو ہمیشہ سے صرف اس کی اپنی ذات ہی رہی تھی۔ پھر ایسے میں اس زندگی میں یکایک یہ تنہائی کا احساس کہاں سے اتر آیا تھا۔ وہ حیران تھا۔ بہت حیران۔

وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا جس کی پیدائش

نے بڑے بھرپور انداز میں پرورش کی تھی اور یہ اس کے نزدیک ان کا کوئی احسان نہ تھا' اس کا باپ ایک دولت مند انسان تھا سو اگر انہوں نے اسے زندگی کی ہر آسائش مہیا کی بھی تو کوئی انوکھا کام نہیں کیا تھا۔ رہا ان کا پیار و محبت تو وہ بھی ایک فطری امر تھا جس کے بدلے میں اس نے بھی انہیں چاہا تھا۔ پھر بھلا وہ اب اور کیا کرتے؟ کیا اس کی اپنی کوئی زندگی' کوئی خواہشات نہ تھیں؟

وہ آگے بڑھا تھا اور اپنی ترجیحات کے مطابق آگے بڑھا تھا۔ دولت کو اس نے اپنی زندگی میں اولین ترجیح پہ رکھا تھا جس کی طاقت اور اہمیت سے وہ ہمیشہ بہ خوبی واقف رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ امریکا جیسے ملک میں جو طرز زندگی وہ گزار رہا ہے' وہ فقط اس کے باپ کی جانب سے ملنے والی دولت کے بل پہ ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اس نے اپنے دوست مارک کے ساتھ مل کر اپنی ذاتی فرم بنائی تھی جس نے اس پر کامیابی کے نئے دروازے کھول دیے تھے۔ اپنی ذات کے حوالے سے اس کے فیصلے ہمیشہ جوش کے بجائے ہوش پر مبنی رہے تھے۔ اس نے رشتے ناتوں کو کبھی بھی اپنی کمزوری نہیں بننے دیا تھا۔

نتیجتاً" وہ آج اپنی مرضی کی ایک کامیاب اور بھرپور زندگی گزار رہا تھا۔

لیکن اس حادثے نے یکایک اس کی اس کامیاب اور بھرپور زندگی پر سوالیہ نشان کھڑا کر دیا تھا۔ اسے اس خوف سے دوچار کر دیا تھا جس کے بارے میں اس نے آج تک سوچا ہی نہ تھا۔

اس رات کچرے کے ڈھیر پہ صرف وہ ہی نہیں بلکہ خود سے جڑی اس کی بہت سی خوش فہمیاں بھی ڈھیر ہوئی تھیں۔ لوگوں کی ہر طرح کی گندگی نے جب اس کے تن کو بستر کی طرح چھوا تھا اور اس چبھتی ہوئی نہایت تیز بدبو نے جب اس کی ناک اور منہ میں راستہ بنایا تھا۔ تب اسے حقیقی معنوں میں اپنی اوقات اور اپنی طاقت کا احساس ہوا تھا۔ وہ کیا تھا اور حالات اسے محض منٹوں میں بے بسی کی کس انتہا پر پہنچا سکتے تھے یہ اسے اس روز پتا چلا تھا۔ اس خوف نے ہوش میں آنے کے بعد اس کے اندر پنجے گاڑ دیے تھے۔ اسے زندگی میں پہلی بار وقت اور حالات سے ڈر لگا تھا۔ اپنی موت سے ڈر لگا تھا۔

وہ مخمل کے بستر پہ پیدا ہوا تھا' لیکن اسی مخمل کے بستر پہ مرتا' یہ ضروری نہیں تھا۔

اس روز اگر اسے اس کچرے کے ڈھیر پہ موت آجاتی یا پھر اس کا بے ہوش وجود ہی چوہوں اور آوارہ کتوں کی خوراک بن جاتا تو کیا ہوتا اس کا؟

کیا وہ اگلی صبح ایک کٹی پھٹی لاوارث لاش کی صورت لوگوں کو ملتا۔ جس سے وہ خوف کھاتے پولیس کے حوالے کر دیتے؟ کیا اس نے اپنا ایسا ہی بھیانک انجام تصور کیا تھا؟ یقیناً" نہیں۔

لیکن خود مختاری اور آزادی کی جس زندگی کا وہ پروردہ تھا۔ اس کا ایک نہ ایک دن اور کہیں نہ کہیں ایسا ہی تنہا اور گمنام خاتمہ ہونا تھا اور یہ ایک طے شدہ بات تھی' مگر اسے اس سفاک حقیقت کا احساس زخمی حالت میں اس بستر پر پہنچنے کے بعد ہوا تھا اور اس جان لیوا احساس نے اس کے اندر سے سود و زیاں کے ہر حساب کو ختم کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس وجہ کو بھی فراموش کر گیا تھا جو اس حادثے کا سبب بنی تھی۔ اس رات وہ وہاں کیسے پہنچا تھا اور اس کے ساتھ کیا ہوا تھا ہر بات' ہر چیز بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

اس کی زندگی کی ترجیحات نے یکایک جیسے پلٹا کھایا تھا۔ امارت' اسٹائل' دوست' عورت اس فہرست میں کہیں نیچے چلی گئی تھیں۔ اور ان سب پہ حاوی ہو گیا تھا فقط ایک موت کا احساس۔ موت جو اپنے شکار کو مہلت نہیں دیتی۔ موت جس کا ذائقہ سب نے چکھنا ہے۔

☆ ☆ ☆

"تم نے مجھے پایا ہی کس دن تھا؟ تم میری زندگی کا ناسور ہو۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں' شدید نفرت!" آئینے کے سامنے کھڑے حنان نے پرفیوم

اسپرے کرکے جوں ہی وہ ڈائننگ ٹیبل پہ پہنچی تھی۔

"ٹھیک ہے سر صاحب! آج اس آنکھ مچولی کا بھی اختتام کرتے ہیں۔" اس نے ایک آخری نظر خود پہ ڈالی اور مطمئن سا کمرے سے نکل کر نیچے ڈائننگ روم کی طرف چلا آیا تھا۔ جہاں اس وقت سب ہی گھر والے ناشتا کرنے میں مصروف تھے۔

"السلام علیکم!" سب کو سلام کرتا وہ باپ کے بائیں جانب اپنی مخصوص کرسی کی طرف بڑھا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو بیٹا؟" صغیر صاحب نے اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے بیٹے کو دیکھا۔

"فائن۔ وزیدی' میں کل ڈیل فائنل کرکے آیا تھا۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ سرپرائز کے چکر میں، میں کام کسی اور کے ذمے چھوڑ آیا ہوں۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا تو صغیر صاحب مسکرا دیے۔

"تمہیں مجھ سے بہت سے گلے سہی' لیکن تمہارے پروفیشنل ازم پر میں نے کبھی شک نہیں کیا۔"

"چلیں شکر ہے۔ آپ کو میری کوئی ادا تو بھائی۔" اس نے سلائس پلیٹ میں رکھا۔

"اوں ہوں۔ صبح صبح کوئی تلخ بات نہیں۔" نوریہ نے نرمی سے ٹوکتے ہوئے بھائی کے لیے پلیٹ میں انڈہ نکالا۔

"کل مہر نظر نہیں آئی مجھے۔ کیا اس نے فنکشن اٹینڈ نہیں کیا؟" اس نے ایک نظر چائے بناتی زیب بیگم پہ ڈالتے ہوئے نوریہ کی جانب دیکھا۔ اس کے منہ سے مہر کا نام سن کے حسب توقع زیب کا چہرہ تن گیا۔ جسے حنان نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے خاصا حظ اٹھایا تھا۔

"نہیں ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟ جاشی کو' آپی اور میں نے ہی مل کر تیار کیا تھا۔" نوریہ کے جواب پر اس نے چونکنے کا تاثر دیا۔

"اچھا! تو پھر وہ مجھے نظر کیوں نہیں آئی؟"

"اس کے سر میں درد تھا۔ اس لیے وہ جلدی چلی گئی تھی۔" جواب نوریہ کے بجائے زیب بیگم کی طرف سے آیا تو حنان کی سرد نگاہیں ان کی پرتپش نگاہوں سے جا ٹکرائیں۔

"جلدی چلی گئی تھی یا بھیج دی گئی تھی؟" اس کے استہزائیہ انداز نے زیب بیگم کو اندر ہی اندر خائف کر دیا۔

"کیا مطلب؟" انہوں نے ایک اچٹتی نظر صغیر صاحب پہ ڈالی۔ حنان انہیں کوئی جواب دیے بنا باپ کی جانب رخ پھیر گیا۔

"پتا نہیں آپ لوگوں نے محسوس کیا ہے یا نہیں' لیکن مجھے لگتا ہے انجم آنٹی کو مہر کا یہاں زیادہ آنا پسند نہیں۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟" صغیر صاحب نے الجھ کر بیوی کی جانب دیکھا۔ جو خود بھی حنان کی اس بات سے پریشان ہو گئی تھیں۔ جائشہ اور نوریہ بھی ہاتھ روکے بھائی کی طرف متوجہ تھیں۔

"ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ان فیکٹ مجھے تو مہر بھی ڈپریشن کا شکار لگنے لگی ہے۔" وہ اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے بولا تو صغیر صاحب پریشان ہو گئے۔

"ہو سکتا ہے بیٹا! آخر وہ بھی تو انسان ہی ہے۔"

"تو آپ لوگ اس مسئلے کو حل کیوں نہیں کرتے؟" اور زیب سے لمحے میں بھانپ گئیں کہ وہ کس ارادے کے تحت یہ ساری گفتگو کر رہا تھا۔

اگر صغیر قاضی اور دونوں بچیاں وہاں موجود نہ ہوتیں تو وہ اس لڑکے کا دماغ ٹھکانے لگا دیتیں۔ اندر ہی اندر کھولتے ہوئے انہوں نے فوراً" سے پیشتر مداخلت ضروری سمجھی تھی۔

"وہ اپنے مسئلے خود حل کر سکتے ہیں۔"

"آپ شاید بھول رہی ہیں' یہ ہمارا بھی مسئلہ ہے۔ رہے انجم آنٹی اور ابراہیم انکل تو ان لوگوں کی نیت اگر حل کرنے کی ہوتی تو بہت پہلے اس معاملے کو حل کر چکے ہوتے۔" حنان نے پلٹ کر جتایا تو زیب نا چاہتے ہوئے بھی خاموش ہو گئیں۔ ان کی خاموشی پہ حنان کی آنکھوں میں کلش زاری چمک بھر گئی۔ جسے

زیب بیگم کے سوا وہاں بیٹھا کوئی بھی شخص محسوس نہیں کرسکا تھا۔ سارے ضبط کے ان کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہوگئے تھے۔

"ویسے اگر دیکھا جائے زیبی! تو حسان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں اب اس بارے میں تپا اور بھائی جان سے بات کرنا چاہیے۔" اور باپ کی بات پہ حسان کا دل چاہا تھا کہ وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑے۔ اس کی تمسخر اڑاتی نظریں بے اختیار زیب بیگم کی جانب اٹھی تھیں۔ جنہیں انہوں نے کمال حوصلے سے نظر انداز کردیا تھا۔

"کوئی فائدہ نہیں صغیر صاحب! امر اس معاملے میں کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔"

"وہ بچی ہے زیبی اور ابھی اتنی دور اندیش نہیں ہوئی کہ اس کے فیصلوں کو ہم حتمی مان کر خاموش بیٹھے رہیں۔" وہ قدرے خفگی سے گویا ہوئے تو زیب گہری سانس لیتے ہوئے بولیں۔

"چلیں ٹھیک ہے۔ نہیں مانتے اس کی بات لیکن آپ نے سوچا ہے اس زور زبردستی کا کیا نتیجہ نکلے گا؟"

"جو بھی نکلے گا موجودہ صورت حال سے تو بہتر ہی ہوگا۔" انہوں نے چائے کی پیالی اپنی جانب سرکائی۔

"ہم تپا کو انفارم کردیتے کہ کل ہم ان کی طرف چکر لگائیں گے اس کے علاوہ کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ جو بھی بات ہوگی روبرو ہوگی۔" ان کے حتمی لہجے پہ زیب بیگم نے پریشان نظروں سے شوہر کی جانب دیکھا تھا۔

جبکہ حسان کا دل اپنی اس فتح پہ اندر تک سرشار ہوگیا تھا۔ بات نے بہت جلدی اور بہت آسانی سے اس کی مرضی کا رخ لے لیا تھا اس نے ایک فاتحانہ نگاہ زیب بیگم کے مضطرب چہرے پر ڈالی اور لبوں پہ در آنے والی کٹ دار مسکراہٹ کا گلا گھونٹنے کو چائے کا کپ اٹھا کے لبوں سے لگا لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر نے سیم کی ذہنی حالت کو اس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے سے منسوب کرتے ہوئے ذہنی دباؤ کا نتیجہ قرار دیا تھا جو اس کے بقول رفتہ رفتہ ہی زائل ہوتا۔ ڈاکٹر کی بات سے مارک کو خاصا اطمینان ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر مزید اسپتال میں ٹھہرنے کے بعد آفس چلا آیا تھا۔

سیم کی غیر موجودگی کے باعث کام کا سارا بوجھ اس پر آپڑا تھا۔ وہ ان ڈھائی تین دنوں میں اسپتال اور دفتر کے درمیان حقیقتاً "گھن چکر" بن کے رہ گیا تھا' لیکن اس کے باوجود اس کے ماتھے پہ شکن تک نہ آئی تھی۔ وجہ اس کی حد سے زیادہ پر خلوص اور نرم طبیعت تھی۔ وہ خود سے جڑے سب ہی لوگوں کا جن میں اس کے دوست بھی شامل تھے خیال رکھنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا تھا۔

اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے مغرب کے سرد سینے میں مشرقی اقدار نے پر حدت الاؤ روشن کردیا ہے۔

اس کی اس درجہ جذباتی طبیعت کا سیم اکثر مذاق اڑایا کرتا تھا' لیکن وہ برا مانے بغیر مسکرا دیا کرتا تھا۔ ابھی بھی وہ کام کرتے ہوئے مسلسل اسی نقطے پہ سوچ رہا تھا کہ کیا اسے اس حادثے کے بارے میں سیم کے والدین کو آگاہ کرنا چاہیے یا نہیں' جب اس کے سیل پہ آنے والی جوزفین کی کال نے اس کا دھیان بٹا دیا تھا۔

"ہاں جوزی! کہو۔"

"مسٹر مکمل! تم جلدی سے سیم کے گھر پہنچو۔ یہاں بہت گڑبڑ ہوگئی ہے۔" جوزفین کی گھبرائی ہوئی آواز نے مارک کو پریشان کردیا تھا۔

"کیسی گڑبڑ؟" اس نے متفکر لہجے میں سوال کیا۔

"مارک! یہاں۔ یہاں چوری ہوگئی ہے۔"

"کیا؟" وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تپا! میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اب کیا ہوگا۔ اگر بھائی جان نے بھی صغیر صاحب کی تائید کی تو ہم کیا کریں گے؟" روتی ہوئی زیب نے بے اختیار اپنا سر تھام لیا۔

صغیر قاضی اور حنان کی دفتر روانگی کے بعد زیب پالی بلند پرشر کا بیلنہ کیے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ اندر آنے کے بعد انہوں نے ملازمہ سے کارڈلیس منگوا کر بسن کو فون ملایا تھا اور صغیر صاحب کے پیغام سے لے کر پوری بات ان کے گوش گزار کردی تھی۔

"مگر نہیں۔ وہ یہی کریں گے۔ میں جانتی ہوں۔" انجم دل گرفتہ لہجے میں بولیں تو زیب بیگم رونا بھول گئیں۔

"ہائے آپا! اب پھر ہم کیا کریں؟" ان کی پریشانی سوا ہوگئی تھی۔ انجم نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔

"کرنا کیا ہے۔ ہم مکمل طور پر بے بس ہیں زیبی! سچ پوچھو تو میرے پاس صغیر کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں۔"

"تو پھر کل کیا ہوگا؟" ان کے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔

"اللہ جانے۔" بوجھل انداز میں کہتی وہ پل بھر کو رکیں۔

"ویسے زیبی! اگر دیکھا جائے تو اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا ہی پڑے گا۔ ہم کب تک آنکھوں پر پٹی باندھے 'حقیقت' کو نظر انداز کرتے رہیں گے۔" انہوں نے انتہائی حوصلے سے بہن کو سمجھایا۔

"آپ کا کیا خیال ہے کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ مہر کی ہر تکلیف کا خاتمہ ہو جائے؟" انہوں نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے۔

"لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ بھی تو سوچیں۔"

"ہونا کیا ہے۔ اگر حنان' مہر سے اتنی ہی محبت کا دعوے دار ہے تو ٹھیک ہے' اسے بھی آزما لیتے ہیں۔" وہ دھیرے سے بولیں تو زیب تلخی سے مسکرادیں۔

"یہ محبت نہیں صرف ضد ہے۔ زیر کرنے کی ہوس ہے اور آپ یہ بات اچھی طرح سے جانتی ہیں۔ برسوں کے آزمائے ہوئے کو بھلا کیا آزمانا آپا۔ اور مہر' آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ اس کے لیے مان جائے گی؟ وہ تو اس کے سائے تک سے دور بھاگتی ہے۔ وہ کبھی بھی حنان کے لیے راضی نہیں ہوگی۔" ان کی بات پر انجم

بیگم کو حنان اپنے دل و دماغ میں اترتی محسوس ہوئی۔

"زندگی اس قدر تلخ کیسے ہوگئی؟ کیسے اتنی شفقت بھری ہوجائے گی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ زیبی! نجانے اللہ نے ہم دونوں بہنوں کی قسمت میں اولاد کا سکھ کیوں نہیں لکھا؟" ان کے دل گرفتہ لہجے پر زیب بیگم کی آنکھیں نئے سرے سے بھر آئیں۔

"میں اگر حنان کے آج کے عمل دخل اور کوشش کو ایک طرف رکھ دوں۔ تب بھی صغیر نے ایک نہ ایک دن تو یہ سوال اٹھانے ہی ہیں پھر کیوں نہ ابھی سہی۔ تم آنے والے دیکھتے ہیں کل ابراہیم کیا جواب دیتے ہیں۔"

"اور مہر؟" زیب کو فکر لاحق ہوئی۔

"اسے میں فی الوقت پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ بات تو ویسے بھی ہم چاروں کے درمیان ہی ہونی ہے۔"

"لیکن میں آج حنان سے ضرور بات کروں گی۔" زیب کے تصور میں اس کا سرشار چہرہ اور حقارت بھری نظریں گھومیں تو ان کا غصہ پھر سے تازہ ہوگیا۔

"کیا فائدہ۔ کیوں اپنا خون جلاتی ہو۔" انجم بیگم نے سمجھانا چاہا۔

"نہیں آپا۔ آج جو اس لڑکے نے کیا ہے اس کے بعد مجھے ہر حال میں اس سے بات کرنی ہے۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" ان کے قطعی لہجے پر وہ فقط اتنا ہی کہہ پائی تھیں۔

✿ ✿ ✿

سیم کے بیڈ روم میں' مدرک کنگ سائز دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی بے خبری پہ خود کو کوسے یا سیم کے راز داری برتنے پر اس سے سوال کرے۔

دھیرے سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے بے بسی سے ایک بار پھر سائیڈ ٹیبل پر رکھے فوٹو فریم کی طرف دیکھا اور اس کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہوگئے تھے۔

جونہی ان کی کال سننے کے بعد وہ ادھر ادھر دھند کا تکی

وڑا سیم کے اپارٹمنٹ پہنچا تھا۔ طرح طرح کے دل بے اور وسوسے سارا راستہ اسے پریشان کرتے رہے تھے۔ یہ سب آخر ہو کیا رہا تھا؟

جوزی یاسے پریشانی کے عالم میں اپارٹمنٹ کے باہر ہی ٹہلتی نظر آئی مارک کو دیکھ کر وہ بے اختیار اس کی جانب لپکی تھی۔ جوزفین کا ہاتھ تھامے وہ گھر کے اندر چلا آیا تھا۔ اس کی توقع کے برعکس اندر کسی قسم کی کوئی بے ترتیبی نہ تھی بلکہ پہلی نظر میں کہیں کسی گڑبڑ کے آثار نہ تھے مگر جوزفین کے بتانے پر اسے بہت سی قیمتی چیزیں اپنی جگہ سے غائب نظر آنے لگی تھیں۔

کام واقعی نہایت اطمینان اور طریقے سے کیا گیا تھا۔ یوں جیسے آنے والے کو سیم کی اچانک آمد کا کوئی دھڑکا نہ ہو۔ تو کیا چور یہ جانتا تھا کہ سیم زخمی ہے یا زخمی حالت میں اسپتال میں پڑا ہے؟ اور کیا یہ ممکن تھا کہ سیم کے ساتھ ہونے والے حادثے اور گھر میں ہونے والی چوری کے پیچھے ایک ہی شخصیت ملوث تھی؟ اس خیال نے مارک کو چونکا دیا تھا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ وہ سیم کے بیڈ روم کی جانب بھاگا تھا تاکہ اس کی الماری میں موجود لاکر کو چیک کرسکے نا سمجھی کے عالم میں جوزفین بھی اس کے پیچھے لپکی تھی۔ ڈریسنگ روم میں موجود دیوار گیر الماری کھول کر اس نے لاکر کو چھوا تھا اور وہاں آٹو جنک کوڈ والا سسٹم دیکھ کے اس نے بے اختیار اطمینان بھری گہری سانس لی تھی۔

"شکر ہے یہ تو محفوظ رہا۔" جوزفین نے بھی شکر کا کلمہ ادا کیا۔ مارک اب ایک ایک کر کے باقی خانے اور دراز کھول کے دیکھ رہا تھا۔

"اب ان میں سے کیا کچھ غائب ہے یہ تو سیم ہی بتا سکتا ہے۔" جوزفین نے کہتے ہوئے آگے بڑھ کر الماری کا آخری پٹ کھولا۔

"اف۔ یہ کس کے کپڑے ہیں؟" ترتیب سے لٹکے لیڈیز ڈریسز کو دیکھتے ہوئے وہ ایک پل کے لیے ٹھٹک گئی۔ اس کی بات پہ مارک سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس کے پیچھے آکھڑا ہوا اور غور سے سامنے لٹکے کپڑوں کو دیکھنے لگا۔

"کیا پتا سوزی کے ہوں۔" اس نے خیال آرائی کی۔

"سوزی کے؟ اور اتنے سستے سے کپڑے۔" جوزفین نے پلٹ کر اسے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کے ایک شرٹ کی آستین اونچی کرتے ہوئے مارک کو دکھائی۔

"تو پھر یہ کس کے ہوسکتے ہیں؟" مارک کی آنکھوں میں الجھن در آئی۔ اس نے جوزفین کو ایک طرف کیا اور آگے بڑھ کے اندر موجود دیگر خانوں کو کھنگالنے لگا مگر سوائے ایک ٹوٹے ہوئے پرس اور دو جوڑی سستے سے استعمال شدہ جوتوں کے وہاں اور کچھ نہ تھا۔ اس دوران جوزفین اندر بیڈ روم میں جاچکی تھی۔

"مارک! جلدی ادھر آؤ!" چند لمحوں بعد اسے جوزی کی پکار سنائی دی تو وہ تیزی سے کمرے کی جانب پلٹا جہاں جوزفین سائیڈ ٹیبل کے پاس ہاتھ میں فوٹو فریم لیے کھڑی تھی۔

"یہ سیم کے ساتھ کون ہے؟" اور مارک نے آگے بڑھ کے فریم اس کے ہاتھ سے لے لیا جس میں ایک مسکراتا ہوا گندمی چہرہ سیاہ چمکتے بالوں کے درمیان سیم کے شانے سے ٹکا ہوا تھا۔ اس چہرے کو دیکھتے ہوئے مارک کی آنکھیں بے اختیاری کے عالم میں پھیل گئی تھیں اور اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

"یہ... یہ تو..."

☆ ☆ ☆

"ہائے! بیوٹی فل۔" سامنے موجود چہرے کو خمار آلود نگاہوں سے تکتے ہوئے وہ اس کی جانب جھکا تو اس کے برابر کھڑے مارک نے بے اختیار اس کا بازو تھام لیا۔

"سیم!" اس کی تنبیہی پکار پہ گلاس ہاتھ میں تھامے کھڑے سیم نے بدمزگی سے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا سیم؟ دیکھ نہیں رہے ہمارے سامنے کیسی حسین خاتون کھڑی ہیں۔" اور اس کی اس برملا تعریف

یہ جملہ سنتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ سوزی میں مارک ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے کھڑی لڑکی کو جانے کے لیے کہا۔ تو وہ مسکراہٹ دباتی وہاں سے ہٹ گئی۔

"تم بھی نا کتنے بدذوق آدمی ہو۔ آج تو جوزی بھی تمہارے ساتھ نہیں۔" سیم نے ایک بڑے سے گھونٹ میں گلاس ختم کرتے ہوئے پاس سے گزرتے ویٹر کو تھمایا۔

"مارٹینی۔" اس کے نئے آرڈر پہ مارک نے بے اختیار اسے گھورا۔

"تم غالباً" اس پارٹی کے میزبان ہو۔" مارک نے جتایا۔

"تو؟"

"تو یہ کہ کچھ تو حواس قائم رہنے دو۔" اور مارک کے یوں جل کر کہنے پہ وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔

"جیسے مہمان ویسا میزبان۔ یہ میری فریڈم پارٹی ہے اور میں یہاں پوری آزادی سے انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ صرف انجوائے!" وہ اپنی بات کر کے ایک طرف بنائے گئے اسپیشل ڈانس فلور کی جانب تھرکتا ہوا بڑھ گیا۔ تو مارک اس کی بے پروائی پہ بے اختیار مسکرا دیا۔

آج یہاں شہر کے بہترین ہوٹل میں سیم نے اپنی اور سوزی کی طلاق کی خوشی میں اپنے تمام دوستوں کو بہت بڑی پارٹی دی تھی۔

ڈھائی سال قبل ان دونوں کے متعلق کبھی کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ محض تیس ماہ بعد ان کی اس طوفانی محبت کا اختتام اس نقطے پر آ کے ہوگا۔

سوزی سیم کے دل کو اور سیم سوزی کے دل کو ایسا اور اس حد تک بھایا تھا کہ دونوں نے اپنی فیملیز کے خلاف جا کے ایک دوسرے سے شادی کر لی تھی۔ شادی کے بعد دونوں نے بڑے بھرپور محبت بھرے انداز میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ لیکن پھر پھر وہی ہوا تھا جو اس سرد معاشرے میں ہوتا آیا ہے۔ رفتہ رفتہ ان کی محبت اپنی رعنائی کھونے لگی تھی۔ دونوں کا دل ایک دوسرے سے بھرنے لگا تھا اور دونوں نے ہی اپنی دلچسپیوں سے نئے سامان ڈھونڈ لیے تھے یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے جان چھڑانے کے شدت سے خواہش مند ہو گئے تھے۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ طلاق کی صورت میں سیم کو ملک کے قوانین کے مطابق اپنی ساری جائیداد سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ جو اسے کسی طور منظور نہ تھا۔ رات دن کی سوچ بچار اور وکیل کے مشورے سے سیم کو ایک حل سوجھ ہی گیا۔ اس نے نہایت ہوشیاری سے اور مارک کے بھروسے پر غیر قانونی ڈاکیومنٹس بنوا کر عدالت میں خود کو مارک کا مقروض ظاہر کر دیا۔ یوں سوزی کے ہاتھ سوائے آزادی کے پروانے کے اور کچھ نہ آیا اور سیم اپنی دوہری کامیابی کے نشے میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کی زندگی سے سوزی نام کی پریشانی بغیر کسی نقصان کے دور ہو گئی تھی۔ اسے فی الوقت اور کیا چاہیے تھا؟

اپنی اسی کامیابی کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے اس نے اپنے دوستوں کی فرمائش پہ آج شہر کے مشہور ہوٹل میں پول سائیڈ پر بہترین پرائیویٹ پارٹی ارینج کروائی تھی۔ جہاں مہمانوں کی تفریح کے لیے شراب اور شباب دونوں کی کمی نہ تھی۔ نتیجتاً اس وقت ہوٹل کے پول ایریا میں رونق اپنے عروج پر تھی۔ شگفتہ میوزک اور جلتی بجھتی لائٹوں کے درمیان کئی جوڑے ایک طرف بنائے گئے خاص ڈانس فلور پہ محو رقص تھے۔ جوزفین چونکہ شہر سے باہر اپنی بہن سے ملنے گئی ہوئی تھی اس لیے وہ سیم کی اس پارٹی میں شریک نہ ہو سکی تھی۔

سیم اپنے کہے کے مطابق ڈانس فلور پہ پوری آزادی سے انجوائے کر رہا تھا۔ اس کی حرکتوں نے جلد ہی مارک کو بھی اس کے ساتھ شامل ہونے پر مجبور کر دیا۔ سب ہی بڑے بھرپور انداز میں کھانے پینے اور خاص طور پر بلوائی گئی ڈانسرز میں مگن تھے۔ ایسے میں ان کے چند دوستوں کو نئی شرارت سوجھی تو انہوں نے مارک کو اٹھا کر پول میں پھینک دیا۔ اس کے بعد تو جیسے وہاں نیا تماشا شروع ہو گیا۔ ایک کے بعد ایک سب ہی پول میں غوطے کھانے لگے۔

پاگلوں کی طرح ہنستا" سیم اپنی پارٹی بھلا کے ڈگمگاتے قدموں سے ہال سے باہر آیا تو ایک نازک سی لڑکی پاس سے آ ٹکرائی۔

"دیکھ کے ڈارلنگ۔" اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے سیم نے نظریں اٹھائیں اور بے اختیار چونک گیا۔

"ارے تم تو بڑی خوب صورت خاتون ہو۔" تیکھے نقوش سے سجے گندمی چہرے پر نظریں جمائے وہ مسکرا کر بولا۔ تو وہ بھی مسکراتی ہوئی سنبھل کر پیچھے ہٹی۔

"جی میں جانتی ہوں مسٹر سیم۔" اور سیم اس کے غیر ملکی لہجے میں اپنا نام سن کے چونک گیا۔

"تم میرا نام کیسے جانتی ہو؟"

"کیونکہ آپ اس پارٹی کے میزبان ہیں اور میں یہاں آپ کی اور آپ کے مہمانوں کی خدمت پر مامور ہوں۔" اس کی بات پر پہلی بار سیم کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹ کر اس کے جسم پر سجے ویٹرس کے یونیفارم پر جا ٹھہریں۔ لیکن محض لمحہ بھر کو۔ اگلے ہی پل وہ دوبارہ اس کے پرکشش چہرے کی جانب لوٹ آئیں۔

"تمہیں کس بے وقوف نے ویٹرس بنایا ہے؟" آنکھوں میں ستائش لیے وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس کے سفید موتیوں کے سے دانت اور چہرے پر پھیلی چمک نے سامنے کھڑے سیم کو مبہوت سا کر دیا۔ وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں ایک ٹک اسے دیکھے گیا تو اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس کے گمبھیر لہجے پر مقابل کے گالوں پر ہلکی سی سرخی اتر آئی۔

"لورین۔"

"لورین فرام۔۔؟" وہ جان گیا تھا کہ وہ امریکن نہ تھی۔

"فرام اسپین۔"

"تو کیا لورین فرام اسپین کیا تم میرے ساتھ ڈانس کرو گی؟" شوخ نظروں سے اسے تکتے ہوئے سیم نے مسکرا کر اس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

"مگر میں یہاں ڈیوٹی پر۔۔"

"تمہاری یہاں ڈیوٹی صرف میری بات ماننا ہے۔ سو بتاؤ، میرے ساتھ ڈانس کرو گی؟" اس کی بات کاٹتے ہوئے سیم نے اپنا سوال دہرایا تو لورین کے پاس مزید انکار کی کوئی وجہ نہ رہی۔ اس نے جھجکتے ہوئے سیم کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جسے اس نے دھیرے سے لبوں سے لگا کر لورین کے چہرے کو سرخ ہونے پر مجبور کر دیا۔

وہ اسے اپنے ساتھ لیے ڈانسنگ فلور پہ چلا آیا اور سب کی حیرت بھری نظروں کی پروا کیے بنا اس کے ساتھ ڈانس کرنے لگا۔ یہاں تک کہ رات دھیرے دھیرے ڈھلنے لگی مگر سیم کی بانہوں نے اسے خود سے دور نہ جانے دیا اور جب صبح کے وقت پارٹی اپنے اختتام کو پہنچی تو وہ مدہوش سا لورین کو ساتھ لگائے اپنی شان دار گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس وقت پارکنگ میں موجود اس کے سب ہی دوست یہ بات بہ خوبی جانتے تھے کہ دونوں کی منزل فی الوقت ایک ہی ہے۔

☆ ☆ ☆

"مارک، تم صحیح کہتے ہو۔ وہ یہاں شفٹ ہو چکی ہے۔ پورے گھر میں اس کی چیزیں موجود ہیں۔" لاؤنج سے آتی جوزفین کی آواز نے مارک کو ایک گہری سانس لینے پر مجبور کر دیا۔

اس نے سائیڈ ٹیبل پہ دھرے فوٹو فریم پر سے نظریں ہٹائیں اور بیڈ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سیم کی اس رازداری نے حقیقتاً اسے دھچکا پہنچایا تھا۔ جب سے ان دونوں کی دوستی اعتبار کی ایک خاص منزل کو پہنچی تھی انہوں نے کبھی بھی ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ پھر اس معاملے میں سیم نے ایسا کیوں کیا تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر ہونے کے ساتھ ساتھ دل میں دکھی اور جوزفین کے سامنے عجیب سی شرمندگی بھی محسوس کر رہا تھا حالانکہ ساری تفصیل

سننے کے بعد اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی مگر پھر بھی نسیم کی اس حرکت نے اسے اندر ہی اندر مغموم کر دیا تھا۔

"صرف چیزیں ہی موجود ہیں۔ وہ محترمہ یہاں سے بھی شفٹ ہو چکی ہیں۔" مارک باہر آیا تو اندر کی تلخی نا چاہتے ہوئے بھی لہجے میں اتر آئی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" جوزفین نے حیرت سے غصے میں بھرے شوہر کا چہرہ دیکھا۔

"حد ہے۔ تمہیں وہ یہاں کہیں یا نسیم کے ارد گرد نظر آ رہی ہے؟"

"لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس چوری میں اسی کا ہاتھ ہے۔"

"صرف اس چوری میں نہیں بلکہ نسیم کے ساتھ ہونے والے حادثے میں بھی اس کا ہاتھ ہے۔" مارک یقین سے بولا تو جوزفین کی آنکھوں میں موجود حیرت دوچند ہو گئی۔

"اگر ایسی بات ہوتی مارک، تو بھلا نسیم اس لڑکی کو بخشتا؟ وہ تو ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے اس کے خلاف رپورٹ لکھواتا۔" جوزفین کی بات پہ مارک ایک پل کو خاموش ہو گیا۔

"تو پھر وہ کہاں ہے؟" اس نے نیا سوال اٹھایا۔

"اب یہ تو نسیم ہی بتا سکتا ہے۔" جوزی نے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی۔

"اور نسیم صاحب منہ سے کچھ پھوٹنے کو تیار نہیں۔" مارے اشتعال کے مارک نے پاس پڑی کرسی کو ٹھوکر لگائی۔

"میں پولیس کو کال کر رہا ہوں۔ میں اس سارے گورکھ دھندے سے تنگ آ چکا ہوں۔" جوزفین کو دیکھتے ہوئے اس نے غصے سے جیب سے سیل نکالا۔

"بہتر ہو گا اگر تم یہ کام نہ کرو۔" جوزفین کے رسان سے کہنے پر اس کا ہاتھ ساکت ہو گیا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ ہمارا کام صرف نسیم کو جا کے مطلع کرنا ہے۔ آگے پولیس کو کال کرنا یا نہ کرنا اس کا ذاتی فیصلہ ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں اسے سمجھایا تو مارک نے ایک گہری سانس لی۔ جوزفین ٹھیک کہہ رہی تھی۔

معاملے کو پولیس تک پہنچانا واقعی ایک بڑا فیصلہ تھا جسے کرنے کا حق صرف نسیم کو تھا ویسے بھی جس حد تک رازداری وہ اس سے برت چکا تھا اس کے بعد تو پتا نہیں نسیم کو اس کی اس درجہ مداخلت پسند آتی بھی یا نہیں؟

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمیں سیدھا نسیم کے پاس جانا چاہیے۔" اس نے قدرے پرسکون آواز میں کہا تو جوزی نے اطمینان کی سانس لی اور پھر اپنا پرس اٹھائے اس کے ساتھ باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی جب حنان کی گھر میں آمد ہوئی۔ پورچ میں اس کی گاڑی رکنے کی آواز پر اپنے کمرے میں اس کی منتظر زینب بیگم نے ایک نظر سوئے ہوئے منیر صاحب پر ڈالی اور آہستگی سے اٹھ کر باہر چلی آئیں۔ انہوں نے آج سارا دن جس اعصاب شکن کیفیت میں گزارا تھا وہ اس پل سوا ہو گئی تھی۔

تیز قدموں سے چلتی وہ سیڑھیاں اتر کر لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں کہ سامنے موجود داخلی دروازہ کھلا اور حنان نے اسی دھیان میں اندر قدم رکھا تھا لیکن جوں ہی اس کی نظر زینب بیگم پر پڑی تھی اس کی بھنویں استہزائیہ انداز میں اوپر اٹھ گئی تھیں اور لبوں پہ بڑی دل جلانے والی مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔ اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے لاک لگایا اور اطمینان سے چلتا ان کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

"السلام علیکم!" جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ پرسکون انداز میں بولا تو زینب کا ضبط جواب دے گیا۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ تم یہ تماشا کر کے اپنا مقصد

بلوگے؟ میرے صبر کو اتنا مت آزماؤ حنان! کہ میں تمہارے کردار کی اصلیت تمہارے باپ کے سامنے کھولنے پر مجبور ہو جاؤں۔" غصے سے سرخ آنکھیں اس پر جمائے وہ دھیمے لیکن سرد لہجے میں بولیں تو حنان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"آپ کے جو جی میں آئے وہ کریں' لیکن ایک بات یاد رکھیے گا' آپ کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتیں جبکہ میں ہر بات با آسانی آپ سے منسوب کر سکتا ہوں۔" اور اس کی بات پہ زیب بیگم کا دل دھک سے رہ گیا۔

"میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ تم اتنی گری ہوئی بات کر سکتے ہو۔" انہوں نے دکھ میں ڈوبی بے یقین نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا کریں۔ سنا ہے کہتے ہیں نا محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہے۔" اس نے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی۔

"مت بھولو حنان! کہ مارنے والے سے بچانے والی ذات ہمیشہ برتر رہی ہے' میں ابھی زندہ ہوں اور میری مرضی کے خلاف سر کیف کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"آپ اپنی مرضی کر چکیں۔ اب میری باری ہے۔ دیکھتا ہوں کون میری راہ کھوٹی کرتا ہے۔" ان کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ گویا ہوا۔

"اپنی راہ کھوٹی کرنے والے تم خود ہو۔ تمہارا گندہ کردار ہے۔ کل کو اگر حالات تمہاری مرضی کا رخ لے بھی لیتے ہیں تب بھی مہر کم از کم تمہارے حق میں فیصلہ دینے والی نہیں۔" انہوں نے ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر سچائی کا آئینہ اس کے سامنے رکھ دیا' لیکن وہ بجائے شرمندہ ہونے کے طنزیہ انداز میں مسکرا دیا۔

"یہ آپ کی بھول ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ اس لڑکی کو میری قسمت بنائیں' مگر آپ نے میری بات نہیں سنی۔ اب دیکھیں میں آپ لوگوں کی ہر خوش فہمی کا کیسے خاتمہ کرتا ہوں۔" اس کی بات اور انداز پہ زیب بیگم کا دل اذیت سے بھر گیا۔

"تم میری ہر خوش فہمی کا خاتمہ بہت پہلے کر چکے ہو حنان! کاش کہ تم میری آزمائش بننے کے بجائے میرا مان' میرا فخر بنے ہوتے تو شاید آج وقت کچھ اور ہوتا۔"

"ایسا مان اور فخر بننے سے بہتر ہے کہ میں آپ کی آزمائش بنا رہوں۔ مجھے ویسے بھی ناصحوں سے ہاتھ ملانے کی عادت نہیں۔" کاٹ دار لہجے میں وہ کہتا آگے بڑھ گیا تھا اور زیب اس کے وار کی تختی پہ اپنا نچلا لب دانتوں سے دبا گئی تھیں۔ ان کی آنکھیں نہ چاہتے ہوئے بھی بھر آئی تھیں۔

"یا اللہ مجھے حوصلہ دے۔ میری مدد فرما میرے مالک!" بہتے اشکوں کے درمیان وہ ہمیشہ کی طرح صرف اپنے رب کو ہی پکار پائی تھیں۔ اس لڑکے کی ہٹ دھرمی اور ان کی قسمت مزید کیا رنگ دکھانے والی تھی۔ ان کا دل یہ سوچ کر ہی ہولنے لگا تھا۔

* * *

رات کا ایک بڑا حصہ گزر چکا تھا' مگر نیند انجم بیگم کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ نہ سوچوں میں کوئی ربط تھا اور نہ دل و دماغ کو یکسوئی حاصل تھی۔ گزرے وقت کی تلخیوں کو یاد کر کے کبھی آنکھیں زار و قطار برسنے لگتی تھیں اور کبھی آنے والے وقت سے جڑے تمام خوف انہیں یوں منجمد کر ڈالتے کہ ان پر وحشت میں ڈوبے بنجر صحرا کا گمان ہونے لگتا۔

دراصل وہ آج تک اپنے فیصلے کے لیے خود کو مطمئن ہی نہیں کر پائی تھیں اور کرتیں بھی کیسے؟ اولاد کی ہر تکلیف آپ کو نئے سرے سے پچھتاوے کے چرکے لگاتی ہے یوں کہ آپ ساری زندگی کے لیے اپنی ہی نظروں میں مجرم بن جاتے ہیں۔

جرم کا ایسا ہی اذیت ناک احساس دن رات انجم بیگم کو بھی کھائے جا رہا تھا۔ ان کی ایک غلطی نے مہر کی زندگی کو ایسے امتحان سے دوچار کر دیا تھا جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

انہیں آج بھی اس دن کا ایک ایک لمحہ یاد تھا' جب اپنی محبت اور خلوص کے ہاتھوں مجبور ہو کے انہوں نے ایک ایسے کام کے لیے رضامندی دے دی تھی جو وہ جانتی تھیں کہ کتنا مناسب نہ تھا' لیکن یہ بھی ایک

حقیقت تھی کہ اگر آج بھی وقت انہیں اسی جگہ اور ان ہی حالات میں دوبارہ لے جاتا اور ان کے سامنے ان کی بیمار والدہ اپنی ایک بظاہر بے ضرر سی خواہش کا اظہار اسی مان سے کرتیں تو شاید وہ آج بھی ان کی خواہش کا احترام اسی طرح کرتیں جس طرح انہوں نے اس روز کیا تھا' جب اماں جان کا نرم و نحیف ہاتھ ان کے ہاتھ پہ آن ٹھہرا تھا۔

"انجم! میری ایک بات مانو گی؟"

"جی اماں۔" انہوں نے پاس بیٹھی ماں کی جانب محبت سے دیکھا تھا جو فقط چند ہی ماہ میں گھل کر آدھی ہو گئی تھیں۔ سچ ہے کہ اولاد کا غم اچھے اچھوں کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے جبکہ وہ تو پہلے ہی ایک ناتواں سی عورت تھیں جنہیں ان کے شریک سفر جوانی میں ہی دو کم سن بچیوں کے ساتھ' دنیا کے سرد و گرم جھیلنے کو تنہا چھوڑ گئے تھے کیونکہ ان کی وفات کے بعد اس وضع داری اور انسانیت کے دور میں ان کے مرحوم شوہر کے بہن بھائیوں نے ان کا اور ان کی بچیوں کا بھرپور طریقے سے خیال رکھا تھا' مگر جو مان اور جو بھروسا ایک شوہر اور ایک باپ کی موجودگی میں زندگی پر کیا جا سکتا ہے وہ حاجی صاحب کے ساتھ ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا' لیکن پھر بھی صد شکر تھا کہ ان کی زندگی بہت اچھے اور باوقار انداز میں گزری تھی۔

بڑے ہونے پر انجم کا رشتہ ان کے تایا نے اپنا کلوتے بیٹے ابراہیم کے لیے مانگ لیا تھا۔ یوں وہ بڑی خوشیوں اور دھوم دھام سے بیاہ کر اپنے تایا کے گھر چلی گئی تھیں۔ ابراہیم جو ویسے ہی اپنی چچی کا اپنی ماں کی طرح احترام کرتے تھے اور زیب کو اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح چاہتے تھے انہوں نے شادی کے بعد نفیسہ بیگم کی زندگی میں صحیح معنوں میں ایک بیٹے کی کمی پوری کر دی تھی۔ جس پہ وہ اپنے رب کی بے حد شکر گزار تھیں۔

زیب کے سمجھ دار ہونے پہ جب ان کے لیے ایک غیر خاندان سے رشتہ آیا تب ابراہیم صاحب نے ہی ہر طرح کی ضروری چھان بین کروا کے نفیسہ بیگم کو مطمئن کیا جس کے بعد زیب بھی رخصت ہو کے اپنے گھر چلی گئیں۔

بیٹیوں سے فراغت کے بعد اماں جان ابراہیم اور انجم کے بے حد اصرار کے باوجود ان کے گھر منتقل نہ ہوئیں' وہ ان نازک رشتوں کی اونچ نیچ سے بہ خوبی واقف تھیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنے ہی گھر میں اپنے پرانے اور قابل بھروسا ملازمین کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تھا اور تب اچانک حالات نے ایک ایسی کروٹ لی تھی کہ ان سب کی پرسکون زندگیوں میں ہلچل برپا ہو گئی تھی' وار اتنا کاری تھا کہ جن سے وہ خود کو سنبھال نہ پائے تھے' لیکن آخر کب تک؟ نہ چاہتے ہوئے بھی ان سب کو سنبھلنا پڑا تھا' مگر اماں جان کے ناتواں وجود میں گزری طاقت اور ہمت پھر لوٹ نہ پائی تھی۔

اس کڑی آزمائش نے انہیں توڑ کے رکھ دیا تھا اور وہ فقط چند ہی ماہ میں بستر سے آ لگی تھیں۔ سوچوں اور پریشانیوں نے ان کی صحت کو گھن کی طرح کھا لیا تھا۔ انجم اور ابراہیم ہر ممکن طریقے سے ان کی تسلی و تشفی میں لگے رہتے' لیکن درد میں ڈوبا ان کا دل کسی طور سنبھلنے میں نہ آتا تھا۔

پھر ایک روز ایک خیال نے اچانک ہی ان کا دامن تھام لیا جس کے فقط تصور سے ہی ان کی بے چین روح کو قرار سا آنے لگا۔ اس روز انہوں نے سیر ہو کے کھانا بھی کھایا اور زیب سے ڈھیر ساری باتیں بھی کیں اور جب شام میں انجم نے چکر لگایا تو ان کے اصرار پر وہ دونوں بیٹیوں کے سہارے اپنے کمرے سے نکل کر لان میں آ بیٹھی تھیں۔ اور تب انہوں نے اپنے دل کی بات کہنے کو بیٹی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"تم لوگ مجھے میرے نواسا نواسی کی خوشی میری زندگی میں ہی دکھا دو۔"

"میں سمجھی نہیں اماں؟" انجم نے الجھی نظروں سے ماں کا پرامید چہرہ دیکھا۔

"میں چاہتی ہوں' مہر اور ہنی کا نکاح ہو جائے۔"

اور ان کی بات پہ دونوں بہنیں چونک گئیں۔
"مگر اماں! یہ دونوں تو ابھی بچے ہیں۔" انجم حیرت سے مسکرائیں۔
"جانتی ہوں لیکن کیا کروں میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے بیٹا۔" وہ کرفتی سے پھیکی سی ہنسی ہنسیں تو دونوں کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبا لیا۔
"کیسی باتیں کررہی ہیں اماں! ابھی تو آپ کو بہت سا جینا ہے۔" زینب نے اماں کا بازو تھاما۔
"کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلینے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی زینب! میری حالت تم لوگوں کے سامنے ہے۔ تم بہنوں نے بچوں کے لیے جو فیصلہ کیا ہے اس نے مجھے جتنی خوشی دی ہے تم دونوں سوچ بھی نہیں سکتیں لیکن میں تمہارے اس فیصلے کو بھی پورا ہوتا دیکھ سکوں گی۔ یہ مجھے نہیں لگتا۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ تم دونوں مجھے خوشی کی یہ گھڑیاں ابھی دکھادو تاکہ میں اپنی ہر خلش کے ایک بڑے حصے سے نجات پاسکوں۔ ورنہ وقت تو ان شاء اللہ بعد میں بھی آئے گا۔ بس تمہاری ماں نہ دیکھ سکے گی۔" بات کرتے کرتے ان کی آواز بھر آئی تو بے اختیار ان کی بات سنتی انجم اور زینب کی آنکھیں چھلک گئیں۔
"آپ کی خواہش سر آنکھوں پر اماں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" سسکتے ہوئے انجم نے ماں کا ہاتھ لبوں سے لگالیا۔
"جیتی رہو۔ خوش رہو۔ اللہ تم دونوں کو تمہارے بچوں کی ڈھیروں خوشیاں دکھائے۔" انہوں نے جھک کر بیٹی کو چوما تھا۔
"ابراہیم کو صبح میرے پاس بھیج دینا میں اس سے خود بات کروں گی۔" ان کی بات پہ انجم نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔
"جاؤ زینب! اندر سے کچھ میٹھا لے کر آؤ۔ میں اور تمہاری سمدھن منہ میٹھا کریں گے۔" ان کے مسکراتے لہجے پہ دونوں کھل کر ہنس پڑی تھیں۔ ان کی ہنسی اس گھر کے در و دیوار نے بہت دنوں بعد سنی تھی۔

☆ ☆ ☆

اماں جان نے ابراہیم صاحب سے کیا کہا تھا پتا نہیں، لیکن وہ پورے دل و جان سے نکاح کی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔ خاندان میں اس خبر پہ ملے جلے تاثرات آئے تھے۔ ہاں جنہوں نے اعتراض کیا تھا انہیں ابراہیم صاحب نے خود جواب دے دیا تھا۔ یوں میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی کے مصداق، سب ہی بولنے والے خاموش ہوگئے تھے اور وہ دن بھی آگیا تھا جب دس سالہ عمر اور پانچ سالہ ہنی کو زرق برق کپڑے پہنا کر نانی کے دائیں بائیں لا بٹھایا گیا تھا اور پھر ان کی موجودگی میں ہی نکاح کی پوری کارروائی عمل میں آئی تھی۔
اس دوران سب ہی کی آنکھیں کتنی ہی بار اشک بار ہوئی تھیں اور کتنی ہی بار وہ سب ان دونوں کی شرارتوں اور معصوم سوالوں پر بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک یادگار دن تھا جس کے کئی یادگار لمحوں کو کیمرے نے محفوظ کیا تھا۔ اس دن کا اختتام ڈھیروں دعاؤں پر ہوا تھا۔
نفیسہ بیگم کی خوشی دیدنی تھی۔ ان کی صحت کی جانب سے سب ہی کو اب تسلی سی ہو چلی تھی لیکن ہونا وہی تھا جو انہوں نے کہا تھا۔ اس تقریب کے محض ڈیڑھ ہفتے بعد وہ اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔
ان کے انتقال نے انجم اور زینب کی دنیا اندھیر کردی تھی۔ انہیں اس بات کا بھرپور اطمینان تھا کہ انہوں نے اپنی ماں کی خواہش پوری کرکے انہیں خوش و خرم اس دنیا سے جانے کا موقع دیا تھا۔ مگر تب وہ نہیں جانتی تھیں کہ آنے والا وقت اپنے اندر کیسے کیسے طوفان سمیٹے ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔
ان کی زندگیوں کے پرسکون ساحل سے بھی یہ چھپے ہوئے طوفان بڑی زور سے آکر ٹکرائے تھے جس کے نتیجے میں ہر سو دکھ اور بے سکونی پھیل گئی تھی۔ ایسی الجھنوں نے ان سب کو گھیرا تھا کہ انہیں سلجھانے کی کوئی تدبیر نظر نہ آتی تھی۔ ایسے حالات

میں زندگی صرف آج تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ آنے والا کل اپنے اندر کیا راز سمیٹے ہوئے تھا کسی میں کریدنے کی ہمت نہ تھی۔ اور گزرا ہوا کل جو الجھنیں چھوڑ گیا تھا انہیں اگر مل بیٹھ کر سلجھانے کی کوشش کی جاتی تو ایسی بہت سی تلخ سچائیاں سامنے آجاتیں جنہیں آج تک مصلحت کے پردے کے پیچھے وہ زیب اور مہر چھپائے بیٹھی تھیں اور ان کی یہی خاموشی حنان کو ان پہ حاوی کیے دے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ زیب بیگم کو تو حوصلہ رکھنے کی تلقین کر چکی تھیں۔ لیکن خود اب ہمت ہار بیٹھی تھیں۔ ان ہی سوچوں میں رات تمام ہوئی تھی۔ نتیجتاً" صبح ان کی آنکھیں سرخ اور سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ مہر کو تو انہوں نے طبیعت خرابی کا بہانہ بنا کے زبردستی کالج جانے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن ابراہیم صاحب کو مطلع کرنا ضروری تھا۔

"کل زیب کا فون آیا تھا۔ وہ اور صغیر مہر کے سلسلے میں بات کرنے کے لیے آج ہماری طرف آرہے ہیں۔" آفس کے لیے تیار ہوتے ابراہیم صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا تو ان کی نظریں اپنی شریک حیات کی جانب اٹھ گئیں۔

"اچھا تو تمہاری یہ حالت اس فون کا نتیجہ ہے۔" وہ لمحے میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔

"کیوں آپ کو پریشانی نہیں ہوئی؟" انہوں نے بوجھل لہجے میں سوال کیا۔

"تمہاری پریشانی اپنی جگہ۔ لیکن صغیر بہرحال ہم سے ہر سوال کرنے کا حق رکھتا ہے۔" ان کی بات پہ انجم بیگم کے اندر بے چینی پھیل گئی۔

"میں جانتی ہوں کہ صغیر ہم سے ہر سوال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ لیکن۔" ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ وہ کن الفاظ میں اپنا مدعا شوہر کے سامنے بیان کریں۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھیں کہ ان کا اولاد کی طرف داری میں کہا گیا ایک بھی لفظ ابراہیم صاحب کے غصے کو ہوا دینے کے لیے کافی تھا۔ اسی لیے بچ کر خاموش ہو گئی تھیں۔

"جب تم یہ حقیقت جانتی ہو تو پھر اس ہچکچاہٹ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی انجم۔" اور انجم بیگم کے چہرے پہ دکھ کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔

"جانتی ہوں۔ لیکن پھر بھی آپ سے صرف اتنا کہوں گی کہ مہر کے لیے بہتر مستقبل کی خواہش میں آپ کہیں اس کی مشکلات میں اضافہ نہ کر دیجئے گا۔ اس کے لیے نئے سرے سے کوئی اچھا اور مناسب شریک سفر ڈھونڈنا ہمارے لیے آسان نہیں ہوگا۔" ان کی بات پہ ابراہیم صاحب لمحہ بھر کو خاموش ہو گئے۔

"تم نے مہر سے ان کے آنے کا ذکر کیا؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے بنا کسی خیال آرائی کے نیا سوال کیا۔ انجم بیگم کا بوجھل دل مزید بوجھل ہو گیا۔

"نہیں۔"

"اچھا کیا۔ تم زیب سے کہو کہ وہ بچیوں سے کہہ کر مہر کا کوئی پروگرام بنوا لے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ آج شام گھر پہ رہے۔" وہ گاڑی کی چابیاں اور بریف کیس اٹھاتے ہوئے بولے۔ انجم اک گہری سانس لیتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔"

"اچھی بات ہے۔ چلو پھر شام میں ملاقات ہوتی ہے۔" وہ دروازے کی جانب بڑھے تو انجم ہمیشہ کی طرح انہیں رخصت کرنے کو ان کے پیچھے چل دیں۔

☼ ☼ ☼

"مبارک ہو سیم۔ تم کامیاب ہو گئے دوست۔ لیکن اب اپنی حد میں رہنا ہوگا۔" مارک اور جوزفین ساتھ ساتھ چلتے سیم کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مارک کا لاپروا انداز ہوا میں کے اڑ گیا تھا۔ وہ خود کو تلخ ہونے سے روک نہ پایا تھا۔

"کیا مطلب؟ ہیسٹر۔" وہ اڑ سیم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ تلخی سے مسکرایا۔

"میری فضول باتوں کے مطلب کو چھوڑو۔ اور یہ سن لو کہ تمہارے گھر میں چوری ہو گئی ہے۔"

"مارک!" اس کی بد لحاظی پہ جوزفین دنگ رہ گئی تھی۔ جبکہ سیم بالکل ساکت ہو گیا تھا۔

"سیم۔ میں معذرت چاہتی ہوں سیم! تم پلیز حوصلے سے کام لو۔ دیکھو وہ جو کوئی بھی ہے پولیس اسے ڈھونڈ لے گی۔" شرمندگی کے مارے جوزی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے بات کو سنبھالے بھلا کوئی کسی مریض کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہے؟۔

"مجھے کسی کو نہیں ڈھونڈنا۔" سیم کی بے تاثر آواز شرمندہ ہوتی جوزفین کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ ساری شرم بھول بھال حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔ جبکہ مارک طنزیہ انداز میں قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم چور کو اچھی طرح جانتے ہو سو ڈھونڈنا کیسا؟" سیم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے کاٹ دار لہجے میں جتایا تو سیم جیسے پھٹ پڑا۔

"ہاں جانتا ہوں پھر؟"

"پھر یہ کہ ذلیل تو ہی! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم اس عورت کو اپنے گھر میں لے آئے ہو؟" وہ غصے سے بولا تو گھبرائی ہوئی جوزفین نے پریشان نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا۔ یہ شور شرابا کہیں اسپتال کے عملے کو نہ متوجہ کر لیتا۔

"میری مرضی۔" غصے سے کہتے ہوئے سیم نے آنکھیں پر باندھ رکھ لیا۔ مگر تب تک بھی مارک تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اور ایک جھٹکے سے اس کا بازو نیچے کر دیا تو جوزفین کی سانس حلق میں اٹک گئی۔

"تمہاری اس حالت کی ذمہ دار بھی وہی ہے نا؟" اور جوزفین کو لگا کہ اب تو دونوں دوستوں کے درمیان ضرب ہولی ہی ہوئی۔ لیکن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب سیم چند لمحے خاموشی سے مارک کا چہرہ تکنے کے بعد طل گرفتہ لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ اپنی اس حالت کا میں خود ذمہ دار ہوں۔"

"پلیز سیم اب تو بتا دو یار کہ یہ کیسے ہوا؟" مارک کا غصہ بے بسی میں ڈھل گیا۔

"کیوں اور کیسے کے ذکر کو جانے دو۔ یہ پوچھو کہ کس لیے ہوا؟" اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ بوجھل لہجے میں بولا تو مارک نے جیسے ہار مان لی۔

"اچھا۔ یہی بتا دو کہ کس لیے ہوا؟"

"مجھے موت کا احساس دلانے کے لیے۔"

"کیا؟" مارک نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کے ذہنی توازن بگڑ جانے کا اندیشہ ہو۔

"کیوں یقین نہیں آیا نا؟" اس کے تاثرات پہ سیم کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مجھے بھی نہ آتا اگر میں اس رات بدبو سے بھرے اس کچرے کے ڈھیر پہ بے یار و مددگار نہ پڑا رہتا۔"

"مجھے لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔" مارک نے تشویش سے اسے دیکھا۔

"ہاں ہوں' طبیعت ابھی تو صحیح معنوں میں ٹھیک ہوئی ہے۔" اس کے جواب پہ مارک کی پریشانی دوچند ہو گئی۔ چند سیکنڈ اس کی جانب دیکھنے کے بعد وہ ڈاکٹر سے بات کرنے کی نیت سے پلٹا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ قدم بڑھاتا' سیم نے اس کی کلائی تھام کر اسے اپنی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

"اس بار تو میں اس عورت کو مل گیا۔ سو میری جان بچ گئی۔ لیکن اگر میں دوبارہ کسی کو نہ مل سکا تو؟"

"سیم! بھول جاؤ تم اس حادثے کو ذہن پہ سوار۔"

"میری بات کا جواب دو مارک۔ اگر میں دوبارہ کسی کو نہ مل سکا تو؟" اور مارک اسے بے بس نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔

"کوئی جواب نہیں ہے نا۔ مگر میرے پاس ہے۔ تو میں کسی کچرے کے ڈھیر۔ یا کسی تیز رفتار گاڑی کے پہیوں تلے آ کے' یا اپنے فلیٹ کی تنہائی میں یا شراب کے نشے میں کسی بار میں ایک تنہا لاش کی صورت پڑا رہ جاؤں گا جس کے قریب جاتے ہوئے بھی ہر کوئی ڈرے گا۔ اس وقت اگر میری جیب سے کوئی نشانی نکل آئی تو شاید کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے تمہیں کال کر لیا جائے

گا۔ تم تسلیم نہ ہو سکے یا سرے سے کوئی نشانی ہی نہ مل سکی تو مجھ پہ ایک لاوارث لاش کا ٹھپہ لگا کے چند دنوں کے لیے سرد خانے میں پھینک دیا جائے گا۔ اور میری باری آنے پہ چند انجان لوگ ایک دن مجھے وہاں سے نکال کے ایک گمنام گڑھے میں ڈال دیں گے۔ جس پہ پہچان کا نہ تو کوئی کتبہ ہوگا اور نہ کوئی تحریر۔ پھر اگر تم بھی کبھی مجھے ڈھونڈنا چاہو گے تو ڈھونڈ نہ پاؤ گے۔ میں کہاں کھو جاؤں گا میرے اپنوں کو کبھی پتا نہ چل سکے گا۔ کیا میں ایسے ہی کسی بے کس اور گمنام انجام کے قابل ہوں مارک؟"

بولتے بولتے اس نے اچانک سوال کیا تو دم سادھے کھڑا مارک اسے خاموشی سے ایک ٹک دیکھے گیا۔ اس منظر کشی نے اس کی رگ و پے میں عجیب سی سنسناہٹ دوڑا دی تھی۔

"بولو نا مارک کیا میری موت کی خبر میری لاش کی بدبو لوگوں تک پہنچائے گی؟" اس نے مارے وحشت کے اپنے ہاتھ میں دبا مارک کا ہاتھ دبایا تو مارک خود بھی بے چین ہو گیا۔

"نہیں سیم! نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ تم ایسے کسی انجام کے مستحق نہیں ہو۔" اس نے جھک کر شدت جذبات سے اس کا شانہ دبایا۔ تو سیم کے پورے وجود میں در آنے والی بے قراری اور سراسیمگی سمٹ سی گئی۔

"بس مجھے یہی سننا تھا۔ اب مجھے کوئی الجھن کوئی کشمکش نہیں۔" گہری سانس لیتے ہوئے اس نے پرسکون انداز میں آنکھیں موند لیں۔ اس کی اس پل پل بدلتی کیفیت پہ مارک نے گھبرا کے جوزفین کی جانب دیکھا جو اسی کی طرح حیران پریشان سی کمرے کے وسط میں پتھرائی کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ سیم کو کیا ہو گیا ہے؟" خاموشی سے کھانا کھاتے ہوئے جوزفین نے اچانک سر اٹھا کے مقابل بیٹھے مارک کی جانب دیکھا جو اسی کی طرح سوچوں میں گم ایک کے بعد ایک نوالے منہ میں رکھتا جا رہا تھا۔ اس کے سوال پہ مارک نے نظریں اٹھا کے جوزفین کی طرف دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا کانٹا پریشانی سے پلیٹ میں رکھ دیا۔

"میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ لیکن ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ وہ خوف کا شکار ہے۔ اور ایسی حالت میں ہمیں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ اسے ڈسچارج کروانے کے بعد میں کچھ دن اس کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہوں گا۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو۔"

"میں کیوں اعتراض کروں گی۔ اس کی حالت نے تو مجھے خود پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ ہمیں اسے جلد از جلد کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھانا ہوگا۔" اس کے متفکر انداز پہ مارک نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بے فکر رہو۔ میں کل صبح ہی کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے ٹائم لیتا ہوں۔" اس کی بات پہ جوزفین نے اک گہری سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

مہر کالج میں تھی۔ جس وقت عائشہ کا فون آیا تھا۔ اور نورین شام میں شاپنگ کا پروگرام بنائے بیٹھی تھیں۔ اور اسے ساتھ لے جانے پہ مصر تھیں۔ مجبوراً مہر کو ہامی بھرنی پڑی تھی۔ کالج سے آنے کے بعد اس نے کھانا کھا کے نماز پڑھی اور کچھ دیر ستانے کے بعد تیار ہو کے نیچے آئی لیکن لاؤنج میں انجم بیگم کو سوچوں میں غلطاں بیٹھا دیکھ کے وہ چونک گئی تھی۔ یہ وقت تو ان کے آرام کا ہوتا ہے پھر بھلا۔

"کیا بات ہے مما جان۔ آپ یوں کیوں بیٹھی ہیں؟" تیز قدموں سے ان کے قریب آتے ہوئے اس نے پریشان نظروں سے ان کی جانب دیکھا جو اس کی آواز پہ بے اختیار چونک گئی تھیں۔

"یوں ہی نیند نہیں آرہی تھی۔ اس لیے سوچا تھوڑا ٹی۔ وی دیکھ لوں۔" آواز میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے وہ مسکرائیں۔ صبر نے ایک نگاہ سامنے ٹی۔ وی پہ ڈال کے ان کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چرا گئیں۔

"کیا بات ہے مما جان۔ آپ مجھے صبح سے پریشان لگ رہی ہیں۔" ان کے برابر میں بیٹھتے ہوئے اس نے ان کے شانے پہ ہاتھ رکھا تو انجم بیگم کی آنکھیں نہ چاہتے ہوئے بھی بھر آئیں۔

"صبر! یہ سب کب تک چلے گا بیٹا؟" ان کے استفسار پہ ایک بوجھل سانس اس کے لبوں سے ٹوٹ کر فضا میں بکھر گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ انہیں کون سی بات ستا رہی تھی۔

"آپ اس بات کو قبول کیوں نہیں کر لیتیں۔ مما جان! کہ زندگی اب یونہی گزرنے والی ہے۔"

"زندگی کوئی بچوں کا کھیل ہے جو میں تمہاری اس فضول بات کو قبول کر لوں؟ ہم آج ہیں کل نہیں۔ اس کے بعد بھی سوچا ہے کہ کیا ہو گا؟" انہوں نے غصے سے اسے دیکھا تو وہ نگاہیں جھکا گئی۔

"زینب اور صغیر کے سامنے ہم پہلے کیا کم شرمندہ ہیں جو تم ہمیں مزید شرمندہ کرنے پہ تلی ہوئی ہو۔"

"آپ کیوں شرمندہ ہوتی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔" وہ پلکیں اٹھاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

"تمہارے جیسے جذباتی بھرے فیصلوں کو کوئی نہیں مانتا۔ وہ اگر اب تک چپ ہیں تو صرف اس لیے کہ تم خود ہوش کے ناخن لو۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ ہمیں خود ہی کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔" ان کے قطعی لہجے پہ اس کے چہرے پر اضطراب ابھرا۔

"پلیز مما جان! آپ لوگ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔" اس نے مضطرب نظروں سے دیکھتے ہوئے ان کا ہاتھ تھاما۔ لیکن اس سے پہلے کہ انجم کوئی جواب دیتیں، لاؤنج کا دروازہ کھلنے کی آواز سے دونوں نے ایک ساتھ پلٹ کر دروازے کی جانب دیکھا۔

"میرا خیال ہے باہر زینب بی بی کی گاڑی آئی ہے۔" متوجہ دیکھ کے دل شیر نے اسے وہیں سے مطلع کیا تو صبر صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا مما جان! میں جا رہی ہوں۔" اس کی نظریں ان کے جھکے ہوئے چہرے پہ جا ٹھہریں۔ "آپ پلیز کچھ دیر آرام کر لیں۔"

"کر لیتی ہوں۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولیں۔ صبر بے بسی سے انہیں دیکھتی پلٹ کر بوجھل قدموں سے باہر نکل گئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد انجم کچھ لمحے یونہی خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی رہیں اور پھر ہاتھ بڑھا کر سامنے رکھا فون اٹھا لیا۔ ان کی انگلیاں "قاضی ولا" کا نمبر ملانے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تم سے بڑا بے وقوف اپنی زندگی میں نہیں دیکھا سیم!" اور زمین پہ گرے درد سے بے حال ہوتے سیم کی آنکھیں حیرت سے پھیلائے نگار کے بے یقینی سے پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔

ہسپانوی نقوش سے سجا اس کا حسین چہرہ تمسخر اور حقارت کے رنگوں میں ڈوبا ایک لمحے کو اس کے قریب جھکا تھا اور اگلے ہی لمحے سیدھے ہوتے ہوئے اس نے اپنی ٹانگ پوری طاقت سے سیم کی پسلیوں میں ماری تھی۔ اس کے جوتے کی نوک نے سیم کو بلبلانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ ایک کراہ اس کے لبوں سے نکلی تھی اور سوئے ہوئے سیم کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی تھی۔ بے اختیار تھوک نگلتے ہوئے اس نے لیٹے لیٹے گردن گھما کے اپنے دائیں طرف دیکھا جہاں مارک بے خبر سو رہا تھا۔ اسے دیکھ کے اطمینان کا گہرا احساس سیم کو اپنے اندر اترتا محسوس ہوا۔

دھیرے سے رخ موڑ کر اس نے اپنا سینہ مسلا تاکہ اس بے چینی اور گھبراہٹ سے نجات پا سکے جو اس تلخ حقیقت نے سوتے میں بھی اس کے اندر جگا دی تھی۔ مگر اس خوب صورت ناگن کا چہرہ اور اس کا دیا ہوا زہر

اس کے روم روم میں کھنچاؤ پیدا کرنے لگا تھا۔ یہ حادثہ تو جیسے اس کی روح تک سے چمٹ گیا تھا اور کیوں نہ چمٹتا؟ وہ اس لڑکی کے ہاتھوں صرف لوٹا نہیں گیا تھا بلکہ ذلیل ہوا تھا۔ جسم سے لے کر احساسات تک اور احساسات سے لے کر روح تک ذلیل!

وہ لمحے، جب اس پہ اچانک پل پڑنے والے لڑکوں کے ہاتھ اور پاؤں لمحہ بھر کو رکے تھے اور اس کی درد سے بند ہوتی آنکھوں نے لورین کو اپنے قریب دو زانو جھکتا دیکھ کے اس کا اپنی جانب بڑھتا ہاتھ تھامنا چاہا تھا۔ اسے یقین ہے کہ شاید وہ نازک سی لڑکی اسے ان غنڈوں کے نرغے سے نکال لینے میں کامیاب ہو جائے، وہ اس کی زندگی کے سب سے کربناک لمحے تھے کیونکہ اگلے ہی پل لورین نے اس کی ہر خوش فہمی کی دھجیاں اڑاتے ہوئے انتہائی بے رحمی سے اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا تھا اور اس کے ہاتھ انتہائی سرعت سے اس کی جیبوں میں رینگنے لگے تھے۔ جنہیں خالی کرنے کے بعد اس نے اس کی کلائی میں بندھی قیمتی گھڑی اتار کے پیچھے کسی کو تھمائی تھی۔

تب اسے اٹھتا دیکھ کے سیم نے اپنے نڈھال پڑے وجود کی پوری ہمت صرف کر کے اس کی کلائی جکڑ لی تھی۔

بے اختیار لورین کی نظریں اس کی وحشت زدہ بے یقین نظروں سے ٹکرائی تھیں اور اس کے سرخ لپ اسٹک سے سجے ہونٹوں کی تراش میں بڑی بے رحم سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔

"میں نے تم سے بڑا بے وقوف اپنی زندگی میں نہیں دیکھا سیم!" اس کا تمسخر اور حقارت کے رنگوں میں ڈوبا حسین چہرہ پل بھر کو اس کے قریب جھکا تھا اور اگلے ہی لمحے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے اس نے اپنی ٹانگ پوری طاقت سے سیم کی پسلیوں میں ماری تھی۔ اس کے جوتے کی نوک نے سیم کو بلبلانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اس کے لبوں سے اک کراہ نکلی تھی، لیکن اذیت اور ذلت کی جو کراہیں اس پل اس کے دل و دماغ سے نکلی تھیں وہ تاحال اس کے اندر گونج رہی تھیں۔

اعصاب کے تناؤ نے اس کے اندر سگریٹ کی طلب بیدار کر دی تھی۔ وہ کنپٹیوں کے تل زور دیتا آہستگی سے اٹھ بیٹھا تھا۔

سائیڈ ٹیبل کی دراز سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال کے وہ سیدھا ہونے کو تھا کہ اس کی نظر ٹیبل کی ٹاپ پہ پڑی، جہاں لیمپ کے پاس رکھا فوٹو فریم جاذب تھا۔ چند لمحے ٹیبل کی سمت کو دیکھنے کے بعد اس نے پلٹ کر مارک کی طرف دیکھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار سیم کو اپنے دل میں کسی کے لیے تشکر کے احساسات اٹھتے محسوس ہوئے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک بہترین انسان اور باکمال دوست تھا۔ اسے مارک کا اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ یکایک بالکل درست لگنے لگا تھا۔

اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے کسی خوب صورت احساس سے لطف لیتا وہ آہستگی سے بیڈ سے نیچے اتر گیا تھا اور لیمپ بجھا کر نائٹ بلب کی روشنی میں دھیرے دھیرے چلتا دروازہ کھول کے باہر لاؤنج میں نکل گیا تھا۔

اپنے پیچھے بنا کسی آہٹ کے دروازہ بند کر کے اس نے لائٹ جلائی تھی اور چلتا ہوا صوفے پہ آ بیٹھا تھا۔ سگریٹ جلا کے اس نے ایک گہرا کش لیا تھا۔ بہت دنوں بعد سکون کی ایک گہری لہر سے اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی تھی۔ ایک سگریٹ ختم کر کے اس نے فوراً دوسرا سگریٹ جلایا تھا۔

اپنے دھیان میں دھواں اڑاتے ہوئے اس کی نظر سامنے رکھے سینٹر ٹیبل کی جانب اٹھی تھی اور وہ بے اختیار چونک گیا تھا۔

ٹیبل پہ سجے بیش قیمت کرسٹل پیسز لب جاذب تھے، لیکن ان کے برابر میں ڈیڑھ ہفتہ پہلے لا کر سجائے جانے والے نہایت سستے سے چند ایک رنگ برنگے ڈیکوریشن پیسز وہیں موجود تھے۔ یکایک اس کا اپنے منہ کی جانب بڑھتا ہاتھ ساکت ہو گیا تھا اور آنکھیں گویا اس پیس پر جم سی گئی تھیں۔ ان ڈیکوریشن پیسز کو لورین کے گھر سے لا کے جہاں اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بڑی محبت سے سجایا تھا اور تب وہاں رکھے ان

قیمتی کرسٹل پیسز سے بھی زیادہ بجتے تھے۔ وہ کتنی دیر لورین کے پہلو میں کھڑا انہیں نہار تا رہا تھا۔

لیکن اب رات کے اس پہر اسے وہ چیزیں ایک قیمتی میز پہ اپنی اوقات آپ بتاتی محسوس ہو رہی تھیں۔ دونوں میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ "یہ فرق اسے پہلے کیوں نظر نہیں آیا تھا؟" عجب سے سوچتے ہوئے اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیا تھا۔ بے اختیار وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے قدم اور اس کی نظریں پورے گھر میں بھٹکنے لگی تھیں۔

ہر جگہ سے آسمان غائب تھا اور زمین رہ گئی تھی۔ یوں جیسے اس رات اپنی ذات سے متعلق اس کی تمام خوش گمانیاں غائب ہو گئی تھیں اور صرف اس کی لاچاری اور بے بسی رہ گئی تھی۔

وہ یہ کیسا نقصان کا سودا کر بیٹھا تھا؟ واقعی شاید اس سے بڑا بے وقوف اور کوئی نہ تھا جو خود کو عقل کل سمجھ کے نجانے کون کون سے پتھر اور کنکر اپنی جھولی میں اب تک بھرتا رہا تھا اور اب جو عقل ٹھکانے آئی تھی تو احساس ہوا تھا کہ وہ کتنے پانی میں تھا اور اپنے حق میں کتنے غلط فیصلے کر چکا تھا۔ پہلا غلط فیصلہ سوزی کو اپنی شریک سفر بنانے کا تھا۔ جس کی خود سر اور کھلی فطرت اس کے سامنے تھی، مگر پھر بھی اس نے سوزی کو ساری دنیا سے لڑ کے اپنایا تھا کیوں کہ ان دونوں کی فیملیز ان کی شادی کے خلاف تھیں جبکہ انہیں یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ ان جیسی ذہنی ہم آہنگی شاید ہی کسی خوش نصیب جوڑے کے درمیان پائی جاتی ہو گی، لیکن جب سوزی ایک معشوقہ سے ایک بیوی کے روپ میں آئی تھی تب سیم کو احساس ہوا تھا کہ دھونس جمانے اور من مانی کرنے والی بے باک فطرت عورت کے ساتھ بطور شوہر اس کی ذہنی ہم آہنگی صفر کے برابر تھی۔ دونوں حکم دینے کے عادی تھے لینے کے نہیں۔ وہ گویا ایک ہی دو تلواروں میں تبدیل ہو گئے تھے جو اپنی ہی غلطی سے ایک میان میں آگھسی تھیں اور اب ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کے درپے تھیں۔ بچے جیسا کوئی مختاج چونکہ سوزی نے پیدا ہی نہیں ہونے دیا تھا۔

اس لیے دونوں نے مزید کسی مشکل کے اپنی اپنی راہ لی تھی۔

یہ الگ بات تھی کہ سیم کو اپنی دولت بچانے کے لیے بے تحاشا پاپڑ بیلنے پڑے تھے اور تب اس نے شادی جیسی بلا اس کے بے ہودہ اور تحفظ سے ہمیشہ کے لیے توبہ کی تھی۔ لیکن وہ اپنی توبہ پہ قائم نہیں رہ سکا تھا۔

محض ایک ہی ہفتے بعد لورین کا جادو اس کے دل، ذہن اور اس کے حواسوں پر سوار ہو گیا تھا۔ وہ یونہی "آناً فاناً" لوگوں اور چیزوں کے عشق میں گرفتار ہونے کا عادی تھا۔ جب تک مقصود کو پا نہ لیتا، طلب کا بخار ایک سوہان روح بنے پہ پہنچا رہتا اور جب چیز دسترس میں آجاتی تو شوق کا پیمانہ بھرنے میں زیادہ دیر نہ لگتی اور اب کے تو واسطہ بھی لورین سے پڑا تھا۔ جو کسی ساحرہ سے کم نہ تھی۔ وہ زندگی کے ایک ایک لمحے سے "زندگی" کشید کرنا جانتی تھی۔ وہ اتنی متحرک اور ایڈونچر پسند تھی کہ سیم جیسے جیالے شخص کو بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے اپنی رفتار بحال کرنی پڑی تھی۔ اتنے عرصے بعد بنا کسی زنجیر کے یوں اڑتے اڑتے پھرنا اس کے لیے ایک بے حد نیا اور بھرپور تجربہ تھا جو اس نے لورین کے اصرار پہ ہی پارک تک سے چھپایا تھا۔

لورین کی ہمراہی نے اس کی من موجی اور بے نیاز فطرت کو خوب ہوا دی تھی۔ وہ کون تھی؟ کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی؟ اس کا ماضی کیسا تھا؟ سیم کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔

ورنہ کسی کو بتائے خود جا کر اس کی ایک ایک چیز اس کے ڈربے نما مکان سے سمیٹ لایا تھا اور لا کر اس نے وہ تمام چیزیں بڑی محبت سے اپنی چیزوں کے ساتھ سجا دی تھیں۔ ایک دوسرے کے پہلو میں سجنے کے بعد ان کے درمیان موجود فرق اور بھی شدت سے ابھر کر آیا تھا مگر تب بھلا سیم کو کب پروا تھی بلکہ اسے تو یہ فرق سرے سے نظر ہی نہیں آیا تھا یا شاید یہی قدرت کی منشا تھی۔

اور اب جب پہلی اترنے کا حکم آیا تھا تو وہ حق دق

بیٹھا اپنے سامنے موجود اس واضح ہوتے فرق کو دیکھ اور پرکھ رہا تھا۔ اپنے فیصلے جو اسے کبھی غلط نہ لگے تھے راستے کے اس سرے پہ یکایک ان میں بہت سی خامیاں' بہت سی کمزوریاں نظر آنے لگی تھیں۔ وہ اپنی بدلتی سوچ پہ حیران تھا۔ انگلیوں میں دبی راکھ ہوتی سگریٹ نے اس کی انگلیوں کو چھوا تھا تو وہ ایک جھٹکے سے ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔

"یہ۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے اس نے پریشانی سے اپنا سر تھام لیا۔ "پہلے ہر زعم ڈھیر ہوا اور اب۔ اب یہ احساس کہ او گاڈ۔ کیا میں ہر لحاظ سے غلط تھا؟"

نچلا لب دانتوں تلے دبائے اس نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوچا تب ہی ایک جھماکے کے ساتھ ذہن کی اسکرین پہ بے ہوشی کی حالت میں دیکھا جانے والا خواب واضح ہونے لگا۔

ویران' تاریک گلیاں' اس کے بھاگتے قدم' خوف ناک بھونکتے کتے' بند دروازے۔ اور ان سب کے درمیان اس کی مدد کے لیے کھلنے والا فقط ایک در۔ اس کے قدموں کا اس دہلیز کو چھونا۔ اور۔ اور اندر جانے کے بجائے پلٹ جانا۔ واپس تاریکیوں میں پلٹ جانا۔ حیرت سے سوچتے ہوئے سیم بے اختیار پریشانی کے عالم میں سیدھا ہوا۔

"یہ۔ یہ بھلا کیسا خواب تھا؟" اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں۔ "اور یہ وہ کس پناہ گاہ کے دروازے کو کھلا چھوڑ آیا تھا۔ وہ بھی اندھیروں کی جانب مشکلات کی جانب۔" تعجب سے سوچتے ہوئے اس کا دل سہم گیا تھا۔

نجانے کیوں' لیکن اسے یہ خواب محض خواب نہ لگ رہا تھا بلکہ ایک اشارہ لگ رہا تھا۔ ایسا اشارہ جو اس کی ایک فاش غلطی کی جانب کیا جا رہا تھا۔ اب اتنی بہت سی دریافت ہونے والی غلطیوں میں سے وہ سب سے بڑی غلطی کون سی تھی۔ سیم سمجھنے سے قاصر تھا۔ بالکل قاصر!

☆ ☆ ☆

ڈرائنگ روم میں کچھ دیر تک وہ چاروں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے خاموش بیٹھے تھے۔ رسمی گفتگو ختم ہو چکی تھی اور اب وقت تھا کہ اصل موضوع کی جانب پیش رفت کی جاتی جس کا ہر پہلو کھلی کتاب کی طرح تھا۔ پھر بھی صغیر قاضی کو بات شروع کرنے کے لیے الفاظ ترتیب دینے پڑے تھے۔

"بھائی جان اور آپا۔ آج میری آمد کا مقصد صرف مراد اور ہنی کے مسئلے کو حل کرنا ہے۔ آپ ہی بتائیں آخر آپ دونوں نے اس بارے میں کیا سوچا ہے؟" انہوں نے سامنے بیٹھے ابراہیم صاحب اور انجم بیگم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ابراہیم ملک نے اک گہری سانس لی۔

"سوچنا کیا ہے صغیر ہر چیز تمہارے سامنے ہے۔ مہری ضد نے جیسے بے بس سا کر دیا ہے۔"

"وہ بچی ہے بھائی جان۔ اس کے پیچھے لگنا کہاں کی عقل مندی ہے۔" صغیر صاحب کی بات پہ زیب بیگم کی پریشان نگاہیں بہن کی جانب اٹھ گئیں۔ دونوں کی نظریں ملیں تو انجم نے اک بے آواز و بوجھل سی سانس کھینچی۔

"تو کیا کروں؟ تم ہی بتاؤ؟" ابراہیم صاحب نے تھک کے صغیر قاضی کی جانب دیکھا۔

"میرے خیال میں تو آپ سب سے پہلے اسے قاضی ولا رخصت کرنے کی تیاری کریں۔" اور شوہر کی بات پہ زیب کا دل اس تیزی سے ڈوب کر ابھرا کہ ان کی سانس ایک پل کو رک سی گئی۔

"لیکن صغیر! مہر ایسا نہیں چاہتی۔" انجم بیگم نے سرعت سے مداخلت کی۔

"جانتا ہوں آپا! لیکن اب تھوڑی سی سختی تو کرنی پڑے گی آپ دونوں کو۔"

"چلو مان لیا کہ ہم یہ سختی کر لیتے ہیں' لیکن اس زور زبردستی سے اس کا دل تو نہیں بدلا جا سکتا نا۔" انجم کی بات پہ زیب بیگم کو تھوڑا حوصلہ ہوا۔

"اس کا دل ان حالات میں بدلے گا بھی نہیں۔ آپ لوگ ذرا حالات کو نیا رخ دینے کی کوشش تو

کریں۔" مغیر صاحب نے رسان سے کہتے ہوئے انجم اور ابراہیم صاحب کو دیکھا۔
"حالات اتنی آسانی سے نیا رخ نہیں لیں گے مغیر۔" ابراہیم ملک کے بوجھل لہجے پہ مغیر قاضی بے اختیار خاموش ہو گئے۔
"تو بس پھر اس بے نام رشتے کو ختم کیجیے۔ معاملہ خود ہی پار لگ جائے گا۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد مغیر صاحب دو ٹوک لہجے میں بولے تو ڈرائنگ روم میں موجود تینوں نفوس پہ خاموشی چھا گئی۔
"معذرت کے ساتھ بھائی جان لیکن میں اب اس بات کو مزید لٹکانے کے حق میں نہیں اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور پریشان حال زینب بھی شوہر کے انداز پہ اندر ہی اندر خائف ہوتی اپنی جگہ سے اٹھ گئیں۔
"اچھا مغیر! تم بیٹھو تو سہی۔" بہنوئی کا یوں اٹھ جانا انجم کو بھی پریشان کر گیا۔ وہ سرعت سے انہیں تو ابراہیم ملک بھی کسی نتیجے پہ پہنچ گئے۔
"انجم صحیح کہتے ہو۔ اس بے نام رشتے کو واقعی اب اپنے انجام تک پہنچ جانا چاہیے۔" ان کی بات پہ مغیر قاضی نے سوائے خاموش نظروں سے انہیں دیکھنے کے کوئی جواب نہ دیا لیکن انجم اور زینب کے دل جیسے بیٹھ سے گئے۔
"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ کچھ تو سوچیں۔" انجم نے پلٹ کر دہائی دی۔ ابراہیم صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔
"سوچ لیا ہے۔ میری جان اس رشتے سے چھوٹنے کی تو کچھ ہو گی۔" ان کے قطعی لہجے پہ انجم بے بسی سے خاموش ہو گئیں۔
"میں کل ہی اپنے وکیل سے بات کرتا ہوں۔" انہوں نے مغیر قاضی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ ہمیں اب اجازت دیں۔" انہوں نے ایک نظر ساتھ کھڑی بیوی پہ ڈالی جن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ نگاہیں جھکائے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئے تو زینب کے لبوں سے دبی دبی سی سسکی نکل گئی۔
بے اختیار انجم نے آگے بڑھ کے انہیں خود سے لگا لیا۔
"مجھے معاف کر دو زینب۔ میں اماں کے بنائے ہوئے رشتے کو بچا نہ سکی۔" آنسو انجم بیگم کی آنکھوں سے ٹوٹ کے بہہ نکلے تو بہن کے سینے سے لگی کھڑی زینب کا ضبط بھی جواب دے گیا۔
جبکہ ابراہیم ملک اپنی بچی کی لاج سے شرمندہ ہوتے چور چور دل لیے باہر نکل گئے۔

☆ ☆ ☆

صبح کے آٹھ بج رہے تھے جب مارک نیند سے بیدار ہوا تھا۔ اپنے برابر خالی بستر دیکھ کے وہ یہی سمجھا تھا کہ سیم باتھ روم میں ہو گا مگر جب دس منٹ تک اندر سے کوئی برآمد نہ ہوا تو وہ تیزی سے اٹھ کر باتھ روم کی جانب گیا اور اسے خالی دیکھ کر وہ یک لخت گھبرا گیا۔
اپنے بیڈ روم کے کمرے کا دروازہ کھول کے وہ تیز قدموں سے لاؤنج میں چلا آیا اور صوفے پہ نظر پڑتے ہی اس کے سینے سے اک سکون بھری سانس برآمد ہوئی۔ سیم صوفے پہ لیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔
وہ مطمئن سا چلتا دوسری طرف رکھے کاؤچ پہ آگے کو گر سا گیا۔ سوئے ہوئے سیم کو بے دھیانی سے تکتے ہوئے وہ سیدھا ہوا تو نظریں صوفے کے ایک جانب نیچے زمین پہ رکھے درمیانے سائز کے گتے کے ڈبے پہ پڑیں۔
"یہ تو رات تک یہاں نہیں تھا۔" بڑبڑاتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس ڈبے کی جانب بڑھا۔ اور اسے کھول کر دیکھنے کو جھکا لیکن جوں ہی اس کی نظر اندر رکھی چیزوں سے ٹکرائی وہ بے اختیار ٹھٹک گیا۔
وہ سب لورین کا سامان تھا۔ یعنی سیم رات بھر اسی حالت میں اور اسی عورت میں پھنسا رہا تھا۔ سیدھے ہوتے ہوئے اس کی متفکر نگاہیں سیم پہ جا ٹھہری تھیں۔ جو نجانے کب سویا تھا؟ اسے جگانے کا ارادہ ترک کر کے وہ باتھ روم میں چلا گیا اور جب فریش

ہو کے واپس آیا تھا تب سیم آنکھیں کھولے صوفے پہ چت لیٹا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" مارک اس کے چہرے کی جانب آرکا۔

"ٹھیک ہوں۔ تم نے وہ تصویر کہاں رکھی ہے؟" سیم کی نگاہیں چھت پہ سے ہٹ کے مارک کے چہرے پہ آٹھہریں جو اس کے سوال پہ بُری طرح چونکا تھا۔ یعنی سیم جان گیا تھا کہ اس کے بیڈ سائیڈ ٹیبل سے ان دونوں کی تصویر اس نے اٹھائی تھی۔

"اندر الماری میں ہے۔" اس کے بے تاثر چہرے کو تکتے ہوئے مارک نے جواب دیا۔

"لے آؤ پلیز۔" وہ دھیرے سے بولا تو مارک بیڈ روم کی جانب بڑھ گیا۔ الماری میں سے تصویر نکال کے وہ واپس آیا تو سیم اٹھ کر بیٹھ گیا اور خاموشی سے اس کے ہاتھ سے فریم پکڑ لیا۔

فریم میں جڑی تصویر پہ اک نگاہ غلط ڈالے بنا اس نے فریم کو الٹ کر اندر موجود تصویر نکالی، اس کے کئی ٹکڑے کیے اور فریم کو بیٹھے بیٹھے نیچے پڑے ڈبے میں اچھال دیا۔ اس کی اس حرکت پہ مارک لمحہ بھر کو حیران رہ گیا، لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے قصداً نارمل لہجے میں سوال کیا۔

"تم نے اپنی باقی چیزوں کو چیک کیا ہے؟"

"ہوں۔" اس نے مختصر ہنکارا بھرا۔

"زیادہ نقصان تو نہیں ہوا نا؟" اور مارک کے سوال پہ سیم کی خالی خالی سی نگاہیں اس کے چہرے پہ آٹھہریں۔ اس کے تاثرات پر مارک پریشان ہو گیا۔

"کیا زیادہ نقصان ہوا ہے؟" وہ اس کے قریب چلا آیا۔

"بہت۔ بہت زیادہ۔" اس نے دل گرفتی سے جواب دیا۔

"مگر تمہارا لاکر تو محفوظ ہے۔" مارک پریشانی سے بولا۔

"بس وہی محفوظ ہے باقی تو سب ختم ہو گیا۔" سیم نے تھکے ہوئے انداز میں اپنا سر صوفے کی پشت پہ ڈال دیا۔

"تم ایسا کرو نا شام تک غائب ہونے والی ساری چیزوں کی ایک لسٹ بناؤ۔ ہمیں اب یہ معاملہ ہر حال میں پولیس کے حوالے کرنا ہوگا۔" مارک کی بات پہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ سیم کے لبوں پہ پھیل گئی۔ اس کی نظریں اوپر چھت پہ جمی نجانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

"ساری رات یہی تو کیا ہے۔"

"اچھا!" مارک نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا "یہ تو بہت عقل مندی کا کام کیا تم نے۔"

"بس ایک آخری چیز سمجھ میں نہیں آرہی۔" دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل کے مارک کو دیکھا۔

"کیا؟"

"یہ کہ میں کس بنا پہ گھر کے دروازے کو کھلا چھوڑ گیا ہوں؟" اور مارک کا منہ اس کی بات پہ مارے حیرت کے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

☆☆☆

"ڈاکٹر پلیز! مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ وہ کبھی بھی میرے ساتھ یہاں آپ کے کلینک نہیں آئے گا۔" شام میں مارک سائیکاٹرسٹ کے سامنے بیٹھا تھا۔ سیم کی حالت اس سے ڈسکس کرنے کے بعد مارک نے ملتجی لہجے میں کہا تو ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو کیا آپ میرے کزن بن کے اس کے گھر میرے ساتھ چل سکتے ہیں؟" مارک نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر پل بھر کو خاموش ہو گیا۔

"دیکھیں مسٹر مارک' ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے صرف ایک سٹنگ تو نہیں۔"

"میں جانتا ہوں سر! لیکن اگر آپ ایک بار اس سے مل لیں گے تو شاید اگلی بار وہ خود آپ سے ملنے کے لیے تیار ہو جائے۔ آپ پلیز۔ پلیز میری درخواست قبول کر لیں۔ دیکھیں یہ ایک انسانی زندگی کا سوال ہے۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے مارک التجائیہ انداز میں بولا تو ڈاکٹر جیسے بے بس سا ہو گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں چلوں گا آپ کے ساتھ۔"

"بہت بہت شکریہ سر۔ میں آپ کی مدد کے لیے ممنون ہوں۔" مارک کا چہرہ کھل اٹھا۔

"آپ بس اتنا خیال رکھیے گا کہ آپ کی باتوں سے اسے یہ شک نہ ہو کہ آپ ایک سائیکاٹرسٹ ہیں۔"

"بے فکر رہیں۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اپنے سامنے کھلے لیپ ٹاپ پہ انگلیاں چلائیں۔

"کل میں پانچ سے چھ کے درمیان فارغ ہوں' آپ پونے پانچ بجے تک یہاں پہنچ جایئے گا۔" اس نے اپنا شیڈول چیک کیا۔

"شیور۔" مارک مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایک بار پھر آپ کا بہت شکریہ۔" وہ ممنون سا بولا تو ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆ ☆ ☆

رات کھانے کی میز پہ وہ تینوں موجود تھے۔ مارک چونکہ جوزفین کو ساری بات سے آگاہ کر چکا تھا۔ اس لیے ادھر ادھر کی باتوں کے درمیان اس نے قصداً" یوں بات شروع کی جیسے ابھی ابھی کچھ یاد آیا ہو۔

"ہاں سیکی تمہارے کزن کا کیا بنا؟" اس نے کھانا کھاتے ہوئے مارک کی طرف دیکھا۔

"پہنچ گیا ہے وہ۔ کل ملنے کے لیے کہہ رہا ہے۔"

"پھر؟" جوزفین نے جواباً" استفسار کیا۔

"سوچ رہا ہوں اسے کل شام یہاں انوائٹ کر لوں۔ اگر سیم کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔" مارک نے سیم کی طرف دیکھا۔

"کیوں نہیں۔" سیم نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تم اس سے ملو گے نا۔" مارک نے نرمی سے پوچھا تو سیم جھجک سا گیا۔ اس کی جو کیفیت تھی اس میں فی الوقت وہ کسی سے بھی ملنے ملانے کا خواہاں نہ تھا مگر وہ یوں دو ٹوک انکار مارک کو نہیں کر سکتا تھا۔

"دیکھو۔" وہ محض یہی کہہ پایا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ تمہارا گھر ہے اور تم ہی نہ ملو یہ تو اچھا نہیں لگے گا۔" مارک کی بات پہ وہ لحظہ بھر کو خاموش ہو گیا۔

"ویسے بھی تمہیں اب اپنی نارمل روٹین کی طرف آنا چاہیے سیم۔" جوزی نے بھی مداخلت کی تو وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

"شاید تم صحیح کہہ رہی ہو۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا تو مارک بے اختیار مسکرا دیا۔

"زبردست یہ کی نا مردوں والی بات... تمہیں اپنی دل ہار سے خود کو سنبھالنا ہو گا۔" اس کے رسان سے کہنے پر سیم دھیرے سے مسکراتا اپنی پلیٹ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"واقعی۔ مجھے اپنی قوت ارادی سے ہی خود کو ان فضول سوچوں سے نکالنا ہو گا۔" نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

"تمہاری غلطیوں کی نشان دہی کرتی یہ سوچیں

فضول ہیں کیا؟" اندر سے ایک آواز سی آئی تو اس کا نوالہ چباتا منہ رک گیا۔

"فضول نہ سہی، لیکن یہ میرا سوچنے کا انداز نہیں! میں چیزوں کو اس نظریے سے دیکھنے کا عادی نہیں!" اس نے غصے سے اس آواز کو باور کروایا۔

"تب ہی تو منہ کے بل گرے ہو۔" آواز نے ٹھٹھا لگایا تو سیم نے لب بھینچتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا کانٹا پلیٹ میں پٹخ دیا۔

اس کی اس حرکت پہ اپنے دھیان میں کھانا کھاتے مارک اور جوزی نے چونک کر اس کی طرف اور پھر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"سیم! تم ٹھیک تو ہو؟" اور مارک کی آواز پہ اسے بھی جیسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ بری طرح شرمندہ ہو گیا۔

"آئی ایم سوری۔ سو سوری یار۔" چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے مقابل بیٹھے مارک کی طرف دیکھا۔

"کوئی بات نہیں، لیکن تم ٹھیک تو ہو نا؟" مارک نے نرمی سے اپنا سوال دہرایا۔

"ہاں نہیں... نہیں میں ٹھیک نہیں۔ شاید کل رات کی بے آرامی نے مجھے تھکا دیا ہے۔" مزید بات بنانے کا اس میں حوصلہ نہ ہوا تو تھک کر اس نے قبول کر لیا۔

"میں تمہاری دوائیں لاتی ہوں۔" جوزی سرعت سے اٹھی۔

"نیند کی دوا بھی لاؤ۔ اس کے لیے بھرپور نیند بہت ضروری ہے۔" مارک نے کچھ سوچتے ہوئے باآواز بلند کہا تو جوزی اثبات میں سر ہلاتی کمرے کی طرف چل دی۔

جوزی نے دوائیں لا کے اس کے سامنے رکھیں تو سیم نے چپ چاپ انہیں منہ میں رکھ لیا۔

"میں لیٹنے جا رہا ہوں۔" کرسی پیچھے دھکیلتا وہ اٹھ کھڑا ہوا تو دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور بیڈ پہ گرنے کے انداز میں لیٹ گیا۔ وہ اس وقت کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ بھی!

سختی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے چہرے پہ بازو رکھ لیا۔ اب یہ اس کی کوشش تھی یا نیند کی دوا کا اثر کہ جلد ہی اسے اپنے اعصاب پہ غنودگی چھاتی محسوس ہوئی تھی اور اسی سوئی جاگی کیفیت میں اسے دور سے ایک آواز ذہن پہ دستک دیتی محسوس ہوئی تھی۔

"ٹوٹتا ہے جب جام آرزو
تب در آگہی کھلتا ہے..."

"آں... یہ... یہ کس کی آواز ہے؟" ڈوبتے ذہن نے سوچنے کی کوشش میں آنکھوں کو کھولنے کی سعی کی تھی مگر پپوٹوں پہ گویا منوں بوجھ آ دھرا تھا۔ اتنے میں آواز دوبارہ آئی تھی لیکن مزید دور سے۔

"ٹوٹنا... جام آرزو
در آگہی کھلنا..."

"مطلب؟" ایک اور آواز ابھری تھی اور اس کے ساتھ ہی ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ گہرا سناٹا!

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مصباح سجاد

ریت کی دیوار



"بس ہے۔ میں اس موضوع پر اب اور کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔ ایک بٹے ہوئے شخص کا ساتھ کبھی بھی میری خواہش نہیں تھا۔ مجھے ایک مکمل گھر، مکمل انسان چاہیے۔ لہٰذا اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تم میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو یا اپنی ماں کی پسند کے ساتھ؟"

اس کا لہجہ حتمی اور دو ٹوک تھا۔ جس نے مقابل کو مکمل طور پر بے بس کر دیا تھا۔

"پلیز نازلی! ایسے تو مت کہو۔ تم جانتی ہو میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم میری محبت ہو اور وہ مجبوری۔ تمہارا اور اس کا مقابلہ ہی کیا ہے؟"

"یہ مقابلہ میں نے نہیں، تم نے شروع کیا ہے نیاز! اور اب اس کا انجام بھی تمہارے ہی ہاتھوں میں ہے۔ اور وہ تمام عہد و پیمان جو پچھلے دو سالوں میں تم بارہا مجھ سے کر چکے ہو۔ مجھے امید دلا رہے ہیں کہ تم مجھے ہارنے نہیں دو گے۔" وہ خاموش ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

نیاز ابھی ابھی ورکشاپ سے لوٹا تھا۔ حسنہ نے اس کے سامنے کھانا لا کر رکھا تو حسب معمول اس نے نوالہ توڑنے سے پہلے ٹی وی آن کر لیا۔ سارے دن کی انتھک محنت کے بعد رات کا یہ ابتدائی پہر بے حد خوشگوار ہوا کا ایک جھونکا ہوتا تھا اس کے لیے۔ حسنہ کا مسکراتا چہرہ اور کھانے میں لذت بن کر گھلی اس کی محبت۔ جسے شوہر کی آمد کے بعد ہر ڈرامے، ہر دلچسپی سے بڑھ کر اسے دیکھنا سننا اور اس کا خیال رکھنا دنیا کا سب سے اہم کام لگتا تھا۔ اس سے ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران اپنا من پسند کھانا کھاتے ہوئے گویا یہ گھڑی اس کے لیے دنیا کی سب سے خوب صورت مصروفیت لگتی تھی۔

ایسی ہی مصروفیت میں حسنہ کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے ٹی وی پر چلتے اس منظر نے بالکل اچانک ہی اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی اور وہ خود ایسے ہی آج کل کی عورتوں کے بدلے رنگ ڈھنگ سے خائف رہتا تھا، سر جھٹکتے ہوئے رہ گیا۔

"پتا نہیں کیا ہو گیا ہے آج کل کی عورتوں کو۔ نہ کوئی خاوند کی عزت ہے دل میں اور نہ ہی اس کی

مکمل ناول



مجبوریوں کا احساس۔۔۔ ہر معاملے میں بس اپنی ہی مرضی چلانی ہے ان کو۔۔۔ کبھی بندہ پوچھے کہ اگر اتنا ہی غلط کام ہے دوسرا بیاہ کرنا تو اللہ پاک نے چار شادیوں کی اجازت کیوں دی ہے مرد کو۔۔۔ اور وہ پرانے زمانے کے مرد بھی تو تھے نا، دو چھوڑ کئی کئی بیاہ کرتے تھے ایک وقت میں۔۔۔ پر شاباش ہے ان کی بیویوں کو، صبر سے برداشت کرتی تھیں وہ بھی ایک گھر میں آمنے سامنے۔"

وہ کھل کر اپنی ناگواری کا اظہار کررہا تھا اور ساتھ ساتھ تیرہ منٹ سے الفنف بھی۔۔۔ حسنہ جو بڑے غور سے سنتی نیاز کا لفظ لفظ اپنے اندر اتار رہی تھی ہمیشہ کی طرح سر اثبات میں ہلانے لگی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو نیاز آج کل کی عورت واقعی بڑی اتھلی اور بے صبری ہو گئی ہے۔۔۔ لیکن ابھی بھی دنیا میں ایسی عورتیں موجود ہیں جن کے شوہر دو چھوڑ چار دفعہ بھی کرلیں، ان کو تو نہیں فرق نہیں پڑتا۔"

"اچھا!" وہ اس کے یقین لہجے پر دھیرے سے ہنسا اور سر جھٹک کر کھانا کھانے لگا۔

✱ ✱ ✱

حسنہ، نیاز علی کے سگے چچا کی بیٹی تو تھی ہی۔۔۔ ساتھ ساتھ بچپن سے آج تک پل پل کی سنگی اور ہر خوشی غمی کی ساتھی بھی تھی۔ حسنہ کی ماں نگہت کی شادی کو ابھی دو سال ہی ہوئے تھے جب نیاز کی پیدائش پر اس کی ماں زندگی کی بازی ہار گئی۔ نگہت نے بنا کسی کے کہے سنے۔ بڑی خاموشی سے اس کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

پھر تین سال بعد جب خود اس کے ہاں حسنہ کی پیدائش ہوئی تو نیاز کی تنہائی کو جیسے کھلونا مل گیا۔ وہ اپنا سارا فارغ وقت اس کے ساتھ کھیل کر بتانے لگا اور حسنہ بھی اس کی عادی ہو گئی تھی۔

وقت یونہی گزرتا گیا اور پرائمری کے بعد گاؤں میں مزید تعلیم کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے اس نے پڑھائی کو خیرباد کہہ دیا۔ ایک تو تھوڑی سی زمین سے پہلے ہی بمشکل گزر اوقات ہوتی تھی۔ دوسرا اس کا اپنا دماغ بھی پڑھائی سے زیادہ کام میں چلتا تھا۔۔۔ اس لیے باپ اور چچا نے آوارہ گردی میں وقت ضائع کرنے کا موقع دینے کے بجائے گاؤں کی واحد ورکشاپ میں کام سیکھنے کے لیے بٹھا دیا۔

اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔۔۔ یہ اس کا من پسند کام تھا۔ جسے سیکھنے میں اس نے زیادہ وقت نہیں لیا، اور محض چند ہی مہینوں میں اس فن میں طاق ہو گیا۔

تب ہی ایک دن شہر سے نئی فصل کے بیج لیتے گئے ابا اور چچا کسی ظالم ٹرک ڈرائیور کی اندھی رفتار کی بھینٹ چڑھ گئے اور خون میں لت پت ان کی لاشوں نے گھر اور دل دونوں میں کہرام برپا کر دیا۔

نیاز جیسے تیسے زمین پر کام کرکے روزی روٹی کا سامان کرنے لگا اور حسنہ نے ماں کی حالت دیکھتے ہوئے گھر کا انتظام سنبھال لیا۔ سال پر سال گزرا اور شوہر کی جدائی کے محض چار برس بعد ہی نگہت بھی راہ عدم سدھار گئی۔ مگر جاتے جاتے نیاز اور حسنہ کو ایک بندھن میں باندھ گئی۔ ان دونوں کو بھلا کیا اعتراض ہوتا تھا۔ نیاز کو حسنہ بے حد عزیز تھی اور حسنہ کے لیے تو ساری دنیا ہی فقط نیاز تھا۔ اس کا ہر لفظ حسنہ کے لیے حرف آخر تھا اور وہ حقیقی معنوں میں اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔

نگہت کے گزرنے کے بعد ان کی رشتے کی ایک پھوپھی خدیجہ نے ان کا بڑا ساتھ دیا تھا اور کئی ماہ ان کے پاس ٹھہری رہیں۔ دراصل ان کا اپنا کوئی بھائی نہیں تھا، اس لیے شروع سے ہی حسنہ اور نیاز کے والد انہیں اپنے بھائیوں کی طرح پیارے تھے۔ اسی تعلق نے انہیں ہمیشہ ان دونوں کا خیال رکھنے پر مجبور کیا۔ پھر نیاز گاؤں کی زمین سے منافع نہ پاکر قریبی شہر منتقل ہو گیا تو اس وقت بھی خدیجہ پھوپھی کے بیٹے نے اس کی بھرپور مدد کی۔

زمین کی رقم سے نیاز نے ایک دکان خرید لی اور گاڑیوں کا کلینک بن گیا۔ ہاتھ میں ہنر تو تھا ہی.... سونے پہ سہاگہ اس کی محنت' ایمان داری اور اچھے اخلاق نے کچھ ہی عرصے میں اس کی دکان کو ایک ورکشاپ میں بدل دیا۔۔۔ اچھے علاقے میں گھر بھی خرید لیا اور انور اور نگی نے انہیں والدین کے عہدے پر فائز کر کے ان کی زندگیوں کو بھی مکمل کر دیا۔

خوشیاں ان کے آنگن میں بستی تھیں اور محبت آنکھوں میں۔۔۔ انور بارہ اور نگی سات سال کی ہو گئی تھی' مگر ابھی بھی نیاز کی پُر حدت نظریں حسنہ کے رخساروں پر لالی بکھیر دیتی تھیں' جیسے کوئی نیا نویلا شادی شدہ جوڑا ہو۔۔۔ انہیں ایک دوسرے کی محبت پر ایسا ہی اندھا اعتبار تھا۔۔۔ شاید اس لیے کہ ابھی تک ان کی محبت نے کسی آزمائش کا منہ نہیں دیکھا تھا۔۔۔ اور محبتوں کے بھرم قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسا وقت کبھی آئے بھی نا۔۔۔

☼ ☼ ☼

وہ بڑا منہمک سا آئینے کے سامنے کھڑا اپنے گیلے بالوں کو کنگھی سے جمانے میں مصروف تھا اور حسنہ اسی انہماک سے یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ آج اپنے دوست کی شادی میں مدعو تھا۔ کلف لگے سفید کڑکڑاتے سوٹ کے ساتھ سیاہ ہند جوتی۔۔۔ اور سیاہ واسکٹ کے ساتھ وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دیگر مردوں کی نسبت کم عمری میں ہی شادی کرنے کے سبب وہ کہیں سے بارہ سالہ بچے کا باپ نہیں لگتا تھا۔ ہزاروں نظریں اب بھی اس کی طرف اٹھتی تھیں اور ان میں سب سے جدا نظر حسنہ کی تھی۔ جسے وہ کام والے سیاہ دھبوں سے بھرے لباس میں بھی کسی ریاست کا شہزادہ ہی لگتا تھا۔ اور آج تو وہ واقعی عام دنوں سے بہت مختلف لگ رہا تھا تو حسنہ کیسے نہ اس کی بلائیں لیتی۔ نیاز نے بھی اس کی محویت نوٹ کر لی اور لبوں پر شریر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا؟" اس کا لہجہ بھی شرارت سے بھرپور تھا۔ حسنہ جھینپ کر سر جھکا گئی۔

"چل اب اجازت دے' ایسا نہ ہو کہ دوست بارات لے کر نکل جائے اور میں راہ تکتا ہی رہ جاؤں۔"

اسے کندھوں سے تھامتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا تو حسنہ نے بے تو آزلے آیۃ الکرسی کے حصار میں دے دیا۔

"اور دھیان رکھنا! آج کل کی کڑیاں بڑی تیز ہو گئی ہیں۔۔۔ کہیں کوئی چڑیل ودڑیل نہ عاشق کر والینا۔" نیاز دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دور سے ہی لبوں میں دبی مسکراہٹ چھپا لی اور بڑی معصومیت سے بولا۔

"اپنی طرف سے تو میں پوری کوشش کروں گا۔۔۔ پھر بھی اگر کوئی بے چاری مجبور ہو کے میرے پاس آ گئی تو تو جانتی ہے میں کسی کا دل نہیں توڑ سکتا۔"

"نیاز۔۔۔!" اس کی زبردست گھوری پر وہ ہنستا ہوا باہر نکل گیا تو وہ بھی مسکراتے ہوئے اپنے کاموں میں لگ گئی۔

☼ ☼ ☼

اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور صبح کے گئے نیاز کا ابھی تک کچھ پتا نہیں تھا۔ بارات قریبی گاؤں جانی تھی اور نیاز نے کہا تھا کہ حد سے حد بھی وہ پانچ چھ بجے گھر لوٹ آئے گا اور اب آٹھ سے بھی اوپر ٹائم ہو چکا تھا۔

حسنہ کا پریشانی سے برا حال تھا۔ انور بار بار باپ کا نمبر ملا چکا تھا مگر وہ مسلسل بند جا رہا تھا۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا اور نہ ہی نیاز فطرتاً کوئی لاپروا انسان تھا۔ پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ خدانخواستہ کوئی حادثہ۔۔۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔

"امی! ابو کب آئیں گے؟" انور سمجھ دار ہو رہا تھا اس لیے باپ کے لیے بھی فکر مند تھا۔

تب ہی دروازے پر ایک ٹھہری ہوئی سی دستک ہوئی۔

"لگتا ہے تیرا ابو آ گیا۔" امید و بیم کی کشمکش میں

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے عجلت میں جا کر دروازہ کھولا تو سامنے واقعی نیاز کو دیکھ کر اس کی جان میں جان سی آگئی۔

"شکر ہے نیاز! تم آگئے۔ قسم سے جان سولی پر ٹنگی ہوئی تھی۔ عجیب عجیب خیال آرہے تھے۔ اتنی دیر کیوں لگا دی۔ تم نے تو جلدی آنے کا کہا تھا اور فون بھی بند تھا۔"

اطمینان کی سانس نصیب ہوئی تو اس نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ مگر نیاز نے حیرت انگیز طور پر اس کے ایک بھی سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ہنوز خاموش تھا۔ سنجیدہ اور نظریں چراتا ہوا۔ حسنہ بھی شاید وہ تھکا ہوا ہے اسی لیے ماتھے پر ہاتھ مار کر ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔

"میں بھی کتنی پاگل ہوں نا! بجائے پانی پلانے کے پولیس کی طرح تفتیش کرنے بیٹھ گئی۔ اندر آکے کچھ دیر آرام کر لو۔ میں تب تک پانی لاتی ہوں، پریشانی میں میں نے بھی ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔"

وہ دروازے کے ایک طرف کھڑی اس کے اندر آنے کی منتظر تھی مگر نیاز نے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا تھا۔ اور اپنے محبوب شوہر کی رگ رگ سے واقف حسنہ کو جیسے ہی اس کے ہر انداز کو سمجھ جایا کرتی تھی اب چونکے بنا نہ رہ سکی۔ وہ حیران سی آگے بڑھی تاکہ قریب جا کر اس کے بدلے رویے کی وجہ جان سکے۔ کہ نیاز کی پشت سے نکلا سایہ جو نہی لپٹا وجود اس کی نظر میں آیا وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

ایک فطری عمل کے تحت اس کی سوالیہ نگاہیں نیاز کے چہرے پر جا ٹھہریں۔

"یہ عورت کون ہے نیاز؟" وہ الجھ کر اس ساکت کھڑے وجود کو دیکھ رہی تھی۔ اور کب سے اس لمحے سے بھاگتے نیاز کے لیے نظریں اٹھانا اور بھی دشوار ہو گیا۔

"بتاؤ نیاز، کون ہے یہ۔" جس کی مستقل خاموشی حسنہ کے دل میں گہری شدت کو جنم دے رہی تھی۔

"یہ بیوی ہے میری حسنہ!"

"کس کی بیوی؟" اسے لگا اس کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔

"یہ میری بیوی ہے حسنہ میں نے شادی کی ہے اس سے۔"

"تم… تم اس سے شادی کرنے گئے تھے نیاز؟ مجھ سے جھوٹ بولا تم نے؟" اسے خود بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کیا بول رہی ہے۔ عجیب بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

"خدا کے لیے حسنہ! اتنی بدگمان نہ ہو۔ بھلا میں تم سے جھوٹ بول سکتا ہوں تو جو چاہے قسم لے لے، پر میرا یقین کر میری خوشی نہیں تھی اس سب میں۔ بڑا مجبور ہو گیا تھا ورنہ۔" سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیسے یقین دلائے۔

دنیا کے تمام پہاڑ بھی اگر اس پر توڑ دیے جاتے تب بھی حسنہ کے لیے قیامت کے معنی نہیں بدل سکتے تھے۔ اس کی اپنی ہی کہی بات کل چند دنوں میں یوں سچ ہو جائے گی۔ آسمان ٹوٹنا کسے کہتے ہیں؟ وہ اب سمجھ رہی تھی۔ زمین قدموں کے نیچے سے کیسے سرکتی ہے… وہ محسوس کر رہی تھی۔ اور جب زمین سرک جائے تو کھڑے رہنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے دیوار سے ٹکرائی اور دھیرے دھیرے زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے گہری خاموشی کے حصار میں تھی اور نیاز اسی خاموشی کی بدولت اس سے بات کرنے کے لیے ہمت باندھ رہا تھا۔ اس کے ساکت وجود کو کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح بے جان دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گیا تھا۔ شگفتہ کو بچوں کے ساتھ بھیج کر وہ اس کے کمرے میں آیا۔

بے بسی کے گہرے احساس سے مغلوب ہو کر اس نے بھیگی پلکوں کے ساتھ اسے خود میں بھینچ لیا۔ اور پھر وہ یوں بلک بلک کر روئی کہ نیاز کے لیے سنبھالنا

مشکل ہو گیا۔

چاہے وہ جتنے بھی حوصلے کا دعوے کر لی۔ تھی تو ایک عورت ہی ناں! جان سے عزیز شوہر کو سوکن کے ساتھ بانٹنے کا خیال ہی رگوں میں کانٹے پیوست کرنے کے لیے کافی تھا۔ دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام کر سہلاتے ہوئے بولا۔

"مجھے احساس ہے حسنہ! میں نے تجھے بڑی چوٹ پہنچائی ہے۔ پر یقین مان۔ یہ سب میں نے خوشی سے نہیں کیا۔ تو اور میرے بچے ہی میری کل کائنات ہیں۔ اور میں اب بھی یہ بیاہ کر کے ہو محض کسی کی زندگی برباد ہونے کا نہ ہوتا۔ کسی کو مصیبت میں دیکھ کے منہ پھیرنے والوں میں سے نہیں ہے تیرا نیاز... تو جانتی ہے ناں۔"

"وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ حسنہ سے زیادہ کسے علم تھا" اس نے چونک کر نیاز کو دیکھا۔

"بشیر اور اس کی بیوی کا انتقال خیر خیریت سے ہونے کے بعد ہم لوگ دعا مانگ رہے تھے جب اس لڑکی کا چاچا اسے زبردستی گھسیٹتا ہوا احاطے میں لے آیا۔ یہ بہت روری تھی شور بھی مچا رہی تھی لیکن اس کا چاچا اس کی ایک بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ زبردستی اس کا نکاح ایک ستر سالہ لفنگے بڈھے سے کروانے پر تلا ہوا تھا، جس سے پچیس ہزار روپے لے کر اس نے کھا لیے تھے اور اب بدلے میں اپنی سگی بھتیجی دے کر جان چھڑا رہا تھا۔

سب نے اسے بہترا سمجھانے کی کوشش کی۔ پر عملی طور پر مدد کے لیے کوئی بھی آگے نہیں آیا۔ یقین کر حسنہ! وہ بے چاری ایسے رو رو کے دہائیاں دے رہی تھی کہ میرا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ میں نے اس کے چاچے سے کہا۔ کہ پیسے میں دے دیتا ہوں تو اسے گھر لے جا اور کسی اچھی جگہ اس کی شادی کر دے، پر وہ مانا ہی نہیں۔ اور اس کی بیوی اب کسی صورت اسے گھر رکھنے کو راضی نہیں تھی۔ اس نے ان کی شرط تھی کہ جو بھی پیسے دے گا اسے لڑکی کو بھی ساتھ ہی لے جانا پڑے گا۔"

"تو تو ویسے ہی لے آتا اسے۔ تم کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈ کر خود ہی اس کا بیاہ کر دیتے۔ نکاح کرنے کی کیا مجبوری تھی؟" حسنہ نے پہلی بار اس پورے معاملے پر اپنی چپ توڑی تھی۔ نیاز احمد ہی اندر اطمینان محسوس کر تا اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"میں نے بھی ان سے یہی کہا تھا حسنہ۔ پر لٹنے لوگوں میں اس کے چاچا کی ساری غیرت اچانک ہی جاگ گئی۔ اور اس نے نکاح کے بغیر اپنی بھتیجی کو کسی کے بھی ساتھ بھیجنے سے صاف انکار کر دیا۔ میں نے لوگوں کی بڑی منتیں کیں۔ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر بھی منایا کہ وہ اس لڑکی کو اپنا لیں۔ پر ان میں سے کوئی بھی اس کے چاچے جیسے بے غیرت کمینے سے رشتہ جوڑنے کو تیار نہیں ہوا۔ سب نے اپنے قدم پیچھے کر لیے حسنہ لیکن میں نہ کر سکا۔ جانتی ہے کیوں؟ کیونکہ میرے سامنے میری گڑیا کا چہرہ آ گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کی جگہ میری اپنی دھی ہوتی تو..." اس سے آگے بولا ہی نہیں گیا۔

"نہیں۔" حسنہ سوچ کر ہی کانپ اٹھی تھی۔ نیاز اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے دکھ سے مسکرا دیا۔

"میں بھی اس وقت ایسے ہی اندر سے ہل گیا تھا حسنہ! جب یہ سوچ میرے دماغ میں آئی۔ حالانکہ میں تیرا مقام تیری جگہ کسی دوسری عورت کو دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا، پھر بھی میں نے یہ سب کیا۔ صرف اسی لیے کہ شاید آج میں کسی اور کی دھی کی عزت بچا لوں تو رب سوہنا بدلے میں میری دھی کا نصیب بھی کھول دے۔ تو ہی بتا حسنہ۔ کیا میں نے غلط کیا۔ ہمیشہ، ہر موقع پر تو نے میرا ساتھ دیا ہے۔ تو کیا آج اپنے نیاز کو اکیلا چھوڑ دے گی؟ بتا ناں حسنہ، سہارا نہیں دے گی مجھے؟ ساتھ نہیں دے گی میرا؟" وہ مان سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور حسنہ۔

اس نے تو کبھی نیاز کی کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا، کبھی اختلاف نہیں کیا تھا۔ تو پھر آج کیسے کرتی۔ آج جبکہ وہ اس سے کچھ مانگ بھی رہا تھا اور نیاز حسنہ سے کچھ مانگے اور حسنہ نہ دے۔ ایسا تو ہو ہی

[illegible] دیکھنے کے لیے اس کے پاس صرف پھول تھے۔

اس کے اثبات میں ہلتے سر کو دیکھ کر نیاز کے کندھوں سے جیسے کوئی بھاری بوجھ سرک گیا تھا۔ تشکر کے جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے حسنہ کے ہاتھ کی پشت کو نرمی سے چھو لیا تو وہ بھیگی پلکوں سے مسکرا دی۔

یہ ان دونوں کے لیے مشکل ترین وقت تھا۔ جو ایک پر سے گزرا تو دوسرے کے لیے ٹھہر گیا تھا۔ مگر اسے خبر نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح حسنہ معمول کے مطابق اٹھ کر نیاز اور بچوں کے لیے ناشتہ تیار کرنے لگی تھی۔ زندگی کی داستان میں ایک نئے کردار کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جسے ہر پل نظروں کے سامنے دیکھ کر جینا آسان تو نہیں تھا، مگر نیاز کی محبت کے سہارے وہ یہ پل صراط پار کرنے کو بھی تیار ہو گئی تھی۔

اس کے زندہ رہنے کے لیے تو فقط نیاز کا چہرہ جواز تھا۔ اور خوشی کے لیے یہ گمان کہ کوئی عورت چاہے اس کی زندگی میں جس حیثیت سے بھی داخل ہو۔ مگر اس کے دل تک رسائی صرف حسنہ کی تھی۔ گزری رات نے اس کے گمان پر یقین کی کئی مہریں ثبت کر دی تھیں اور اسی یقین کی طاقت تھی کہ وہ ہر طوفان کے خوف سے بے پروا ہو گئی۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔

کیونکہ اندھی محبت ہو یا اندھا یقین۔ ہمیشہ گہری کھائی میں گراتا ہے۔

☆ ☆ ☆

شام کو نیاز جلدی گھر لوٹ آیا تھا۔

"پتا نہیں حسنہ کیسے خود کو سنبھال رہی ہو گی؟ گھر میں کیا ہو رہا ہو گا؟" کیسے متضاد خیالات نے سارا دن اسے یوں بے چین رکھا کہ وہ چاہ کر بھی ورکشاپ کے کسی کام میں دلچسپی نہ لے پایا اور جلدی گھر کی طرف [illegible] ہوم ورک کر رہے تھے اور حسنہ۔

کچن سے آتی کھٹر پٹر کی آوازوں پر وہ اندازہ لگاتا اس طرف چلا گیا۔ جہاں حسب معمول وہ رات کا کھانا بنانے میں مشغول تھی۔

"کیا بنایا جا رہا ہے؟" اس سے بات کرنے کی غرض سے لہجے میں خوشگواریت بھرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"تیری پسند کا گوبھی گوشت۔" اس نے بھی بظاہر مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا مگر مسکراہٹ میں ہمیشہ والی چمک اور بے ساختگی مفقود تھی جو نیاز کی زیرک نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے گہرا سانس بھرتے ہوئے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"تو کیوں فکر کرتی ہے حسنہ۔ میں ہوں نا تیرے ساتھ، تیری جگہ کبھی کوئی نہیں لے سکتا۔ یقین کر میرا۔"

"پتا ہے مجھے۔" نیاز کی تسلی نے اس کے چہرے پر اعتبار کا اجالا بکھیر دیا اور وہ پہلے سے بہتر نظر آنے لگی۔

"تم میری ٹینشن نہ لو۔ تھکے ہوئے ہو۔ جاؤ نہا کے کپڑے بدل لو۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔ بچے بھی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔"

اس کے کہنے پر وہ سر ہلاتا کچن سے چلا گیا۔ حسنہ نے تازہ روٹی بنائی اور کھانا دسترخوان پر لگا دیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ لوگ کھانا شروع کرتے اس نے سنجیدہ سی آواز میں بیٹے کو پکارا۔

"انور! پتر جا۔ اس کڑی کو بھی بلا لے روٹی کے لیے، تیرے ساتھ والے کمرے میں ہو گی۔" نیاز نے بے اختیار چونک کر اسے دیکھا تھا مگر وہ جان کر بھی انجان بنی رہی۔ کیونکہ اس کے سوا اب اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ صبح اس نے انور کے ہاتھ اس لڑکی کا ناشتہ اس کے کمرے میں بھجوا دیا تھا، لیکن پھر اس نے سوچا کہ آخر کب تک۔ اگر اس نے اسے اس گھر اور نیاز کی زندگی میں برداشت کرنے کا کڑوا گھونٹ بھر ہی

لیا تھا تو پھر اسے ایک کونے تک محدود رکھنے کا کیا فائدہ۔ اس گھر کی ہر چیز اور سب سے بڑھ کر خود نیاز پر بھی اس گھر کے ہر فرد کے برابر حق رکھتی تھی وہ۔۔۔ اور حسنہ حق مارنے والوں میں سے نہیں تھی۔

"پر امی۔۔۔ وہ لڑکی کون ہے اور ہمارے گھر کیوں آئی ہے؟" اور کے سوال پر حسنہ چپ رہ گئی۔ نیاز نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

"آنٹی ہے وہ تمہاری پتر! چل اب جلدی سے اسے بلا لا' بڑی بھوک لگی ہے سب کو۔" باپ کے کہنے پر وہ مزید کوئی سوال کیے اٹھ گیا تھا۔

اس شام دسترخوان کا ماحول بڑا کھنچا کھنچا سا رہا۔ بچے مہمان کی وجہ سے جھجکے ہوئے تھے۔۔۔ اور حسنہ گھر والوں کا ساتھ دینے کے لیے صرف کھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جس کا احساس نیاز کو تھا اس لیے وہ مسلسل اسے کھانے کے لیے اکسا رہا تھا۔ کبھی سالن اس کی پلیٹ میں ڈالتا۔۔۔ کبھی نوالہ بنا کر زبردستی کھلاتا۔ کسی کا دھیان بھی اس نئی لڑکی شگفتہ کی طرف نہیں تھا۔

شگفتہ۔۔۔ جسے سادہ فطرت حسنہ نے اس کی کم عمری کے باعث ایک بے ضرر انسان سمجھ کر قبول کر لیا تھا مگر نہیں جانتی تھی کہ وہ لاکھ کم عمر سہی۔۔۔ بے ضرر ہرگز نہیں تھی۔ سوتیلے باپ کے بغیر ہوئی اس کی پرورش میں کہیں بھی تربیت کا عنصر شامل نہیں ہو سکا تھا اور سے چچی کی شاطرانہ چالوں کو سمجھتے اور ان کا مقابلہ کرتے اس کے اندر کی معصوم لڑکی بہت پہلے ایک گھاگ عورت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک ایسی گھاگ عورت جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے کا ہنر جانتی تھی۔

اور اسی گھاگ عورت نے حسنہ کے لیے نیاز کی فکر اور پریشانی اور ایک نئی نویلی دلہن سے عدم دلچسپی کا عالم دیکھ کر لمحوں میں ان کے تعلق کی گہرائی کو بھانپ لیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اگر اسے نیاز کی زندگی میں جگہ بنانی ہے تو سب سے پہلے حسنہ کو اس کی زندگی سے بھی بے دخل کرنا ہو گا۔۔۔ ورنہ وہ اس گھر میں بھی اپنی جڑیں مضبوط نہیں کر سکے گی۔ یہ سچ تھا کہ وہ نیاز کی پہلی بیوی تھی۔ مضبوط اور مستحکم حیثیت کی مالک۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر اس کے بچوں کی ماں۔۔۔ لیکن شگفتہ کے پاس بھی وہ ہتھیار تھا جو بڑے بڑے اتھرے مردوں کے ہوش دنوں میں ٹھکانے لگا دیتا ہے۔

وہ نوجوان تھی' خوب صورت اور نئی بھی۔۔۔ اور اسے اچھی طرح پتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ حسنہ نے اسے قبول کرنے کی بے وقوفی کی تھی مگر اس کا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کو حتمی شکل دی اور مسکراتے ہوئے کھانا کھانے میں مگن ہو گئی۔۔۔ جو واقعی بہت مزے کا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ رات اس کی زندگی کی سب سے طویل رات تھی' اور بوجھل اتنی کہ کاٹے نہیں کٹ رہی تھی۔ سینے میں اٹکی گھٹن سے گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھی اور لمبے لمبے سانس لے کر بے چین دل کو سنبھالا دینے کی کوشش کی۔۔۔ مگر دل نے کیا سمجھنا تھا' الٹا دوسری طرف کا خالی بستر دیکھ کر اور بے کل ہو گیا۔

اتنے برسوں میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اس کمرے میں تنہا تھی نیاز کے بغیر۔۔۔ اور وہ یہیں تھا اسی گھر میں دوسرے کمرے میں کسی اور کے ساتھ۔۔۔

اس نے کرب کی شدت سے لب بھینچ کر ضبط کرنے کی کوشش کی۔۔۔ مگر اپنے ہی وجود سے پریشان آنسو بے اختیار گالوں پر لڑھکتے چلے گئے۔۔۔ اور وہ ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس درد کے لیے وہ کسی کو الزام نہیں دے سکتی تھی۔ نیاز کو بھی نہیں۔۔۔ اس نے خود ہی تو اسے اس کمرے میں بھیجا تھا۔ اپنی رضا سے' منشا سے اس درد کا انتخاب کیا تھا۔ نیاز بے چارا تو خود اس کا یہ فیصلہ سن کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ حسنہ کے لیے اس کی طرف دیکھنا محال ہوا تو بات کرنے کے لیے دیکھنا ضروری بھی نہیں ہوتا' خاص کر تب جب نظریں الفاظ منجمد کرنے لگیں۔

"بات نیت کی نہیں ہے نیاز! اس ذمے داری کی

بھی تو تم نے اللہ اور اس کے رسول کو گواہ کر کے سب کے سامنے اس کی بچی لی ہے۔ اس لیے اس کا خیال رکھنا اس کو وقت دینا اور اس کے حقوق پورے کرنا تم پر فرض ہے بالکل ویسے ہی جیسے تم میرے اور بچوں کے لیے کرتے ہو۔ دل کی مرضی نہیں تو مجبوری سمجھ کے ہی سہی۔ جیسے میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا ہے۔

میں یہ نہیں چاہتی کہ کسی ناانصافی کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب ہو اور تم بے سکون ہو یا اگلے جہان میں اس زیادتی کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول کے سامنے مجرم بن جاؤ۔ میں تمہیں کسی بھی شکل میں گرفتار نہیں دیکھ سکتی نیاز!"

اس کے قول اور فعل میں سچ اور خلوص نیت کے سوا اور کوئی سوچ کار فرما نہیں تھی۔ وہ واقعی نیاز کو کسی مشکل میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ خواہ اس کے لیے اسے خود ہی کیوں نہ تکلیف اٹھانا پڑتی۔

جب کہ دوسری طرف اس کی کیفیات اور شدتوں کے بالکل برعکس نیاز سب کچھ بھلائے، چہرے پر حسین تاثرات کا اک ہجوم لیے بڑے غور سے شگفتہ کو سن رہا تھا جو معصومیت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے اپنے چچا چچی کے مظالم اور اپنی مظلومیت کی داستان بڑے رقت بھرے لہجے میں سنا کر اس کا دل کھینچ رہی تھی۔ کیونکہ اس کا ماننا تھا کہ نرم زمین پر پرانے نقش مٹانے سے نئے ثبت کرنا کہیں آسان ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہو رہی تھی نیاز کو دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا جو اس کے الفاظ پر آنکھیں بند کر کے یقین کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

محض کچھ ہی دنوں کا کھیل تھا اور شگفتہ نے اپنی چالاکی اور مصنوعی بھولپن سے نیاز کے دل سے اپنائیت، خلوص اور محبت کی تمام دیواروں کو زمین بوس کر دیا۔ اور وہی نیاز جو اس سے بات کرتے بھی کتراتا تھا، کھل کھلا اس سے مخاطب ہو کر دلچسپی کا اظہار کرتا تھا۔ اب اس کی شگفتگی سے لطف کشید کرنے لگا۔

حسنہ کے سادہ سے انداز کی نسبت شگفتہ کی دلبرانہ اور حشر خیز اداؤں نے نیاز کو عورت کے ایک نئے روپ سے آشنا کیا تھا جس نے اس کے اندر شوق اور تجسس کی ایک نئی دنیا آباد کر دی تھی۔ اس لیے وہ ورکشاپ سے آتے ہی جلد سے جلد کمرے میں جانے کی کوشش کرتا۔ زیادہ سے زیادہ وقت شگفتہ کے ساتھ گزارنا، اس کی باتیں سننا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔

شگفتہ کو بھی بخوبی احساس تھا کہ نیاز کافی حد تک اس کے کنٹرول میں آ چکا تھا مگر یہ اس کی منزل نہیں تھی۔ کسی بھی وقت حسنہ کے آنسو اسے واپس اسی مقام پر لے جا سکتے تھے جہاں سے وہ چلا تھا۔ اسی لیے اس کا اگلا ہدف حسنہ تھی۔ وہ اس کا اور نیاز کا آمنا سامنا اور بچا کھچا تعلق بھی اس حد تک ختم کر دینا چاہتی تھی کہ شکوے شکایات اور سچ جھوٹ کی جانچ پڑتال کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے اور نیاز کے پاس شگفتہ کی بات پر یقین کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ بچے۔

اس مقصد کے لیے اس نے سب سے پہلے ساتھ کھانا کھانے کی روایت توڑنے کی ٹھانی۔ کیونکہ اب صبح و شام کی ان ملاقاتوں کے علاوہ نیاز کا حسنہ اور بچوں سے اب شاذ و نادر ہی سامنا ہوتا تھا۔ اسی لیے رات ورکشاپ سے واپسی پر جب نیاز اسے کھانے کے لیے بلانے آیا تو اس نے نخرے سے انکار کر دیا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"دن میں زیادہ کھا لیا تھا کیا؟" اس کے انکار پر وہ پریشانی سے پوچھتا اس کے قریب چلا گیا تو اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

"پھر کیا بات ہے؟ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ!" اس کے اصرار پر وہ نظریں جھکا کر جھجکتے ہوئے بولی۔

"وہ دراصل۔ میں جب بھی آپ کے ساتھ کھانا کھانے جاتی ہوں ناں تو حسنہ آپا بار بار مجھے اتنی عجیب نظروں سے دیکھتی ہیں کہ میری بھوک ہی مر جاتی ہے اور پھر مجھ سے کچھ کھایا ہی نہیں جاتا۔"

"کہاں ہے حسنہ؟" نیاز کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

"نہیں نہیں۔۔۔ مجھے یقیناً" کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں دو دن ہو آیا ہوں میں نے تو کبھی ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی۔" شگفتہ جانتی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے نہیں مانے گا' اس لیے جھٹ سے آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔

"اسی لیے میں آپ کو نہیں بتا رہی تھی۔ پتا تھا مجھے آپ یقین نہیں کریں گے۔۔۔ کیونکہ آپ کے ساتھ تو وہ بہت اچھی بنی رہتی ہیں ناں۔۔۔ آپ پوچھیں گے تو بھی نہیں مانیں گی۔ آپ کو راضی رکھنے کے لیے ہی تو انہوں نے مجھے قبول کرنے کا ڈراما کیا ہے۔۔۔ ورنہ ان کی آنکھوں میں 'اپنے لیے نفرت میں صاف محسوس کر سکتی ہوں۔ ایک سوکن سے بھلا کسی کو کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔۔۔ میں جیوں یا مروں ان کی بلا سے۔"

اس کی بھیگی آنکھوں نے یکایک نیاز کی سوچوں کا رخ موڑ دیا تھا۔۔۔ اور پھر اس کی بات میں وزن بھی تھا۔ نیاز نے واقعی کبھی کسی عورت کا دل اپنی سوکن کے لیے اتنا بڑا نہیں دیکھا تھا۔ آخر تھی تو وہ بھی ایک عورت ہی ناں!

اس وقت وہ یہ بھول گیا کہ شگفتہ بھی تو حسنہ کی سوکن ہی تھی تو وہ بھی ہو سکتی تھی۔۔۔ مگر وہ لاتو تھا ناں۔

"چل ایسا ہی ہو گا جیسے تو کہہ رہی ہے۔۔۔ پر اب اس بات کے پیچھے تو ساری رات بھوکی تو نہیں رہ سکتی ناں! میں ایسا کرتا ہوں کہ تیرا اور اپنا کھانا کمرے میں ہی لے آتا ہوں۔۔۔ دونوں مل کر کھائیں گے۔ میرے ساتھ تو تجھے کوئی پریشانی نہیں ہو گی ناں؟"

اس کے محبت سے پوچھنے پر شگفتہ نے شرما کر سر نفی میں ہلا دیا۔ یہی تو وہ چاہتی تھی۔ وہ گھر توڑ رہی تھی اور حسنہ کا دل بھی۔۔۔ جو نیاز کو الگ سے ٹرے میں کھانا نکالتے دیکھ کر حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

اس کے بغیر کھانا کھانے کے تصور سے نیاز کے لیے بھوک کا احساس ہی مٹ جاتا تھا اور آج وہ دوسری عورت کے ساتھ۔۔۔ دس سال کی عادت ختم ہوتے نہیں دن بھی نہیں لگے تھے اس کے لیے یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

✿ ✿ ✿

الگ کھانے کا وہ عمل پھر صرف ایک رات تک ہی محدود نہیں رہا تھا بلکہ بار بار دہرائے جانے کے سبب معمول کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ بچوں کی اپنی ہی روٹین تھی۔۔۔ اور حسنہ محض جسم و جاں کی ڈور بندھے رکھنے کے لیے کھانے کا سہارا لینے لگی۔۔۔ اور وہ دستر خوان جو کبھی بڑی شان سے سجا کرتا تھا' ویران ہو کے رہ گیا۔۔۔ حسنہ خاموشی سے دن رات اپنے کام نمٹائے جاتی۔ صبح و شام کا کھانا بنانا اس کی زندگی میں دلچسپی کا واحد سامان رہ گیا تھا کیونکہ وہ کھانا نیاز کھاتا تھا اور حسنہ کی خوشی کے لیے یہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔

شگفتہ کئی دن تک بڑی گہرائی سے اپنی سوکن کی فطرت کا اندازہ لگاتی رہی۔ مختلف آڑی باتوں سے اسے تنگ کرتی رہی۔۔۔ اور جب اسے اچھی طرح تسلی ہو گئی کہ وہ چاہے کچھ بھی کر لے۔۔۔ حسنہ ان دونوں کی لڑائی میں نیاز کو گھسیٹ کر پریشان نہیں کرے گی۔۔۔ تو وہ کھل کر میدان میں آ گئی۔

نیاز کے ناشتہ کر کے ورکشاپ کے لیے نکلتے ہی وہ تن فن کرتی کچن میں آئی اور دروازے کی اوٹ میں لگا گھر کی چابیوں کا گچھا اپنے قبضے میں کر لیا۔ بچوں کی خالی روٹی میں سے لقمہ لیتی حسنہ نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ دونوں ہاتھ کمر پر ٹکائے طنزیہ نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔۔۔ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" اس نے رخ موڑ کر عام سے انداز میں پوچھا تھا مگر شگفتہ کا انداز عام تھا اور نہ ہی الفاظ۔

"دیکھ رہی ہوں کہ بڑے عیش اڑا لیے ہیں تم اور بچوں نے نیاز کے پیسے پر۔۔۔ لیکن اب جب تمہاری راجدھانی ختم ہونے والی ہے تو کیسے گزارا کرو گے تم لوگ۔۔۔؟" اس کے لہجے کی تلخی نے نہ چاہتے ہوئے بھی حسنہ کو ششدر کر دیا تھا' وہ اگلا نوالہ لینا بھول گئی۔

"کیا مطلب۔۔۔؟"
"مطلب یہ کہ جیسے سہاگن 'پیا من بھائی' ہوتی ہے ویسے ہی گھر میں حکم بھی تو اسی عورت کا چلنا چاہیے ناں جو اپنے شوہر کے دل پر راج کرے۔۔۔ جبکہ تمہارا شوہر تو تمہاری طرف دیکھتا بھی نہیں ہے، پھر یہ چابیاں تمہارے پاس کیوں۔۔۔؟" سوالیہ انداز میں بھنویں اچکاتی وہ عین اس کے چہرے کے سامنے رکی اور آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔
"بس اسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اب سے یہ چابیاں میرے پاس رہیں گی۔ تمہاری حاکمیت ختم۔۔۔ اگر نیاز میرا ہے تو اس کا گھر اور اس میں چلنے والا حکم بھی تو میرا ہی ہونا چاہیے ناں۔۔۔ کیوں میں غلط کہہ رہی ہوں کیا؟"
اس کے چہرے پر طنز سی مسکراہٹ تھی۔ حسنہ افسوس سے اسے دیکھے گئی۔۔۔ دکھ دھواں بن کر نہ چاہتے ہوئے بھی اندر بھرنے لگا اور وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔
"کیوں کر رہی ہے تو یہ سب کچھ۔۔۔؟ اگر میں نیاز کی پہلی بیوی، اس کے بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی دل بڑا کر سکتی ہوں تو تھوڑا سا جگرا تو بھی دکھا سکتی ہے۔ اگر تجھ میں واقعی انسانیت ہے تو ورنہ جس نیاز کا تو گمان کر رہی ہے ناں، اسے تیری حرکتوں کے بارے میں بتا دوں تو ایک منٹ میں چوٹی سے پکڑ کے باہر کرے گا تجھے۔"
"اوہو۔۔۔ دھمکی۔" شگفتہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور استہزائیہ نظریں حسنہ پر گاڑ دیں۔
"کس خیال میں ہو تم حسنہ بیگم! نکالنے کی جرات وہ اب کبھی نہیں کر سکتا بلکہ لو یہ بات۔۔۔ اتنے دن تیل نہیں بیچا میں نے۔۔۔ اور اس سب کے باوجود اگر تم اپنا شوق پورا کرنا چاہو تو یاد رکھنا۔۔۔ کہ ہم دونوں کے اس جھگڑے میں نیاز کو پاگل کرنے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں کر پاؤ گی۔"
اس نے بڑی چالاکی سے حسنہ کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا اور لاپروائی سے سیب دھوتے ہوئے بولی۔
"چلو اب جلدی سے کچن صاف کرو، پھر مجھے اسے تالا بھی لگانا ہے۔ آئندہ کچن ناشتے کے بعد بند ہو گا تو پھر صرف شام میں ہی کھلا کرے گا اور میری مرضی کے علاوہ کچھ نہیں بنے گا اس گھر میں۔۔۔ بہت عیاشی کر لی تم لوگوں نے اب اور نہیں۔"
وہ رعونت سے کہہ کر جانے لگی تھی، جب حسنہ نے فکرمندی سے پکار لیا۔
"لیکن اگر باورچی خانہ دوپہر کو بند ہو گا تو بچے اسکول سے آکر کیا کھائیں گے؟ میری تو خیر ہے مگر انہیں تو بھوک لگی ہوگی ناں۔۔۔!"
"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔۔۔ اور ویسے بھی اتنے سالوں میں کچھ نہ کچھ جمع جوڑ تو کیا ہی ہو گا تم نے۔۔۔ اگر اتنی ہی فکر ہے بچوں کی تو بازار سے منگوا لینا کچھ۔"
۔۔۔ تنفر سے کہہ کر وہ چلتی بنی تھی اور حسنہ دوپہر کے لیے پریشان ہوتی برتن سمیٹنے لگی۔

☼ ☼ ☼

دوپہر میں بچے حسب معمول اسکول سے لوٹے تو بھوک، بھوک کا شور مچا کر ماں سے کھانا مانگنے لگے۔ اب حسنہ انہیں کیا بتاتی۔۔۔ نیاز ہمیشہ سے اس کی ذاتی ضرورتوں کے لیے الگ سے پیسے دیا کرتا تھا، جو بھی خرچ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔۔۔ مگر شاید وہ اسی وقت کے لیے رکھے تھے۔۔۔ اس نے تھوڑے سے پیسے نکال کر انور کو دیے اور بازار سے کھانا لانے کو کہا۔
"کیا امی۔۔۔ آج گھر میں کچھ نہیں پکایا؟ رات کا تو رکھا ہو گا، میں وہی لے کر آتا ہوں۔" وہ اسکول سے تھکا ہوا آیا تھا، اسی لیے باہر جانے سے کتراتا کچن کی طرف بھاگا۔ حسنہ نے بھی نہ روکا۔۔۔ جانتی تھی ابھی منہ لٹکائے واپس آئے گا اور وہی ہوا۔
"امی۔۔۔ کچن میں تالا کیوں لگا ہے؟" ماں کے پاس آکر اس نے پوچھا۔ پھر ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔
"لائیں چابیاں دیں۔۔۔ میں فریج سے کچھ لے کر آتا ہوں۔" اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ حسنہ کے

سامنے تھے اور نظریں چرانے پر مجبور۔

"نہیں ہیں میرے پاس کوئی چابیاں۔۔۔ امی نے لے لی ہیں اور تالا بھی اس نے لگایا ہے۔ آج تو تو ایسے چلا گیا تھا آنٹی پیسے لے کر جا اور اپنے دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ لیتے آنا۔۔۔ کیونکہ اب دوپہر میں کچن نہیں کھلا کرے گا۔"

اپنے آنسو چھپانے کے لیے وہ رخ موڑ کر چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی تھی۔ انور کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ وہ بچہ ضرور تھا مگر اتنا بچہ بھی نہیں تھا کہ کچھ سمجھ نہ پاتا۔ باپ کا نئی بیوی کی طرف جھکاؤ وہ صاف محسوس کر رہا تھا اور اپنی ماں کی اداسی بھی۔۔۔ اور یہ سب کچھ اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اچھے اور برے کی تخصیص اس کے معصوم ذہن میں ایک نئی جنگ چھیڑ چکی تھی جس سے نبرد آزما ہوتا وہ خاموشی سے کھانا لینے چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"سارا دن گاہکوں کے ساتھ مغز ماری کرتے دماغ تھکا ہو گیا۔ ذرا جو سکون آیا ہو۔۔۔ سر بھی دکھنے لگا ہے اب تو۔۔۔ ہاں اگر کوئی محبت سے دبا دے تو شاید آرام آجائے۔" اس نے کن انکھیوں سے کپڑے تہ کرتی شگفتہ کی طرف دیکھا تو وہ اس کا مطلب سمجھ کر مسکراتی ہوئی بیڈ پر آ گئی۔

آج بہت کام تھا اسے ورکشاپ میں۔۔۔ اس لیے وہ رات میں بھی دیر سے آیا تھا اور اب کھانا کھا کر چائے کے بجائے یہ فرمائش۔۔۔ وہ شگفتہ کا ساتھ چاہ رہا تھا یعنی وہ مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں آ چکا تھا۔ شگفتہ اپنی اس کامیابی پر اندر ہی اندر خوش ہوتی بظاہر دھیما سا مسکرا رہی تھی۔۔۔ نیاز کا سر دباتے دباتے وہ کئی بار اپنی پیشانی بھی مسل چکی تھی۔۔۔ جسے بالآخر نیاز نے محسوس کر ہی لیا۔

"تیرے سر میں بھی درد ہے کیا؟ کہیں دونوں کے بیچ جنگ تو نہیں ہو گئی۔۔۔ لڑ لڑا کے متھا ہی گرم کروالیا ہو اپنا۔" اس کے شرارت بھرے استفسار پر اس نے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ طاری کر لی۔

"میری کیا اوقات کہ آپا سے جھگڑا کروں۔۔۔ میرے نصیب میں تو بس دن رات ان کی پھٹکار سہنا اور ان کے ہاتھوں ذلیل ہونا ہی لکھا ہے۔ بیگم جو ہوئی اور وہ اس گھر کی مالکن۔۔۔ بھلا میں ان سے لڑنے کی ہمت کیسے کر سکتی ہوں؟"

"خیر مالکن تو اب تو بھی ہے اس گھر کی۔۔۔ وہ بھی پورے برابر حق کے ساتھ۔" وہ اپنی پیشانی پر دھرا اس کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے بولا۔

"پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ حسنہ کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ ایسی تو نہیں تھی۔۔۔ بڑی سادہ دل اور احساس کرنے والی فطرت تھی اس کی۔"

"کچھ نہیں ہوا اور نہ ہی کچھ بدلا ہے۔ اپنے شوہر اور بچوں کے لیے تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔۔۔ بس فرق یہ پڑا ہے کہ ایک بے سہارا لڑکی ان کے بیچ آ گئی اور ان کے اندر کی ظالم اور سخت دل عورت کو باہر نکلنے کا راستہ مل گیا۔ ورنہ ہیں تو وہ ہمیشہ سے ہی ایسی۔۔۔ بس آپ ہی انہیں پہچان نہیں پائے۔"

شک کی طرح نفرت کا بیج بھی بس ایک بار بونے کی دیر ہوتی ہے پھر اس کو تناور درخت بنانے میں زیادہ محنت نہیں لگتی۔۔۔ اس کی بڑھتی شاخیں محبت، عقل اور بھروسے سمیت سب کچھ سلب کر لیتی ہیں۔۔۔ اور انسان اس کے جال میں یوں جکڑا جاتا ہے کہ پھر نکلنے کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔۔۔

نیاز کے ساتھ بھی اس وقت یہی کچھ ہو رہا تھا۔۔۔ اور اس کی ساکت بے سوچ نظریں چھت پر لگی تھیں۔

☆ ☆ ☆

شام گہری ہو کر رات میں ڈھل چکی تھی اور حسنہ تنہائی کی سیج سجائے دھیرے دھیرے کرب کے ساتھ اپنے دل میں بھی اندھیرا اترتے محسوس کر رہی تھی۔

نیاز اس رات جو اس سے بچھڑا تو پھر اب تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ بچھڑنا صرف نظروں سے اوجھل ہونا ہی تو نہیں ہوتا۔ بعض اوقات کوئی سامنے ہو کر بھی

قریب ہو کر بھی بچھڑ جاتا ہے۔ ایسے بچھڑنے کی اذیت کی کوئی حد۔۔۔ نہیں ہوتی۔

وہ ان دنوں ایسا ہی کرب جھیل رہی تھی۔ اکثر ساری رات اسی امید پر جاگتے گزار دیتی کہ کہیں نیاز اس کے دروازے پر آئے اور اسے سوتا پا کر واپس ہی نہ پلٹ جائے۔۔۔ مگر کیا زندگی پر محیط تعلق کو' سالوں سے امر بیل کی طرح دل سے لپٹی محبت کو ختم ہونے میں' مرجھانے میں' مرنے میں فقط اتنا ہی وقت لگتا ہے۔

"نہیں' نہیں۔" وہ اس کا دل ماننے کو تیار نہ ہوتا اور سر بے اختیار نفی میں ہلاتے ایک نئی سوچ دل کے کونوں میں براجمان ہونے لگتی کہ شاید نیاز بے قصور ہے۔ یہ شگفتہ ہی ہے۔ جس نے اپنی عیاری سے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔۔۔ اور جیسے ہی یہ پٹی اترے گی وہ واپس اس کے پاس لوٹ آئے گا کیونکہ نیاز اور حسنہ کو بھول جائے' ناممکن۔۔۔

اسے اپنی۔۔۔ سوچ پر شرمندگی ہونے لگتی اور کبھی ہنسی آتی۔۔۔ یقین گہرا ہونے لگتا اور آنکھوں میں بجھی جوت پھر سے جل اٹھتی۔

☼ ☼ ☼

ان ہی دنوں حسنہ کی خاموشی نے شگفتہ کی دیدہ دلیری کو مزید ہوا دی۔ اور وہ جو پہلے ہی اسے کچھ نہیں سمجھتی تھی اب مزید حقیر جانتے ہوئے لازمہ کا سا سلوک کرنے لگی تھی۔

انور کو یہ سب برداشت نہ ہوتا تھا۔ اسی لیے اس دن وہ عام سی بات جو معمول کا حصہ تھی انور کی موجودگی کے سبب جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی۔

انور بخار کے سبب دو دن سے گھر پر ہی تھا۔

جب مشین لگانے کی تیاری کرتی حسنہ کے سامنے شگفتہ نے چند کپڑے لا پھینکے۔

"پورے تین جوڑے ہیں' دھیان سے دھونا۔۔۔ اور دیکھنا! بڑا نازک کپڑا ہے کہیں سے خراب نہ ہو۔۔۔ اور ہاں' پچھلی بار بھی ایک دو جگہ داغ رہ گئے تھے لیکن میں خاموش رہی' اس لیے کوشش کرنا کہ اس بار شکایت کا موقع نہ ہی ملے تو اچھا ہے۔"

ماں کی ایسی عزت افزائی پر اس کے اندر طوفان اٹھا کہ تمام نصیحتوں کو بھلائے گلال بھبھوکا چہرے کے ساتھ وہ ان کے سر پر جا پہنچا اور براہ راست شگفتہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ترخ کر بولا۔

"کیوں دھوئیں میری امی تمہارے کپڑے؟ تمہارے ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں اور نہ ہی ہم تمہارے نوکر۔۔۔ پھر کیوں دھوئیں۔"

اس کی آنکھوں میں اشتعال تھا اور نفرت بھی۔۔۔ بالشت بھر چھوکرے کی ایسی زبان درازی پر وہ سن ہو کر رہ گئی۔۔۔ اور رکھ کر ایک تھپڑ اس کے پھول سے گال پر جڑ دیا۔

غصے اور تکلیف سے بے حال ہوتے انور نے بھی پھر کوئی ادھار نہیں رکھا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی پوری طاقت سے اسے اس زور کا دھکا دیا کہ سنبھلنے کی کوشش کے باوجود وہ پیچھے دیوار سے جا لگی۔۔۔ اس کی کہنی پر کئی خراشیں پڑ گئیں۔

انور کارروائی کرتے ہی گھر سے بھاگ گیا تھا۔ شگفتہ بے بسی سے پہلے تو پیچ و تاب کھاتی رہی۔۔۔ مگر پھر اس کے شاطر دماغ نے اسی جھگڑے کو اپنے حق میں استعمال کرنے کا سوچا۔۔۔ اور حسنہ۔۔۔ اسے خاموشی سے کمرے میں جاتے دیکھ کر ایک اطمینان بھری سانس خارج کر کے رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

نیاز جب سے آیا تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ شگفتہ بڑی چپ چپ سی تھی اور اداس بھی۔۔۔ تب ہی نیاز نے کھنکارتے ہوئے اسے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا۔

"کیا بات ہے جناب! آج ہماری مینا بڑی چپ ہے۔ کمرے میں کوئی رونق ہی نہیں! بندے سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو سزا دے لو' یوں اداس رہ کے اپنی ننھی سی جان پر تو ظلم نہ کرو۔" اس نے جو کی اسے پکڑ کر پاس بٹھانا چاہا۔۔۔ شگفتہ کے لبوں سے سسکاری

نکل گئی۔ اس کی "ترخی" گھنی نیاز کے ہاتھ میں تھی اور اس پر لگی خراشیں بھی وہ دیکھ چکا تھا' اس لیے ساری شوخی ہوا ہو گئی اور وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا۔

"یہ کیا ہوا ہے شگفتہ؟ کہیں گر گئی تھیں کیا؟۔۔۔ تو ٹھیک تو ہے؟" وہ اس کا بازو الٹ پلٹ کر دیکھتا سوال پہ سوال کر رہا تھا اور شگفتہ بجائے جواب دینے کے پھپھک کر رو دی۔ نیاز اور بوکھلا گیا۔

"او کیا ہو گیا ہے؟ زیادہ درد ہو رہا ہے تو چل ڈاکٹر کے پاس لے چلوں تجھے۔"

"کیا اس گھر پر اور آپ پر میرا کوئی حق نہیں؟" سسکیوں کے درمیان کہے گئے اس کے الفاظ نے نیاز پر بہت کچھ عیاں کر دیا تھا۔ وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"کیا مطلب۔۔۔ آج پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے؟ پر اس جھگڑے کا تیرے زخم سے کیا تعلق۔۔۔؟"

"میرے ہر زخم کا تعلق اسی گھر اور اس کے جھگڑوں سے ہے نیاز صاحب!"

"او کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہے۔ سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتی کہ کیا ہوا ہے؟" نیاز زچ ہو اٹھا تو بالآخر وہ بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"آج گھر کی صفائی کے بعد میں اپنے کپڑے دھونے لگی تو آپ کے گندے کپڑے بھی ساتھ رکھ لیے دھونے کے لیے۔۔۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپا اس قدر دامن جاگیر کی۔ انہوں نے مجھے اتنا برا بھلا کہا کہ میری جرات کیسے ہوئی ان کے شوہر کے کپڑوں کو ہاتھ لگانے کی۔۔۔ میں صرف ترس کھا کر اس گھر میں رکھی گئی ہوں' اس لیے آپ پر یا آپ کی چیزوں پر حق جتانے کی کوشش نہ کروں۔

میں نے جواب میں احترام کے ساتھ صرف اتنا کہا کہ بے شک میں ترس کھا کر لائی گئی ہوں پر ہوں تو ان کی بیوی ہی نا۔۔۔ میرا بھی دل چاہتا ہے اپنے شوہر کے کام کروں' ان کا خیال رکھوں۔۔۔ اتنی سی بات پر آپا کو اتنا غصہ آیا کہ میں نے ان کے سامنے زبان چلائی ہے اور انہوں نے میرے منہ پر زور کا تھپڑ دے مارا۔۔۔ میں اس پر بھی خاموش رہی کہ چلو آپا بڑی ہیں کوئی بات نہیں۔۔۔ مگر جب آپا کی شہ پا کر انور نے مجھے دھکا دیا تو مجھے بہت تکلیف ہوئی نیاز! سر اور بازو پر چوٹ بھی اسی وجہ سے آئی۔"

اس کی درد بھری سسکیاں مسلسل کمرے میں گونج رہی تھیں اور نیاز کا فشار خون بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جھٹکا کھا کر بستر سے نیچے اتر گیا۔

"یقین نہیں آتا مجھے کہ جس عورت کو میں فرشتوں سا معصوم سمجھتا تھا وہ اس حد تک نیچے گر جائے گی۔۔۔ ابھی سبق سکھا کے آتا ہوں ان ماں بیٹوں کو۔۔۔ لاوارث سمجھ لیا ہے تجھے کہ جو مرضی کرتے پھریں گے اور کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔" وہ غصے میں آگ بگولا جونہی باہر جانے کو لپکا' شگفتہ نے جھٹ اس کا بازو پکڑ لیا۔

"نہیں' نہیں۔۔۔ خدا کے لیے! میری وجہ سے آپ گھر میں جھگڑا نہ کریں۔ اگر آپ میرے ساتھ ہیں تو میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ یقین جانیے مجھے اور کچھ نہیں چاہیے سوائے آپ کے۔۔۔"

اس نے بمشکل آتے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔ کیونکہ ایسے چھوٹے موٹے جھگڑے اس کا مقصد ہرگز نہیں تھے۔ وہ اسے اس حد تک بھرنا چاہتی تھی کہ پھر جب وہ پھٹے تو سب کچھ تہس نہس کر دے۔۔۔ اور اس کی راجدھانی کے لیے خطرہ بننے والا کوئی وجود باقی نہ رہے۔

"کتنا پریشان کرتی ہوں ناں میں آپ کو۔۔۔ پر میں بھی کس سے کہوں؟ آپ کے سوا میرا ہے ہی کون۔۔۔"

کچھ دیر بعد جب وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو وہ اس کا ہاتھ تھامے محبت سے کہہ رہی تھی۔ پھر اچانک کچھ یاد آنے پر ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔

"ہائے اللہ! میں آپ کے لیے چائے بنانا تو بھول ہی گئی۔۔۔ ٹھہریے' ابھی بنا کر لاتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگی تو نیاز نے پکڑ کر دوبارہ بٹھا لیا۔

"ٹھہر جا۔۔۔ کہاں جائے گی تو۔۔۔ پہلے ہی چوٹ لگی ہوئی ہے۔ میں جاتا ہوں' چائے بھی بنا لاؤں گا اور تیرے زخم کے لیے کوئی ٹیوب بھی لیتا آؤں گا۔ تجھ باہر

کوئی جسے لگ گیا تو خواہ مخواہ میں۔" وہ بڑبڑاتا باہر چلا گیا تو شگفتہ کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

شگفتہ کی امیدیں شدید مایوسی میں ڈھلتی جا رہی تھیں کہ اس دن اچانک بغیر کسی منصوبہ بندی کے ہی وہ سب ہو گیا جس کا انتظار اور تیاری وہ پچھلے کئی ماہ سے کر رہی تھی۔

ہوا کچھ یوں کہ اس دن حسنہ کے پاس محفوظ تمام رقم خرچ ہو چکی تھی اور ساری دوپہر بھوک برداشت کرنے کے بعد بچے شدت سے شام کے منتظر تھے تاکہ کچن کھلے اور ان کی ماں کھانا تیار کر سکے۔ ان کی گفتگو سے شگفتہ پہلے ہی اندازہ لگا چکی تھی۔ اسی لیے جوں ہی نیاز رات میں گھر آیا اس کی اداکاری شروع ہو گئی۔ نیاز کے لیے کھانا لینے کے بہانے اٹھی وہ فوراً ہی چکرا کر گر گئی تھی۔ نیاز کے تشویش سے پوچھنے پر بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

"کچھ خاص نہیں۔ بس وہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے صبح کے کام نہیں کر سکی نا۔ تو سزا کے طور پر آپا نے دوپہر کا کھانا ہی بند کر دیا۔ شاید اسی وجہ سے کمزوری ہو گئی ہے۔"

نیاز کا ضبط سے بدلا چہرہ دیکھ کر وہ اپنی چالاکی پر نازاں جونہی باہر نکلی۔ انور کو کھانا لے کر اس کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ حالانکہ انہیں شگفتہ کے کھانا نکالنے کے بعد کھانا لینے کی اجازت تھی مگر اس دن بھوک کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ ماں کے روکنے کے باوجود کھانا لینے چلا گیا۔ ایک تو اس کی اس بے صبری نے شگفتہ کو سخت تاؤ دلایا تھا اور سے اپنی اچھی بوٹیوں سے بھری اس کی پلیٹ نے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے اور وہ نیاز کی موجودگی کو یکسر فراموش کر کے اس پر برس پڑی۔

"اتنی جرات تیری کہ میرے کہے کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی تیرے نزدیک۔ ساری ہنڈیا خالی کر کے جا رہا ہے موئے۔ مفت کا مال سمجھ لیا ہے کیا۔؟"

شرربار نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے شگفتہ نے بنا کسی لحاظ کے اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے کو ہاتھ مار کر زمین پہ گرا دیا۔

برتن گرنے کی زوردار آواز کے ساتھ حسنہ اور نیاز بھی کمرے سے نکل آئے اور اسے دیکھتے ہی شگفتہ کو احساس ہو گیا کہ جلد بازی میں وہ کیا کر بیٹھی ہے۔

"خدا کے لیے آپا! مجھے معاف کر دیں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی' آئندہ جو آپ کہیں گی وہی کروں گی بس اس بار معاف کر دیں۔" وہ زاروقطار روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور حسنہ اس کے یوں پینترا بدلنے پر ہکا بکا رہ گئی لیکن نیاز تیزی سے اس کی جانب لپکا۔

"کیا بات ہے شگفتہ! تو معافی کیوں مانگ رہی ہے۔ اور یہ بوٹی سالن؟ آخر کیا تماشا ہو رہا تھا ادھر۔؟"

"کوئی تماشا نہیں ہے نیاز۔ ساری غلطی میری ہی ہے۔ جب آپا نے مجھے ان کے کہے بغیر کھانا کھانے سے منع کیا تھا تو مجھے اپنے لیے کھانا نہیں لانا چاہیے تھا۔ بس اسی بات پر آپا کو غصہ آگیا اور انہوں نے ٹرے گرا دی۔ مگر کوئی بات نہیں آپا! آپ ناراض نہ ہوں۔ اب جب آپ کہیں گی میں تب ہی کھانا کھاؤں گی۔ میں بھلا آپ کی حکم عدولی کر سکتی ہوں۔ کبھی نہیں کبھی بھی نہیں۔"

وہ ڈر کے مارے کانپ رہی تھی اور حسنہ اس کے جھوٹ اور اداکاری پر ششدر رہ گئی تھی۔

"یہ سراسر جھوٹ بول رہی ہے نیاز۔ تم اس کی بات کا بالکل یقین نہیں کرنا۔ تم نہیں جانتے اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے۔ نوکروں کی طرح ہم اپنے ہی گھر میں رہتے ہیں نیاز۔ سارا گھر اس نے اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ بچوں کو مارتی ہے' دھتکارتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی مرضی کے بغیر یہ بچے روٹی بھی نہیں کھا سکتے۔ سارا سارا دن بھوکے گزار دیتے ہیں۔ آج بھی یہ نہیں انور کھانا لے کر آرہا تھا تو اس نے ہاتھ مار کر گرا دیا۔ تم میرا یقین کرو نیاز۔ یہ وہ نہیں جو نظر آتی ہے۔ تم نہیں جانتے۔"

"سب کچھ جانتا ہوں میں۔۔۔" اس کی تمام باتوں کے جواب میں نیاز کے ایک جملے نے سارا ماحول ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔

"سب جانتے ہو نیاز۔۔۔ پر کب سے؟" حسنہ تیزی سے اس کے قریب آئی۔

"میں کہتی تھی کہ بچوں سے کہ جب تمہارے ابو کو سچ کا پتا لگے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے یقین تھا تم پر اور اپنی محبت پر۔۔۔ لیکن معاف کرنا نیاز! میں اب اس عورت کو اور اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی۔ اپنے ساتھ ہوا ہر ظلم میں بھول بھی جاؤں تو اپنے بچوں کے ساتھ زیادتی نہیں بھلا سکتی۔۔۔ اس لیے تم برا نہ مانو اور اسے اس کے چاچے کے گھر چھوڑ آؤ۔۔۔ یا نہیں بھی جہاں یہ چاہے۔ میں اپنے گھر کا سکون اور برباد نہیں کر سکتی۔"

وہ ان سے نیاز کو دیکھتے ہوئے بالکل ایسے ہی بات کر رہی تھی جیسے کبھی اچھے وقتوں میں کیا کرتی تھی۔۔۔ لیکن سامنے بھی کیا وہی نیاز تھا؟

شگفتہ کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی جو نیاز کے منہ سے نکلتے الفاظ کے ساتھ گہری ہوتی چلی گئی۔

"ہاں اس گھر سے تو ضرور جائے گی۔۔۔ پر یہ نہیں تُو۔"

اس کے لفظوں میں سختی زیادہ تھی یا آنکھوں میں سفاکی۔ وہاں کھڑا کوئی شخص اندازہ نہیں لگا پایا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو نیاز۔۔۔؟" حسنہ کو ایک بار پھر لگا کہ شاید اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے مگر ایک بار پھر وہ خود ہی غلط ثابت ہو گئی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔۔۔" اس نے حسنہ کو بازو سے پکڑ کر دھکا دیا اور زور سے چلایا۔

"تجھے ذرا شرم نہیں آئی حسنہ! یہ سب کرتے ہوئے۔۔۔ سب بتاتی رہی ہے یہ مجھے کیسے تم لوگوں نے اس کی روٹی بند کی۔۔۔ انور کے ساتھ مل کر اسے مارا۔۔۔ سارے گھر کے کام کرائے، اتنی زیادتیاں کیں اور اس نے کبھی اُف تک نہیں کی۔۔۔ ہر بار تجھے آپا سمجھ کے معاف کیا اور اگر کبھی میں نے کچھ کرنا چاہا تو مجھے بھی روک لیا۔۔۔ اس نے اور تو اور۔۔۔"

وہ اجنبی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور حسنہ میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ سر کو نفی میں ہی جنبش دے سکتی۔ اس کی حالت سے بے خبر نیاز کہتا رہا۔

"بڑے دعوے کرتی تھی نا تو مجھ سے محبت کے۔ میری خاطر ایک چھوڑ ہزار سوکنیں بھی برداشت کرنے کو تیار تھی۔۔۔ اور تو اتنی کم ظرف نکلی کہ یہ مسکین سی لڑکی بھی برداشت نہ کر سکی؟ تو ابھی اور اسی وقت اپنے بچوں کو لے کر میرے گھر سے نکل جا۔ میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔" اپنا فیصلہ سنا کر وہ نفرت سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ حسنہ تڑپ کر اس کے سامنے آئی۔

"رب کی قسم نیاز! میں جھوٹ نہیں بول رہی۔۔۔ مجھے میرے بچوں کی قسم۔۔۔ جو تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے تو بے شک انور سے پوچھ لو۔" حسنہ نیاز کے سامنے رو رہی تھی اور اس کے دل کو کچھ نہیں ہو رہا تھا۔

ضروری تو نہیں کہ ایک چہرہ ہمیشہ ہی پیارا لگے۔۔۔ ایک آنسو ہمیشہ ہی بااثر ٹھہرے۔ وقت بدل بھی تو جاتا ہے۔۔۔ اور وقت بدل چکا تھا کیونکہ وہ اس کے آنسو پونچھنے کے لیے آگے نہیں بڑھا تھا۔

"اچھا۔۔۔ اگر سب کچھ اس نے کیا ہے تو تب تم لوگوں نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ تم لوگوں کا اصلی چہرہ میرے سامنے آ چکا ہے۔۔۔ اس لیے اب بہتری اسی میں ہے کہ مزید جھوٹ بولنے یا شگفتہ پر الزام لگانے کے بجائے فوراً دفع ہو جاؤ میرے گھر سے۔۔۔ میں شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا تم لوگوں کی۔۔۔"

وہ بگڑے چہرے بگڑے لب و لہجے کے ساتھ انہیں باہر کا راستہ دکھا رہا تھا۔۔۔ اور وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے التجا کر رہی تھی۔

"رب دے واسطے نیاز۔۔۔ اتنا ظلم نہ کرو۔ رات کے اس پہر ہم کہاں جائیں گے؟ وعدہ کرتی ہوں اب تمہیں کوئی شکایت نہیں ہونے دوں گی۔۔۔"

"میں تیری کوئی بکواس نہیں سننا چاہتا حسنہ! جو کچھ تو نے کیا ہے اس کے بعد بھی میں تجھے صرف گھر سے نکال رہا ہوں۔۔۔ لیکن اگر تو نے ایک بھی لفظ کہے بغیر یہ گھر نہ چھوڑا۔۔۔ تو میں تین لفظ بول کر تجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔"

اس کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ جنوری کی یخ بستہ رات بھی ٹھٹھر گئی تھی۔۔۔ تین لفظوں کے خوف نے جیسے اس کی چلتی سانسوں کو بھی روک دیا تھا۔ ہر سو گھور اندھیرا چھا گیا اور گمبھیر خاموشی۔۔۔ صرف باہر ہی نہیں اندر بھی پھر وہ کچھ کہہ ہی نہیں سکی۔ چپ چاپ اٹھی اور بچوں کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گئی۔۔۔ پیچھے دروازہ بند ہو گیا تھا۔

٭ ٭ ٭

وہ اپنے گھر کے باہر ہی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا اور وہ اپنے دو بچوں کو دامن میں سمیٹے بار بار اس بند دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ یہ وہ گھر تھا جسے اس نے پچھلے بارہ سال اپنائیت، محبت سے سنوارا تھا، سجایا تھا اور آج بڑی بے دردی سے کسی اور کو اس کا مالک بنا دیا گیا تھا۔ حسنہ انگشت بدنداں تھی کہ یہ وہی شخص تھا جو حسنہ کی ایک مسکراہٹ کے بدلے اپنا آپ وارنے کو تیار رہتا تھا۔

اور آج اسی حسنہ کو اس چند دن کی آئی عورت کے لیے یوں اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا تھا کہ اس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا۔

کیا محبت ایسی ہوتی ہے؟

ریت کی دیوار کی مانند۔۔۔

جو ذرا سی تیز ہوا کا بار بھی برداشت نہ کر سکے اور ذرا دیر میں بکھر جائے کہ جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔۔۔

نیاز کا بدلا روپ ایک حقیقت تھا۔۔۔ مگر حسنہ اس حقیقت کو قبول نہیں کر پا رہی تھی۔ سب بے یقینی اتنی تھی کہ اس کا ذہن ہی ماؤف ہو گیا تھا اور درد اتنا کہ دل پھٹا جا رہا تھا۔ تب ہی ننگی کی کپکپاتی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

"امی! بہت سردی لگ رہی ہے اندر چلیں نا!"

اسے شدت سے اپنے بچوں کی فکر ہوئی مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے۔۔۔ اس کا تو کوئی میکہ بھی نہیں تھا۔۔۔ تب ہی اس تاریکی میں خدیجہ پھوپھی کا چہرہ جگمگایا اور خدا نے جیسے اسے راستہ دکھا دیا۔

٭ ٭ ٭

خدیجہ پھوپھی اتنی رات گئے یوں تنہا اسے بچوں کے ساتھ اپنے گھر دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

پپڑی زدہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر حسنہ نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر اندر سے اتنی نڈھال ہو چکی تھی کہ ایک لفظ بھی نہ بول پائی۔۔۔ اور وہیں زمین پر ڈھیر ہو گئی۔

جب تک اسے ہوش آیا انور۔۔۔ ساری بات تفصیل سے گھر والوں کو بتا چکا تھا۔ گھر کے تمام افراد اس وقت اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔

حسنہ کی آنکھیں ایک بار پھر بھرنے لگی تھیں۔

"بہت برا ہوا ہے میری بچی تیرے ساتھ۔۔۔ اور تو کتنے وقت سے یہ سب اکیلی برداشت کر رہی تھی۔ ایک بار بھی اپنی پھوپھی کو دل کا حال نہیں بتایا۔

پر تو فکر نہ کر میری بچی۔۔۔ اللہ کے بعد جب تک تیری پھوپھی زندہ ہے تجھے کبھی بے آسرا نہیں ہونے دے گی۔۔۔ اور جہاں تک نیاز کا تعلق ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی جلد ہی سیدھا ہو جائے گا۔ ایسی رنگینیاں زیادہ دن نہیں رہتیں کسی کے پاس۔"

اسے خوب تسلی دینے کے بعد جب انہوں نے اپنی بھیگی آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس کا ماتھا چوما تو ان کے لمس سے آتی ممتا کی خوشبو نے اسے اس کی ماں کی یاد دلا دی تھی۔

٭ ٭ ٭

وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے گھوم رہا تھا۔ شروع کے دو چار دن نیاز کو بچوں کی کمی کھلی۔۔۔ حالانکہ وہ کئی مہینوں سے ان سے ملا تک نہیں تھا لیکن گھر میں ان کی موجودگی کا احساس تو تھا، وہ پل بھر کو اداس ہوا مگر پھر

جیسے ہی شگفتہ کا چہرہ نظر آتا ہر احساس بدل جاتا۔

اب وہ آزاد تھی' خود مختار' اس گھر کے ہر سیاہ و سفید کی مالک۔ نیاز تو سارا دن ورکشاپ پر ہوتا اور وہ جو چاہتی کرتی۔ اس لیے وہ بے پناہ خوش تھی اور نیاز کو بھی خوش رکھ رہی تھی۔

شروع کے کچھ دن تو خوب مزے کرنے کے بعد اب شگفتہ بور ہونے لگی تھی۔ اس لیے اپنی پرانی عادت کے مطابق اس نے گھر سے باہر تانکا جھانکی شروع کر دی۔۔۔ اور جیسے ہی سبزی والے کی آواز سنی ضرورت نہ ہونے کے باوجود باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

"بھائی! آلو بھی ہے تمہارے پاس؟" اس نے اپنی پسندیدہ سبزی کے بارے میں پوچھا۔

"جی باجی ہے۔"

"ٹھیک ہے' دے دو۔۔۔ اور یہ ٹماٹر۔" پوچھتے ہوئے یونہی اس نے سرسری سی نظر سامنے اٹھائی تو بُری طرح چونک گئی۔

سیاہ بنیان پر کھلے بٹنوں کی شرٹ چڑھائے وہ منہ میں دبے تنکے کو یہاں سے وہاں گھماتا بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شگفتہ نظر انداز کر کے خریدا ہوا سامان لیے اندر آ گئی۔

مگر پھر اگلے کئی روز روزانہ ہی کچھ نہ کچھ خریدتے ہوئے مسلسل اسے گھورتا رہا ہوتا۔

چاچا چاچی کے گھر بھی وہ کھانے پینے کے بہانے ان چکروں میں پڑی رہتی۔۔۔ اور ایسے معاملات میں اسے کبھی دشواری کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ اس کی خوب صورتی اور ادائیں ہمیشہ ہی اس کا ساتھ نبھاتی تھیں۔

لیکن اب وہ کھلے عام ایسا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ایک شریف آدمی کا نام اس کے نام کے ساتھ جڑ چکا تھا۔ دوسرا کوئی ٹھکانہ اس کے پاس نہیں تھا۔ اس لیے وہ ڈھکی چھپی مسکراہٹ سے کام چلاتی۔

لیکن پھر بھی اس شام نیاز گھر لوٹا تو وہ بہانے سے اس سے پوچھے بغیر بھی نہ رہ سکی۔

"ہم بھرے پرے محلے میں رہتے ہیں نیاز! لیکن کوئی بھی ہمارے گھر نہیں آتا۔ آپ کا نہیں خیال کہ ہمیں پڑوسیوں سے تعلقات بنانے چاہئیں؟ میں سوچ رہی تھی کہ کل سامنے والوں کے گھر ہو آؤں۔۔۔ ویسے بھی سارا دن بور ہوتی رہتی ہوں۔"

"او خبردار! ان کے گھر جانے کی تو سوچنا بھی ناں۔" نیاز تو سنتے ہی جیسے اکھڑ گیا۔

"بڑا آوارہ ہے ان کا چھوٹا لڑکا! بڑے بھائیوں اور بیوہ ماں کے پیسے پر عیش کرتا ہے سارا دن گلی کے نکڑ پر بیٹھا لڑکیاں تاڑتا رہتا ہے۔ اس لیے گھر میں آرام سے بیٹھ۔ ایک نمبر کا لفنگا ہے وہ۔"

نیاز کی سختی سے کی گئی تنبیہہ پر اس نے بظاہر تو سر اثبات میں ہلا دیا تھا مگر اندر ہی اندر وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

✡ ✡ ✡

مجبور شگفتہ تھی۔ لیکن اس آوارہ لڑکے آصف کی ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ اس پر شگفتہ کی مسکراہٹ نے بارہا اسے شہ دی تھی' جس سے وہ اس کی "چاہت" کو اچھی طرح پہچان گیا تھا۔ اسی لیے اس دن جب سہ پہر کا وقت تھا اور وہ درخت کی چھاؤں میں لیٹی ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی۔۔۔ چھوٹے سے پتھر میں لپٹا ایک کاغذ اس کے قریب آ گرا۔

چونک کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے کاغذ اٹھا لیا تھا۔ کھول کر دیکھا تو بڑے بڑے ہندسوں میں موبائل نمبر لکھا تھا اور نیچے "تمہارا آصف" شگفتہ کے لبوں پر ایک جاندار سی مسکراہٹ آ گئی وہ جانتی تھی کہ آصف اسی سامنے والے لڑکے کا نام ہے۔

حفظ ماتقدم کے طور پر نمبر لبنیٰ کے نام سے موبائل میں محفوظ کیا اور کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا۔

دو دن خدا جانے کس طرح کاٹ کر تیسرے دن خود کو اس کا نمبر ملانے سے نہیں روک پائی۔

"ہیلو! کون بول رہا ہے؟" سادہ سے انداز میں کیے گئے سوال نے اسے تاؤ دلا دیا۔

"خود ہی نمبر پھینک کر پوچھتے ہو کہ کون بول رہا ہے۔"

اگر بولنا ہی تھا تو نمبر کیوں چھینا؟؟"

آصف کے ذہن میں جھماکا ہوا اور وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

"اچھا! تو تم ہو... دراصل دو دن کے شدید انتظار کے بعد میں اتنا مایوس ہو گیا تھا کہ دماغ سے ہی نکل گیا۔"

"اچھا تو کیا سمجھا تھا تم نے مجھے کوئی آوارہ لڑکی؟ جو تمہارے ہی نمبر کے انتظار میں بیٹھی تھی کہ جھٹ سے کال ملا دیتی... ایک شریف آدمی کی بیوی ہوں میں شاید تم بھول رہے ہو۔"

"یہ یاد رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے... اور اگر تم اسے دیانت داری سے نبھا رہی ہوتیں تو آج میرے موبائل پر تمہاری کال نہ آتی۔"

آصف کے دو بدو جواب نے اسے پل میں کرچی کرچی کر دیا۔ وہ یکدم چپ کر گئی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"اب چپ کیوں ہو گئی ہو؟ اچھا بھئی... سوری... دراصل میں تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ تم بہت خوب صورت ہو۔ کچھ ایسا خاص ہے تم میں... جو میں نے آج تک کسی دوسری لڑکی میں نہیں دیکھا' اسی لیے تمہاری وہ شادی شدہ والی کوالٹی بھی بھول گیا... لیکن میں بھی عام ہرگز نہیں ہوں' یہ میں بھی تم سے منواؤں گا اگر تم مجھ سے دوستی کرو تو..."

اس نے کچھ اس انداز سے بات پلٹی کہ شگفتہ کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ خود بخود مسکرانے لگی۔ پہلی بار کسی سے بات کرنے اور بات بڑھانے میں مزا آ رہا تھا اسے...

"میں اتنی جلدی کسی راہ چلتے سے دوستی نہیں کرتی... سوچ کر بتاؤں گی۔" ایک ادا سے کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

احسان جلدی ہی شہر کے لیے نکل آیا اور سیدھا نیاز کی ورکشاپ پر پہنچا۔ نیاز اسے یوں اچانک سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اٹھ کر گلے سے لگا لیا۔

"اور سنا احسان... کیا حال ہے تیرا؟ یوں اچانک... سب خیریت تو ہے ناں۔" اسے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے اس نے خوش دلی سے پوچھا تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"بس نیاز بھائی! خیریت ہے بھی اور نہیں بھی... وہ دراصل میں انور اور نگی کا اسکول کا سامان لینے آیا تھا... ان کے امتحانات ہونے والے ہیں ناں!"

وہ صرف نیاز سے بات کرنا چاہتا تھا اسی لیے تو نے کی وجہ تلاشی... تاکہ ڈائریکٹ بات کرنے پر وہ برا نہ مان جائے۔

"اچھا! تو وہ تم لوگوں کے پاس ہیں۔" اسے ایک گونہ سکون ملا تو دوسری طرف بے زاری بھی ہوئی۔

"خوب شکایتیں لگائی ہوں گی میری... بڑھ چڑھ کے میرے ظلم کے قصے سنائے ہوں گے... لیکن اپنی ایک بھی کارستانی نہیں بتائی ہو گی۔"

بجائے ان کی خیریت پوچھنے کے وہ ایک دم سے شروع ہو گیا تو احسان نے بمشکل اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

"تو غلط سوچ رہا ہے نیاز بھائی... حسنہ نے آج تک تیرے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ ہمیں جو کچھ پتا چلا وہ انور نے بتایا... حسنہ نے نہیں۔"

"وہ بھی تو اس کی اولاد ہے ناں اور وہی کہے گا جو ماں سکھائے گی۔ تو نہیں جانتا احسان... ان ماں بیٹے نے مل کر کتنی زیادتی کی ہے شگفتہ کے ساتھ... ورنہ تو کبھی ان کی حمایت نہ کرتا۔"

"بچے ایسے معاملوں میں کبھی جھوٹ نہیں بولتے نیاز بھائی... اور پھر تو ان کا سگا باپ ہے۔ کوئی سوتیلا تو نہیں جو وہ تیرے خلاف سازشیں کریں گے' سمجھنے کی کوشش کر بھائی... معصوم وہ لڑکی نہیں بلکہ حسنہ اور تیرے بچے ہیں۔ یہ تو اس کی چالاکی ہے جو اس نے اس طرح تجھے اپنی باتوں میں پھنسایا کہ تو صحیح اور غلط میں تمیز ہی بھول گیا... ورنہ کیا تو حسنہ اور اپنے بچوں کو جانتا نہیں تھا۔"

"جانتا ہوتا تو اس طرح جو کا نہ کھاتا۔۔۔ اور خوب سبق پڑھا کے بھیجا ہے تجھے حسنہ نے۔۔۔ اپنی نہیں چلی تو تجھے وکیل بنا کے بھیج دیا۔۔۔ پر ایک بات کان کھول کے سن لے احسان! اور جا کے اسے بھی بتا دینا کہ اب میرے گھر میں اس کی کوئی جگہ نہیں۔۔۔ میں دوبارہ اسے شگفتہ پہ ظلم کرنے کا موقع نہیں دینے والا۔۔۔ اس لیے تو بھی اپنا ٹائم ضائع نہ کر۔۔۔ اور جو کرنے آیا ہے کر کے گھر جا۔" وہ کہتے ہوئے موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا تھا۔ احسان اس کے پیچھے لپکا۔

"تو ایک بار پھر غلط سمجھ رہا ہے نیاز۔۔۔ میں تو یہ سب خود ہی۔"

"مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔۔۔ اور نہ ہی میں اس بارے میں اور کوئی بات کرنا چاہتا ہوں۔ چپ کر کے موٹر سائیکل پہ بیٹھ اور گھر چل۔۔۔ بس۔"

اس نے حتمی انداز میں کہتے ہوئے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ حسنہ اور انور سچ کہتے تھے۔۔۔ اس کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔

جب شگفتہ نے یہ جاننے کے بعد کہ وہ حسنہ کا رشتے دار ہے ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی اور بڑے فخر سے گردن اکڑا کر گھر کی چابیوں کا گچھا اسے دکھایا۔۔۔ مگر نیاز سے نظر بچا کر۔

نیاز کی عقل پر افسوس کرتا وہ گھر لوٹ آیا تھا۔ بچے اپنا سامان دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔۔۔

ملاقات کے بارے میں وہ حسنہ سے کچھ بھی نہیں کہہ پایا تھا۔

٭ ٭ ٭

دیکھتے ہی دیکھتے دوستی کے رشتے سے کہیں آگے نکل گئی تھی۔

نیاز کی راہ دیکھنے والی شگفتہ اب اس کے دیر سے آنے کی دعائیں مانگا کرتی۔

"آخر اس میں حرج ہی کیا ہے شگفتہ! میرا تم سے ملنے کو، دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔ تم بھی کہیں نہیں ہو۔"

"دل میرا بھی چاہتا ہے تم سے ملنے کو۔۔۔ لیکن ڈرتی ہوں کہ اگر محلے والوں نے دیکھ لیا۔۔۔ یا نیاز کو پتا چل گیا تو کیا ہو گا میرا۔۔۔ میرے پاس تو اور کوئی ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔"

اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا اور وہ پرجوش ہو گیا۔ "سمجھو کہ حل مل گیا۔۔۔ میں بس ابھی بندوبست کر کے آتا ہوں، تم فون بند کرو۔۔۔ اور آج رات ایک زبردست سی ملاقات کی تیاری کرو۔"

"مگر آصف۔۔۔ سنو تو ہیلو۔۔۔ ہیلو۔"

وہ پکارتی رہ گئی لیکن دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد پتھر کے ساتھ ایک لفافہ ٹپ سے گرا صحن میں۔ شگفتہ نے جلدی سے لفافے کے اندر جھانکا تو گولیوں کے دو پتے اور ساتھ ایک پرچی نظر آئی جس پر لکھا تھا۔

"یہ نیند کی گولیاں ہیں۔۔۔ روزانہ دو اپنے شوہر کی چائے میں ڈال کر اسے پلا دیا کرنا۔ وہ سو جائے گا تو میں آکر تم سے مل لوں گا۔"

پرچی پھاڑ کر شگفتہ نے ردی کی ٹوکری میں پھینکی اور گولیاں چھپا کر بے چینی سے رات کا انتظار کرنے لگی۔

ہر کام صرف پہلی بار مشکل لگتا ہے اور پھر معمول کا حصہ بن جاتا ہے۔

شگفتہ نے بھی پہلی بار بہت ڈرتے ڈرتے نیاز کو وہ گولی ملی چائے پلائی تھی۔۔۔ اور پھر سب کچھ آسان ہوتا چلا گیا۔ آصف سے ملنا اور گھنٹوں سامنے بیٹھ کر باتیں کرنا اتنا دل آویز تھا کہ اس کا ڈر زیادہ دن سانسیں نہیں لے سکا اور خواہش کا نشہ زہر بن کر اسے ہمیشہ کی نیند سلا گیا۔ شگفتہ کئی دن سے آصف سے جو سوال پوچھنا چاہ رہی تھی آج پوچھ بیٹھی۔

"سب تمہیں آوارہ کہتے ہیں۔۔۔ پڑھ لکھ بھی نہیں سکے تو کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟" آصف کے

مسکراتے چہرے پر اس کا سوال سنجیدگی کے کئی سائے لہرا گیا۔

"میں کیا کام کروں؟ باپ' بھائی کوئی بھی مجھے کاروبار کے لیے پیسے دینے کو تیار نہیں ہے۔۔۔ اور نوکری اس تعلیم کے ساتھ مجھے مل نہیں سکتی۔۔۔ ایسے میں گلی کے نکڑ پر بیٹھ کر آوارگی کی چھاپ پیشانی پر لکھواؤں خود پر تو اور کروں کیا۔" اس کا لہجہ انتہائی پژمردہ تھا جو شگفتہ کو بالکل اچھا نہیں لگا۔

"کیوں فکر کرتے ہو تم۔۔۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔۔۔ محبت کرتی ہوں تم سے اور چاہے دنیا کچھ بھی کہے تمہارے بارے میں۔۔۔ کبھی تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی۔"

"تو پھر بھاگ کیوں نہیں چلتی میرے ساتھ۔۔۔ کیا ملے گا تمہیں اس بڈھے سے۔۔۔ عمر میں دگنے سے بھی زیادہ ہے تم سے' بیٹی کے برابر ہو تم اس کی۔۔۔ اور اس کے لیے ہر بار مجھے انکار کر دیتی ہو جبکہ تم جانتی بھی ہو کہ اب میں مزید تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

اس نے نروٹھے پن سے کہتے ہوئے رخ پھیر لیا تو وہ برداشت نہیں کر سکی۔

"سب جانتی ہوں میں۔۔۔ میرا حال بھی تم سے کچھ مختلف نہیں ہے' پر کیا کروں۔۔۔؟ ابھی خاصی مولی آسامی ہے۔ یوں چھوڑ کر چلی گئی تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"ہاتھ تو تمہارے اب بھی شاید کچھ نہ آئے' جس طرح لالچ میں پڑی ہوئی ہو تم۔۔۔ ذرا سوچو! کہ اگر کل اسے اچانک اپنی پہلی بیوی اور بچے یاد آجائیں اور وہ انہیں واپس لے آئے تو کیا حیثیت رہ جائے گی تمہاری۔۔۔؟ الٹا یہ جو لاکھوں کا زیور اور قیمتی سامان ہاتھ آرہا ہے۔۔۔ ان سے بھی جاؤ گی۔" بات میں اس کی دم تھا۔ شگفتہ سوچنے پر مجبور ہوگئی اور وہ کہتا رہا۔

"میری مانو تو زیادہ کے لالچ میں تھوڑے کو نہ گنواؤ۔۔۔ اور پھر جب میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ جتنا ہے' بہت ہوگا ہمارے لیے۔۔۔ میں کوئی اچھا سا کاروبار کرلوں گا اور ہنسی خوشی جی لیں گے ہم دونوں۔۔۔ پر تمہیں تو میرا اعتبار ہی نہیں ہے۔ تم سے زیادہ دولت کی پڑی ہوئی ہے۔۔۔ بھلے اس کے لیے مجھے ہی گنوا دو۔" وہ غصے سے بولا تو اس نے جلدی سے ہتھیار ڈال دیے۔

"اچھا مگر مجھے تھوڑا سا ٹائم اور دو۔۔۔ چند اور چیزیں بٹور لوں اس بڈھے سے تو پھر جو تم کہو گے' وہی کروں گی۔"

اس نے مسکراتے ہوئے تجویز دی۔

☆ ☆ ☆

وہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ عورت سوکن کے نام سے دور کیوں بھاگتی ہے۔ اس کا دل اتنا چھوٹا کیوں ہو جاتا ہے۔۔۔ کیونکہ مرد کا ظرف چھوٹا ہوتا ہے۔ اسے چار شادیوں کا حکم ربانی تو یاد ہوتا ہے مگر وہ انصاف کرنا بھول جاتا ہے۔

بچوں کو بھی اپنا باپ' گھر' اسکول اور اسکول کے دوست بری طرح یاد آرہے تھے اور اب تو ان کے پیپر بھی ہونے والے تھے۔ نعمان اور عثمان کو تیاری کرتے دیکھتے تو ان کے سر ہو جاتے' لیکن وہ بھی کیا کر سکتی تھی۔

پہلے ہی خدیجہ پھپھی اور احسان پر جوان کی وجہ سے بوجھ تھا اسے بخوبی احساس تھا۔ اب مزید وہ بچوں کی کتابوں' یونیفارم اور اسکول فیس کا بار ان کے سر نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

احسان نے اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ان دونوں کا داخلہ نعمان' عثمان کے اسکول میں ہی کروا دیا تھا۔ ان کے احسانوں کا بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور ساتھ حسنہ کی شرمندگی بھی۔۔۔ اوپر سے سلمٰی کا رویہ۔۔۔ جوں ہی احسان ان کی ایک اور ذمہ داری اپنے سر لیتا' اس کے ماتھے کی شکنوں میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ شروع شروع کی مسکراہٹ اور نرم گفتاری کی جگہ اب ہمہ وقت چہرے کے بگڑے زاویوں نے لے لی تھی۔

ایسے میں حسنہ کو شدت سے اپنے گھر کی یاد ستاتی'

پھر خیال آنا کہ اب وہ گھر بھی اس کا کہاں رہا تھا۔ نیاز کے لیے اس کے دل میں کوئی خوش فہمی بچی تھی اور نہ ہی خوش امیدی۔۔۔

وہ جانتی تھی کہ اب باقی کی زندگی اسے یونہی ماضی اور حال کی دو دھاری تلوار پر ننگے پاؤں چلتے گزارنی تھی۔ کبھی تشکر اور کبھی ندامت کے احساس سے گردن یونہی جھکائے رکھنی تھی۔ کیونکہ واپسی کے تمام دروازے اس کے لیے بند ہو چکے تھے۔

اس کی مجروح عزت نفس کو بھی اب کسی ساز کے بجنے کا انتظار نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

"کمال ہے! پہلے چائے پی کے نیند ہی اڑ جاتی تھی۔ اور اب اس زور سے آتی ہے کہ ہوش ہی نہیں رہتا۔ اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ آج چائے دیر سے پیوں گا۔ بڑے دن ہو گئے تیرے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

اس دن نیاز نے کھانا کھایا تو اطمینان سے کہتے ہوئے برتن اٹھاتی شگفتہ کو پاس ہی بٹھا لیا۔ وہ اندر سے جی بھر کر بدمزا ہوئی، لیکن بظاہر مسکرا کر بولی۔

"کیوں نہیں۔ میرا بھی بہت دل چاہ رہا تھا آپ سے باتیں کرنے کو۔"

"تو کہا کیوں نہیں۔ بندہ ساری رات جاگ سکتا ہے تجھے سننے کے لیے۔" اس نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو مجبوراً" اسے شرمانے کی اداکاری کرنی پڑی۔۔۔ اور نیاز اس کی اس ادا پر بھی فدا ہو گیا۔ پھر گیارہ بج گئے اس کی باتیں سنتے سنتے۔ مسکرا مسکرا کر جبڑے بھی دکھنے لگے تھے تب کہیں جا کر اس کا چائے بنانے کا سوڑ بنا۔

شگفتہ شکر کرتی کچن کی طرف چلی گئی اس کے جاتے ہی اس کے موبائل کی میسج ٹون بجی۔ نیاز چائے کا انتظار کر رہا تھا موبائل اٹھا کر میسج پڑھنے لگا۔

"کام ہو گیا کیا۔ کب تک آؤں لبنیٰ۔"

وہ مختصر سا پیغام اسے چونکا گیا تھا اور بے اختیار ہی اسے رات ورکشاپ سے لوٹتے ہوئے ساجد سے ہونے والی ملاقات یاد آ گئی۔

ریٹائرڈ سپاہی اور زیور رات کی کسی دکان کا چوکیدار تھا۔ دوسرے چوکیدار کی چھٹی پر کبھی کبھار اسے دیر تک رکنا پڑتا تھا۔ اس رات بھی وہ دیر سے لوٹ رہا تھا" جب نیاز کے دروازے سے اسے کسی کے نکلنے کا گمان ہوا "لیکن رات گئے؟" پھر اسے لگا کہ شاید اسے وہم ہوا ہے۔ اور اسی وہم کی تصدیق اس نے نیاز سے چاہی

"نہیں، نہیں ساجد۔۔۔ تجھے یقیناً" کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ بھلا اتنی رات کو ہمارے گھر سے کون نکلے گا؟" اس کے اطمینان دلانے پر ساجد تو مطمئن ہو گیا۔ مگر اب یہ پیغام پڑھ کر وہ خود الجھ گیا تھا۔ اسی لیے شگفتہ آئی تو پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"شگفتہ۔۔۔ یہ لبنیٰ کون ہے؟ اس نام کی سہیلی کا تو تو نے کبھی ذکر نہیں کیا۔" نیاز کا حملہ اتنا اچانک تھا کہ اس کے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے۔ مگر دماغ شاطر تھا اس لیے بوکھلا کر بناتے بناتے بھی بات بن ہی گئی۔

"ہاں وہ میری پرانی سہیلی ہے ناں! چاچا چاچی کے محلے میں ہی رہتی تھی۔ بڑی دوستی تھی ہم دونوں میں۔ پھر میری شادی ہو کر ادھر آ گئی تو رابطہ بھی ختم ہو گیا۔ اب اس نے موبائل لیا ہے تو پھر سے گپ شپ ہو جاتی ہے۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"پیغام آیا ہے تیرے نمبر پر اس کا۔۔۔ کسی کام کے ہونے کا پوچھ رہی تھی اور یہ بھی کہ کب آؤں۔۔۔"

"او اچھا۔۔۔ اچھا! وہ دراصل آنے کا کہہ رہی تھی تو میں نے کہا کہ آپ مصروف ہوتے ہیں۔ جب کام کچھ ہلکا ہو گا تو بتاؤں گی۔۔۔ اسی بارے میں پوچھ رہی ہو گی۔" اس نے اس خوب صورتی سے وضاحت دی کہ اس کے دل میں ابھرتے تمام شکوک وہیں دم توڑ گئے۔۔۔ اور وہ ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا۔

"ہاں تو بلا لے ناں کسی بھی دن گھر پہ۔ میں آ جاؤں گا۔ اتنا کام نہیں ہے آج کل۔۔۔ اور ہاں، ایک

ضروری بات تو میں تجھے بتانا ہی بھول گیا۔" وہ درمیان آتے آتے پر اٹھا اور الماری سے کوئی پیکٹ نکال لایا۔

"یہ دو لاکھ روپے ہیں۔ کچھ مہینے پہلے کسی دوست کو ادھار دیے تھے ۔۔۔ وہی واپس کیے ہیں اس نے' سنبھال کے رکھ لے۔"

نیاز کی تفصیل نے شگفتہ کی آنکھوں میں چمک بھر دی تھی۔ اس کے سوتے ہی اس نے آصف کو میسج کر دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ رات شاید ان کی زندگی کی سب سے اہم رات تھی۔

شگفتہ بڑی بے چینی سے نیاز کی آمد کی منتظر تھی ۔۔۔ مگر خدا جانے کیا ماجرا تھا کہ اس کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی اور نیاز آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا ۔۔۔ اوپر سے آصف کے پیغامات ۔۔۔

"تم سے بھی آج ہی لیٹ ہونا تھا۔"

وہ بڑی مشکل سے وہاں چکر کاٹ رہی تھی' بالآخر رات کے پونے بارہ بجے وہ لوٹ آیا۔

"اتنی دیر کہاں لگا دی ۔۔۔؟" اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا تھا۔ نیاز تھکا ماندہ بستر پر لیٹتے ہوئے بولا تھا۔

"دوست کی گاڑی آگئی تھی۔ کل بارات جانی ہے اس کی ۔۔۔ اس لیے ایمرجنسی میں ٹھیک کرنی پڑی۔" مختصر سا جواب دے کر اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

شگفتہ کو اس سے کیا لینا دینا تھا۔ اسے تو اپنی پڑی تھی۔ کھانا وہ کھا کر آیا تھا ۔۔۔ اس لیے پوچھے بنا ہی جلدی سے چائے بنا لائی۔ نیاز نے دیکھی تو بے زار ہو گیا۔

"او کہاں لائی ۔۔۔ پوچھ تو لیتا تھا کم از کم ۔۔۔ اب بنا لائی ہے تو خود ہی پی لے ۔۔۔ میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا اس ٹائم چائے کا۔" وہ کہہ کر کروٹ بدل گیا تو وہ روہانسی ہو گئی۔ سارا پلان چوپٹ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اس لیے بے وقت کے لاڈ دکھانا مجبوری بن گئی۔

"روز خود پیتے ہیں اپنی مرضی سے ۔۔۔ آج میرے ہاتھ سے پی لیں گے تو کیا ہو جائے گا۔ اتنے شوق سے بنا کر لائی ہوں اور آپ منع کر رہے ہیں۔" اس نے منہ بسورا تو وہ سر پکڑ کر اٹھ بیٹھا۔

"اچھا بابا! لا دے ۔۔۔ پی لیتا ہوں۔" اس کے کپ پکڑنے پر وہ خوشی خوشی کلام نمٹانے کا کہہ کر چلی گئی تو وہ منہ بنا کر چائے سے بھرے کپ کو دیکھنے لگا۔ جیسے پینے کا آج واقعی اس کا بالکل موڈ نہیں تھا۔

لیکن اگر نہ پیتا تو شگفتہ کے ناراض ہونے کا خدشہ تھا ۔۔۔ اور پھر اسے منانے میں نہ جانے کتنا وقت لگ جاتا۔

اچانک ایک ترکیب نے اس کی ساری ٹینشن دور کر دی۔ اس نے نچلی دراز سے دوائیوں کا ڈبا نکالا ۔۔۔ اور اسے خالی کر کے تمام چائے اس میں انڈیل دی اور ڈبا واپس دراز میں رکھ کر وہ اطمینان سے لیٹ گیا اور شگفتہ کے آنے سے پہلے ہی وہ بیچ گہری نیند سو چکا تھا۔

"خدا حافظ نیاز علی ۔۔۔ اپنی بے وقتی اور مردانہ خصلت سے مجبور ۔۔۔ بہت ساتھ دیا تم نے میرا ۔۔۔ مگر میں تم جتنی بے وقوف ہوں اور نہ ہی کمزور ۔۔۔ انسانوں کی پرکھ ہے مجھے' اس لیے تمہاری طرح گھاٹے کا سودا نہیں کر رہی۔ امید ہے اس خود غرضی کے لیے تم مجھے معاف کر دو گے۔"

اس نے خالی کپ کو دیکھتے ہوئے ایک استہزائیہ نظر اس پر ڈالی ۔۔۔ اور اپنا بیگ اٹھا کر اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔

☼ ☼ ☼

رات ڈیڑھ بجے کا وقت تھا جب حلق کو خشک کرتی پیاس نے نیاز کو گہری نیند سے جاگنے پر مجبور کر دیا۔ جب سے گرمیاں شروع ہوئی تھیں شگفتہ اس کی سائیڈ ٹیبل پر پانی ضرور رکھتی تھی ۔۔۔ مگر اس دن اپنے ہی چکروں میں بالکل فراموش کر بیٹھی اور ویسے بھی جب سے اس نے اسے چائے میں نیند کی گولی دینا شروع کی تھی وہ رات میں اٹھتا ہی کہاں تھا۔

سائیڈ ٹیبل خالی دیکھ کر نیاز خود ہی اٹھ کر کچن کی طرف جا رہا تھا۔۔۔ کیونکہ اس وقت وہ شگفتہ کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔۔ جب اچانک ہی اس کی نظر بستر پر پڑی۔۔۔ دوسری طرف کا خالی پن اسے چونکنے پر مجبور کر گیا۔۔۔ شگفتہ بستر پر نہیں تھی' وہ بھی رات کے اس پہر۔۔۔

"اللہ خیر کرے۔۔۔ وہ ٹھیک تو ہے ناں!"

اسے پل میں فکر مندی نے آگھیرا اور پیاس کا شدید احساس پس پشت چلا گیا۔ جلدی سے باہر نکل کر کچن میں جھانکا' پھر باتھ روم۔۔۔ ایک کمرہ' دوسرا کمرہ' چھت۔۔۔ غرض کے پورا گھر چھان مارا' پریشانی سے نیاز کا برا حال تھا۔۔۔ اور عجیب عجیب خیالات جنہیں وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا اس کی ذہنی سطح کو پراگندہ کر رہے تھے کہ تبھی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

کسی خوش امیدی کے سہارے میں وہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا تھا۔۔۔ مگر دروازہ پہلے سے کھلا پاکر اس کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین ہی سرک گئی۔ کھوئے کھوئے انداز میں اس نے دھیرے سے دروازہ کھول دیا۔

"نیاز بھائی۔۔۔ وہ بھابی!" بوکھلائے ہوئے ساجد نے اسے ہوش کی دنیا میں واپس پہنچا تھا۔

"کیا ہوا ساجد! تو اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟"

"وہ نیاز بھائی۔۔۔ میں نے ابھی شگفتہ بھابھی کو بس اڈے کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ میں ابھی دکان سے آ رہا تھا' بڑی مشکل سے سائیکل دوڑاتے آپ تک پہنچا ہوں۔۔۔ ان کے ساتھ وہ لفنگا آصف بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے جلدی سے چادر میں منہ چھپا لیا۔"

ساجد نے جھجکتے ہوئے اسے بتایا تھا کیونکہ آخر وہ اس کی بیوی تھی۔۔۔ اور ساجد کوئی بچہ تو نہیں تھا جو رات کے اس پہر ایک شادی شدہ عورت کا کسی غیر مرد کے ساتھ ہونے کا مطلب نہ سمجھتا۔ غصے اور ذلت کے احساس سے اس کی کنپٹی کی رگیں پھڑکنے لگی تھیں اور آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"تجھے پکا یقین ہے ساجد! کہ وہ شگفتہ اور آصف ہی تھے؟" ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرتے اس نے پوچھا تھا۔

"بالکل نیاز بھائی' میں انہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔"

نیاز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان دونوں کے ساتھ کیا کر ڈالے۔۔۔

بس اڈے پر پہنچ کر انہیں زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑی تھی۔ ٹکٹ کاؤنٹر کے پاس ہی وہ دونوں انہیں مل گئے تھے۔ شگفتہ کو دیکھ کر نیاز کب سے خود پر کیا ضبط کھو بیٹھا۔۔۔ اور اسے بالوں سے پکڑ کر یوں جھٹکا دیا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر آ رہی۔ اس کا فشار خون خطرناک حد تک بلند تھا اور جبڑے یوں تنے ہوئے تھے کہ اسے دیکھ کر خوف آ رہا تھا۔ شگفتہ بھی اسے یوں آفت ناگہانی کی طرح سر پر کھڑا دیکھ کر زرد پڑ گئی۔ وہ تو بے فکر تھی کہ اب وہ صبح سے پہلے نہیں اٹھے گا۔۔۔ اسے یوں اچانک سامنے پاکر جیسے اس کے جسم کا سارا خون ہی نچڑ گیا تھا۔

"تم۔۔۔ تم تو سو رہے تھے۔۔۔ میں نے خود تمہیں چائے میں نیند کی گولی دی تھی پھر اتنی جلدی کیسے۔۔۔؟" شدید خوف کے زیر اثر وہ بدحواسی میں اپنا ہی راز افشا کر گئی تھی۔۔۔ اور نیاز پر جیسے ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"تو روز مجھے چائے میں نیند کی گولی دیتی تھی؟ تاکہ میں سوتا رہوں اور تو بے فکر ہو کر۔۔۔ کس حد تک گرے گی تو شگفتہ۔۔۔ کس حد تک؟"

وہ نفی میں سر ہلاتا نفرت سے اس کے کم عمر خوب صورت چہرے کو دیکھ رہا تھا جس پر اس نے جان لٹائی تھی اور بدلے میں۔۔۔!

"کیا کچھ نہیں کیا میں نے تیرے لیے شگفتہ۔۔۔! کس چیز کی کمی رکھی تیری زندگی میں؟ اس بڑھے نشئی سے بچایا تجھے۔۔۔ یہاں تک کہ تیرے لیے اپنی بیوی بچوں تک کو بھی چھوڑ دیا۔۔۔ پر تو پھر بھی میری نہ ہو سکی۔۔۔ وہ نفرت سے اسے دیکھتا پھنکار رہا تھا۔۔۔ لوگوں کا ایک وسیع ہجوم ان کے گرد جمع ہو چکا تھا۔۔۔ اور

آصف بھی اس کے ساتھ تھا۔ نیاز اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس کا کھویا ہوا حوصلہ بحال ہونے لگا اور تن کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"اور تم خود کیسے ۔۔۔ ہو نیاز علی! میرا تمہارا تو صرف چند مہینوں کا ساتھ تھا وہ بھی مجبوری کا ۔۔۔ اور اس پر تمہیں اتنا افسوس ہو رہا ہے۔ جبکہ تم نے تو اس عورت کے ساتھ بے وفائی کی ۔۔۔ کو ہی رات کو ذلیل و رسوا کر کے گھر سے نکال دیا۔ جس نے ساری عمر تمہاری خدمت کی تم سے محبت کی ۔۔۔ اور تمہارے سکون کے لیے میری زیادتیاں بھی چپ چاپ برداشت کرتی رہی ۔۔۔ اور تم نے تو اسے سزا سناتے ہوئے صفائی کا ایک موقع بھی نہیں دیا ۔۔۔ اور تم کہتے ہو کہ یہ سب تم نے میرے لیے کیا؟" اس کا استہزائیہ قہقہہ اتنا بلند تھا کہ تمام سماعتوں میں دیر تک گونجتا رہا۔

"یہ سب تم نے میرے لیے نہیں بلکہ صرف اپنے لیے کیا ہے ۔۔۔ اپنے نفس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ۔۔۔ تم مجھے کمینہ کہہ رہے ہو جبکہ تم سے زیادہ کمینہ اور بے غیرت تو میں نے اس دنیا میں نہیں دیکھا۔"

اسے اب نیاز سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اس لیے سچ اگلنے کے لیے سب سچ بول دیا اور نیاز اس یکسر بدلی ہوئی شگفتہ کو حیرت سے دیکھ رہا تھا جس کی زبان کا شہد اچانک زہر میں بدل گیا تھا اور اس پر اس کے انکشافات ۔۔۔ توبہ۔

"تو کیا ۔۔۔ جو تو نے حسنہ کے بارے میں کہا سب جھوٹ تھا؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ جب تم اتنے سالوں میں بھی اپنی بیوی کو نہیں جان سکے ۔۔۔" اور نیاز کے منہ پر جیسے کسی نے زور کے طمانچہ دے مارا تھا۔ کہ وہ اپنی جگہ سے ہل تک نہیں سکا۔ ساجد نے آصف سے اس کا بیگ چھین کر چیک کیا جو نقدی اور زیورات سے بھرا ہوا تھا۔

آصف بے بس کھڑا رہا کیونکہ کہانی کھل چکی تھی اور لوگوں کے ہجوم میں اس کا فرار کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ نیاز نے وہیں کھڑے کھڑے اسے طلاق دے دی ۔۔۔ مگر شگفتہ کی آنکھوں میں اتنا تمسخر تھا کہ اسے لگا جیسے اس نے شگفتہ پر نہیں ۔۔۔ بلکہ خود اپنے آپ پر ہی تھوک دیا ہو۔

☆ ☆ ☆

ہجوم چھٹ چکا تھا اور اکا دکا مسافروں کے سوا اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ دونوں طوفان کے بعد کی سی خاموشی میں بینچ پر تنہا بیٹھے تھے۔ آصف کی حالت اس لٹے پٹے مسافر کی سی تھی کہ جس کا انتہائی قیمتی سامان عین منزل کے قریب پہنچ کر چھن گیا ہو اور وہ بالکل خالی ہاتھ رہ گیا ہو۔

افسوس تو شگفتہ کو بھی بہت تھا ۔۔۔ لیکن اس سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ نیاز سے اس کی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی تھی ۔۔۔ اور اب آصف اور اس کے درمیان کبھی کوئی نہیں آنے والا تھا۔ یہی بات اس نے اداس بیٹھے آصف کو بھی سمجھانے کی کوشش کی۔

"چھوڑو آصف ۔۔۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ افسوس مجھے بھی ہے ان زیورات اور پیسوں کے جانے کا ۔۔۔ اتنی محنت سے پلاننگ کر کے میں نے سب کچھ حاصل کیا تھا۔ پر تم میرے ساتھ ہو تو ہر چیز میرے لیے بے معنی ہے ۔۔۔ کیا تمہارے لیے میری موجودگی ۔۔۔ میرا ساتھ کافی نہیں ہے؟"

مان بھری نظروں سے اسے دیکھتی پوچھ رہی تھی۔ مگر وہ حیران رہ گئی جب اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنے کے بجائے وہ اسے جھٹک کر دور جا کھڑا ہوا۔

"دماغ ٹھیک ہے تیرا؟ تو کہاں کی مس ورلڈ ہے کہ تیرے لیے میں گھر والوں کو ٹھکرا دوں ارے تجھ جیسی پکے پھل کی طرح جھولی میں آگرنے والیوں کو تو میں منہ لگانا پسند نہ کروں ۔۔۔ گھر کی عزت بنانا تو دور کی بات ہے۔ تو کیا سمجھی تھی کہ میں تیرے پیچھے ہوں ۔۔۔؟"

وہ اس کی خوش فہمی پر قہقہہ لگا کر ہنسا ۔۔۔ بالکل ویسے ہی جیسے کچھ دیر قبل وہ نیاز پر ہنسی تھی' اس کی سانسیں رکنے لگیں۔

"ویسے تو بڑی چالاک بنی ہے اور اتنا بھی نہیں سمجھی کہ ایک شادی شدہ عورت سے میرا کیا لینا دینا۔ ٹھیک ہے کہ تو خوب صورت ہے۔ پر اتنی بھی نہیں کہ۔ وہ تو تیرے شوہر کے مال پر نظر تھی' اس لیے تجھے پھنسانا پڑا۔ اور تو نہیں کیا سمجھی۔ خود بڑا مال کو الوبنا چکی ہے پھر بھی مجھ سے امیدیں باندھ بیٹھی۔"

اس کا انداز تخاطب ہی نہیں بلکہ وہ خود بھی سر تاپا بدل چکا تھا' شگفتہ کے اسے جاننے کے تمام دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ پھر بھی یقین تھا کہ آ کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"دیکھ شگفتہ۔ میرے ساتھ اور یہ ڈرامے نہ کر میں پہلے ہی تجھ پر اپنا بڑا وقت برباد کر چکا ہوں۔ دو دن بعد بھی یہی ہونا تھا تو ابھی سہی۔ میں چلتا ہوں۔"

اس نے بڑے ہی اطمینان سے جیسے اس پر کھولتا ہوا پانی انڈیل دیا تھا۔ وہ تڑپ کر اس کے قریب آگئی۔

"خدا کے لیے آصف! تم جانتے ہو ناں! تمہارے سوا میرا کوئی نہیں ہے' نہ گھر۔ نہ ٹھکانہ' میں وعدہ کرتی ہوں تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گی۔ تمہیں پیسے چاہئیں ناں۔ جتنے کہو گے کما کر لا دوں گی۔ بس مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ۔ ایک احسان کرو مجھ پر۔"

وہ اس کا ہاتھ تھامے رو رہی تھی۔ مگر خدا جانے آصف زبان پتھر دل تھا یا اس کے کرموں کا پھل۔ کہ وہ ذرا بھی نہیں پگھلا۔

"ارے چھوڑ۔ بلا کی طرح چمٹ ہی گئی ہے جان کو۔"

اس نے ارد گرد کے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ ہوتے دیکھا تو چوکنا ہو گیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ سب خدائی فوج دار بن کر ان کے معاملے میں ٹانگ اڑاتے' وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر سرعت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شگفتہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے خود سے دور بہت دور جاتا دیکھتی رہی۔

اس کے ادھ موئے وجود میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ دو قدم چل کر اسے روکنے کی کوشش ہی کر لیتی اور نہ ہی زبان میں اتنی طاقت۔ کہ آخری بار اسے آواز ہی دے سکتی۔

اس نے سہم کر ارد گرد دیکھا کہ کسی کو مدد کے لیے پکار سکے۔ لیکن ہر بار کوئی نیاز فرشتہ بن کر پہنچ جائے' ضروری نہیں۔

☼ ☼ ☼

اپنی زبان سے ادا ہوا لفظ لفظ۔ حسنہ کی التجائیں' سردی سے کپکپاتی رات اور اس کے بھوکے بچے۔ کون سا لمحہ تھا جب وہ رات اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اس کی یادداشت پر دستک نہ دیتی۔ اور اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنا سر دیوار سے دے مارے۔

محبت تو حسنہ نے کی تھی بچی اور انمول۔ جس نے خود تکلیف سہہ کر نیاز کو سکھ دینے کی کوشش کی تھی۔

وہ جلتی جاگتی آنکھوں سے صبح کا انتظار کرنے لگا۔ صبح جسے اس کے مقدر کا فیصلہ کرنا تھا۔

"اور پھر اتو نہیں آئے گا اپنے ابو کے پاس؟" ایک

بار آ کے مل تو سکی پایا ہے۔" اس کی منتظر نگاہوں نے حسنہ سے انور تک کا سفر کیا۔

انور ابھی تک اس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ وہ بچی کی طرح نا سمجھ نہیں تھا۔ سب کچھ اس نے خود اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھا تھا۔ اسی لیے وہ ماں کو چھوڑ کر باپ کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس کا دل باپ سے ملنے کے لیے ہمک رہا تھا۔

اس نے امید بھری نظروں سے ماں کو دیکھا' اور حسنہ سنگدل تو کبھی بھی نہیں رہی تھی جو اسے مزید آزمائش میں ڈالتی۔

سر کی جنبش سے انور کو اس کا سامان لوٹا کر وہ تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔۔۔ اور بیٹے کو سینے سے لگاتے نیاز کو اس کی تھکن اپنی رگوں میں اترتی محسوس ہوئی۔

حسنہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ اپنی پدرانہ شفقت سے مجبور ہو کر صرف اپنے بچوں سے ملنے آیا ہے' اسے اپنے سامنے بچھی کرسی پر بیٹھتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"تیرا محبوب نہ سہی۔۔۔ خاوند تو اب بھی ہوں' کیا تو مجھے ایک بار معافی مانگنے کا موقع بھی نہیں دے گی؟"

اس کے لفظوں سے چھلکتی بے بسی نے جیسے حسنہ کی ساری ہمت ہی توڑ دی' وہ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ بھی نہ چھڑا سکی۔

"میں جانتا ہوں حسنہ! تو مجھ سے بہت خفا ہے۔۔۔ اور یہ تیرا ظرف ہے حسنہ۔۔۔ ورنہ اگر ساری عمر کے ساتھ کے بعد بھی کوئی مجھے یوں ذلیل و رسوا کرتا تو شاید میں ساری زندگی اس انسان کی شکل بھی نہ دیکھتا۔

ظرف میں اور محبت میں تو میں کبھی بھی تجھے چھو ہی نہیں پایا حسنہ۔۔۔!" اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ۔۔۔ وہ جیسے آج اپنے آپ پر ہنس کر اپنا ہی مذاق اڑا کر۔۔۔ خود سے انتقام لینے پر تلا ہوا تھا۔

"کتنی راتوں سے میں ایک پل نہیں سو پایا۔۔۔ لعنت نے جیسے میرے قدموں میں انگارے بچھا دیے ہیں۔ میں اسی لائق ہوں کہ مجھ پر تھوکا جائے اور مجھے چھوڑ دیا جائے۔"

نیاز بے بس سا اس کے قدموں میں آ بیٹھا' اور بھیگے چہرے کے ساتھ دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔

"میں جانتا ہوں بہت مشکل ہے' پر مجھے ایک موقع دے۔۔۔ اپنی غلطیوں کو سدھارنے کا' اپنے جرم کی تلافی کا۔۔۔ اور تیرا دامن خوشیوں سے بھرنے کا' بس ایک موقع۔۔۔ ورنہ ساری زندگی تجھے دیے زخموں کی تکلیف مجھے جینے نہیں دے گی۔" وہ امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اور وہ اس کے بندھے ہاتھوں پر چہرہ ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

۔۔۔ وہ اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی تھی۔

اس لیے نہیں کہ وہ کسی اور کے در پر مجبور بیٹھی تھی۔۔۔ اس لیے بھی نہیں کہ وہ اپنے بچوں کو باپ کے ساتھ ماں کا پیار بھی دینا چاہتی تھی۔

بلکہ اس لیے کہ وہ آج بھی اس سے محبت کرتی تھی' اتنی ہی شدت سے۔۔۔ اور یہ وہ واحد کام تھا جو وہ صرف اپنی ذات کے لیے کرتی تھی۔۔۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ اب بھی اس پر پہلے کی طرح اعتبار نہیں کر پائے گی۔۔۔ یہ اس کا خیال تھا۔ مگر کون جانے کہ آنے والے چند مہینوں یا سالوں میں وہ اس پر پہلے سے بھی زیادہ اندھا اعتماد کرنے لگے۔ کیونکہ وہ حسنہ تھی۔

جس کی محبت کو وقت کے منصف نے کندن ثابت کیا تھا۔۔۔ وہ کوئی ریت کی دیوار تھوڑی تھی' جو ذرا سی تیز ہوا کا بار بھی برداشت نہ کر پائے' اور ذرہ ذرہ یوں بکھر جائے کہ جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔۔۔

نبیلہ عزیز

رقصِ بسمل

ماورا مرتضیٰ، عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ڈری رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حامی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دس سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔

خوشینہ اور نینو کے بھائی رضا حیدر کے لاڈلے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شاندار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نینو کے بیٹے سے فارہ کی بہن بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ عارضی ملاقات ولید اور عزت کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ دیتی ہے۔ تاہم عزت کھل کر اس کا اظہار کرتی ہے۔ ولید ابھی تحمل سے کام لے رہا تھا۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر چکا ہے۔ فارہ روتی ہے۔ اشتیاق یزدانی آفاق سے بے حد خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ رضا حیدر، تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بے حد اصرار سے مدعو کرتی ہے۔

تیسویں قسط





اس کے چہرے پہ خراشیں نظر آرہی تھیں جیسے کسی نے اس کا چہرا نوچ ڈالا ہو۔

"یہ... یہ... کیا ہوا ہے ماورا...؟" تیمور دیکھ کر ہی تڑپ گیا تھا اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

لیکن ماورا اس کے اس قدر تشویش زدہ سوال کا جواب دینے کے بجائے سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی تھی۔

"ماورا! میں آپ سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔ کسی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا...؟" تیمور کی پریشانی ہر بڑھتے سیکنڈ کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔

"ہاں... ہوا ہے جھگڑا..." اس نے بے حد دو ٹوک سے لہجے میں جواب دیا تھا۔

"کس کے ساتھ...؟" تیمور کا سوال بڑا بے ساختہ اور حسب توقع تھا۔

"اپنے آپ کے ساتھ..." ماورا کا جواب البتہ غیر متوقع تھا۔

"واٹ...! اپنے آپ کے ساتھ...؟" تیمور کو اچنبھا ہوا تھا۔ ماورا کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"ہاں...! اپنے آپ کے ساتھ... دراصل میرے چہرے پہ کسی اور کا چہرا نظر آنے لگا تھا مجھ سے برداشت نہیں ہوا... میں نے نوچ ڈالا۔"

اس کے جواب پہ تیمور کو اس کی ذہنی حالت پہ شک گزرا تھا۔

"چہرہ نوچ ڈالا...؟ مگر کیوں...؟" اس کی الجھن سلجھ ہی نہیں رہی تھی۔

"بتایا تو ہے... میرے چہرے پہ کسی اور کا چہرہ نظر آنے لگا تھا۔" وہ ہنوز اسی طرح تھی۔

"لیکن کس کا...؟" بے اختیار زبان سے سوال پھسلا تھا۔

"آپ کا..." ماورا نے یک دم سر اٹھا کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

"میرا چہرہ...؟ آپ کے چہرے پہ...؟" تیمور مزید الجھن کا شکار ہوا تھا۔

"ہاں...!" اس نے سرد سے لہجے میں ہاں کہا۔

"ماورا...! مجھے لگتا ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" تیمور کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورت حال کو کس طرح سنبھالے اور کیا کہے؟

"طبیعت ٹھیک ہی تو کرنے آئی ہوں۔" اس کی بہکی بہکی باتیں ہنوز تھیں۔

"میں سمجھا نہیں...؟" اس نے ماورا کی آنکھوں میں دیکھا وہ نظریں جھکا گئی تھی۔

"میں واپس فیصل آباد جانا چاہتی ہوں۔" اس نے یونہی نظریں جھکائے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

"واپس فیصل آباد...؟ مگر کیوں ماورا...؟ آپ تو یہاں جاب کے لیے..."

"میں جاب چھوڑ کر ہی جا رہی ہوں۔" اس نے تمام فیصلے پہلے سے ہی کر رکھے تھے۔

"مگر آپ کے یہاں آنے کا کوئی مقصد تھا۔ آپ نے خود ہی تو کہا تھا؟" تیمور نے اسے جیسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

"میں اپنے ہر مقصد سے دست بردار ہونا چاہتی ہوں، میں ہر چیز کو یہاں ہی چھوڑ کر جا رہی ہوں۔" ماورا جیسے سب کچھ چھوڑنے کی بات کر رہی تھی، تیمور ویسے ویسے ٹینشن کے گھیرے میں آتا جا رہا تھا۔

"آخر کیوں...؟ یہ تو بتائیں...؟" تیمور جھنجلانا نہیں چاہتا تھا مگر پریشانی پیدا ہی کی۔

"آپ کے اس کیوں کا جواب میرے چہرے پہ لکھا ہے۔" وہ بے حد آہستگی سے بولی تھی۔

"آپ کے چہرے پہ زخم تحریر ہیں ماورا... اور میں یہ زخم یہ تحریر پڑھ نہیں سکتا... مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے... پلیز..." تیمور بے بسی سے بولا تھا۔

"بالکل اسی طرح میں بھی اپنے چہرے پہ آپ کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی... مجھ میں بھی اتنا حوصلہ نہیں تھا۔"

ماورا کی ہر بات عجیب اور سمجھ سے باہر تھی۔

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔۔؟" وہ سوال بدل بدل کر جواب اگلوانا چاہ رہا تھا۔

"یہ جو آپ ایک سال سے کہہ کہہ کر تھک گئے ہیں۔" اس کے جواب میں اب بھی ریشم جیسی الجھن تھی۔

"میں تو ایک سال سے محبت کہہ رہا ہوں۔۔ کہ مجھے محبت ہے۔ محبت ہے۔ محبت ہے۔" تیمور کے لب و لہجے میں محبت کی شیرینی سی گھل گئی تھی۔

"اور مجھے دوسرے کہہ رہے ہیں کہ تمہیں محبت ہے۔ تمہیں محبت ہے۔ تمہیں محبت ہے۔" ماورا بھی اسی کے انداز میں بولی تھی۔

"کس سے۔۔؟" اس نے بہت بے ساختگی سے پوچھا تھا۔

"تیمور حیدر سے۔۔" ماورا نے ذرا توقف سے کہا تھا اور تیمور یک دم ٹھٹھک گیا تھا، لیکن پھر چند سیکنڈز کے توقف سے وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور پھر ہنستا چلا گیا تھا۔

اور ماورا اس کی ہنسی پہ ضبط کرتے ہوئے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی تھی۔

"ارے۔۔ سچ۔۔؟ یہ اتنا خوب صورت اور جان لیوا خیال کس کا ہے۔۔؟" تیمور تو جیسے خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔

"نبیل کا۔۔!" ماورا نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"نبیل۔۔؟ آج تو پھر میرا حق بنتا ہے کہ میں ان کا منہ چوم لوں۔" تیمور کی سرشاری اس کے لہجے اور اس کے لفظوں سے ہی ظاہر ہو رہی تھی۔

"میں مذاق نہیں کر رہی سر۔۔!" اس نے چبا کر کہا۔

"میں بھی مذاق نہیں کر رہا۔۔ مجھے واقعی ان کا خیال سن کر خوشی ہوئی ہے۔ ایسا خیال تو کبھی مجھے بھی نہیں آیا۔ اور اگر ان کو آیا ہے تو یقیناً اس کے پیچھے بھی کوئی وجہ ہوگی۔" تیمور کہتے کہتے تھوڑا سنجیدہ ہو گیا تھا، البتہ لہجہ قدرے متبسم ہی تھا۔

"وجہ جو بھی ہے۔۔ میں یہاں سے جا رہی ہوں۔" اس کا فیصلہ دو ٹوک ہی تھا۔

"یہاں سے جا رہی ہیں۔۔؟ مگر کیوں۔۔؟ اس میں میرا کیا قصور ہے۔۔؟ سزا مجھے کیوں دے رہی ہیں؟" تیمور نے بڑی بے چارگی کا اظہار کیا تھا۔

"میں آپ کو سزا دے نہیں رہی بلکہ سزا سے بچا رہی ہوں۔ اگر میں یہاں رہی تو آپ کے حصے میں سزا ہی آئے گی۔" ماورا نے ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں۔۔ مجھے آپ کی ہر سزا قبول ہے۔۔ منظور ہے سب کچھ۔۔ بس آپ نظروں کے سامنے رہو۔"

کہتے ہوئے تیمور کا لہجہ گمبھیر ہو گیا تھا اور ماورا اس کے لہجے کی آنچ سے مزید پگھل گئی تھی۔ اس نے یک دم سر اٹھا کر تیمور کو دیکھا تھا۔

"میں ہر صورت یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔" ماورا کہہ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"ضرور۔۔ چلی جایئے گا۔۔ مگر نکاح کے بعد۔۔" تیمور بھی کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ماورا نے کرنٹ کھا کے اس کی سمت پلٹ کر دیکھا تھا۔

"نکاح کے بعد۔۔؟"

"ہاں۔۔! نکاح کے بعد۔۔ میں بس آج یا کل میں ہی سب کچھ ریڈی کروا لوں گا۔" وہ اپنی کرسی کی جانب بڑھتے

نکل کر مادرا کے قریب آگیا تھا۔ وہ ٹیبل کے پاس ہی کھڑی تھی' ایک ہاتھ ٹیبل پر ہی رکھا ہوا تھا۔

"منگر۔۔۔!" مادرا نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"اب اگر مگر کچھ بھی نہیں مس مادرا مرتضیٰ۔۔۔ یہ میرا دل ہے۔۔۔ مٹی کا کوئی کھلونا نہیں ہے کہ جب دل چاہا کھیل لیا اور جب دل چاہا' اٹھا کر پھینکا اور توڑ دیا۔۔۔ اسے ہاتھ میں بھینچ کر دیکھو۔۔۔ ابھی زندہ ہے اور خوب دھڑکتا ہے۔ جس روز چپ ہو گیا پھر بے شک چلی جانا۔۔۔ سمجھ لینا کہ مر گیا۔۔۔"

تیمور نے اس کے بے حد قریب آکر کچھ اس طرح کہا تھا کہ مادرا اپنی جگہ پر جم سی گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے تیمور اس پہ حاوی ہو رہا ہو۔

اور یہ احساس ہی اس کی تڑپ اور بے بسی کے لیے بہت تھا۔

اس نے بے اختیار تیمور کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

"جائیے' گھر جائیے۔۔۔ اور آرام کیجیے۔۔۔ زخم ہضم کرنے کی کوشش کریں' دلہنوں کے چہرے صاف ہی اچھے لگتے ہیں۔"

تیمور جیسے اپنے قدموں پہ اور اپنے فیصلے پہ جم چکا تھا اور مادرا اب چاہ کر بھی اسے اس فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹا سکتی تھی۔ وہ اپنے مردہ قدموں سے چلتی اس کے کمرے سے باہر نکل آئی تھی' مگر بہت سی سوچیں۔۔۔ بہت سی بے چینیاں اور بہت سی بے بسی اس کے ہمراہ تھی۔ وہ بڑی لاچار حالت میں گھر پہنچی تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی۔۔۔ امی۔۔۔! دیکھیں کون آیا ہے۔۔۔؟" ولید نے گھر میں داخل ہوتے ہی شور مچا دیا تھا اور عزت اس کے ایسے شور پہ اندر ہی اندر شرمندہ سی ہو گئی تھی کہ آنٹی کیا سوچیں گی؟

"کون آیا ہے بھئی۔۔۔؟" زبیدہ خاتون دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کمرے سے باہر نکلیں' لیکن عزت پہ نظر پڑتے ہی خوشی کے مارے ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"ارے میری بہو آئی ہے۔" ان کا لہجہ بھی خوشی کے باعث چہک اٹھا تھا' اور وہ لپک کے عزت کے قریب آگئی تھیں۔

"السلام علیکم۔۔۔!" عزت نے بڑے دھیمے سے انداز میں انہیں سلام کیا تھا' مگر انہوں نے اسے گلے لگا لیا تھا۔

"صرف سلام سے کام نہیں چلے گا۔ یہاں تو بڑی شدتیں ہیں۔۔۔" ولید بال کھجاتے ہوئے کہہ کر برآمدے کی طرف بڑھ گیا تھا اور زبیدہ خاتون کے گلے ملتی عزت اس کی پشت دیکھ کر رہ گئی۔

"امی۔۔۔! آپ کے بچے کہاں ہیں؟" ولید آج بڑے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

"کمرے میں ہوں گے۔ آؤ بیٹا۔۔۔ تم بھی اندر ہی آجاؤ۔" زبیدہ خاتون ولید سے کہہ کر عزت کی طرف متوجہ ہوئی تھیں اور اسے ساتھ لے کر کمرے کی طرف بڑھیں' اتفاقاً" ولید بھی ان کے ساتھ ہی کمرے کی طرف بڑھ آیا تھا اور اندر قدم رکھتے ہی یک دم شور مچ گیا تھا' وحید اور ککو نے پھولوں کی پتیاں نچھاور کرتے ہوئے بڑے پرزور اور بھرپور انداز میں عزت کا استقبال کیا تھا' جس پہ ولید اور عزت دونوں ہی بہت زیادہ خوش ہوئے تھے' انہوں نے ان دونوں کو سر پر اٹھا دیا تھا۔

"السلام علیکم بھابھی۔۔۔!" ککو بے اختیار آگے بڑھی تھی اور عزت نے اس کے گال پہ پیار کرتے ہوئے اسے گلے لگا لیا تھا۔

پھر وحید آگے بڑھا۔

"السلام علیکم...!" وہ تھوڑا جھجک رہا تھا۔
"پاس آئیں۔" عزت مآب نے شرارت سے کہا۔
"کیوں؟ کیا مجھے بھی گلے لگائیں گی...؟" اس نے شرارت کا جواب شرارت سے دیا تھا اور وہ سب بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔
"شریر...! تمہیں تمہاری وہ گلے لگائے گی۔" عزت مآب نے مسکراتے ہوئے اس کے بال بکھیرے تھے اور وحید نے توپوں کا رخ ولید کی طرف موڑ دیا تھا۔
"بھائی...! آپ بتائیں... کیا ایسا ہوتا ہے...؟" وحید نے بے حد آہستگی سے سرگوشی کی تھی۔
"ہمارے ساتھ تو ابھی تک ایسا ہوا نہیں... جب ہو گا تب ہی کچھ بتاؤں گا۔"
ولید نے کہتے ہوئے جھک کر ٹیبل پہ رکھی پلیٹ سے گلاب جامن اٹھا کر منہ میں رکھ لیا تھا اور پھر سیدھے ہوتے ہوئے ذومعنی نظروں سے عزت کو دیکھا تو اسے گھور کر رخ موڑ گئی تھی جس پہ وحید بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
"بھابھی بیٹھیں نا...!" ککو نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
"میں کہاں بیٹھوں...؟" ولید نے ادھر ادھر دیکھا، وہاں انہوں نے صرف ایک کرسی رکھی ہوئی تھی یعنی صرف عزت کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔
"ہمیں کوئی نیگ دیں... کوئی رشوت دیں... کوئی پارٹی دیں تو ابھی بیٹھنے کی جگہ مل جائے گی۔" وحید آج پیش پیش تھا۔
"وحید...! تم بھی یار... کمال کر رہے ہو آج... یہ لڑکیوں والے کام تم نے کب سے شروع کر دیے...؟" ولید بڑے آرام سے کہتا آگے بڑھ کے کرسی پہ بیٹھ گیا تھا اور وہ سب منہ دیکھتے رہ گئے تھے کیوں کہ کرسی اس نے سنبھال لی تھی۔
"بھائی پلیز، یہ بھابھی کی جگہ ہے۔" ککو منہ ہی منہ میں منمنائی تھی۔
"ارے میری جان... بھائی ہو گا تو بھابھی ہو گی نا...؟ اس لیے پہلے میری جگہ پھر اس کی جگہ... مجھے کرسی مل گئی ہے اب اس کے لیے لے آؤ۔"
وہ بڑے مزے سے کرسی پر براجمان ان کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زبیدہ بیگم مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔
"بھائی یہ چیٹنگ ہے۔" ککو پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور اس کے ساتھ وحید بھی۔ اور عزت کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی اس کا منہ دیکھنے لگی۔
"ارے... اس سے اچھا موقع اور کہاں ملے گا...؟ دروازہ بند کر دوں...؟" ولید بے ساختہ ٹیک سے اٹھا تھا۔
"ولید...!" عزت یکدم بدک گئی تھی اور ولید کے قدم رک گئے تھے۔
"حکم میری جان...؟" وہ بڑے دلبرانہ انداز میں اس کی طرف پلٹا تھا۔
"یہ کیا کر رہے ہیں آپ...؟" وہ دبے لہجے میں بولی۔
"موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں بس... اور تو کچھ نہیں۔" اس کا انداز تھوڑا لاپروائی تھا۔
"پلیز...! میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔" اس نے ولید کو دھمکی دی۔
"میری اجازت کے بغیر اب تم کہیں بھی نہیں جا سکتیں... اس کمرے سے اس کمرے تک بھی نہیں۔" ولید نے رعب جمانے کی کوشش کی۔

"کیوں۔ ؟میں کیوں نہیں جاسکتی۔" اس نے تنک کر پوچھا۔
"کیوں کہ تم میری بیوی ہو اور میں تمہارا شوہر۔ تم نے میرا حکم ماننا ہے۔ ہر حال میں۔" ولید اس کے قریب آرکا تھا عزت دو قدم پیچھے ہو گئی تھی۔
"اوہ تو بڑی جلدی شوہروں والی اصلیت سامنے آگئی۔" عزت بڑے استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے مسکرائی تھی۔
"ابھی کہاں۔ ؟ابھی تو دروازہ کھلا ہوا ہے۔" ولید کا لہجہ اور بات معنی خیز تھے۔ عزت کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ جان بوجھ کر پٹری بدل رہا ہے۔
"میں چلتی ہوں۔ میری ساس کے بچے ناراض ہو کر گئے ہیں۔" وہ جانے کے لیے پلٹی۔ ولید نے اس کی کلائی پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔
"یہ بچہ بھی آپ کی ساس کا ہی ہے۔ پہلے اسے تو راضی کرلو۔" وہ اس کے کھینچنے پہ بمشکل توازن قائم رکھ پائی تھی ورنہ سیدھی اس کے سینے سے ٹکرا جاتی۔
"ولید پلیز۔ باہر آنٹی اور بچے۔" عزت نے اسے باز رکھنے کے لیے کچھ کہنا چاہا تھا۔
"نہیں پتا ہے اندر دونوں میاں بیوی ہیں۔" اس نے اس کی کلائی مزید دبائی تھی۔
"آنٹی نہیں آئیں گی۔" اس نے منہ بسورا۔
"میں اٹھا کرلے آؤں گا۔" وہ اسے بانہوں میں بھرنا چاہتا تھا' لیکن عزت نے یک دم اسے پرے دھکیل دیا تھا۔
"اتنا آسان نہیں ہے اٹھا کرلے آنا۔ سمجھے آپ۔" وہ اسے پرے دھکیل کر کہتی ہوئی دروازے کی طرف بھاگی۔ اور پیچھے ولید ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
عزت کے قدم دروازے کے بیچوں بیچ آکر ٹھٹک گئے تھے اس نے پلٹ کر دیکھا وہ بڑے مزے سے کھڑا ہنس رہا تھا۔
"بس اتنی سی خود اعتمادی تھی؟" دو منٹ میں گھبرا گئیں۔ ؟ تمہیں پتا بھی ہے میں ایسی کوئی حرکت کرسکتا ہوں کیا۔ ؟" ولید بڑے سکون سے کھڑا پوچھ رہا تھا اور عزت اپنی بوکھلاہٹ پہ بے اختیار جھینپ گئی تھی۔
"تو بیٹھو۔ میں ان دونوں کو بھی بلا کے لاتا ہوں۔" ولید کرسی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا تھا اور عزت سر جھٹک کر مسکراتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی تھی!

☆ ☆ ☆

پھر یوں ہوا کہ تیمور کے اگلے چند روز سکون سے گزرے تھے۔
نہ کوئی رضا حیدر کی طرف سے ایشو کھڑا ہوا تھا اور نہ ہی مادر امر تضیٰ کی طرف سے۔ اسی لیے اس کے چند دن سکون اور آزادی سے گزر گئے تھے۔
مگر آج گھر آتے ہی وہ ٹھٹک گیا تھا کیونکہ عزت اس کے انتظار میں ایک نیوز لیے بیٹھی تھی۔
"خیریت۔ ؟تم کال کیوں کررہی تھیں؟" تیمور کپڑے تبدیل کرکے سیدھا اس کے کمرے میں آیا تھا۔
"بابا جان آئے تھے میرے پاس۔" عزت چہرے سے کچھ پریشان لگ رہی تھی۔
"تو پھر۔ ؟" تیمور نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"دبئی کے ٹکٹ لیے ہیں انہوں نے ان کے دوست احمد شیرازی کی بیٹی کی شادی ہے۔" وہ کہتے ہیں تم بھی

ساتھ چلو۔" عزت نے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔
"محمد شیرازی کی بیٹی کی شادی۔؟" تیمور نے یاد کرنے کی کوشش کی۔
"ہاں شادی تو ہے۔میں نے بھی چند روز پہلے ذکر سنا ہے۔"
"لیکن بھائی ایک ہفتے کے لیے۔؟" عزت کسی طور بھی جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔
"ارے میری جان ڈونٹ وری۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اب وہ کچھ بھی نہیں کرسکتے۔تم بے فکر ہو کر جا سکتی ہو۔ویسے بھی ماما بھی تو ساتھ ہوں گی۔" تیمور بڑے پرسکون انداز سے کہتا اس کے برابر ہی صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔
"ماما کیا کرسکتی ہیں بھلا۔؟ انہیں تو گھر میں بھی خبر نہیں ہوتی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں۔؟ وہاں کیا ہوگی۔" عزت منہ بنا رہی تھی۔
"چلو ساتھ تو ہیں ناں۔؟ تمہیں کچھ تو سہارا ہوگا۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔
"لیکن بھائی! میرا جانا ضروری تو نہیں ہے۔میں بابا کو انکار کردوں گی شام کو۔" عزت مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔
"دیکھو عزت۔! ہر بات پہ انکار بھی اچھا نہیں ہوتا۔ہم پہلے ہی جو قدم اٹھا چکے ہیں وہ بہت بڑا ہے۔اب اپنے اس قدم کے لیے بابا جان کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔موقع اچھا ہے۔اگر وہ کہہ رہے ہیں تو تم چلی جاؤ۔ تمہیں وہاں کوئی بھی مسئلہ نہیں ہوگا۔میں تم سے رابطے میں رہوں گا اور میرا ایک خاص کوئی تمہاری ہیلپ کے لیے تمہارے ساتھ ساتھ ہوگا مگر اس کا کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا سوائے تمہارے۔ویسے بھی وہاں جا کے وہ لوگ تمہارے ساتھ کوئی زور وزبردستی نہیں کرسکتے۔کیونکہ یہ کام یہاں ہی ہوسکتے ہیں وہاں نہیں۔بس تم بابا جان کو خوش رکھنے کی کوشش کرو۔"
تیمور نے اسے ہر طرح سے مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔
"مگر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔کیونکہ تیام مرزا کی فیملی بھی جا رہی ہے۔" اسے ہر طرف سے خدشہ تھا۔
"ارے پاگل۔! ڈر کس بات کا۔؟ میں ہوں ناں۔؟" تیمور نے اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر اپنے بھائی ہونے کا مان بخشا تھا اور چند سیکنڈز کے لیے عزت سچ مچ مطمئن اور بے فکر ہو گئی تھی۔
"تھینک یو بھائی!" وہ آہستگی سے مسکرائی۔
"ولید کو ساتھ بھیجوں۔؟" تیمور نے اسے چھیڑا تھا اور عزت جھینپ گئی تھی۔
"پلیز!" اس کے گال گلابی ہو گئے تھے اور تیمور یک دم قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا۔
"اچھا۔یہ بتاؤ جانا کب ہے۔؟" تیمور نے اس کا کندھا تھپکا۔
"پرسوں جانا ہے۔" اب وہ مطمئن تھی۔
"تو شادی کے لیے کوئی شاپنگ وغیرہ۔؟ اس کا کیا کرو گی۔؟" تیمور کو اب اس کی شاپنگ کا خیال آیا تھا۔
"وہ بھی وہیں سے کرنی ہے بابا جان نے کہا ہے۔" وہ منہ پھلا کے بولی تھی۔
"چلو۔ اچھی بات ہے۔اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا۔اور ہاں۔ولید کو بھی فون کرکے بتا دینا کہ تم وہاں جا رہی ہو۔"
تیمور نے صوفے سے اٹھتے ہوئے اسے تاکید کی تھی۔
"جی اچھا!" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا اور تیمور کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ولید حسن جب ایک کیس کی رپورٹ تیار کرنے کے سلسلے میں مختلف ہسپتالوں کے چکر کاٹ رہا تھا۔ اسے ایک ہارٹ اسپیشلسٹ سے ملنا تھا اور اس ملاقات کے لیے اس نے پہلے ہی ٹائم لے رکھا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ وہاں پہنچا اس کے قدم ڈاکٹر کے کمرے کے باہر ہی ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ اندر ڈاکٹر کسی کے ساتھ میٹنگ چل رہی تھی اور جس کے ساتھ میٹنگ چل رہی تھی ولید اسے بخوبی جانتا تھا۔

لیکن اندر نہیں گیا تھا بلکہ ایک طرف ہو گیا تھا اور تقریباً بیس منٹ بعد یہ میٹنگ ختم ہو گئی تھی۔ ولید اس کی پشت کو دیکھتا ڈاکٹر کے کمرے کا دروازہ بجا کر اندر آ گیا تھا۔

"السلام علیکم ڈاکٹر شاہنواز صاحب۔" ولید نے بڑے پرجوش انداز میں سلام کیا تھا۔ ڈاکٹر شاہنواز اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"وعلیکم السلام ولید صاحب۔ آئیے بیٹھیے۔" ڈاکٹر شاہنواز اسے پروگرام کے حوالے سے بہت پسند کرتے تھے۔

"حضرت کا بڑا کرم ہے۔ آپ سنائیں کیسی سیریس میٹنگ چل رہی تھی؟" ولید نے کریدنے کی کوشش کی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ مسئلہ کیا ہے؟

"جی۔ ایسی ہی سمجھو ایسا ہے کہ نہ کچھ کے ٹریٹمنٹ ضروری ہے اور نہ ہی مسئلہ حل ہو رہا ہے۔" ڈاکٹر شاہنواز کچھ بے خیالی میں کہہ رہے تھے۔

"کیا مطلب؟" ولید الجھا۔

"مطلب کہ آفاق یزدانی کے دل میں سوراخ ہے اور اب مسئلہ بڑھ چکا ہے جس کی وجہ سے وہ بھی پریشان ہے اور ہم بھی۔" ڈاکٹر شاہنواز حقیقتاً پریشان لگ رہے تھے جبکہ ولید کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔

"آفاق یزدانی کے دل میں سوراخ؟" اس نے آہستگی سے پوچھا تھا۔

"بہت عرصے سے ہی کیس آیا ہے مگر تکلیف اب بڑھ چکی ہے۔"

"کب سے ہے یہ تکلیف؟" ولید کو دل پر دھکا پہنچا تھا۔

"تین سال سے۔" ڈاکٹر شاہنواز تاسف سے بولے۔

"تین سال سے؟" ولید کو حیرت ہوئی۔

"ہاں۔ اور ان کی فیملی میں کسی کو خبر بھی نہیں ہے۔"

"کیوں؟ کیا کوئی ایسی بیماری اور گھر والے انجان؟" حیرت ہی حیرت تھی۔

"کیونکہ آفاق یزدانی کے چھوٹے بھائی امین یزدانی کی ڈیتھ بھی اسی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس کے دل میں بھی سوراخ تھا وہ بھی ہمارا ہی پیشنٹ تھا۔ اس کی موت سے اس کے ماں باپ بہت ٹوٹ گئے تھے اور آفاق چاہتا ہے کہ ان کو اب اس کا پتا نہ چلے کیونکہ اس کی ماں جیتے جی مر جائے گی۔" ڈاکٹر شاہنواز کی بات پہ ولید کے کانوں سے دھواں سا نکل گیا تھا۔ وہ جیسے گم صم سا ہو گیا تھا۔

اس کی نظروں کے سامنے آفاق یزدانی کا چہرہ گھوم گیا تھا۔

اور اس کے بعد تابندہ کا چہرہ۔ جس کی زندگی آفاق کی زندگی سے جڑی تھی۔!

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ملیحہ صدیقی

[illegible]

"زری!" لبی سی کیاری کے گلاب والے حصے کے پاس سہج سہج کر قدم رکھتی دردانہ رکی۔

"کیا ہے؟" وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولی۔ کلو بھنڈی سے بھرا تھال جو ابھی اس کے سر تھوپ گئی تھیں۔

"اگر میرے لمبے بالوں میں یہ گلاب لگ جائے تو کیسا لگے اور ساتھ ہی کسی ہینڈسم کا ہو تو؟"

وہ ایک ہاتھ اپنے بالوں پر رکھے مسکراتی مگن سی بولی۔ زرین نے ایک نظر اوپر سے نیچے تک اس پر ڈالی جو سفید چوڑی دار پاجامہ اور لمبی گھیردار فراک میں اترائی ہوئی کھڑی تھی۔

"ہمیں یہ تھال اٹھا کر تمہارے سر پر دے ماروں گی۔ پھر سرخ گلاب تو نہیں سرخ گومڑ ضرور سجے گا۔ شرافت سے آکر بھنڈیاں کٹواؤ۔" اس نے بری طرح لتاڑ دیا۔

"کیا ہے یار؟" برا سا منہ بنا کر بولی۔ "اور یہ جو اتنی منتیں کر کر کے ابی سے کپڑے بنوائے ہیں نا! ان کے آنے سے پہلے اتار دو' ورنہ عصر کے وقت تمہیں سفید کپڑوں میں کھلے بالوں کے ساتھ کیاری کے پاس چہلیں کرتے دیکھ کر جو حشر ہوگا تمہارا' وہ تمہیں پتا ہے۔"

زرینہ سر جھٹکتے ہوئے دوبارہ بھنڈی کاٹنے لگی۔ وہ ان سنی کرتے ہوئے تخت پر بیٹھ کر سرخ بڑے بڑے گلابوں کو دیکھنے لگی۔

"زری! ہمارے نام بھی کتنے عجیب سے ہیں' پرانے گھسے پٹے۔ میرا دردانہ تمہارا زرینہ۔ وہ تو ہمیں نے دری' زری کر کے ذرا بھرم رکھ لیا ہے۔ ناولز میں دیکھو! کتنے پیارے نام ہوتے ہیں۔ فرشتے' علیزے' عفیرا' اشمالزے۔"

"بس بس۔" زرینہ نے اس کی بات کاٹی۔ "ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں اور خوب صورت نام تو واقعی اچھے لگتے ہیں۔ مگر ایسے بھی نہ ہوں کہ چار بار رٹنا پڑے!"

اچانک دروازے پر کھٹکا ہوا تو دردانہ اچھلی اور فٹ کمرے میں گھس گئی۔ ابی سودا لے کر واپس آگئی تھیں۔ دردانہ کپڑے بدلنے لگی اور زرینہ نے بھی اپنی رفتار بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر میں ابو آفس سے اور رضا سینٹر سے آنے والے تھے۔

☼ ☼ ☼

"چلو زری! یہ پلاؤ سامنے والے کرائے داروں کے ہاں دینا ہے۔"

دردانہ نے چادر لیتے ہوئے کہا۔ رخسانہ بیگم ہر ہفتے کسی نہ کسی پڑوسی کے ہاں کھانا بھجواتی تھیں۔ زرین بھی چادر لینے لگی۔

"تمہیں پتا ہے وہاں ایک اسمارٹ سا لڑکا بھی نظر آیا ہے۔" دردانہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "پر تو ابی کو بس اس کی موٹی سی لال دادی اور چھوٹے چار بچے نظر آئے ورنہ ہمیں کبھی نہ بھیجتیں۔"

"چلو! آج ہم بھی دیکھ لیتے ہیں کہ یہ اسمارٹ کیا بلا ہے۔" زرینہ بھی آج موڈ میں تھی۔

دردانہ نے کھٹکھٹایا تو وہ دستک کا بوجھ نہ سہہ سکا اور کھلتا چلا گیا۔ سامنے والے کمرے میں بچوں کے



کھلونے بکھرے ہوئے تھے۔ دریکی جلی دروانہ کے پیر تلے آگئی۔
"اسچوں۔" آواز زور دار تھی۔ وہ لڑکھڑائی تو زرینہ نے جلدی سے اسے پکڑا۔ اندر والے کمرے میں لیٹا جودبو کھلا کر باہر نکلا تو دونوں نے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔ بنیاں اور ہاف

پینٹ میں ملبوس لڑکا آگے گیا۔
"ہم سامنے والے گھر سے آئے ہیں۔" زری نے پلیٹ تھام کر دردانہ کی طرف دیکھا تو اسے جھٹکا سا لگا۔ پلیٹ خالی کر کے اس نے دردانہ کے ہاتھ میں تھمائی اور بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ دونوں کو دیکھ کر بولا۔
"دراصل اماں خالہ کے ہاں گئی ہیں۔" وہ دونوں سرہلاتی واپس آگئیں۔ کمرے میں آکر زری نے چادر کا گولا بنا کر پھینکا اور چارپائی پر ڈھیری ہو گئی۔
"ہاہا اسمارٹ! دری تیرے ساتھ بچے کا یار مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے پسند کون آیا۔" وہ ہنس ہنس کر بے حال تھی۔ دردانہ غصے میں بھری ہوئی کھڑی تھی۔
"کیسے سمجھ میں آتا اس کی ایک آنکھ تیری طرف' ایک میری طرف تھی۔" وہ بھی ہنسنے لگی تو دردانہ کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔
"ویسے یار! ہے بہت اسمارٹ گیا ہوا جو ذرا سا بھینگا اور دانت پیلے ہیں۔ اس کی ہنسی کا فوارہ پھر چھوٹا تو دردانہ بھی ہنستے ہنستے اس سے لپٹ کر کے مارنے لگی۔

☆ ☆ ☆

رخسانہ بیگم تخت پر بیٹھی پان بنانے میں مصروف تھیں۔ حمزہ ان کے پاس بیٹھا ہوم ورک کر رہا تھا۔ شام کی ٹھنڈی خوشبودار ہوا سرسرا رہی تھی۔ دردانہ نے سب کے لیے گرما گرم چائے لا کر بینچ میں رکھی اور خود اپنا کپ لے کر قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔
"بیٹا! تمہارا بی کام ہونے والا ہے۔ ابھی سے تمہارے لیے کچھ تیاری شروع کرتی ہوں۔" وہ پان منہ میں رکھتے ہوئے بولیں۔
"ابھی نہیں امی! مجھے ماسٹرز کرنا ہے۔" دردانہ نے برا منہ بنایا۔
"بیٹا! اتنے وسائل نہیں ہیں۔ رضا ابھی میٹرک اور حمزہ آٹھویں میں ہے۔ جتنی جلدی تم لوگوں کے فرض سے فارغ ہو جاؤں تو بہتر ہے۔" انہوں نے رسان سے سمجھایا۔ دردانہ چپ سی ہو گئی۔ زرینہ نے اپنا کپ اٹھایا اور تخت کے کنارے ٹک گئی۔
"اچھا! مگر میری مرضی کے بغیر کسی کو فائنل نہ کیجئے گا۔" وہ بے دلی سے بولی۔
"یہ تو ظاہر ہے' کوئی زبردستی تھوڑی ہو گی۔" رخسانہ بیگم نے کہا اور حمزہ کے ہاتھ پر ہاتھ مارنے لگیں جو ان کی چھالیہ نکال رہا تھا۔ وہ بے دھیانی میں گلاب کے پھولوں کو تکنے لگی۔ زرینہ مسکراہٹ دباتی اٹھ گئی۔
وہ باورچی خانے میں گئی تو زرینہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ وہ گوشت دھونے لگی۔
"ہاں! اب آیا نا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔" وہ اسے چھیڑنے لگی۔
"چپ کرو تم۔ میں بھی کسی ایسے ویسے رشتے پر ہاں نہیں کروں گی۔ تمہیں اندازہ تو ہے۔ میں کیا چاہتی ہوں۔" وہ اور رگڑ کر دھونے لگی۔
"دری! ایسا رشتہ آنا آسان بات نہیں۔ ہمیں اپنے مطابق سوچنا چاہیے۔" وہ آٹے کو مکیاں مارتے مارتے رکی۔
"مجھے نہیں پتہ۔ ماسٹرز بھی نہیں کروں تو کم از کم رشتہ تو اچھا ملے۔" وہ ضدی انداز میں بولی۔
"اچھا! جو ہو گا' اللہ بہتر کرے گا۔" وہ بات ختم کرتے ہوئے آٹا گوندھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"یار! میں اتنے دنوں سے اس لڑکے کو دیکھ رہی ہوں۔ کتنا ہینڈسم ہے نا۔" دردانہ کالج کی دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے زرینہ سے بولی۔ زرینہ نے کن انکھیوں سے ادھر دیکھا۔ لڑکا بھی ادھر ہی متوجہ تھا۔
"ہاں! کار بھی زبردست ہے۔" وہ اس کی لمبی سیاہ گاڑی کو دیکھتی کالج کا گیٹ پھلانگ کر اندر آگئی۔
"مجھے لگتا ہے' جیسے وہ ہمارا انتظار کرتا ہے۔" دردانہ شوخ لہجے میں بولی۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کسی محل کی شہزادی نہیں ہو تم، باز آجاؤ۔" وہ اسے جھاڑنے لگیں۔

دردانہ اکتا گئی۔ تحمل ان دونوں کو دیکھ کر لپک کر ان کے پاس آئی۔

"آج میں اپنی منگنی کی تصویریں لے کر آئی ہوں۔ اسمبلی ہو جائے پھر دکھاؤں گی۔" دونوں نے خوش دلی سے سر ہلا دیا۔ اسمبلی کے بعد مس فرحین کا پہلا پیریڈ تھا مگر وہ آئی نہیں تھیں۔ وہ تینوں نیم کے درخت کے نیچے جا بیٹھیں اور تصویریں دیکھنے لگیں۔

"ارے!" ان دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"یہ تو وہ ہے۔"

"کون؟" تحمل حیرت سے بولی۔

"جسے ابھی باہر دیکھا تھا۔" زرینہ جلدی سے بولی۔

"ہاں! کامران مجھے لینے اور چھوڑنے آتا ہے۔" وہ فخریہ بولی۔

"اچھا!" دردانہ کچھ حسرت بھرے انداز میں بولی۔

"اچھا خاصا بزنس ہے کامران کے والد کا۔ میں اپنی پھپھو کے بیٹے احمد بھائی کی شادی میں گئی تھی نا پچھلے دنوں وہیں کامران نے مجھے دیکھا۔ بس پھر منگنی کر کے ہی چھوڑا۔"

تحمل اپنی دھن میں ہیرے کی انگوٹھی سے سجا ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔ تحمل کسی امیر فیملی سے تعلق نہیں رکھتی تھی۔ پچھلے دنوں ہی اس کے والد نے سیکنڈ ہینڈ مہران لی تھی اور وہ خود کسی پرائیویٹ کالج میں لیکچرار تھے۔

"بس! اپنا اپنا نصیب۔" دردانہ رشک کے ساتھ سوچ رہی تھی۔ جبکہ تحمل اور زرینہ تصویریں دیکھنے میں مگن تھیں۔ وہ بھی تصویروں پر جھک گئی۔ کسی مشہور بوتیک کی بیش قیمت کام دار گرین فراک پہنے تحمل کے چہرے سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کا سسرال بھی بہت پڑھا لکھا اور مہذب لگ رہا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اس کے اچھے نصیب کی دعا کی۔

☆ ☆ ☆

وہ پودوں کو خوب سارا پانی ڈال کر مڑی اور تخت پر بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ دو دن سے پانی نہیں آ رہا تھا تو پودے دھلے بھی نہیں تھے سب بے رونق سے ہو رہے تھے۔ زندگی بھی تو ایسی ہی ہے۔ آس، امنگوں کا پانی نہ ملے تو مرجھائی سی لگتی ہے بے رونق۔ وہ اپنے پچھلے شب و روز پر غور کرنے لگی۔ کالج سے گھر، گھر سے کالج۔ تحمل پر اسے رشک آیا۔

"ہنہ، ہم دولت مند چاہئیں والا انتخاب از خود کیا چاہیے۔" وہ بے دلی سے پاؤں ہلانے لگی۔

"دردانہ!" امی کی آواز پر وہ چونکی اور اندر کمرے میں آگئی۔ وہ مسہری پر ہاتھ میں ایک تصویر لیے بیٹھی تھیں۔ اس نے تصویر دیکھی اور امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ انتہائی عام سی شکل و صورت۔ موصوف کافی حد تک فارغ البال بھی تھے۔

"تمہارے ابو کے جنرل اسٹور سے ہی تھوڑی دور اس کی ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان ہے؟" وہ آرام سے بتا رہی تھیں۔

"امی! مجھے نہیں پسند۔" وہ جھنجلا گئی۔

"ارے! ایک دم سے کیسے نہیں پسند۔" وہ حیران ہوتے ہوئے کچھ غصے سے بولیں۔

"سر دیکھا ہے؟ ہر چیز پھسل جائے گی۔" وہ غصے سے بولی تو رخسانہ بیگم ہنس پڑیں۔

"بری بات دردی بیٹا! یہ خاکی چیزیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ تمہیں سکون اس کی عادات اور کردار سے ملے گا۔ اچھی سیرت ہو گی تو خوش رہو گی۔" وہ سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"سیرت کا بھی مجھے کیا پتا۔" وہ بدستور منہ پھلائے ہوئے تھی۔

"تمہارے ابو نے پتا کروایا ہے۔ کچھ ہی دن پہلے دکان کھولی ہے۔ محنتی اور شریف ہے۔ اکثر ہم

ابھی اور پتا کروانا ہے۔ اچھی طرح تسلی کے بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔" رخسانہ بیگم تصویر رکھتے ہوئے بولیں۔

"بس مجھے نہیں پتا۔" وہ دھپ دھپ کرتی چلی گئی۔ رخسانہ بیگم نے فکر مندی سے اسے جاتے دیکھا۔ پھر سر جھٹک کر اٹھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

ابصار صاحب برائی کھانے میں مشغول تھے۔ وہ لوگ کچھ دیر پہلے رات کا کھانا کھا چکے تھے۔ ابصار صاحب کو آج دیر ہو گئی تھی۔ رخسانہ بیگم قریب ہی بیٹھی تھیں۔ دھیمی آواز میں خبریں چل رہی تھیں۔

"میں نے آج اور معلومات کروائی ہیں۔" کٹورے سے پلی نکالتے وہ ان کے ساتھ تھے۔

"پھر کیا ہوا؟" رخسانہ بیگم اشتیاق سے بولیں۔

"لڑکے کی فیملی بہت بڑی ہے۔ وہ دوسرے نمبر پر ہے۔ چھ اور چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ دلہن بھی جچی ہوئی نہیں تھی۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولے۔

"مگر مجھے تو شریف اور اچھے لوگ لگے۔" رخسانہ بیگم کی آواز ہلکی پڑ گئی۔

"ہاں مگر ابھی دردانہ کی کوئی خاص عمر نہیں گزری۔ میرے خیال میں ہمیں اور انتظار کرنا چاہیے۔" وہ بات ختم کرتے ہوئے بولے۔

"ہوں۔" رخسانہ بیگم چپ ہو گئیں۔ دردانہ کا دل چاہا نفل ڈالے۔ وہ مسکراتے ہوئے گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ پھر اپنے اور زرینہ کے کمرے میں آ کر بولی۔

"تجھے میاں سے جان چھوٹ گئی۔ ابو کے دل کو لگا نہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"اچھا!" زرینہ جنرل پر ڈائیگرام بنانے میں غرق تھی۔ وہ سیکنڈ ایر میں تھی اور اس کے پیپرز بھی قریب تھے۔

"یہ تو کوئی خوشی بانٹنے والی نہیں۔" وہ اس کی عدم توجہی پر جھنجلاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

میلاد سے واپسی پر دردانہ کے دانت ہی اندر نہیں جا رہے تھے۔ جبکہ زرینہ جھنجلائی پھر رہی تھی۔ رخسانہ بیگم بھی خوش لگ رہی تھیں۔ ان کی سہیلی صبیحہ نے اپنا گھر بنوانے کے بعد وہاں میلاد رکھا تھا۔ انہوں نے زرینہ کو کافی عرصے بعد دیکھا تو انہیں اپنی بہو کے روپ میں بھا گئی تھلائی آنکھیں' درمیانہ قد' گول سے چہرے کے ساتھ مسکراتی' سمجھ دار سی زرینہ پر انہیں پیار آ گیا اور اسی وقت رخسانہ بیگم سے بات کر ڈالی۔ ان کے بڑے بیٹے کی شادی ہو چکی تھی۔ چھوٹا بیٹا زین بینک میں ملازمت کرتا تھا۔ قبول صورت' ذمے دار تھا۔ دیکھے بھالے لوگ تھے۔ رخسانہ بیگم مطمئن تھیں۔ مگر زرینہ آرام سے پڑھنا چاہتی تھی۔

"امی! پہلے دری کا نمبر ہے نا؟" وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔

"ہاں! تو اللہ نے چاہا تو اس کا بھی جلد ہو جائے گا۔ تمہیں کون سا کل ہی رخصت کر رہے ہیں۔" رخسانہ بیگم کا اطمینان قابل دید تھا۔

"میری باری میں تو کیسی نصیحت بیگم بنی پھرتی تھیں۔ اب خود پڑھنے کی تو پڑھنا ہے۔" دردانہ اس کی نقل اتارتے ہوئے بولی۔

"امی! ابھی تو ابو سے بھی نہیں پوچھا۔" اس نے ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی۔

"انہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اور ابھی میں بات کر بھی لوں گی۔ کس بات کی اتنی بے چینی ہے؟" وہ کچھ خفا ہوتے بولیں۔

"مگر امی! انہیں دری کے لیے کہنا چاہیے تھا۔ وہ بڑی ہے۔" اسے ایک اور نکتہ سوجھا۔

"دردانہ تو زین کی ہم عمر ہی ہے۔ جوڑ تمہارا بنتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ وضو کے لیے اٹھ گئیں۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا۔" وہ منہ لٹکا کر بیٹھ گئی۔

"یہی تو بات ہے مائی ڈیر سسٹر۔" دردانہ شوخی

سے بولی۔

"تم بہت خوش ہو رہی ہو۔" وہ چڑ کر بولی۔ وردانہ ہنستے ہوئے کچن میں چلی گئی۔ وہ منہ بنائے بیٹھی رہی۔

✿ ✿ ✿

وردانہ چٹکری ملا پانی مہاسوں پر لگا رہی تھی۔ ایک مہینے بعد زرینہ کی گھر میں ہی چھوٹی سی رسم ہونی تھی۔ مگر ایک دو دانے تنگ کر رہے تھے۔ زرینہ اطمینان سے رٹا لگانے میں مشغول تھی۔ ابو نے بھی "ہاں" کر دی تھی۔ اس نے ماں باپ کو خوش دیکھا تو راضی بہ رضا ہو گئی۔ رخسانہ بیگم کا پروگرام ابھی صرف رسم کا تھا۔ پھر ایک سال بعد دونوں بیٹیوں کو ساتھ رخصت کرنے کا ارادہ تھا۔ کچھ دن بعد وردانہ بھی بی کام سے فارغ ہو جاتی۔ اس کے پیپرز چل رہے تھے۔

"یار! تم تو بڑی جلدی ہار مان گئیں۔" وہ زرینہ کے سامنے کتاب لے کر بیٹھ گئی۔

"ہاں! تو تمہاری طرح ہی ابو کو پریشان نہیں دیکھنا چاہتی۔" وہ جھٹ سے بول کر پھر رٹا لگانے لگی۔

"اچھا! بس اچھا خاصا ڈھنگ کا رشتہ مل گیا نا۔ میری طرح آتا کوئی فارغ البال۔ تب پوچھتی۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

"تیں تب بھی ہاں ہی بھر لیتی۔ اور زین کا بھی کیا بھروسا۔ شادی کے بعد گنجے ہو جائیں گے۔ آخر کل ان کے والد کی شکل سامنے ہے۔" وہ مزے سے بولی۔

"اچھا! مجھے نیند آ رہی ہے۔" وردانہ کتاب رکھ کر لائٹ بند کر کے لیٹ گئی۔

زرینہ باہر جا چکی تھی۔ مگر وہ کافی دیر تک اپنے بارے میں سوچتی رہی۔ سرکتی رات اور بوجھل سوچوں نے پلکیں بھی بوجھل کر دیں اور نیند نے سوچوں کی جگہ قبضہ کر لیا۔

✿ ✿ ✿

"بہت مبارک ہو زرینہ! مگر وردانہ بڑی ہے تم سے۔" نگل مبارک باد دیتے ہوئے بولی۔ وردانہ کو کچھ ضروری نوٹس لائبریری سے بنانے تھے۔ زرینہ بھی اس کے ساتھ کالج آ گئی تھی۔ وہاں نگل سے بھی ٹکراؤ ہو گیا۔ وردانہ کی مسکراہٹ پھیکی سی ہو گئی۔

"ارے یار! کیا سال دو سال کا فرق بھی کوئی فرق ہے اور میں تو اس سے بڑی لگتی ہوں۔ شادی ساتھ ہو گی ان شاء اللہ۔" زرینہ نے فوراً بات سنبھالی۔

"چلو! اچھی بات ہے۔" نگل بینچ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"میرا تو بھئی کامران نے بی کام کرنا دوبھر کیا ہوا ہے۔ اس کا بس نہیں چلتا، کل رخصتی کروا لے۔ بمشکل پیپرز تک رکے ہیں سب۔" وہ مونگ پھلی کا دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ساتھ ان دونوں کو بھی پیش کش کر دی۔ زرینہ نے ایک دانہ منہ میں ڈال لیا۔ مگر وردانہ کا دل برا ہو رہا تھا۔

"تم لوگ کھاؤ یار۔ میں لائبریری سے ہو کر آتی ہوں۔" وہ چل پڑی۔ زرینہ نے اسے دیکھا، پھر ابھی آئی کہہ کر اس کے پیچھے بھاگی۔

"کیا ہے دوبی! اتنا دل پہ کیوں لے رہی ہو؟" وہ پیچھے سے بولی۔

"مجھے نوٹس بنانے ہیں۔" وہ سیدھا دیکھتے ہوئے بولی۔

"یوں ری ایکٹ کرو گی تو کام نہیں چلے گا۔" زرینہ پھر بڑبڑائی۔ "میں سچ کہتی ہوں۔ ہماری رسم بھی ساتھ ہی ہو گی۔" وردانہ مڑی۔

"نہیں بالکل! میں تو بہت خوش ہوں۔ تم سے زیادہ تیاری کر رہی ہوں۔ بس لوگوں کی باتوں پر کچھ عجیب لگا۔ مگر اب خوش ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"جھوٹ مت بولو۔" زرینہ خفا سی بولی۔

"سچی یار! میری پاکٹ میں بچے آخری سو کے نوٹ کی قسم۔" وہ شوخی سے بولی تو زرینہ ہنس پڑی۔ پھر دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لائبریری میں گھس گئیں۔

✿ ✿ ✿

پیپرز کے بعد وہ فراغت سے تیل کا مساج کرنے بیٹھی تھی۔

"سرسوں کے تیل میں میتھی دانہ پیس کر لگاؤ۔ پھر نہانے سے پہلے لگاؤ۔ مگر تمہیں تو یہ بھی گوارا نہیں۔" رخسانہ بیگم نے اسے جھاڑا۔

"چلو! یہ بھی کر کے دیکھ لوں گی۔ مگر میرا تیل تو ختم ہو۔ اتنا مہنگا منگوایا تھا۔" وہ چھوٹے چھوٹے بالوں کو انگلی میں لپیٹتے ہوئے بولی۔

"اچھا! ادھر آؤ۔" رخسانہ بیگم نے مسہری پر سے کپڑے ہٹا کر اس کی جگہ بنائی۔ وہ فرش پر سے اٹھنے لگی۔

"بلکہ پہلے ہاتھ دھو آؤ۔" وہ اس کے چکنے ہاتھوں کو دیکھ کر بولیں۔

"تھینک یو سو مچ۔" وہ ہاتھ دھو کر آگئی۔

"مجھے پتا تھا۔" وہ ان کے ہاتھ میں تصویر دیکھ کر بولی۔ رخسانہ بیگم نے گھورا تو اس نے تصویر لے کر ایک نظر ڈالی۔ سر پر بالوں کا گھنا جنگل تھا۔ مگر عمر زیادہ لگ رہی تھی۔ جسم بھی قدرے بھرا بھرا تھا۔ درمیانہ قد و قامت تھا۔

"تمہارے ابو کے دوست کی بہن کا بیٹا ہے۔ چھوٹی تینوں بہنوں کی شادی کر دی۔ چھوٹا بھائی پڑھ رہا ہے۔ ساتھ جاب بھی کرتا ہے۔ والد فوت ہو چکے ہیں۔ یہ دبئی میں ہوتا ہے۔" انہوں نے تفصیل سے بتایا۔

"مگر امی! یہ تو میرے انکل لگ رہے ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"فضول بات مت کرو دردانہ!" رخسانہ بیگم سختی سے بولیں۔ "ہر رشتے میں آرام سے کیڑے نکال دیتی ہو۔ اتنی زیادہ عمر بھی نہیں۔ بتیس سال کا ہے۔ دس بارہ سال کا فرق ہو گا تو کتنا فرق پڑتا ہے۔ ذمہ دار ہے۔ پہلے بہنوں کی شادی کی۔ ورنہ خود غرضی سے سوچتا تو کب کا شادی کر چکا ہوتا۔" انہوں نے اچھی طرح جھاڑ دیا۔ وہ آنسو پیتی اٹھ گئی۔

"کر لینا۔ میری جان چھوٹی۔" بیزاری سے رخسانہ

بیگم تک پہنچ چکی تھی۔ وہ ضبط کر کے رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"دری!" وہ اپنے گلاب کے پودوں کے پاس تخت پر ساکت بیٹھی تھی۔ زرینہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

رخسانہ بیگم درزی کے پاس گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں دونوں اکیلی تھیں۔ کل سے وہ اس سے بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہی تھی۔ مگر وہ تو سب سے خفا تھی۔ وہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ابو نے چھان پھٹک کر کے نواز کے لیے ہاں کر دی تھی۔ دبئی میں ان کے ایک جاننے والے تھے۔ انہوں نے سب معلومات کیں۔ اب اگلے ہفتے زرینہ کی رسم کے ساتھ اس کا نکاح تھا۔ کیونکہ کاغذات بنوانے تھے۔ پھر نواز تین چار ماہ بعد بھی چھٹیاں لے کر آتا اور رخصتی ہو جاتی۔ زرینہ کی ہونے والی ساس صبیحہ اتنی جلدی شادی کر نہیں سکتی تھیں۔ حال ہی میں ان کا گھر بنا تھا۔ لہٰذا طے یہ پایا کہ فی الحال دردانہ کی رخصتی کر دی جائے۔ بعد میں زرینہ کی شادی آرام سے ہوتی رہے گی۔

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے مجھ سے پہلے شادی ہو رہی ہے۔" وہ اس کا چہرہ اپنی طرف موڑتے ہوئے بولی۔

"ہاں! ہاں۔" وہ اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے پھٹ پڑی۔ "تم تو کہو گی۔ جس کے ساتھ ہوتا ہے وہی جانتا ہے۔ زرین ایسا ہوتا تب پوچھتی۔ میری شادی کہاں کروا رہے ہیں۔ ایک الیکٹریشن سے۔ نام بھی نواز۔ اتنا پرانا۔ عمر دیکھی۔ کچھ ہے خوش ہونے کے لیے؟"

اس کے آنسو تواتر بہہ رہے تھے۔ زرینہ نے دکھ سے اسے دیکھا۔

"نہیں دری!" وہ بہت پیار سے بولی۔ "امی ابو نے تمہارا اچھا ہی سوچا ہے۔ نواز بھائی بی اے کر چکے ہیں۔

مزید پڑھنا چاہتے ہیں۔ تمہارے پڑھنے پر بھی پابندی نہیں ہے۔ رہی بات ایجوکیشن کی۔ تو ان کی جاب بہت اچھی کمپنی میں ہے۔ اچھی خاصی آمدنی ہے۔ کم عمری میں ذمہ داریاں سنبھالنا پڑیں تو اور کیا کرتے بے چارے؟ تجربہ بڑھے گا کوالیفکیشن بڑھے گی تو کوئی اور جاب کرلیں گے۔ وہ ٹھہر جانے والوں میں سے نہیں لگتے۔ اور رہی نام کی بات تو تمہارا نام بھی کوئی نیا نہیں ہے۔ جس طرح تمہیں اپنا نام رکھنے کا اختیار نہیں ملا۔ انہیں بھی نہیں ملا ہوگا۔ تم رکھ لینا کوئی اچھا سا نک نیم۔" وہ اسے بہلاتے ہوئے بولی۔ مگر وہ بے زاری سے رات کی رانی پر نظریں گاڑے بیٹھی رہی۔ زرینہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اٹھ گئی۔ اب وہ ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

گہرے میک اپ میں اس کے چہرے کا سپاٹ پن نمایاں تھا۔ میرون لپ اسٹک سے سجے خوب صورت ہونٹ سختی سے پیوست تھے۔ آنکھوں میں جمالی بھی محسوس ہو رہا تھا۔ سلور کرتے شرارے میں میرون بازو کا امتزاج بہت کھل رہا تھا۔ مگر دل مردہ ہو تو بھلا کیا اچھا لگتا ہے۔ سادگی میں بھی وہ زرینہ سے زیادہ نمایاں ہوتی تھی۔ کمر تک آتے ریشمی بال، ستواں ناک، شرارتی آنکھیں، کھلتا گندمی رنگ، ہونٹوں میں خم اور دائیں رخسار پر سجا ننھا سا تل۔

ابھی بھی وہ زرینہ کے برابر بیٹھی اس سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ مگر واضح فرق دونوں کے تاثرات کا تھا۔ گلابی ٹخنوں کو چھوتی گھیردار فراک میں ہلکا سا میک اپ کیے دھیما دھیما مسکراتی زرینہ کے چہرے پر بے حد رنگ بکھرے تھے۔ نکاح کے بعد نواز کو دردانہ کے برابر لاکر بٹھایا گیا تو اس چہرے پر سختی چھا گئی۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اب زرینہ کی ساس اس کی رسم کر رہی تھیں۔

ماحول بے حد خوش گوار تھا۔ رخسانہ بیگم اور ابصار صاحب مسکراتی نظروں سے اپنی بیٹیوں کو دیکھ رہے تھے۔ رخسانہ بیگم کے دل کو دردانہ کی طرف سے دھڑکا تھا۔ مگر انہیں اللہ پہ توکل تھا کہ وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ رضا تصویریں اتار رہا تھا۔ حمزہ چہکتا پھر رہا تھا۔ بس بے حد خاص کچھ رشتے داروں کو ہی بلوایا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد کھانا لگا دیا گیا۔ ابصار صاحب نواز کو لے کر چلے گئے۔ وہ دونوں کچھ لمحے اکیلی رہ گئیں۔ چند بچے دوڑتے پھر رہے تھے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ زرینہ نے ایک افسوس بھری نگاہ اس پر ڈالی اور دوبارہ نظر جھکا کر بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"رخسانہ!" دروازے پہ کھڑے ابصار صاحب کی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ کیاری سے دھنیا توڑتی رخسانہ بیگم کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے کانپ سا گیا۔

"نواز کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ چلنے کی تیاری کرو۔" وہ نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں بولے۔

"والدہ کا انتقال۔" وہ بے یقینی سے بولیں۔ "مگر کب؟ اچانک کیسے؟" بے ربط سے جملے گھبراہٹ میں ادا ہو رہے تھے۔

"کل رات ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اب جلدی چلو۔ دردانہ کو بھی لے لو۔" وہ عجلت میں کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولے۔

کچھ دیر میں وہ ان کے گھر پہنچ چکے تھے۔ ابصار صاحب باہر مردوں میں رک گئے۔ رخسانہ بیگم دردانہ کو لیے اندر بڑھ گئیں۔ دردانہ کے ذہن میں دھیمے لہجے میں بولتی وہ شفیق سی خاتون آرہی تھیں، جو اسے نکاح والے دن ساتھ لپٹائے بیٹھی تھیں۔ مگر اس نے جب یہ سب محسوس ہی نہ کیا تھا۔ اسے بھی دکھ ہو رہا تھا۔ اندر بڑے سے ہال نما کمرے میں خواتین جمع تھیں۔ رخسانہ بیگم اس کی تینوں نندوں کو دلاسا دینے بڑھیں۔ اس کی بڑی نند عفت چھوٹی دونوں نندوں کے بیچ میں

بوجھل سی بیٹھی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر وردانہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بے بسی سی چمک لہرائی۔

"تم؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کیوں آئی ہو۔" وہ بلند آواز میں بولی۔ رخسانہ بیگم پریشانی سے اسے دیکھنے لگیں۔ وردانہ ہکا بکا کھڑی تھی۔

"اور کس کو کھانا ہے؟ میری ماں کو تو کھا گئی۔" وہ وحشت زدہ آواز میں چلائی۔ اس کے بال کلپ سے نکل کر بکھر رہے تھے۔ آنکھیں سرخ انگارہ تھیں۔ وردانہ کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اسے وہ کوئی بدروح لگی۔ وہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹی۔

"دو دن نہیں ہوئے اور میری ماں مر گئی۔ سب تیری نحوست ہے۔ جس دن سے گھر میں تیرا نام لیا' خوشی روٹھ گئی ہے۔"

وہ لب مٹھیاں بھینچ کر چیخ رہی تھی۔ اس کی چھوٹی دونوں نندیں بمشکل اسے کھینچ کر اندر کمرے میں لے گئیں۔ اندر سے بھی اس کے چیخنے کی آواز آ رہی تھی۔ وردانہ کے لیے کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسے بے اختیار ہچکی سی چڑھ گئی۔ اتنی عورتوں کی نظریں ایک ساتھ اس پر تھیں۔ بے رحم' تمسخرانہ' ترس کھاتی' جانے کیسی کیسی نظریں۔ زندگی میں اس کا ایسا تماشا کبھی نہیں بنا تھا۔ رخسانہ بیگم نے اسے تھاما اور باہر سے ابصار صاحب کو لے کر گھر آ گئیں۔

"کیوں وہ لڑکی کے لیے نحوست کی جاتی ہے؟"

اصل معاملے سے بے خبر ابصار غصے سے بولے۔

"یہ تو اس سے پوچھو۔" رخسانہ بیگم نے اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "جس دن سے نواز کا رشتہ آیا ہے رو رو کر نحوست ڈالی ہوئی ہے۔ یہ سب تو ہونا ہی تھا۔"

وہ اسے گھورتے ہوئے تلخ لہجے میں بولیں۔

اس نے ڈبڈبائی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ پھر پلٹ کر کمرے میں چلی گئی۔ اس کا دماغ سن ہو رہا تھا۔ مسہری پر لیٹ کر وہ گم صم سی روتی چلی گئی۔ اتنی ذلت' ایسی بے قدری اور سگی ماں بھی حال دل سمجھنے کے بجائے اسی کو دوش دے رہی تھی۔ اس کے دل میں ابال اٹھنے لگے۔

"ہاں! میں ہوں منحوس۔" وہ زور سے چلائی۔ "یا اللہ! میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟" وہ بے قراری سے ہاتھ سرہانے پر پٹخ رہی تھی۔ ہاتھوں میں پہنی چوڑیاں زخم دیتی اسی کی طرح بکھرتی جا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

پورا چاند اپنی دھیمی روشنی بکھیر رہا تھا۔ دودھیا سی چادر چھت پہ بچھی تھی۔ خنک ہوا جسم سرد کر رہی تھی۔ مگر دل سلگ رہا ہو تو وہ تپش سرد موسم سے بھی بے نیاز کر دیتی ہے۔ وردانہ نے دونوں ہاتھ دوبارہ گھٹنوں کے گرد لپیٹے اور سر اٹھا کر چاند کو دیکھا۔ مماثلت تو تھی۔ وہ آسمان پر تنہا اور یہ زمین پر۔ آنسو بہنے لگے جبکہ اسے لگ رہا تھا کہ اب آنسو نہ آسکیں گے۔ کس کس بات کو سوچ' روتے روتے سر اٹھا کر اس نے خود پر ترس کھایا۔

اس دن ہونے والے تماشے پر' گھر والوں کی بے حسی پر' پرسوں ہونے والی رخصتی پر' مستقبل کے اندیشوں پر' یوں سادگی سے بابل کا گھر چھوڑ دینے پر' آخر وہ کس کس پر آنسو بہائے۔ کیا کیا نہ سوچا تھا۔ سب خاک ہو گیا۔ مایوں والے دن ایسا جوڑا پہنے گی۔ سہیلیاں ڈھولکی رکھیں گی' وہ پھولوں سے لد جائے گی۔ گھر والے اپنے ارمان نکالیں گے۔ مگر سب دھواں ہو کر تحلیل ہو گیا۔ اور باقی بچے بس اندیشے' خوف' واہمے۔ جیسے تاریکی میں سفر کیا جائے اور نہ منزل کا نشان ہو' نہ رستے کا پتا۔ جس گھر میں اس کا یوں تماشا بن چکا ہے' وہاں اس کو بھلا کیا عزت ملے گی؟ اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

رخسانہ بیگم نے کچھ دن پہلے اسے بتایا تھا کہ نواز نے سادگی سے جلدی رخصتی پر زور دیا ہے اور اگلے ہفتے رخصتی ہے۔ اب وہ اس کے ساتھ ہی دبئی جائے گا۔ وہ اس کا منہ تکتی رہ گئی۔

پھر وہ اور ابو

اس کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ زرینہ

کے میسٹ چل رہے تھے۔ وہ اسے کہتی تھی جو ہوتا ہے' بہتری کے لیے ہوتا ہے۔ اگر یہ اس کے ساتھ ہوتا تو وہ پوچھتی۔ اس کے ساتھ تو ابھی تک سب اچھا ہوا تھا تو وہ کیسے اس کا دکھ سمجھ سکتی ہے۔ وہ خود سے بھی خفا اپنا غم منا رہی تھی۔ نڈھال ہوتے ہوئے اس نے دیوار سے سر ٹکا دیا۔

✲ ✲ ✲

"آپی! آجائیں۔" باہر سے رضا نے آواز لگائی۔ اس نے ایک نظر پنے گلاب کے پھولوں کو دیکھا۔ ایک گلاب نیچے گرا ہوا تھا۔ رات کی رانی افسردہ سی کھڑی تھی۔ چپ چاپ مرجھائی ہوئی۔ اسے ایک دم بے تحاشا رونا آیا۔ اسے لگا اس کے پودے بھی اس کے ساتھ رو رہے ہیں۔ جیسے وہ اس کا دکھ سمجھتے ہوں۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے ضبط کیا۔ زرینہ ڈبڈبائی آنکھیں لیے کمرے کے دروازے پہ کھڑی تھی۔

انبسار صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کے آنسو چھلک گئے۔ رخسانہ بیگم اسے تھپکتے ہوئے ایک ہاتھ میں سامان لیے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ جیسے دھیرے دھیرے جان سرکتی ہو۔ اللہ کو یاد کرتے ہوئے اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ جیسے کوئی بچہ سمندر طوفانی لہروں کے سامنے ہار مان جائے۔

✲ ✲ ✲

گلاب کی پتیاں بیڈ پر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ گلدستے بھی دائیں بائیں موجود تھے۔ کمرے میں مہک کا قبضہ تھا۔ گولڈن میرون غرارے میں اس کے دمکتے حسن نے ملکوتی روپ دھار لیا تھا۔ مگر وہ گہری چپ کے زیر اثر تھی ———— نواز آکر اس کے برابر بیٹھ گئے۔ وہ بے حس بیٹھی رہی۔ سلام کا جواب بھی نہ دیا۔

"دروانہ! ہماری شادی ذرا مختلف حالات میں ہوئی ہے۔ جیسا ہم نے سوچا' اس سے بہت مختلف۔" وہ کھنکھار کر بولنا شروع ہوئے۔ دروانہ نے سر جھکا لیا۔ ان باتوں کا کیا فائدہ۔ وہ چپ بیٹھی رہی۔

"عفت شروع سے ہی ضدی مزاج کی ہے۔ سسرال پر دھاک جمانے کے لیے اپنی نند کی شادی مجھ سے کروانا چاہتی تھی۔ مگر میں وٹے سٹے کا قائل نہیں ہوں۔ اماں کو بھی اس کی نند پسند نہ تھی۔ انکار پہ وہ بپھر گئی۔ ہمارے نکاح میں بھی اس نے شرکت نہ کی۔ اماں نے اس کی طبیعت خرابی کا بہانہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ جلد اسے منا لوں گا۔ مگر پھر اچانک اماں کا انتقال ہو گیا اور اس پہ اس نے جو تماشا کیا' وہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ میں تہ دل سے معذرت خواہ ہوں۔" وہ تھوڑی دیر کو چپ ہوئے۔ دروانہ ماؤف دماغ کے ساتھ سب سن رہی تھی۔

"میرے دبئی جانے کے بعد عفت مزید مشکلات پیدا نہ کرے' اس خیال سے میں نے جلدی رخصتی پہ زور دیا۔ اماں کے بعد تو ویسے ہی رسومات اور دھوم دھام کا دل ہی نہ تھا۔" وہ رنجیدہ ہو گئے۔

"مجھے پتا ہے دروانہ! حالات نے آپ کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ لڑکیوں کے بہت ارمان ہوتے ہیں اور پھر عفت کا سلوک۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ دروانہ نے کوفت سے ہاتھ چھڑانا چاہا۔ مگر نواز نے اس کا ہاتھ آنکھوں سے لگا لیا۔

"دروانہ! سب باتیں بھول جاؤ۔ درگزر کرو۔ اللہ درگزر کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔ وہ ہمارا دامن خوشیوں سے بھر دے گا۔" اس کے ہاتھ کی پشت نم ہونے لگی۔ اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔

"معاف کر دو۔" انہوں نے اس کا سر سینے سے لگا کر اپنی تھوڑی اس کے ماتھے پر ٹکا دی۔

"آج اماں ہوتیں تو ایسا نہ ہوتا۔ وہ ہمیں دعاؤں کے حصار میں رکھتیں۔"

وہ مضبوط مرد آنسوؤں سے رو رہا تھا۔ خوشی کے سب سے بڑے موقع پر اپنی چھاؤں کھو دی تھی۔ کئی

دنوں کا ضبط ٹوٹ گیا تھا۔ وہ تھک گئے تھے۔ آج اپنی شریک حیات سے اپنا غم بانٹنا چاہتے تھے۔ دردانہ کو نواز کے سینے میں چھپ کر ایسا لگا جیسے شل ہوتے جسم کو ستانے کو دو گھڑی مل جائے۔

اس کا دل پگھلنے لگا۔ نواز کے آنسو بہتے ہوئے اب اس کے آنسوؤں میں مدغم ہو رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"رخصت مبارک ہو۔" نواز اس کے قریب آکر دھیمے سے بولے۔ پھر بے قراری سے گلابی گال کو ننھی بچی کو گود میں لے لیا اور اسے چومنے لگے۔

"ماما! یہ کون ہے؟" فہد انگلی اٹھائے بہن کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ انداز میں کچھ غصہ تھا۔ آج بابا کسی اور کو پیار کر رہے تھے۔

"بیٹا! یہ آپ کی چھوٹی بہن ہے۔" وہ بولی۔ آواز میں کچھ نقاہت تھی۔ نواز اب فہد کو ننھی گڑیا دکھا رہے تھے۔ وہ اب سب خفگی بھول کر بڑے اشتیاق سے کبھی اس کے گلابی گال چھوتا' کبھی منہ میں انگلی ڈالتا۔

"نہیں' بری بات بیٹا!" نواز نے ٹوکا۔ بچی کسمسا کر رونے لگی۔ دیسی تو نواز میں دردانہ کو خوب کھانے پینے کی تلقین بھی کر رہے تھے۔ دردانہ تکیے کے سہارے بیٹھے ہوئے انہیں محبت سے دیکھنے لگی۔ اپنی تصویر کی بہ نسبت وہ کافی کم عمر لگتے تھے۔

نواز اس کے غور سے دیکھنے پر مسکرانے لگے۔ وہ بھی مسکرا دی۔ وہ اس کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ کبھی کبھی تو وہ انہیں چھیڑتی کہ آپ تو ماؤں کی طرح میرے نخرے اٹھاتے ہیں وہ ہنس دیتے۔ وہ گزرتے وقت کو سوچتی تو اسے لگتا کہ نواز نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اس نے صبر کیا تو اللہ نے بہت میٹھا پھل دیا۔ اس کی رخصتی میں بھی عفت شریک نہ ہوئی تھی۔ نواز نے اب سب بھلا کر ملنا شروع کر دیا تھا۔ مگر عفت اجنبیت رکھتی۔

نواز کی محبت نے اسے اتنا تحفظ دیا تھا کہ وہ ذرا پروا نہ کرتی۔ ساتھ عفت کا دل بھی جیتنے کی کوشش کرتی۔

ان دونوں نے کافی رقم بچت کرکے جمع کرلی تھی اور کچھ نواز نے پہلے سے جمع کی ہوئی تھی۔ ان کا ارادہ پاکستان جا کر چھوٹے پیمانے پر الیکٹرونکس اشیا کا بزنس شروع کرنے کا تھا۔ زرینہ کی شادی پر وہ پاکستان گئی تھی اور اب جب نواز نے کہا کہ اپنی گڑیا کا عقیقہ پاکستان میں کریں گے اور مستقل پاکستان میں شفٹ ہو کر بزنس شروع کریں گے تو خوشی سے اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ نواز اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے مسکرا دیے۔

☼ ☼ ☼

"ارے امی! آپ نے تو میرے پودوں کا بہت خیال رکھا ہے۔" اس کی آنکھوں میں دوبارہ آنسو آگئے۔

وہ لوگ ابھی نہانے دھونے کے سیشن سے فارغ ہوئے تھے کہ اس کی نظر اپنے پودوں پر گئی۔ رخسانہ بیگم مسکرانے لگیں۔ رات کی رانی تروتازہ مہک رہی تھی۔ پودا کافی گھنا ہو گیا تھا۔ گلاب کے پودے بھی زیادہ ہو گئے تھے۔ آتشی' سرخ اور زرد گلاب اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ فہد نے جھٹ سرخ گلاب توڑ لیا۔

"ماما! اتنی پیاری خوشبو۔" وہ پھول سونگھنے لگا۔ پھر اس کی ناک کے قریب کر دیا۔ رخسانہ بیگم نواسے کی حرکتوں پر ہنسنے لگیں۔ حمزہ زرینہ کو ساتھ لیے آیا تھا۔ ساتھ زین بھی تھا۔ زرینہ نے اسے لپٹا لیا۔ "مصروف ہو گئی ہو۔" زرینہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

وہ بھی بھیگی پلکوں سے مسکرا دی۔ دو بچوں کے بعد اس کا جسم خاصا بھر گیا تھا۔ جبکہ نواز ویسے ہی تھے۔ جیسے شادی کے وقت تھے۔ بلکہ اب اور جاذب نظر ہو گئے تھے۔ ان کا جوڑ بہت اچھا تھا۔ نواز کو اس کے فربہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اسی شدت سے اسے چاہتے تھے۔ وہ اب اپنے شادی سے پہلے کے خیالات پر شرمندہ ہوتی رہتی۔

جانے انسان کس بل بوتے غرور کرتا ہے۔ اس نے

زین کو سلام کیا۔ وہ اسے کمزور لگا۔ بال بھی کافی کھچڑی ہوگئے تھے۔ کچھ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ اس نے سوچتے ہوئے زرینہ کے بیٹے کو گود میں لے لیا۔ زین کچھ دیر بعد چلا گیا۔ نواز بھی انصار صاحب کے ساتھ باہر تھے۔ اب رات کے کھانے پر سب اکٹھا ہوتے۔
دونوں یہیں بیٹھ کر پرانی یادیں تازہ کرنے لگیں۔
"دری! تجل یاد ہے تمہیں؟" رخسانہ بیگم اٹھ کر گئیں تو زرینہ نے پوچھا۔
"ہاں! اسے کیسے بھول سکتی ہوں۔" دردانہ چہکتے ہوئے بولی۔
"اس کے شوہر کامران نے دوسری شادی کرلی ہے۔ ایک ٹاپ ماڈل اس کی خوب صورتی اور دولت پر فدا ہوگئی تھی۔ زبردست افیئر کے بعد شادی ہوئی ہے۔ تجل بے چاری خون کے آنسو روتی ہے۔" زرینہ نے بتایا۔
"اوہ!" دردانہ کو دلی افسوس ہوا۔
"یہ مرد بھی بس۔" زرینہ منہ بنا کر بولی۔
"اب ایسے بھی نہ کہو۔ ہمارے شوہروں کی مثال سامنے ہے۔ کامران تو لگتا ہی ایسا تھا۔" وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔
"اور زین کی جاب کہاں ہے؟" وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔
"بس... زرینہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔" وہ بینک کی جاب تو شادی کے چھ مہینے بعد ہی ختم ہوگئی تھی۔ اس کے بعد سے کوئی ڈھنگ کی نوکری مل نہیں پائی۔ تم دعا کرنا۔" اب وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔
"ہاں زری! مشکل وقت کے بعد زندگی میں پرسکون دور بھی آتا ہے۔ لیکن یہ اہم ہے کہ ہم صبر کرکے اس کے پسندیدہ بندے بن جائیں یا بے صبری اور ناشکری کرتے ہوئے وہ دور گزاریں۔"
وہ زرینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بولتی جارہی تھی۔ وہ غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جب چپ ہوئی تو وہ بولی۔
"کتنی بدل گئی ہو۔" مسکرانے لگی۔

دردانہ ہنس پڑی۔ ہر نئی بات اس کے دل میں شکر کے جذبے کو بڑھا دیتی تھی۔ وہ اپنے رب کی بے حد شکر گزار تھی۔ یہی تو اس کی خوشیاں تھیں۔
باورچی خانے سے آتی بریانی کی خوشبو سب جگہ چکرائی پھر رہی تھی۔ انصار صاحب نواز کے ساتھ اندر داخل ہو رہے تھے۔ اپنی منی سی نواسی کو انسوں نے گود میں لے رکھا تھا۔ فہد پودوں پر اڑتے تتلیوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اس نے اپنی رات کی رانی کو پیار سے دیکھا۔ پھر گلابوں کو نظروں میں بھر کر مسکرانے لگی۔ صبر و شکر کے رنگ بھر چکے تھے اور اب منظر مکمل تھا۔

☆

زندگی

زندگی ماگیشری، سارنگ، دیپک، سوہنی
بت تراشی، رقص، موسیقی، خطابت، شاعری

پنکھڑی، تتلی، صنوبر، دوب، نسرین، چاندنی
لاجوردی، شربتی، دھانی، گلابی، چمپئی

زعفرانی، آسمانی، ارغوانی، زندگی
وجد تی، مدھ بھری، کومل، سہانی زندگی

ہر نفس موتی پروتی، پھول برساتی زندگی
خیمۂ زربفت میں پازیب جھنکاتی ہوئی

مرکیاں لیتی، ٹھمکتی، ناچتی، گاتی ہوئی
دوڑتی، بڑھتی، ہمکتی، جھومتی، گاتی ہوئی

اک سنہری تان کی زنجیر بل کھاتی ہوئی
اک انگڑائی دھنک کے پل پہ لہراتی ہوئی

زندگی مڑتے ہوئے پتوں پہ بوندوں کی کھنک
صبح سرما کی کرن، شام بہاراں کی دھنک

شہر تن میں پھول والوں کی گلی ہے زندگی
گرد ان آفاق میں چمپا کلی ہے زندگی

جوش ملیح آبادی

جب ایک دشت کو خوش خبریاں سنائی گئیں
پھر اس زمین سے فصلیں نئی اگائی گئیں

میں جانتا ہوں اس ایک شخص کی خاطر
کہاں کہاں سے یہ آسانیاں تھیں لائی گئیں

خدا کے نام پہ ہم نے بسائی جو بستی
خدا کے نام پہ واں بستیاں جلائی گئیں

بنا کے کشتیاں کاغذ کی شاہ زادوں نے
ہمارے واسطے طغیانیوں میں لائی گئیں

مجھے تو یاد نہیں شکل اپنے منصف کی
مجھے تو یاد ہیں سزائیں جو سنائی گئیں

ہماری دنیا کو دوزخ بنا دیا اور پھر
زمیں پہ اپنے لیے جنتیں بسائی گئیں

حقیقتوں کو چھپانے کی کاوشوں میں حضا
کہانیاں ہمیں کیا کیا نہیں سنائی گئیں

عطاء الحق قاسمی



تیرے میرے درمیاں اب رہا کچھ بھی نہیں
میری جاں! تیرے لیے تو ہوا کچھ بھی نہیں

اک بھرم ہی رہ گیا تھا اپنے رشتے کی بنا
یہ جو ٹوٹا تو سمجھو پھر بچا کچھ بھی نہیں

کس قدر اداس تھا چپ رہا جب بھی ملا
آنکھیں کہہ رہی تھیں، منہ سے کہا کچھ بھی نہیں

بن کچھ کہے سنا دیا فیصلہ اس نے مجھے
کیا خطا ہوئی تھی؟ اس نے کہا کچھ بھی نہیں

ساتھ بھی وبال تھا، چھوڑنا بھی تھا محال
کیوں نہ جانے جلتے تھے ہم پتا کچھ بھی نہیں

نائلہ جاوید قریشی

اعتراف

بھولتا کون ہے
وقت کے گھاؤ کو
ہجر کے تند طوفان کی
وصل کے خواب کی زد بہتی ناؤ کو
بھولتا کون ہے

بھولتا کون ہے
اپنے قاتل کے قاتل خد و خال کو
دکھ اٹھاتے دنوں اور سرد سال کو
بھولتا کون ہے

بھولتا کون ہے
عمر کی شاخ پر کھلنے والی اس اک اولین
شام کو
بے سبب جو لگا ہے اس الزام کو
پھر ترے نام کو
بھولتا کون ہے

زنی گیلانی

ہم بھی مسکرائیں

تجربہ کار

ہالی ووڈ کی ایک اداکارہ جو تیسری شادی کر رہی تھی شادی کی رسومات سے فارغ ہوئی تو روایت کے مطابق اس کے نئے شوہر نے اس کا بازو تھام لیا۔

"تم نے میرا ہاتھ غلط طریقے سے پکڑا ہوا ہے۔" اداکارہ نے اعتراض کیا۔ "میرا ہاتھ چھوڑ دو۔"

"میں نے ٹھیک طریقے سے ہاتھ پکڑا ہے۔" دولہا نے اصرار کیا۔

اداکارہ چڑ کر بولی۔ "میرا تجربہ زیادہ ہے یا تمہارا؟"

عظمیٰ امین

تبدیلی

شوہر: "بیگم! تمہیں یاد ہے میڈیکل کالج میں ایک لڑکا کاشف ہماری کلاس میں پڑھتا تھا۔ یونین کا صدر بھی تھا، وہی جو تم سے شادی کرنا چاہتا تھا؟"

بیوی: "ہاں یاد ہے۔ یہ تقریباً تیس سال پہلے کی بات ہے۔"

شوہر: "آج اس سے ملاقات ہوئی وہ تو اتنا موٹا، گنجا اور بدصورت ہو گیا ہے کہ اس نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔"

نمرہ اقرا

پہچان

دو سہیلیوں کی کافی عرصے بعد ایک بازار میں ملاقات ہوئی۔ ایک دوسرے سے ملتے ہوئے ایک نے کہا۔

"ارے انیلا! تم نے اتنی جلدی مجھے کیسے پہچان لیا۔ حالانکہ میں تو کافی بدل گئی ہوں؟"

"میں تو شاید پہچان بھی نہ پاتی، لیکن تمہیں وہی سوٹ پہنے دیکھ کر جو آج سے نو سال قبل میں بازار مارکیٹ سے ساڑھے بارہ سو کا لائی تھی اور تمہارے بار بار مانگنے پر ایک بار خود پہن کر میں نے تمہیں دے دیا تھا۔ میں نے فوراً تمہیں پہچان لیا۔"

پہلی والی یہ سن کر۔۔۔ شرمندہ ہو گئی۔

"اب یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟"

دوسری نے پھر چوٹ کی۔

"ہاں شاید میں بھی تمہیں اتنی آسانی سے نہ پہچان پاتی، لیکن تمہیں آج وہی دستانے پہنے دیکھ کر جو ایک دن اچانک میرے گھر سے چوری ہو گئے تھے میں نے تمہیں فوراً پہچان لیا۔" پہلی والی جھٹ بولی۔

نویدہ قدیر مرزا۔۔۔ اسلام آباد

غلطی

بازار سے واپسی پر بیوی نے شوہر کو بتایا۔

"گاڑی کے بونٹ پر ذرا سی خراش آ گئی ہے۔ اگر تم دیکھنا چاہو تو ایک نظر دیکھ لو۔ بونٹ ڈکی میں رکھا ہے۔"

افشاں ریحان۔۔۔ کراچی

اظہار مسرت

پروفیسر صاحب کے گھر کی کال بیل بجی تو انہوں نے اپنی خوبصورت بیوی سے کہا۔

"اگر باہر پروفیسر راحیل ہوں تو اس سے کہہ دینا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔"

کچھ دیر بعد بیگم واپس آئیں تو پروفیسر صاحب نے پوچھا۔

"کون تھا۔۔۔؟"

"پروفیسر راحیل ہی تھا اور اس نے یہ سن کر بہت خوشی کا اظہار کیا کہ آپ گھر پر نہیں ہیں۔" بیگم نے

سادگی سے بتایا۔

مسرت الطاف احمد۔۔۔ میٹرو ول کراچی

قابل دید

مرغا بانگ دیتے دیتے عاجز آچکا تھا کیونکہ اس کی بانگ سے بمشکل دو یا تین نمازی ہی نماز کے لیے اٹھتے تھے۔ ایک دن مرغے نے بانگ دیتے دیتے چیخنا شروع کر دیا۔

"آج تو تم جاؤ بڑ حرام ہوں! فجر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔"

فوراً" ہی کافی تعداد میں لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکلے۔ نماز پڑھنے کے لیے نہیں' بلکہ اس مرغے کو ڈھونڈنے کے لیے۔

مسرت الطاف احمد۔۔۔ کراچی

خوب گزرے گی۔۔۔!

طالب میاں سعدیہ کو بچپن ہی سے پسند کرتے تھے اور اس کے ساتھ منگنی ہو جانے پر بے حد خوش تھے ایک روز ترنگ میں طالب میاں نے سعدیہ سے پوچھا۔

"تمہیں کچھ کھانا وغیرہ بھی پکانا آتا ہے یا نہیں؟"

"کھانا پکانا میں نے کبھی کیا تو نہیں۔" سعدیہ نے شرمیلے لہجے میں کہا۔ "لیکن بچپن کے کھانے پکانے کے طریقے مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ تمہیں یاد نہیں' جب ہم بچپن میں گھر گھر اور مہمان مہمان کھیلا کرتے تھے تو مٹی کے بینگن آلو جوہڑ کے پانی میں دھو کر جھوٹ موٹ کے چولہے پر کتنا اچھا پکاتی تھی۔"

مسرت الطاف احمد۔۔۔ کراچی

موسم

کرایہ دار نے مالک مکان سے کہا۔ "آپ کے گھر کی چھت ٹپکتی ہے۔ اس لیے مرغیاں بھیگ رہی ہیں۔"

"پھر آپ موسم کا خیال کرتے ہوئے کچھ دنوں کے لیے مرغیوں کے بجائے بطخیں کیوں نہیں پال لیتے۔"

فائقہ سہیل۔۔۔ کراچی

خواہش

کسی ملک کے وزیر خزانہ بے تکلف احباب کے حلقے میں چہک رہے تھے۔ "بچپن کا زمانہ بھی کیا زمانہ ہوتا ہے۔ ان دنوں میری تمنا تھی کہ بڑا ہو کر ڈاکو بنوں گا۔"

"مبارک ہو۔" کسی ستم ظریف نے کہا۔ "آپ کی خواہش پوری ہو گئی۔"

فوزیہ تمر بٹ۔۔۔ اہانیہ عمران۔ گجرات

ایمرجنسی

جنگ عظیم دوم کے دوران مجھے بطور جیپ ڈرائیور ایک شیطان قسم کے میجر کے ساتھ لگا دیا گیا۔ ایک دن میں اسے لیے ایک بڑے ہی مصروف بازار سے گزر رہا تھا کہ سڑک کے دوسرے کنارے پر سے ایک خوب صورت لڑکی مخالف سمت میں جاتی دکھائی دی تو وہ تیزی سے بولا۔

"سارجنٹ! فوراً" اس گاڑی کو روکو' جلدی۔"

میں نے یکایک چونکتے ہوئے گاڑی کا انجن بند کر دیا۔ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ اس نے مجھے رکنے کا حکم دیا ہے اور پھر جب میں نے انجن اسٹارٹ کیا تو لڑکی نجانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

"ایمرجنسی کے وقت تم انتہائی نقصان دہ ثابت ہو گے سارجنٹ۔" میجر گرجا۔

"میرے خیال میں' میں نے بالکل ٹھیک کیا ہے سر۔" میں نے کہا۔ "وہ لڑکی دراصل میری دوست تھی۔"

فائدہ

جعفر صاحب نے اپنی بیگم سے مشورہ طلب انداز میں پوچھا۔

"اگر ہم وجاہت کو سائیکل لے دیں تو تمہارے خیال میں اس کی شرارتیں کم ہو جائیں گی؟"

"یقیناً" بیگم جعفر نے جواب دیا۔ "کیوں کہ پھر وہ زیادہ بڑے رقبے پر پھیل جائیں گی۔"

شگفتہ

یادوں کے جھروکے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

جس نے جھوٹا خواب بیان کیا، اسے جو کے دو دانوں کو ایک دوسرے سے گرہ لگانے کا حکم دیا جائے گا اور وہ ایسا نہیں کر سکے گا، چنانچہ) اسے اس وجہ سے عذاب دیا جائے گا۔ (بخاری)

فوائد و مسائل،

1۔ جس شخص نے خواب نہیں دیکھا، اپنے ہی پاس سے بنا کر بیان کر دیتا ہے۔ اس کا یہ جھوٹ بہت بڑا گناہ ہے۔

2۔ جھوٹا خواب بیان کرنا اس لیے زیادہ بڑا ہے کہ اس کی کسی طرح تحقیق نہیں کی جا سکتی کہ اس نے خواب دیکھا ہے یا نہیں۔

3۔ بعض افراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی اور اہم شخصیت کے خواب میں نظر آنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ عام لوگ اسے ان کی بزرگی کی علامت سمجھ کر محبت و احترام کا اظہار شروع کر دیتے ہیں حالانکہ اصل شرف نیک اعمال کا انجام دینا ہے ورنہ کافر اور منافق تو حقیقی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ کسی احترام کے مستحق نہیں گردانے گئے۔

4۔ خواب کسی کے جائز یا ناجائز کا ثبوت نہیں۔ شرعی مسائل کے لیے شرعی دلائل ضروری ہیں کسی کا یہ دعویٰ کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں کام کی اجازت دی ہے۔ قابل قبول نہیں۔

زبان،

اپنی زبان کو دوسروں کے عیبوں سے آلودہ نہ کرو کیونکہ عیب خود تم میں بھی ہیں اور زبان والے دوسرے لوگ بھی ہیں۔

(امام شافعیؒ)

مرسلہ: نورین مہک۔ برنالی

اچھی حکومت کی نشانی،

ایک بار قدیم چین کے عظیم فلسفی کنفیوشس سے ایک والیٔ ریاست نے دریافت کیا تھا۔

"آقا! یہ بتاؤ کہ اچھی حکومت کی نشانی کیا ہے؟"

کنفیوشس نے جواب دیا۔

"احتجاجات حکومت کی کمی۔"

مرسلہ: ناصر، اکملی ناصر۔ کراچی

اقوال لقمان،

جد و جہد نہ کرنا محتاجی کا باعث ہوتا ہے اور محتاجی دین کو تنگ، عقل کو خفیف اور مروت کو زائل کرتی ہے۔

عائشہ۔ گوجرہ

عقل و حکمت،

عقل و حکمت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔

- نظر نیچی رکھنا۔
- زبان کو بے محل نہ کھولنا۔
- حلال غذا کھانا۔
- سچ بولنا۔
- حسد کو ختم کرنا
- مہمان کی عزت کرنا۔
- ہمسایوں کی حمایت کرنا۔

اور

- جس بات سے کوئی فائدہ نہ ہو اسے ترک کر دینا۔

(حضرت لقمانؒ)

مزہ اقرا۔ کراچی

ذرا سوچیے!

جارج کی عمر پچاس سال سے کچھ زیادہ ہے۔ وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ واشنگٹن میں رہتا ہے۔

عیدالاضحی قریب آ رہی تھی۔ جارج اور اس کے گھر والے ٹی وی، ریڈیو اور انٹرنیٹ پر دیکھ رہے تھے کہ عید کس تاریخ کو ہو گی سنّی اور اسلامی ویب سائٹس پر چیک کر رہے تھے۔ سب کو عید کا بے صبری سے انتظار تھا۔ جیسے ہی ذی الحج شروع ہوا۔ ان لوگوں نے عید کی تیاریاں شروع کر دیں۔ گھر کے قریب ایک فارم ہاؤس تھا وہاں سے انہوں نے ایک بھیڑ خریدی۔ جس کے چناؤ میں تمام اسلامی اصولوں کو مدنظر رکھا۔ بھیڑ کو گاڑی میں رکھا اور گھر کی راہ لی۔

بچوں کا خوشی کے مارے کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ جارج کی بیوی کیتھی نے گھر جا کر اس کو نہلایا۔

"اس بھیڑ کے تین حصے کریں گے۔ ایک حصہ غربا میں بانٹ دیں گے ایک حصہ اپنے ہمسائیوں ڈیوڈ، لیزا اور مارک کو بھیج دیں گے اور ایک حصہ اپنے لیے رکھیں گے۔"

یہ تمام معلومات اسے اسلامی ویب سائٹس سے ملی تھیں۔

کتنے دن کے انتظار کے بعد عید کا دن آ ہی گیا۔ سب بچے خوشی خوشی صبح سویرے جاگے اور تیار ہو گئے۔ اب بھیڑ کو ذبح کرنے کا مرحلہ آیا۔

انہیں قبلے کی سمت کا پتا نہیں تھا لیکن اندازاً مکہ کی طرف رخ کر کے جارج نے بھیڑ ذبح کر لی۔ کیتھی گوشت کو تین حصوں میں تقسیم کر رہی تھی کہ اچانک جارج کی نگاہ گھڑی پر پڑی۔ وہ کیتھی کی طرف منہ کر کے چلایا۔

"ہم چرچ کے لیے لیٹ ہو گئے۔ آج سنڈے ہے اور ہمیں چرچ جانا تھا۔"

جارج ہر اتوار باقاعدگی سے اپنی وائف بچوں کے ساتھ چرچ جاتا تھا۔ لیکن آج عید کے کاموں کی وجہ سے چرچ کا ٹائم نکل گیا۔"

یہاں تک بول کر ہادی چپ ہو گیا۔ ہال میں سب بہت غور سے اس کی بات سن رہے تھے۔ اس کے خاموش ہونے پر ایک بندہ بول اٹھا۔

"آپ نے ہمیں کنفیوز کر دیا ہے۔ جارج مسلمان ہے یا کرسچن؟"

ہادی نے جواب دیا: "جارج کرسچن ہے۔ وہ اللہ کو نہیں مانتا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ خدا کا بیٹا مانتا ہے!"

یہ سن کر ہال میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ آخر ایک شخص کہنے لگا۔

"ہادی! وہ کرسچن کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر وہ کرسچن ہوتا تو مسلمانوں کا تہوار اتنے جوش اور عقیدت سے کیوں مناتا۔ عید کی تاریخ کا خیال رکھنا، پیسے خرچ کر کے بھیڑ خریدنا، اسے اسلامی طریقے پر ذبح کرنا۔"

ہادی یہ سن کر مسکرایا اور بولا۔

"میرے بھائیو! آپ کو یہ کہانی اتنی ناقابل یقین کیوں لگ رہی ہے؟ آپ کو یقین نہیں آ رہا کہ ایسی کرسچن بھی موجود ہو سکتی ہے؟ کیا کبھی ہم مسلمانوں میں سے کوئی عبداللہ، کوئی خالد، کوئی خدیجہ، کوئی فاطمہ نہیں دیکھی جو کرسچن کے تہوار مناتے ہوں؟ اپنے مسلمان بھائیوں کو کرسمس، نیو ایئر، ویلنٹائن، ہالووین، برتھ ڈے وغیرہ مناتے نہیں دیکھا؟ اگر وہ سب حیران کن نہیں تو آپ کو یہ بات کیوں حیران کر رہی ہے کہ غیر مسلم ہمارے تہوار منائیں؟

جارج کا کرسچن ہو کر عید منانا ہمیں عجیب لگ رہا ہے لیکن تمام غیر اسلامی تہواروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں تو کسی کو عجیب نہیں لگتا۔ بخدا میں دس سال امریکہ میں رہا کبھی کسی یہودی یا عیسائی کو مسلمانوں کا تہوار مناتے نہیں دیکھا۔ لیکن جب میں واپس اپنے مسلمان ملک آیا تو مسلمانوں کو ان کے تہوار بہت جوش و خروش سے مناتے دیکھا۔"

ہال میں سب خاموش تھے۔ ہادی کی بات میں

ایک کڑوی سچائی ہے۔
عائشہ ، تحریم - گوجرہ

لفظ بولتے ہیں،

☆ جن لوگوں کے دلوں میں محبت کی کرنیں بغیر کسی صلے یا تمنا کے پھوٹتی ہیں، وہ سب سے حسین لوگ ہوتے ہیں۔

☆ دل کی پلیٹ پر لکھنے سے پہلے سوچ لیں کہ نقش مٹائے نہیں مٹتے۔

☆ اہم بات یہ نہیں کہ آپ ہار گئے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہارنے کے بعد آپ ہمت تو نہیں ہار گئے۔

(منتظر حسین نازش)
قوذیہ ، نمرہ شہ - گجرات

آپ بھی سنیں،

☆ ضمیر کی عدالت میں ضرور جائیے کیونکہ وہاں فیصلے غلط نہیں ہوتے۔

☆ جڑیں سلامت ہوں تو ٹنڈ منڈ درختوں پر بھی موسم بدلتے ہی پھول آ جاتے ہیں۔
عمیرا نوشین - منڈی بہاؤالدین

عالموں کی عزت،

امیر اسمٰعیل بن احمد سامانی، خراسان کا بادشاہ تھا۔ اس کا سب سے بڑا بھائی امیر اسحاق بھی اس کے درباریوں میں شامل تھا۔

ایک دن بخارا کا کوئی عالم کسی ضرورت سے امیر اسمٰعیل سے ملاقات کے لیے آیا۔ امیر نے ادب اور احترام کے طور پر سات قدم بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔

امیر اسحاق کو یہ ناگوار گزرا اور اس نے اسمٰعیل کو سمجھایا۔

"اس قسم کی تعظیم بادشاہوں کے شایانِ شان نہیں بلکہ شخص کے حفظِ مراتب کی ایک حد ہوتی ہے اور اس سے آگے بڑھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔"

امیر اسمٰعیل نے جواب دیا۔ "میں نے اس کے علم کی وجہ سے اس کی عزت کی ہے کیونکہ علم سب سے بڑا شرف ہے۔"

اسی رات امیر اسمٰعیل نے خواب میں دیکھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

"میری امت کے ایک عالم کی تو نے عزت کی اور اُسے لینے کے لیے تو سات قدم آگے بڑھا۔ میں اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا ہوں کہ تیرا نام اور نسل زندہ رہے اور تیرے بعد تیرے سات فرزند بادشاہی کو پہنچیں۔ تیرے بھائی کی نسل منقطع ہو جائے تاکہ اس کی اولاد میں سے کسی کو بادشاہی نصیب نہ ہو۔"
صائمہ حسیں - کراچی

قیامت اور معافی،

ایک مرتبہ امیر المومنین مامون نے احمد کو ولایت سے معزول کر کے دربار خلافت میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ جب وہ حاضر ہوا تو مامون نے سخت سست کہنا شروع کیا۔ اور اس نے جو خطائیں کی تھیں، ایک ایک کر کے گنوانے لگا۔

جب تمام جرائم کی فہرست دُہرا چکا تو احمد نے پوچھا۔

"کل قیامت کے دن امیر المومنین سے بھی اسی طرح حساب لیا جائے گا اور ایک ایک جرم بتا کر جواب طلب کیا جائے گا اس وقت امیر المومنین کس چیز کو پسند فرمائیں گے؟"

مامون نے جواب دیا۔ "مجھے معافی کا حکم پسند ہے۔"

احمد نے جواب دیا۔ "تو میرے حق میں بھی معافی ہی پسند فرمائیے۔"

اس پر مامون نے اس کے تمام جرم معاف کر دیے۔
ندا ، نفسہ - فیصل آباد

مرتبہ: خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

ثمرہ اقرأ ـــــــ کراچی
آج ٹوٹ کر اس کی یاد آئی تو احساس ہوا
اثر باتیں جو دل میں بھلائے نہیں جاتے

ثنا عبدالقیوم ـــــــ بنگہ حیہ
محبت کے سفر میں کوئی بھی راستہ نہیں دیتا
زمیں واقف نہیں بنتی فلک سایہ نہیں دیتا
خوشی اور دکھ کے موسم سب کے اپنے اپنے ہوتے ہیں
کسی کو اپنے حصے کا کوئی لمحہ نہیں دیتا

نوال افضل گھمن ـــــــ لاہور
کیا پوچھتے ہو میری زیست کی کتاب کا
ہر ورق ہے لپٹا ہوا درد و غم میں
کبھی فرصت ملے تو سوچنا اے دوست
یہ سال بھی گزر گیا تیرے ہجر و فراق میں

نجبہ اکرم ـــــــ گاؤں کریلکی
چاروں سو پھیلی خوشبو کی حفاظت کرنا
اتنا آسان بھی نہیں تجھ سے محبت کرنا

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ـــــــ کراچی
دیکھا مجھے تو ترک تعلق کے باوجود
وہ مسکرا دیا یہ ہنر بھی اسی کا تھا

پاکیزہ ہاشمی ـــــــ بہاولپور
واقعہ یہ ہے کہ بدنام ہوئے
بات اتنی تھی کہ آنسو نکلا

فریدہ لاکھو ـــــــ نواب شاہ
خوش نہ تھا مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی
اس کے چہرے پہ لکھا تھا لوگو

صائمہ آصف ـــــــ اسلام آباد
ہمیں خبر ہے ہوا کا مزاج رکھتے ہو
مگر یہ کیا کہ ذرا دیر کو رکے بھی نہیں

نجمہ نور ـــــــ شیخوپورہ
لازم نہیں کہ اس کو بھی میرا خیال ہو
جو میرا حال ہے وہی اس کا بھی حال ہو

رابعہ اقبال ـــــــ حاجی واہ
ٹوٹنا دل کا کوئی ایسی نئی بات نہیں
توڑنے والے تیری خیر، پریشان کیوں ہے

زوبیہ حنیف ـــــــ کالونی سرگودھا
حیات بیچ دیں عقوبتِ سیم یار کے بدلے
یہ کاروبار بھی تیرے غلام کرتے ہیں

آمنہ عائشہ ـــــــ کمالیہ
بھول بھی جاؤ بیتی باتیں
ان باتوں میں کیا رکھا ہے
چپ چپ کیوں رہتے ہو ناصر
یہ کیا روگ لگا رکھا ہے

مہوش ـــــــ جام پور
تو بھی میسر اب مجھے جہاں میں مل کر دیکھ
باہر سے تو دیکھ لیا اب اندر جا کر دیکھ

ماروی مہر بخش ـــــــ گوجرانوالہ
دل کے ہر کھیل میں ہوتا ہے بہت جاں کا زیاں
عشق کو عشق سمجھ، مشغلۂ دل نہ بنا

صوفیہ ـــــــ چیچہ وطنی
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم، وہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو

ماروی ـــــــ سکھر
ہمیں بھی عرضِ تمنا کا ڈھب نہیں آتا
مزاجِ یار بھی سادہ ہے کیا کیا جائے





خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعا گو ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور پاکستان کا برا چاہنے والوں کو ان کے ارادوں میں ناکام کر کے ان کے چہروں کو بے نقاب اور ان کو دنیا میں بدترین انجام سے دوچار کرے۔ (آمین)

پچھلے ماہ سالگرہ نمبر میں سروے "ایک دیا آرزو کا" دیا گیا تھا جس میں قارئین کے وہ سوالات شائع کیے گئے تھے جو وہ مصنفین سے کرنا چاہتی ہیں۔

بہن عائشہ جمیل نے فرح بخاری سوال کیا تھا کہ عازم حیدر حقیقی کردار ہے یا فرضی ہے؟

بہن فرح بخاری نے اس کا میسج کے ذریعے جواب دیا ہے۔ جواب ہے کہ "عازم کا کردار یوں تو فرضی ہے لیکن اسے آپ کچھ حقیقی کرداروں کا مجموعہ کہہ سکتی ہیں۔"

بہت شکریہ فرح جی! آپ نے ہماری قاری بہن کے سوال کا جواب دیا۔ آپ کا جواب ہم عائشہ جمیل تک پہنچا رہے ہیں۔

پہلا خط جڑانوالہ سے کوثر خالد کا ہے۔ انہوں نے اپنے مخصوص اور دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔

سیما علی کا نام اور زندہ دل سا "نانا" پسند آیا۔ "تو سب سے جدا ہی نا" آؤٹ اسٹینڈنگ رہا۔ واہ۔ "اور لڑائی کرو گندے بچو۔" نعت و حمد میں تو "تحریر پھول" کی قبولیت سند ہے۔ "دین کی باتیں" شکر ہے تو سب ہے ورنہ کچھ نہیں۔ اور صدقے سے بڑھ کر تو کچھ نہیں ہے۔ "دیا آرزو کا" سب نے میرے دل کی باتیں لکھ دیں' خاص کر عائشہ جمیل نے۔ تاریخ کے جھروکے اور کتابوں پر تبصرہ اس کی انفرادیت کا ثبوت ہے اور معیار تو سب سے بلند ہے۔ اگر مجھے مصنفین ملیں تو بس ان کو تکتی رہوں گی۔ سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی تحریروں سے انہیں جان چکی ہوں۔ بھی تو ناموں سے بھی پہچان لیتی ہوں کہ شخصیت پر نام کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ "بندھن" تنا بچھ دار ہے اور ٹھیک پیغام دیا۔ "ایک تھی مثال" حسب توقع جاری ہے۔ "الٹی ہو گئیں سب تدبیریں" دلچسپ و سبق آموز رہی۔ احساس ملکیت صرف اللہ کو سجتا ہے۔ "شانزے کی ساس" "تم میرے باقی سب تمہارا"۔ انعامی کہانی "میری عمر کی جمع پونجی" بھی بس ایسی ہی عبارت ہے اور ہم بھی قطرہ قطرہ سمندر بنانے میں کوشاں ہیں۔ "وہ اک لمحہ" "ایک طویل اور دلچسپ داستان۔" نایاب جی اللہ نہ کرے کسی کی زندگی میں بدبودار لمحے آئیں۔ ہم تو خوشبودار لمحوں سے تکمیل کی دعا مانگیں گے۔ ام طیفور کامیڈی و ٹریجڈی کی خاص ملکہ۔ بہترین تحریر' بہترین گانا "چلو دلدار چلو' چاند کے پار چلو' ہم ہیں تیار چلو" ذرا اس پر لکھیے نا۔ آج ہم اپنی دعاؤں کا اثر دیکھیں گے۔ میری بچی نے ان کا "قصائی ہرجائی" دوبار پڑھا تھا۔ اس کے پاس وقت نہیں پڑھنے کا۔ وہ میرے گھر کی بہو ہے نا۔ مگر ہم اسے عورت بنانے کا چکر چلا رہے ہیں۔ اللہ کرے جلد۔ چھوٹی نند مستانہ جی ہاں یقیناً "خدا کے سوا کسی سے مدد نہیں مانگنی چاہیے۔" نند تو دور کی بات سگی ماں سے بھی ہم مدد نہیں مانگتے' اللہ ہے نا۔ "تعویذ حب" دل نکال کر لے گیا۔ ایمل رضا کا تو نام پڑھ کر ہی دل نے گواہی دے دی تھی کہ زبردست ہوگی اور

واقعی جھوک ریت بھی دل لے گئی ہے۔ انہیں سلام اور ان کے انٹرویو کی فرمائش قبول کریں۔ "رنگ خوشبو" نعیمہ ناز۔ نعیمہ صبا محر سعدیہ عزیز سب سے پہلے آپ کے غم میں شریک ہو لوں۔ اللہ آپ کی ماؤں کو اعلا درجات سے نوازے۔ (آمین) مگر آخر فصل بہار اتر آئی۔ شکر کی بات ہے۔ دکھوں پہ صبر کرنے سے واقعی اطمینان کا انعام دل کو حاصل رہتا ہے۔ میری چہارم کلاس کی ٹیچر نعیمہ یاد آگئیں۔ "کرم کی بارش" ہمارے حسب حال اور ہماری دل پسند تحریر۔ انور شعور جی کا یہ شعر سب کے حسب حال ہے۔

بہتی ہوئی ندی پہ کسے اختیار ہے
میری ہے زندگی نہ تمہاری ہے زندگی

مسکراہٹوں میں اقصیٰ مجھے جتانے پر مجبور کر گئی بس۔ "باتوں سے خوشبو" بھلا کسے نہ آتی ہوگی۔ توحید کی طاقت۔ جب سالوں پہلے اللہ سے سوال کیا تھا یہ شعر سن کر۔ (بزبانی مسز)

دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

تو آج پتا چلا۔ غالباً" یہ شعر حضرت سعدؓ کے لیے ہی فرمایا گیا ہے اور کسی کے ریا کو جلن کر ہم نے کیا کرنا ہے۔ ہم انجان ہی اچھے کہ اللہ کا ہم پر جتنا کرم ہے شاید ہی دنیا میں کسی پر ہو۔ خط آپ کے۔ مسز الیس۔ کے زندہ باد ہیں۔

وی دیکھنا چھوڑ دو نا سب۔ جو لڑکیاں نانا۔ سروے میں حصہ نہیں لے سکیں۔ افسوس کا ہے کا۔ آپ کے سیکھنے کے لیے تو روداد یں اور تجربات پیش کیے جا رہے ہیں۔ اپنے لائحہ عمل کو ترتیب دیجیے اور شادی کے بعد ایک کامیاب زندگی آپ کی منتظر ہو اور امثل آپی کو تو فون کرنے کو دل چاہتا ہے۔ مگر۔ اپنی آواز کی دہشت سے ڈر۔ سب ہی عاجز ہیں ہماری آواز کی بد صورتی سے۔ میرا شریف کو شادی مبارک اور دعائیں بھی۔ البتہ اس بار سرورق کی تعریف کرنی پڑ رہی ہے۔ اتنے تیز میک اپ میں بھی شہزادلسن ہی۔ پتا ہے کیوں اچھی لگ رہی ہے کہ اس کا "اندر" دلہن کے جذبات کی عکاسی کر رہا ہے۔ ورنہ جذبات میں اثر نہ ہو تو خوب صورت نین نقش صرف ایک بے جان بت ہوتے ہیں۔
ج۔ کوثر! تحریر واقعی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ چہرے سے بھی بہت کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن یا سمین والی آپ کی بات سے ہم متفق نہیں۔ ایک ہی نام کے ہم نے اتنے مختلف ذہن اور خیالات کے لوگ دیکھے ہیں کہ زمین آسمان کا فرق ہے۔

آپ کی یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ ہر حال میں خوش اور اللہ کا شکر ادا کرتی ہیں۔ نائلہ کے بارے میں بھی آپ نے صحیح کہا۔ بے جان تاثر سے عاری چہرے ہمیں بھی اچھے نہیں لگتے۔

علامہ اقبال نے اس شعر میں عقبہ بن نافع کی جانب اشارہ کیا ہے جب مراکش میں دشمنوں کا پیچھا کرتے ہوئے اچانک ان کے سامنے دریا آگیا تو انہوں نے اپنے ساتھیوں سمیت گھوڑے دریا میں ڈال دیے۔ دین کی سربلندی کے لیے دریا کی روانی کو بھی خاطر میں نہ لائے۔

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" ہمیں آپ کا سلسلہ مل گیا ہے۔ لیکن آپ نے بہت مختصر جواب لکھے ہیں۔ تھوڑی تفصیل سے دوبارہ لکھ کر بھجوائیں۔ آپ کے تو خط بھی اتنے دلچسپ ہوتے ہیں تو اس سلسلے کو تو بہت مزے دار ہونا چاہیے۔ آپ کی بیٹی کے لیے دعائیں عورت کو عورت کی طرح رہنا چاہیے۔ عورت کا درجہ اور مقام بہت بلند ہے۔ وہاں سے جو کسی قوم کی بنیاد ہوتی ہے۔ نپولین نے کہا تھا تم مجھے اچھی مائیں دو میں تمہیں اچھی قوم دوں گا۔ تنزیلہ ریاض نے عہد الست میں بڑی اچھی بات لکھی ہے۔

"اللہ نے بیٹی دی ہے تو فخر سے اسے بیٹی والی سوچ کے ساتھ پالیں اسے اس کے ہونے کا فخر دیں، غرور دیں' تاکہ وہ کل کو نہ صرف اپنے گھر کے لیے بلکہ معاشرے کے لیے بھی ایک صحت مند کردار ادا کر سکے۔"

ثمائلہ شریف لکھتی ہیں

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتوں کے بعد فوراً" پہنچی "ایک سی مثال" پہ۔ مگر یہ کیا؟ ہمیشہ کی طرح بہت کم صفحات اور حیرت در حیرت عفت کے بارے میں آکر عدیل' مثال کی زندگی تباہ کرنے پر تیار ہو گیا۔ "نعوذ حب" ابصل رضا کی بہت اچھی کوشش تھی اور خوب صورتی سے اپنے اختتام کو پہنچی۔ "سیاہ حاشیہ" بلاشبہ ایک اور کمال کی تحریر بننے والی ہے۔ افسانوں میں "الٹی ہو گئیں

تحریریں" اور "چاند کے پار چلو" بہت سبق آموز کہانیاں تھیں۔ نایاب جیلانی کا "ڈاک ٹو" بھی بس ٹھیک رہی۔ اگست کا مہینہ تھا اور ساجدہ حبیب کی آزادی کے حوالے سے کوئی تحریر دیکھنے کو نہیں ملی۔

ج ۔ پیاری شمائلہ! بڑے عرصے بعد ہمارا ساجدہ حبیب سے رابطہ ہوا ہے ہم نے ان تک قارئین کی فرمائشیں پہنچادی ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد شعاع اور خواتین کے لیے لکھیں گی۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

ایم اسرار نے مردان سے لکھا ہے

شعاع جیسے ڈائجسٹ نے "پیرِ کامل" "جنت کے پتے" اور "یارم" جیسے شاہکار ناول ہمیں دیے۔ کافی سالوں سے زیر مطالعہ ہے شعاع۔ شکریہ۔ خط خاص طور پر رقص بسمل کے لیے لکھ رہی ہوں۔ شعاع کے تیس سالہ سفر میں اس جیسا ناول کبھی شائع نہیں ہوا۔ (معذرت کے ساتھ) کہانی آگے بڑھنے کا نام نہیں لے رہی اور اوپر سے ہر دو ماہ بعد غائب۔ تیس دن بہت ہوتے ہیں پانچ صفحات لکھنے کو مگر یوں لگتا ہے نبیلہ جی منجدھار میں پھنس گئی ہیں۔ ان کی خود سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کیا لکھیں۔ خدارا کچھ تو سوچیں، شعاع کے معیار کو اتنا مت گرائیں۔ "سیاہ حاشیہ" صائمہ اکرم بہت خوب صورتی سے کہانی کی گرہیں کھول رہی ہیں۔ عکلوو عرف ڈیڈی ہی صالح آ گئی ہیں۔ نایاب جیلانی عرصے بعد آئیں اور خوب لکھا مگر اتنی شدت کیوں ہوتی ہے نایاب کے کرداروں میں۔

ج ۔ پیاری ایمن! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ شعاع کے ناول آپ کو پسند نہیں آرہے ہیں۔ ہمیں خود احساس ہے کہ رقص بسمل کے صفحات بہت کم ہوتے ہیں اور کہانی آگے نہیں بڑھ پا رہی ہے۔ نبیلہ بہت اچھی مصنفہ ہیں مگر اس وقت پریشان کن حالات کا شکار ہیں۔ اس کے باعث لکھ نہیں پا رہی ہیں۔ آپ دعا کریں کہ ان کی پریشانی دور ہو جائے تاکہ وہ یکسوئی سے لکھ سکیں۔

اقصیٰ مریم سلطان، اسوہ مریم سلطان۔ کالسی اسٹریٹ کوٹ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

اگست کے شمارے سے شعاع ایک نیا سلسلہ شروع کر چکا ہے۔ "تجھ سے ناتا جوڑا ہے" میری ناقص رائے جس سے باقی قاری بہنوں کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے یہ ہے کہ اس سلسلے میں بہت سے ایسے سوالات ہیں جو کہ کسی بھی شادی شدہ قاری بہن کی پرائیویٹ لائف اور پرائیویسی کو بڑی بری طرح سے ڈسٹرب کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ میاں جی کے جوابات کو ہی لے لیجیے میاں جی کے ان جوابات کی روشنی میں اگر کچھ کہا جائے تو میں کہہ سکتی ہوں کہ اس قسم کے جوابات پڑھ لینے کے بعد میاں جی کی خوب درگت بنی ہوگی۔ اچھے یا برے ذاتی زندگی کے تجربات کو کسی ایسے رسالے کی زینت بنا دینا جس کی پہنچ دور دور تک ہو انتہائی غلط بات ہے۔ لہٰذا اس سلسلے کو جلد از جلد ختم کر دینا چاہیے۔ باقی قارئین اپنی آراء سے ضرور آگاہ کریں اور میاں جی بھی کہ آیا ان کے جوابات کی اشاعت کے بعد ان کے ساتھ کیا کچھ ہوا۔ اب آتے ہیں تبصرے کی جانب شعاع اس ماہ بھی سو سو رہا۔ نایاب جیلانی کو مبارک باد، اچھا ناول تھا۔ نفیسہ ناز اور سعدیہ عزیز آفریدی، صبا عمران تمام رائٹرز کی ماؤں کے لیے ڈھیر ساری دعائے مغفرت کرتی ہوں، افسانے سارے اچھے تھے۔

ج ۔ پیاری اقصیٰ اور اسوہ! قارئین کی زندگی کے اچھے یا برے تجربات سامنے لانے کا مقصد یہ ہے کہ سسرال والوں کو احساس دلایا جائے کہ ایک لڑکی اپنے گھر کے ماحول سے نکل کر بالکل مختلف ماحول میں آتی ہے تو سسرال والوں کے رویوں سے اس پر کیا گزرتی ہے۔ والدین کو بھی یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو غیروں کے حوالے کرتے ہوئے اچھی طرح دیکھ بھال کے اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔
جہاں تک درگت بننے کا تعلق ہے تو ضروری نہیں ہے کہ اپنا اصلی نام لکھا جائے۔ قارئین اس سلسلے کے لیے فرضی نام بھی استعمال کر سکتی ہیں۔
قارئین کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے۔ آیا یہ سلسلہ جاری رکھا جائے یا بند کر دیا جائے یہ فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑ رہے ہیں۔
شعاع آپ کو پسند نہیں آیا۔ معذرت خواہ ہیں۔ مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

افرا اشتیاق نے طور جہلم سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

اللہ کا شکر ہے اس بار شعاع دو تاریخ کو ہی مل گیا، لیکن

خواتین نہیں ملا۔ سرورق تو بہت خوب صورت ہے۔ میک اپ بھی اچھا ہے اور مہندی تو کمال ہے۔ تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ "سیاہ حاشیہ" اور "تعویذ حب" کی تعریف کے لیے الفاظ بھی کم پڑ گئے ہیں۔ نایاب جیلانی کا نام ہی بتا رہا ہے کہ ناول کمال کا ہوگا۔ نیا سلسلہ "جب مجھ سے ناتا" اچھا ہے۔ غیر شادی شدہ لڑکیوں کو سیکھنے کا موقع ملے گا۔ توبہ وجداں ای نا' سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاریخ کے جھروکے میرا سب سے پسندیدہ سلسلہ ہے۔ آپ کے تمام پرچوں سے اسلامی معلومات اور اچھی باتیں میں نہ صرف نوٹ کرتی ہوں بلکہ عمل کرنے کی بھی کوشش کرتی ہوں۔ آپ کے پرچوں سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ پلیز شاہین رشید سے میری درخواست ہے کہ وہ مشہور صحافی اور اینکر وسیم بادامی کا انٹرویو کریں۔

ج ۔ پیاری اقرا! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ ہمارے تینوں پرچوں کی باقاعدہ قاری ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

حمیرا لوشین نے منڈی بہاؤالدین سے لکھا ہے

ایک ماہ کے طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد شعاع مل جانے کی خوشی دیدنی تھی اور اس خوشی میں میرا ساتھ دینے کے لیے دودھ ابل ابل کر نیچے فرش پر خوب لوٹنیاں لگا رہا تھا۔ ساتھ ہی دوسرے چولہے پر چڑھا گوشت کا سالن اپنے سے میری بے توجہی برداشت نہ کرسکا اور وہ جل کر کباب ہوگیا۔ میاں اور بچے پس منظر میں چلے گئے اور میں "سیاہ حاشیہ" میں غوطہ زن ہوگئی۔ ایمل رضا کے ناول سے زیادہ مجھے ناول کا نام پسند ہے۔ میں اس کو درمیان درمیان سے پڑھتی ہوں اور ایمل کی منظر نگاری کی دل سے قائل ہوجاتی ہوں۔ ام طیفور کی تحریر شروع میں مزاح کا عنصر لیے ہوئے تھی اور اینڈ پر تو اپنے لیے ایک سبق بھی تھا۔ "چھوٹی نند" پڑھ کر ہانیہ کی چالاکی پر بے حد غصہ آیا' آتی

اچھی بھابھی کو اتنا عرصہ پریشان کیے رکھا۔ ایسے نندوں کو تو سبق ملنا چاہیے۔ قرۃ العین خرم ہاشمی کی کہانی کے اینڈ پر عمار اور ثانیہ کے جملے پسندیدگی کی سند حاصل کرگئے۔ نئے سلسلے میں میاں علی کی ازدواجی زندگی کے رازوں سے واقفیت ہونے پر ان کے لیے دل سے ڈھیروں دعائیں نکلیں۔ ویسے

یہ کون سی رائٹر تھیں یا قارئین میں سے تھیں۔ خط آپ کے میں قارئین بہنیں بہت ہی عمدہ خطوط لکھتی ہیں۔ انٹرویو سب کے اچھے تھے۔ اشعار بالکل بھی پسند نہیں آئے۔

ج ۔ پیاری حمیرا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ میا علی ہماری ایک قاری بہن ہیں' لیکن ان کی تحریر کی روانی دیکھ کر ہم نے بھی انہیں افسانے لکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ بہت اچھے افسانے لکھ سکتی ہیں۔

عروج یوسف نے کراچی سے لکھا ہے

آج کا خط لکھنے کی خاص وجہ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" آخر کیوں شروع کردیا یہ سلسلہ۔ 100 میں 99.9 پرسینٹ شادی شدہ لوگوں کے ٹانکے ادھیڑ کر رکھ دیے آپ نے۔ نام الگ ہوں گے مگر احساسات سب کے ایک سے ہوں گے کس کس کے زخموں پر مرہم رکھیں گی آپ۔ ابھی آج T-20 میچ دیکھتے ہوئے ایک بات ذہن میں آئی تو سوچا آپ سے اور اپنی بہنوں سے ڈسکس کرتی ہوں کہ وہ اس بارے میں کیا کہتی ہیں اور پلیز اسے ایڈٹ نہ کیجئے گا بھلے ایڈٹ کم لگے آپ کو۔ ایک شادی شدہ لڑکی' عورت اور اس کا سسرال بھی کرکٹ گراؤنڈ میں ہونے والے میچ کی طرح ہیں۔ ایک طرف وہ عورت اور دوسری طرف سسرال' وہی مخالف ٹیم' وہی امپائر' وہی تھرڈ امپائر حتیٰ کہ تماشائی بھی وہ۔ بے چاری عورت تھارڈ کٹ کو بچانے کی تگ و دو میں رہتی ہے۔ (مصباح الحق کی طرح) اور کبھی تو یوں ہی عمر بیت جاتی ہے اور کبھی بلکہ زیادہ تر اسی باؤلر کے ہاتھوں اس کی ساری وکٹیں اڑ جاتی ہیں جو اتفاق سے اس کے مجازی خدا کے عہدے پر فائز ہوتے ہیں۔ باؤنسر پر باؤنسر مارتے رہتے ہیں اور بالآخر ایک نئے فریش کھلاڑی کو (دوسری بیوی) ورثہ کے سامنے لاکھڑا کرتے ہیں اور وہ پہلا کھلاڑی ناکام اپنی کوششوں پر آنسو بہاتا پویلین لوٹ جاتا ہے۔ (یہ پویلین کبھی تو ماں باپ کا گھر

ہوتا ہے اور کبھی ابدی گھر) آپ کا کیا خیال ہے؟ پلیز ضرور بتایئے گا ایسا ہی ہے نا؟ میں اپنی دوستوں کی رائے بھی جاننا چاہتی ہوں اور ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ نہیں پوچھوں گی کیونکہ اس کا جواب آپ سمیت کسی کے پاس نہیں

ہو گئے۔

ج ۔ ہماری امی کہتے ہیں جب کوئی تنازعہ ہوتا ہے تو صرف ایک طرف کی کہانی سن کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ایک طرف کی کہانی آدھی سچی ہوتی ہے۔ اگر کہیں بہو کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو کہیں ساس، نندوں کے ساتھ بھی برا ہوتا ہے کیا آپ نے ان ماؤں کو نہیں دیکھا جن کے بیٹے شادی کے بعد بیوی اور ماں کے جھگڑوں سے تنگ آکر ماں کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ ہمارے ہاں زیادہ تر بہو کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔ لیکن سو فیصد والی بات بالکل غلط ہے۔

نجمی المراتی پاسلاحت مصنفہ فریدہ ہاک جن سے شریک محفل ہیں لکھتا ہے

خوب صورت ماہ اگست کے استانی حسین ٹائٹل سے لطف اندوز ہو کر فہرست تک پہنچے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں حرف حرف سینے میں اتار کر "ایک دیا آرزو کا" میں ہر کسی کی رائے پڑھ کر ہم تو چپ۔ شریک ہو کر بھی شریک رہے وجہ ہر دوست کے ہمارا تو سے سوالات وہی تھے جو خود ہمارے دل میں بھی تھے "بند حسن" کا سلسلہ پسند ہے مگر شاہ سے الرجک ہونے کی بنا پر اس ماہ گول کر گئے۔

"جب مجھ سے ناتا جوڑا ہے" استانی یونیک آئیڈیا جس کسی کے بھی دماغ میں آیا کمال کا ہے سوالات جتنے منفرد اور مزے کے تھے سیاہ علی کے جوابات بھی انتہائی برجستہ اور رواں لگے۔ الحمد للہ ہم اس سلسلے میں اپنے 15 سالہ تجربے کی بنا پر شرکت کرنے کے لائق ہیں اگر اجازت میسر ہو تو سلسلے وار ناول میں "ایک تھی مثال" سے ہمیں لاکھ شکایات سہی مگر رفعت ناز کی تحریر پڑھے بنا ہم آگے بڑھ نہیں سکتے۔

"تعویذ حب" کی تینوں اقساط اکٹھا کر کے مطالعہ کیں۔ لازوال تحریر ایک ایک لفظ موتی جڑا ہوا ایسی تحریر پڑھ کر ہم خود کو مصنف کہلانے لائق بھی نہیں پاتے ایمل رضا کیسی لگیں تو "تعویذ حب" ہم بھی ان کے گلے میں ڈال دیں۔

"سیاہ حاشیہ" میں بارش کی نظم اور منظر نگاری نے لطف دیا۔ پاک چین میں بارش ہمیشہ پڑتی ہے کے رکھتی ہے خوشیوں کی طرح آنکھوں سے بوندوں کو ترستے رہتے۔

اس ماہ تین اسٹوریز میں شانزے کا نام استعمال ہوا۔ "شانزے کی ساس" ثمینہ فضل کی مختصر اور جامع تحریر اگرچہ میری ساس میری سگی ممی کی طرح ہیں مگر اچھی بات جتنی بار دہرائی جائے کم ہے "اپنی تدبیریں" ایک اور شانزے کا کامیاب پلان افشی اسٹوری بھی یقیناً "کسی نہ کسی گھر میں ایسا ہوتا ہوگا" "گرم کی بارش" "قرۃ العین خرم ہاشمی کے بارے میں بتائیں کہ یہ ایک ہی نام ہے کہ دو الگ الگ کیونکہ قرۃ العین اور خرم ہاشمی کے درمیان کوما ہے۔ عجیب سا لگا۔

"مکمل ناول" کا آخر میں سکون سے مطالعہ کیا نایاب جیلانی کا نام تو فہرست میں دیکھ کر ہی بلیوں اچھل پڑے۔ میری سب سے فیورٹ رائٹر عمیرہ علیم کے بعد تو ہم ان کے دیوانے ہی ہو گئے ہیں۔ شعاع میں گزشتہ کچھ عرصے سے اسٹوریز کے موضوعات اور اسلوب میں بہت فرق آگیا ہے ایسے میں نفیسہ ناز اور نایاب جیلانی کے روایتی انداز تحریر اور موضوع نے خوشگواریت کا احساس فراہم کیا سب سے اعلا بات یہ کہ نایاب جی کی تحریر میں کوئی کردار بھی فرشتہ یا دیوتا نہیں تھا عام انسان تھے جن کی خوبیاں اور خامیاں سب تحریر میں نظر آئیں۔ نفیسہ ناز کی تحریر "اپنے سارے رنگوں سمیت ہمارے دل میں اتر گئی۔ "اس ماہ کی مسکراہٹیں" میں "بے قصور" "بہت یونیک" اور "فی خیز" انتخاب تھا۔ "باتوں سے خوشبو آئے" "میں صدقے کی برکت" نے دماغ کی گرہیں کھول دیں۔

"خط آپ کے" میں اس بار خطوط کی تعداد کم تھی اور جو شامل تھے انہیں کافی کانٹ چھانٹ کا سامنا کرنا پڑا تھا، صاف لگ رہا تھا۔ مسرت الطاف کے بارے میں پہلی بار جانا کہ یہ ان کی مسز ہیں۔ ان کے خطوط کافی سوبر ظاہر کرتے تھے (سوبر سے ہماری مراد ایجڈ تھی)۔

حسن ایس کے حسین کی بات سے ہم اتفاق نہیں کرتے انڈین پاکستانیوں سے زیادہ محب وطن نہیں وہاں ہندوستان سے محبت بھی پاکستان سے نفرت جتانے کے لیے کی جاتی ہے، وہاں کے فلمی گیتوں کی معلومات ہمیں بھی ہیں مگر ذرا مختلف رائے ہے آپ سے بہرحال اپنی اپنی [illegible] ہے۔

اس سال اللہ نے دو خوشیوں سے نوازا ایک مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اعتکاف کی سعادت نصیب فرمائی

اور دوسرے خواتین ڈائجسٹ اور شعاع کو ادبی ساخت بنایا۔

پیاری فریدہ! سب سے پہلے عمرے کی مبارک باد۔ مسجد نبوی میں اعتکاف بہت بڑی سعادت ہے۔ اللہ تعالیٰ قبولیت عطا فرمائے۔ اپنی دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھیے گا۔ فریدہ! آپ جتنا اچھا لکھتی ہیں، تبصرہ بھی اتنا ہی عمدہ ہے۔ بہت جامع اور خوب صورت انداز، ہر تحریر اور سلسلے پر نظر۔ بلاشبہ ایک اچھا مصنف اچھا قاری بھی ہوتا ہے۔

اب تک آپ نے مختصر تحریریں لکھی ہیں۔ باقاعدہ کہانی کا پلاٹ ترتیب دے کر ناول یا ناولٹ لکھیں۔ اور سلسلے میں لکھنے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں۔ ضرور لکھیں ہم آپ کے پندرہ سالہ تجربے سے مستفید ہونے کے منتظر ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ شعاع اس وقت بہنوں کا پسندیدہ ترین پرچہ ہے۔

کراچی سے ثمینہ اکرم لکھتی ہیں

سالگرہ کا سروے "ایک دیا آرزو کا" جو قارئین کے بہترین جوابات پر مشتمل ہے، بہت پسند آیا۔ اس میں اپنے شریک نہ ہونے کا دل رنج ہوا۔ نیا مستقل سلسلہ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" سیاہ عمل کے حقیقت سے قریب تر جوابات من کو بھائے۔ واقعی شادی شدہ زندگی "اک آگ کا دریا ہے اور تیر کر جانا ہے" کے مصداق ہوتی ہے جبکہ اچھی بیٹیاں اپنے والدین کی تربیت پر حرف نہیں آنے دیتیں۔ یہ سلسلہ بہت خوب ہے مگر جن کے سسرال میں بھی شعاع پڑھا جاتا ہو۔ (میری طرح!) وہ قارئین کیا کریں؟ کیونکہ اس طرح اپنے تجربات اور آپ بیتی نوک قلم لانے میں سسرال والوں کی ناراضی کا بھی خدشہ ہے نا۔ پھر آئینہ دیکھنا کون پسند کرتا ہے جی۔ "ایک تھی مثال" مثال، ذاتی کو ملتے ملتے پھر دور ہوگئی۔ افسانے اس بار سب بہترین لگے۔ مکمل ناول "وہ ایک لمحہ" نایاب جیلانی کافی عرصہ بعد جلوہ افروز ہوئیں۔ فرحت لی اور وکیل صاحب کی نوک جھونک دلچسپ لگی اور اس ہلکی پھلکی مزاحیہ تحریر سے کچھ تو ٹینشن ریلیز ہوئی ہے اس طرح کی دلچسپ تحریریں ہر بار شامل ہونی چاہئیں۔

مکمل ناول "نفور رجب" (ایمل رضا) کی قارئین میں دھوم مچی ہوئی ہے مگر اب تک میں ایک قسط بھی نہ پڑھ پائی۔ اس ناول میں کرداروں کے مشکل مشکل نام ہیں، اس کا فلسفہ، زبان، بیان، انداز تحریر سب کچھ میری عقل و فہم سے اوپر کی چیزیں ہیں۔ لہٰذا بہت تسلی، توجہ اور دھیان کی محتاج ہے یہ تحریر۔ اور مجھے وقت فرصت ملے تو کچھ بات بنے۔

سب سے زیادہ مجھے نفیسہ ناز کا ناول "رنگ اور خوشبو" پسند آیا۔ کہانی پلاٹ اور کردار سب جاندار تھے۔

صائمہ اکرم چوہدری میری پسندیدہ رائٹر ہیں اور "سیاہ حاشیہ" اول قسط سے ہی دل میں گھر کر گئی ہے۔ عبداللہ اگر زندہ ہے تو مدینہ کو مل جائے ورنہ یہ لڑکی تو منگیتر کی نہ ملنے کا بدلہ ہر ایک سے لے گی۔ اس قدر باغی لڑکی ہے مدینہ کہ خدا کی پناہ۔

"تو نبہ وجدا ای نا" آمنہ مفتی کا کیا یہ سفرنامہ ہے؟ ایلوویرا کا پودا کب سے گھر میں لگا ہوا ہے مگر ایلوویرا کے فائدے شعاع کے توسط سے معلوم ہوئے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

ج: پیاری ثمینہ اکرم! خالد اس بار شامل ہیں۔ یہ بتائیں کہاں غائب تھیں۔ بہت سی قارئین کے ساتھ ساتھ ہم نے بھی آپ کی کمی شدت سے محسوس کی۔ یقین کریں کہ آپ کے خط نہ لکھنے سے ہمیں تشویش لاحق ہوگئی تھی اور ہم دعا کر رہے تھے کہ آپ خیریت سے ہوں۔ آئندہ خط میں اپنا فون نمبر ضرور لکھیں تاکہ ہم آپ سے رابطہ کر سکیں۔

جب "تجھ سے ناتا جوڑا ہے" یہ نیا سلسلہ ہم نے ایک خاص مقصد کے تحت شروع کیا ہے۔ وہ لوگ جو بہت چاؤ سے ایک لڑکی کو بہو بیوی بنا کر گھر میں لاتے ہیں لیکن اسے وہ عزت اور مقام نہیں دیتے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ ہم ان تک یہ احساسات پہنچانا چاہتے ہیں کہ ایک لڑکی جب سب کچھ چھوڑ کر ایک نئے گھر میں قدم رکھتی ہے تو اسے ان رویوں سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں ہم اصل نام شائع نہیں کریں گے۔ فرضی نام دیں گے۔ آپ بھی اس میں شرکت کر کے قارئین تک اپنے تجربات پہنچائیں۔ اپنا اصلی نام نہ لکھیں کوئی بھی فرضی نام لکھ سکتی ہیں۔

"تو نبہ وجدا ای نا" آمنہ مفتی کا سفرنامہ ہے۔

صائمہ اکرم کے ناول میں عمرہ بانی نہیں ہے۔ لیکن امن کی ماں کی سخت گیر طبیعت نے اس میں تجسس پیدا کر دیا ہے۔

مسرت الطاف احمد نے کراچی سے شرکت کی

اس بار شعاع کا ٹائٹل بہت ہی متاثر کن اور دل کو چھو لینے والا تھا۔ سب سے زیادہ منڈی نے ہمیں گھائل ہی کر دیا البتہ سالگرہ نمبر کے حوالے سے اگست کا شمارہ کچھ اور بہتر ہو سکتا تھا افسانوں کی بھرمار تھی اور مکمل ناول قابل تعریف ضرور تھے لیکن انٹرسٹنگ اور انٹریکٹیو نہیں تھے ڈپریسنگ تلخ حقیقت پر مبنی اسٹوری تھی۔ "سیاہ حاشیہ" میں شاہزیب کا کردار میرا موسٹ فیورٹ کردار اور بہت ہی انٹریکٹو بھی اور دیا اور ارسم کا کردار ایک آنکھ نہیں بھایا۔ "دو ایک تھے" اسٹوری بہت ہی اشوٹنگ اور حقیقت کے قریب تر محسوس ہوئی ہیوں اور فرحت آپی کی نوتوں میں اور ان کے ڈائیلاگز بہت ہی دلچسپ تھے۔ "رنگ اور خوشبو" نعیمہ ناز نے اپنوں سے جڑے رشتوں کی تلخ حقیقتوں اور جفاکیوں کو عیاں کیا۔ افسانوں میں حنا یاسمین کا "الٹی تدبیریں" بہت ہی زبردست تحریر تھی۔ فیئر آپی مزے کی بات بتاؤں میں اور صائمہ جڑواں سسٹر ہیں ہمارے عادات و اطوار ایک دوسرے سے نوٹلی ڈفرنٹ ہیں۔ جنوں میں روایتی نوک جھونک بھی ہوتی ہے لیکن ایک دوسرے کی چیزوں کے لیے کبھی بھی کھینچا تانی نہیں ہوئی۔

پیاری مسرت! ہمیں افسوس ہے کہ سالگرہ نمبر آپ کی پسند کے معیار پر پورا نہیں اتر سکا۔ جبکہ سالگرہ نمبر میں وہ مصنفین شامل تھیں جو ہماری قارئین کی پسندیدہ ہیں۔ نعیمہ ناز، نایاب جیلانی، صائمہ اکرم، حنا یاسمین، ام طیفور اور قرۃ العین خرم ہاشمی قارئین کی پسندیدہ مصنفین ہیں دو نام البتہ نئے تھے مہناز یوسف اور ثمینہ فیصل۔ نئے سلسلے کو بھی ہماری قارئین نے بہت پسند کیا ہے۔ آپ کے پیارے بھانجے فیصل کو سالگرہ کی مبارک باد اور دعائیں۔ 6 ستمبر کا دن پاکستان کی تاریخ میں بھی یادگار دن ہے۔

آسیہ ارم کراچی سے لکھتی ہیں

میں شعاع کی 30 سال پرانی قاری ہوں۔ عمر میری 38 سال ہے۔ بچپن سے ہی شعاع کا چسکا لگا ہوا ہے اس ماہ میرے دوست کی سالگرہ ہے۔ اسی لیے اپنی ناراضی کو لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔

"سیاہ حاشیہ" صائمہ اکرم چوہدری کا یہ ناول مجھے بہت پسند ہے اس لیے اسے ہی پڑھا ہے ابھی تک۔

پیاری آسیہ! معذرت خواہ ہیں۔ آپ کے پچھلے خطوط شامل نہ ہو سکے۔ آپ شعاع کی ابتدا سے قاری ہیں۔ آپ کی رائے ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ آئندہ تفصیلی تبصرہ لکھیں۔

قارئین متوجہ ہوں!

1. ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
2. افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔
3. ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
4. کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
5. مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
6. تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
7. ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع
37- اردو بازار کراچی

دستک دستک دستک

شاہین رشید



منی بیگم

منی بیگم سے پہلی ملاقات ان کے گھر پر ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہیلو ہائے ہوتی رہی۔ پھر یہ امریکہ شفٹ ہو گئیں۔ ان کا آنا جانا لگا رہا۔ مگر ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔۔۔ کچھ دنوں پہلے ایک محفل میں ان سے ملاقات ہوئی تو کچھ باتیں ہوئیں۔

"جی کیسی ہیں آپ؟"

"الحمد للہ۔۔۔ بڑے دنوں بعد ملاقات ہوئی آپ سے۔"

"بس اتفاق ہے۔۔۔ اتنے برس بیت گئے" "آپ کے گلے کا سُر ماشاء اللہ برقرار ہے کیا راز ہے؟"

قہقہہ۔ "راز کچھ بھی نہیں لوگوں کی محبت نے میرے گلے کے سُر کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ جب تک لوگ پسند کرتے رہیں گے۔ دعائیں دیتے رہیں گے، میں گاتی رہوں گی ان شاء اللہ۔"

"ان شاء اللہ۔۔۔ کسی نے بتایا کہ آپ اپنی لائف ہسٹری لکھنا چاہ رہی ہیں؟"

"جی میں اپنی سوانح عمری لکھنا چاہ رہی ہوں اور میری سوانح عمری کی خاص بات یہ ہوگی کہ اس میں میں اپنی دو ہجرتوں کے بارے میں لکھوں گی۔"

"دو ہجرتیں؟۔۔۔ کیا مطلب؟"

"جی میں نے دو ہجرتیں کی ہیں اور اس کے بارے میں بہت کچھ لکھنا چاہتی ہوں لوگوں کو بہت کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ پہلی ہجرت میں نے ڈھاکہ سے کراچی کی اور دوسری ہجرت کراچی سے امریکہ کی۔"

"دونوں ہجرتوں کی کوئی خاص وجہ؟"

"پہلی ہجرت کی تو کوئی خاص وجہ نہیں تھی بس پاکستان سے محبت تھی اس لیے کی اور دوسری ہجرت مجبوری کے تحت کی کیونکہ یہاں پاکستان میں رہ کر میں اپنے بچوں کی کفالت ٹھیک طرح سے نہیں کر پا رہی تھی میرے مالی حالات بہت اچھے نہیں تھے۔ چنانچہ امریکہ جانا پڑا اور شکر ہے کہ وہاں جا کر بہت جلد تک حالات بہتر ہو گئے۔"

"بہت کم عمری سے آپ اس فیلڈ میں ہیں۔ آواز کی چاشنی ابھی تک برقرار ہے۔۔۔ کس طرح حفاظت کرلی ہیں؟"

"میں نو سال کی عمر سے اس فیلڈ سے وابستہ ہوں، اور نہ صرف اپنی آواز کی بلکہ اپنی صحت کی بھی بہت حفاظت کرتی ہوں۔ یاالله۔ چھوڑتی ہوں مگر اپنی صحت کی دعائیں بہت مانگتی ہوں، کھانے پینے کے معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیتی ہوں ایسی چیزوں سے پرہیز کرتی ہوں جس سے گلا خراب ہونے کا ڈر ہو،

بالی ننھا حفاظت کرنے والا ہے۔"

"منی بیگم۔ سب سے یونیک نام۔ مگر اصل نام نادرہ بیگم تھا۔ شخصیت پہ کوئی اثر پڑا؟"

"جب منی بیگم نام رکھا گیا تب واقعی یہ نام مجھ پر سوٹ کرتا تھا اور نادرہ بیگم میری شخصیت کے حساب سے ایک بڑا نام تھا۔ اب نادرہ سوٹ کرتا ہے منی نہیں مگر شہرت اور میری پہچان بن گیا ہے یہ نام تو شخصیت پہ ہی اثر پڑا کہ اس نام کو میں اپنے لیے لکی نام سمجھتی ہوں کہ اس نام سے میں مشہور ہوئی۔"

"منی بیگم نام رکھا کس نے تھا؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں پانچویں کلاس کی طالبہ تھی تو میری کلاس میں شیخ مجیب الرحمٰن کا بیٹا کمال بھی تھا اور ہماری بڑی اچھی دوستی بھی تھی' اسے بھی گانے کا شوق تھا اور مجھے بھی تو اکثر اوقات ہم دونوں مل کر گایا کرتے تھے۔ ایک دن ہمارے پرنسپل نے ہمیں گاتے دیکھا تو کہا کہ آپ تو بہت اچھا گاتی ہیں۔ کیا نام ہے آپ کا؟ ہم نے بتایا کہ نادرہ بیگم تو کہنے لگے کہ اتنی سی بچی کا اتنا بڑا نام۔ آپ کا نام تو منی ہونا چاہیے بس پھر اس کے بعد تو جیسے یہ نام سب کی زبانوں پر چڑھ گیا۔"

"ہوں... اچھا... آپ تقریباً پندرہ سولہ سال قبل امریکہ چلی گئی تھیں۔ آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہوگا۔ کچھ تبدیلیاں آئیں پاکستان میں؟"

"میں جب آئی کراچی میں ہی ٹکی اس بار پنڈی اور اسلام آباد اور پھر لاہور جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ تو لاہور میں مجھے زیادہ ترقی نظر آئی کہ نئی سڑکیں بنی ہیں۔ نئے پل... میٹرو بس اور بھی بہت کچھ... تو اچھا لگا اپنے ملک میں ترقی دیکھ کر۔ مگر ترقی پورے ملک میں ہونی چاہیے۔"

"آج کل تو کوئی سنگر تھوڑی سی بھی شہرت حاصل کرتا ہے تو انڈیا دوڑ جاتا ہے یا پھر وہاں سے آفرز آجاتی ہیں۔ آپ کی آواز میں تو جادو ہے آپ انڈیا نہیں گئیں؟"

"یہ بہت اچھا سوال کیا آپ نے۔ مجھے یاد ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں میں نے ایک بار انڈیا میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا اور مجھے پذیرائی بھی بہت ملی تھی مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ہمارے ملک میں پابندی ہے کہ کوئی انڈیا میں اپنے فن کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ چنانچہ جب حکومت وقت کو اس بات کی خبر ہوئی تو انہوں نے تقریباً چار سال کے لیے مجھ پر گانے گانے کی پابندی لگادی۔ جو میرے لیے دکھ کی بات بھی تھی۔"

"تو کس کس کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرچکی ہیں؟"

"میں... میں بھارت کے تین وزرائے اعظموں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرچکی ہوں۔ ان میں ایک اٹل بہاری واجپائی ہیں۔ "ایل کے ایڈوانی" اور نرسما راؤ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ لتا منگیشکر اور دلیپ کمار کے سامنے بھی میں نے ان کی پسندیدہ غزلیں گائی ہیں۔"

"فخر ہوا؟"

"ہاں کیوں نہیں اور شاید ان کو بھی ہوتا ہوگا کہ ہم نے منی بیگم کو لائیو گاتے سنا ہے۔"

"بالکل ہوتا ہوگا... آج کل کے گلوکاروں کے بارے میں کیا کہیں گی؟"

"کچھ فنکار تو بہت اچھا گا رہے ہیں اور خوب نام بھی کما رہے ہیں' مجھے شفقت امانت علی اور راحت فتح علی نے بہت متاثر کیا۔ ان کی گلوکاری میں ان کے آباؤ اجداد کا خون ہے اس لیے ان کی گلوکاری بہت متاثر کن ہے۔"

"اپنے گانے' غزلیں گیت وغیرہ سنتی ہیں تو کیسا لگتا ہے؟"

"بہت اچھا اور اپنی ہی چیزیں زیادہ سنتی ہوں۔ اس وقت جب میں ڈرائیو کررہی ہوتی ہوں۔ دوسروں کو بھی سنتی ہوں مگر اپنے آپ کو زیادہ سنتی ہوں اور اکثر تو خود ہی گاتی چلی جارہی ہوتی ہوں۔"



ملورا حسین

خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ یہی حال اب ان دونوں بہنوں کا ہے۔ شہرت کی بلندیوں کو چھونے والی اب ان بہنوں کے پاس صحافیوں کے لیے بہت کم وقت ہوتا ہے۔

"مریم سیریل میں بہت پیاری لگ رہی ہو کیا رسپانس آرہا ہے؟"

"سچ میں آپا۔ بہت اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ سب کو مجھ سے اور میرے کردار سے بہت ہمدردی ہو گئی ہے دراصل آج کل ڈرامے کچھ ایسے بن رہے ہیں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید ہم سچ مچ روتی دھوتی لڑکیاں ہیں۔"

"عام لائف میں کیسی ہو؟"

"فل آف لائف ہوں۔ زندگی کو انجوائے کرتی ہوں۔ گھومتی ہوں پھرتی ہوں۔ بہت مزے کی زندگی گزار رہی ہوں۔"

"پاؤں میں بیڑیاں نہیں ڈالنی کیا؟ آزادی میں زیادہ مزہ ہے کیا؟"

"آزادی میں جو مزہ ہے سچ میں کسی چیز میں مزہ نہیں ہے۔ جو زندگی میں ابھی گزار رہی ہوں۔ ایسی زندگی کے رنگین خواب دیکھتی ہیں اور مجھے ان کی تعبیر ملی ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں ڈالنوں کی کیونکہ یہ بھی بہت ضروری ہے۔ مگر ابھی نہیں۔ ان شاء اللہ چار پانچ سال تک۔ کیونکہ کچھ پتا نہیں کہ شادی کے بعد کی زندگی کیسی ہو۔ ہماری سوچ کے مطابق ہو یا بالکل ہی مختلف۔ ابھی اور مشہور ہونا چاہتی ہوں' نام کمانا چاہتی ہوں اور پیسہ بھی۔"

"ویسے کوئی آئیڈیل تو ہو گا؟"

"آئیڈیل تو خیر نہیں بنایا۔ کہ آئیڈیل کبھی ملتے نہیں ہیں۔ ہاں خواہش ضرور ہے کہ میرے والد کی طرح پیار محبت کرنے والا ہو' آزاد خیال ہو اور بہت زیادہ روک ٹوک کرنے والا نہ ہو۔"

"آج کل تو انڈین فلمیں بھی سائن کی ہیں آپ نے؟"

"جی۔ بالکل ہیں' اچھی آفرز تھیں' اچھے کردار تھے تو ہاں بھری۔ بس اب آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ کامیابی دے۔"

"پرائیویٹ لائف متاثر ہوتی ہے؟"

"بہت ہوتی ہے۔ بے شک چکا چوند کر دینے والی لائف بھی بہت اچھی ہے۔ پیسہ ملتا ہے۔ شہرت ملتی ہے۔ لوگوں کی نظروں میں ہم معروف شخصیت بن جاتے ہیں۔ اس کے لیے میں اپنے رب کی بہت شکر گزار ہوں۔ مگر جب اپنی فیملی کو اپنے دوستوں کو ٹائم نہیں دے پاتی تو پھر افسوس ہوتا ہے۔"

"مگر یہ بھی تو آپ کے اپنے اختیار میں ہے کہ آپ اتنا کام ہی نہ لیں کہ آپ کی ذاتی زندگی متاثر ہو؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مگر سچ میں اب ہماری پوزیشن ایسی بھی نہیں رہی کہ ہم کسی کو انکار کر دیں۔ پھر آپ کو پتا ہے ناکہ مغرور کا لیبل تو ہم پہ لگے گا ہی۔ پھر وہ باتیں بھی سنائی دیں گی جو ہم نے کبھی بھی نہ ہوں گی۔ تو بس ڈرتی ہوں اس دن سے۔"

"ملک سے باہر جانے کا اتفاق تو ہوتا ہی ہو گا! کہاں رہنے کو دل چاہتا ہے۔ اور واپس آکر ملک کا مستقبل

کیسا دیکھتی ہیں؟"

"بہت جانا ہوتا ہے ملک سے باہر۔ بہت اچھا بھی لگتا ہے' مزہ بھی آتا ہے اور سچ پوچھیں تو مجھے آسٹریلیا بہت اچھا لگتا ہے۔ اور واپس آکر کیا سوچتی ہوں اور کیسا مستقبل دیکھتی ہوں تو میں ویسے تو کچھ نہیں کر سکتی کہ میں پاور میں نہیں ہوں۔ ہاں انفرادی طور پر میں اچھی ہونے کی ضرور کوشش کرتی ہوں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر انسان خود اچھا ہو جائے تو سب کچھ اچھا ہو جائے' بس خود اچھا ہونے کی دیر ہے۔ ہمارا ملک بھی اچھا ہو جائے گا۔"

"پہلی بار کیمرے کا سامنا کرتے وقت ہاتھ پاؤں کپکپائے تھے؟"

"پہلی بار کیمرے کا سامنا بہت کم عمری میں کیا تھا' یہی کوئی بارہ سال کی عمر میں شاید۔ اس وقت اتنا مینشن نہیں تھا اس لیے آسانی سے فیس کر لیا ہاں جب 2012ء میں کیمرے کا سامنا کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ تو بڑے مزے کی چیز ہے۔ پھر سوچا کہ اداکاری کی طرف آجاؤں تو زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے پھر اس جانب توجہ دی۔ اور اللہ نے کامیابی دی۔"

"انڈیا میں جاکر یہاں کی شرمیلی لڑکیاں بھی بہت کھل جاتی ہیں۔ اپنے بارے میں کیا کہیں گی؟"

"آپ مجھ سے تو یہ امید نہ رکھیں کہ میں بھارتی فلم میں کام کرکے آپے سے باہر ہو جاؤں گی۔ بلکہ میں اپنی روایات کو برقرار رکھوں گی اور کوئی ایسا کام نہیں کروں گی کہ میری فیملی کو یا میرے فینز کو شرمندگی اٹھانی پڑے اور مجھے نہیں لگتا کہ میں آئٹم سونگ کر پاؤں گی۔"

"کس انڈین اسٹار کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دیں گی؟"

"رنبیر کپور کو اور اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ وہ مجھے بے حد پسند ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کی اور میری تاریخ پیدائش بھی ایک ہی ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ ہمارے مزاج اور عادتیں بھی ملتی جلتی ہوتی ہوں گی۔"

"پاکستانی فلم میں کام کرنے کی پیشکش ہوئی؟"

"جی آفرز تو بہت ہیں۔ مگر میں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس فلم میں کام کرنا پسند کروں گی جو معیاری ہوگی اور میرا کردار اسٹرانگ ہوگا اور جس کو دیکھ کر میری فیملی بھی مجھ پر فخر کر سکے۔"

"کبھی اسکینڈلز کا سامنا کرنا پڑا؟"

"اسکینڈلز کا تو نہیں اسکینڈل کا سامنا کرنا پڑا اور مزے کی بات یہ کہ جن کے ساتھ میرا اسکینڈل بنا وہ میرے بڑے بھائیوں اور میرے لیے استاد جیسے ہیں لہٰذا

واصفہ سہیل



بتایئے۔" پھر غوث علی شاہ صاحب نے بھی یہی کہا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "کراچی بلکہ پورے سندھ کے میرے اوپر بے شمار احسانات ہیں۔ ایک آخری احسان اور چاہوں گا۔ آپ کے نمائندے کے طور پر کہوٹہ میں ملک کی خدمت انجام دے رہا ہوں۔ کراچی میں مرنا چاہتا ہوں، صرف سات فٹ زمین کی درخواست ہے۔ یہ میرے لیے ضرور رکھیے گا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس مٹی میں دفن ہونا چاہتا ہوں۔"

غوث علی شاہ اور جنرل جہانداد ہکا بکا رہ گئے۔ (شاید انہیں یہ توقع ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب کسی بڑے پلاٹ وغیرہ کی درخواست کریں گے لیکن۔۔۔)

سفارش

ان دنوں شہزاد شیخ بہت خوش ہیں (ابھی ان کی کراچی سے لاہور جو پسند کی جا رہی ہے۔) کہتے ہیں کہ یہ میری



بڑائی

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا تعلق کراچی سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو کراچی سے بے حد لگاؤ ہے۔ وہ اس سرزمین کے شکر گزار ہیں جس نے انہیں سر چھپانے کی جگہ دی اور یہیں وہ اس قابل ہوئے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیرون ملک جا سکیں۔ کراچی سے ان کی محبت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔

ایک دن جہاز میں وہ اسلام آباد سے کراچی جا رہے تھے اس جہاز میں سابق گورنر سندھ جہانداد خان اور وزیر اعلیٰ غوث علی شاہ بھی موجود تھے۔ جنرل جہانداد خان انہیں بلا کر اپنے پاس لے گئے۔ وہاں کراچی کے ایک تاجر بھی بیٹھے تھے۔ ان کے مطابق دوران گفتگو جنرل صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔ کراچی میں آپ جو چاہیں

پہلی فلم ہے۔ اور اس فلم سے میری بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ میرے والد نے مجھے کہا تھا کہ بیٹا! انڈسٹری میں خود سے کام کرنا پڑتا ہے۔(ارے۔ پاپا بوائے) یہاں پہ سفارش زیادہ عرصے نہیں چلتی۔(ارے بھئی چلتی تھی جب ہی تو انڈسٹری میں۔۔؟) میں کوشش کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ضرور ہوں گا۔(لگے رہو۔ بھئی کام میں۔)

خواہش

بھارتی رائٹر اور ڈائریکٹر خالد اعظمی نے اداکارہ میرا کی فلم بغیر معاوضے کے ڈائریکٹ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ خالد اعظمی سے میرا نے امریکہ سے رابطہ کر کے کہا کہ وہ ان کی فلم کی ڈائریکشن دیں لیکن ان کو معاوضہ فلم کی ریلیز کے بعد دیا جائے گا۔(یہ میرا کا ہی حوصلہ ہے کہ وہ اس طرح کی فرمائشیں کرتی ہیں۔) خالد اعظمی نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ان ڈائریکٹرز میں سے نہیں ہیں جو بلا معاوضہ فلمیں بناتے ہیں۔(کچھ تو معاوضہ لے کر بھی نہیں بناتے۔ بھئی فلم۔ اور کیا۔؟) خالد اعظمی کا کہنا ہے کہ میرا نے ان سے کہا کہ وہ اپنی ایک ذاتی فلم بھی بطور رائٹر ان سے لکھوانا چاہتی ہیں۔(کیا وہ بھی بلا معاوضہ؟) میرا نے ان سے مزید کہا کہ وہ جلد ہی ان معاملات کو حتمی شکل دینے انڈیا آ رہی ہیں۔(پہلے پاکستان تو آ جاؤ میں میرا! یہاں کوئی آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ بھئی عدالت اور کون۔)

مبارک

خوب صورت اداکارہ عائزہ خان اور خوبرو ہیرو دانش تیمور گزشتہ سال رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے اور اب خیر سے ایک عدد پیاری سی بیٹی بھی ان کے ہاں آ چکی ہے۔ انہوں نے اپنی ننھی سی پری کا نام "حورین تیمور" رکھا ہے (ہماری طرف سے رحمت مبارک ہو) دانش تیمور تو شادی کے بعد دو تین فلموں میں کام کر چکے ہیں اور پذیرائی بھی حاصل کر رہے ہیں۔ لیکن عائزہ شادی کے بعد سے شوبز سے دور ہیں جب کہ ان کے پرستار اس انتظار میں ہیں کہ وہ کب ٹی وی اسکرین پر دوبارہ اداکاری کا آغاز کریں گی۔ خبر ہے کہ عائزہ خان نے بچی کی پیدائش کے بعد اب فوٹو شوٹس کروانے شروع کر دیے ہیں تو یقیناً اداکاری بھی جلد ہی شروع کر دیں گی۔

کچھ ادھر ادھر سے

☆ محمد علی جناح بالکل ٹھیک تھے اگر ہمارے بزرگوں نے پاکستان بننے کی مخالفت نہ کی ہوتی تو شاید آج پاکستان رقبہ میں بڑا اور زیادہ طاقت ور ہوتا۔ مجھے اپنے ہندوستانی ہونے پر شرمندگی ہے۔ میں کشمیری مسلمانوں کو سلام پیش کرتا ہوں۔

(پھانسی چڑھنے سے پہلے ہندوستانی مسلمان یعقوب میمن کا بیان)

☆ سوشل میڈیا پر جو نام نہاد دانش ور بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ دراصل یہ بالکل وہی معاملہ ہے کہ جس طرح اشفاق احمد فرمایا کرتے تھے کہ کچھ لوگ اسلام کو گالی دینا چاہتے ہیں لیکن خوف خلق کے باعث اسلام کے بجائے مولوی کو لعن طعن کرتے رہتے ہیں۔ یہ دانش ور افغانستان میں پہلے روس اور اب امریکہ کی مجاہدین کے ہاتھوں شاندار اور تاریخی شکستوں کو ہضم نہیں کر پا رہے۔

(منصور اصغر راجہ۔ سب نیام)

جنرل حمید گل کو سی آئی اے نے دنیا کے پانچ بڑے دماغوں میں سے ایک قرار دیا۔ ان کے دشمن بھی ان کی صلاحیتوں کا لوہا مانتے تھے۔ جنرل حمید گل شخصیت سے زیادہ ایک عہد کا نام ہے۔ مسلمانوں کی رزمیہ (جنگی) تاریخ کا چمکتا ہوا عہد۔

(روزنامہ امت) ☆☆

امتہ الصبور

خوش نصیب

یونان میں ایک شخص سولن گزرا ہے۔ یہ ایک مانا ہوا متین فلسفی اور شاعر تھا۔ ایک بار تبرس کے بادشاہ کری سس نے سولن کو اپنے ملک مدعو کیا۔ سولن نے دعوت قبول کرلی۔ ملاقات کے دن بادشاہ اپنے بیش قیمت لباس اور ہیرے جواہر زیب تن کر کے تخت پر جلوہ افروز ہوا اور پورے شاہانہ طمطراق سے سولن کا انتظار کرنے لگا۔ سولن آیا اور اطمینان و بے نیازی سے بادشاہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے بادشاہ کے جاہ و حشم اور سطوت و شوکت پر کوئی توجہ نہ دی۔ بادشاہ بے چین ہو گیا۔ اس نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ سولن کو ہمارے خزانے دکھائے جائیں۔ وزیر نے سولن کے سامنے سونے چاندی اور لعل و زمرد کا ڈھیر لگوا دیا۔ یہ چمک دمک بھی سولن کو متاثر نہ کر سکی۔ وہ بے پروا بیٹھا رہا۔ بادشاہ سے نہ رہا گیا۔ اس نے بلند آواز سولن کو مخاطب کیا۔

"سولن! تم یونان کے مشہور فلسفی ہو۔ بتاؤ تمہارے نزدیک دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی کون ہے؟"

سولن نے پُروقار لہجے میں کہا۔ "بادشاہ! میرے ملک میں ٹیلس نامی ایک آدمی بہت خوش نصیب تھا۔ وہ بہادر نیک، صاحب نصب اور اچھے بچوں کا باپ تھا۔ اس نے اپنے وطن کی خاطر لڑتے لڑتے جان دے دی۔"

"اس کے بعد دوسرا خوش نصیب کون ہے؟" بادشاہ نے دریافت کیا۔

سولن نے جواب دیا۔ "دو بھائی سب سے زیادہ خوش نصیب ہیں۔ انہوں نے ماں کی خدمت کرتے کرتے جان دے دی۔"

بادشاہ آگ بگولا ہو گیا۔ "کیا تم ہمیں خوش نصیب نہیں سمجھتے؟"

"خوش نصیب وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ خوش نصیبی زندگی کے آخری لمحے تک رہے۔" سولن نے وضاحت کی۔ "جس کی زندگی ابھی ختم نہ ہوئی ہو، اس کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ انسان کی زندگی ہمیشہ ایک حالت پر برقرار نہیں رہتی۔"

بادشاہ مشتعل ہو گیا۔ اس نے سولن کے ساتھ انتہائی نفرت و حقارت کا سلوک کیا۔

بعد میں شہنشاہ سائرس نے تبرس فتح کرلیا اور بادشاہ کری سس کو زندہ جلا دینے کا حکم دیا۔ کری سس کو جلانے کے لیے لکڑیوں پر بٹھایا گیا۔ اس کے منہ سے ایک دردناک چیخ بلند ہوئی۔ "ہائے سولن۔"

فاتح بادشاہ نے ہاتھ اٹھا کے کارروائی اچانک رکوا دی اور کری سس کے قریب جا کر سوال کیا۔

"ہائے سولن سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

کری سس نے پورا واقعہ بتا دیا۔ فاتح بادشاہ یہ واقعہ سن کر مغلوب ہو گیا۔ اس نے کری سس کی جان بخش دی اور اس کے ساتھ عزت و تکریم سے پیش آیا۔

رفعت قریشی۔ کراچی

توزک جہانگیری سے

جہانگیر رقم طراز ہے۔

سلطان نصیر الدین اپنے مزاج کی گرمی دور کرنے کے لیے بسا اوقات پانی میں بیٹھا رہتا۔ ایک دن وہ ایک گہرے حوض میں ڈوبنے لگا۔ چند خادموں نے اسے بچالیا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے ایک خادم کے ہاتھ قطع کرا دیے۔ اس خادم نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کے پانی سے باہر نکالا تھا۔ سلطان نے اسے سوئے ادب سمجھا۔ جب وہ دوسری مرتبہ ڈوبنے لگا تو کسی نے پانی سے باہر نہیں نکالا۔ وہ ڈوب کے مر گیا۔ اس کی موت کے ایک سو دس برس بعد ہم نے اس کی گلی سڑی نعش کو جلا دینے کا حکم دیا پھر سوچا کہ اس کی ناپاک نعش جلا کر آگ کی لطافت کیوں کم کی جائے۔

خواتین ڈائجسٹ



ستمبر 2015ء
کے شمارے کی ایک جھلک

- "فیصلہ سامنے تھا" آسیہ رزاقی کا مکمل ناول،
- "شہرِ آشوب" امۃ العزیز شہزاد کا مکمل ناول،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول "نمل"،
- عمیرہ احمد کا ناول "آبِ حیات"،
- عفت سحر طاہر کا ناول "بن مانگی دعا"،
- ناعمہ جبیں، فرح بخاری اور صدف آصف کے ناولٹ،
- قرۃ العین رائے، بشریٰ احمد، سمیرا حمید، فروا خان اور نازیہ جمال کے افسانے،
- ہم ٹی وی کے اینکر "ارسلان خالد" سے ملاقات،
- "ڈاکٹر نادیہ حسین" سے باتیں،
- "حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ" مصنفین سے سروے،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور ان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا ستمبر 2015 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

بلوچی کشمشی قورمہ

ضروری اشیا :

مرغی کا گوشت	1 کلو
پیاز (باریک کاٹ لیں)	3 عدد
لورک (باریک کٹی ہوئی)	1 چائے کا چمچہ
لہسن پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
سرخ مرچ پاؤڈر	1 کھانے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	1 کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
دہی	1 کپ
کشمش (دھو کر بھگو دیں)	1/4 کپ
نمک، تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ساس پین میں تیل گرم کرکے اس میں گوشت سنہرا رنگ آنے تک بھون کر نکال لیں اور اسی تیل میں پیاز سالتے کرلیں۔

پیالے میں دہی، سرخ مرچ پاؤڈر، لہسن پیسٹ، ہلدی پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ گوشت اس میں ڈال کر دس منٹ کے لیے رکھ دیں۔

سالتے کی ہوئی پیاز میں مسالا لگا گوشت مع آمیزے کے ڈال کر اتنا بھونیں کہ روغن اوپر آجائے۔ گوشت گلانے کے لیے تھوڑا پانی ڈال دیں۔ گوشت گل جائے تو کشمش، لورک اور گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر پانچ منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔

مزیدار بلوچی کشمشی قورمہ ڈش میں نکال کر نان یا تافتان کے ساتھ سرو کریں۔

ٹوکیو چوپ سوئی

ضروری اشیا :

گوشت (اسٹرکٹ)	1/2 کلو
(ابال کر ٹکڑے کاٹ لیں)	
نوڈلز	1 پیکٹ
ہری پیاز	3-4 عدد
(لمبائی میں کاٹ لیں)	
سویا ساس	1/4 کپ
سفید سرکہ	2 کھانے کے چمچے
چلی گارلک ساس	1 کھانے کا چمچہ
ووسٹر شائر ساس	1 کھانے کا چمچہ
ہاٹ چلی ساس	1 کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	4 کھانے کے چمچے

ترکیب :

کڑاہی میں تیل گرم کرکے ابلے ہوئے نوڈلز ہلکے سے فرائی کرکے نکال لیں۔ اسی تیل میں گوشت ڈال کر فرائی کریں اور ہری پیاز ڈال کر دو منٹ فرائی کریں۔ سویا ساس، ووسٹر شائر ساس، سفید سرکہ، چلی گارلک ساس، ہاٹ چلی ساس اور نمک ڈال کر فرائی کریں نوڈلز شامل کردیں۔

ڈش میں نکال کر کیچپ کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

کلاسک ڈرائی چکن

ضروری اشیا :

مرغی کا گوشت	1/2 کلو
ٹماٹر	5-6 عدد
(بیج نکال کر کاٹ لیں)	
لال مرچ پاؤڈر	1 چائے کا چمچ
ٹماٹو کیچپ	1/4 کپ
لورک، لہسن (پسا ہوا)	1 چائے کا چمچہ
کارن فلور	2 کھانے کے چمچے

دہی	2 کھانے کے چمچے
نمک 'تیل	حسب ضرورت
ہری پیاز (باریک کٹی ہوئی)	2 کھانے کے چمچے

ترکیب :

ساس پین میں تیل گرم کر کے گوشت 'ٹماٹر' لال مرچ پاؤڈر 'کبھی 'ادرک' لہسن 'دہی اور نمک ڈال کر بھون لیں اور گوشت میں تھوڑا سا پانی ڈال کر گلا لیں۔ گوشت گل جائے تو ہری پیاز شامل کر کے تین سے چار منٹ تک پکائیں۔ گوشت کو ٹھنڈا کر کے اس پر کارن فلور چھڑک کر گہرے تیل میں تل لیں۔ ڈش میں نکال کر گرم گرم پیش کریں۔

چاکلیٹ فج کیک

ضروری اشیا :

میدہ	175 گرام
کوکو پاؤڈر	2 کھانے کے چمچے
بیکنگ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
پسی ہوئی چینی	150 گرام
انڈے	2 عدد
تیل	3/4 کپ
دودھ (بغیر بالائی کا)	3/4 کپ

کوٹنگ اور فلنگ کے اجزاء :

پھیکا مکھن	5 کھانے کے چمچے
پسی ہوئی چینی	175 گرام
کوکو پاؤڈر	3 کھانے کے چمچے
دودھ	1 کھانے کا چمچ

ترکیب :

ایک باؤل میں میدہ 'بیکنگ پاؤڈر اور کوکو پاؤڈر ڈال کر ملا لیں اور چھلنی میں ڈال کر ان تمام اجزا کو چھان لیں اس کے بعد اس میں پسی ہوئی چینی شامل کر کے اچھی طرح ملا لیں۔ میدے کے آمیزے میں انڈے' تیل' دودھ شامل کر کے خوب اچھی طرح پھینٹ لیں۔ جب تک آمیزہ بالکل ہموار نہ ہو جائے اس آمیزے کو مکھن یا تیل سے چکنے کیے ہوئے کیک پین میں ڈال کر پہلے سے گرم اوون میں 180 پر رکھ کر پچیس سے تیس منٹ تک بیک کریں تیار ہو جانے پر اوون سے نکال کر ٹھنڈا کر لیں۔ (اوون نہ ہونے کی صورت میں یہ کیک دیگچی میں بھی بنایا جا سکتا ہے)۔

آئسنگ کے لیے :

کسی برتن میں مکھن ڈال کر نرم ہونے تک پھینٹیں اور ساتھ ساتھ اس میں پسی ہوئی چینی اور کوکو پاؤڈر شامل کر کے مزید پھینٹیں۔ اس کے بعد اس میں تھوڑا دودھ شامل کر لیں تیار کیے ہوئے کیک کے درمیان میں سے سلائس کاٹ لیں۔ اور کیک کے سلائس پر دو چمچے دودھ کے پھیلا کر ڈال دیں۔ آئسنگ ہموار شکل اختیار کر لے تو کیک کی دونوں حصوں کو آئسنگ سے کور کر دیں اور ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

نان خطائی

اجزا :

میدہ	دو کپ
گھی	آدھا کپ
چینی (باریک پیس لیں)	آدھا کپ
انڈے کی زردی	دو عدد
بیکنگ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ

ترکیب :

سب سے پہلے گھی کو اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اب اس میں چینی ڈال کر مزید پھینٹ لیں۔ اس کے بعد اس میں میدہ اور بیکنگ پاؤڈر ڈال کر آٹے کی طرح گوندھ لیں۔ اب اس کی تھوڑی گول گول اپنی پسند کی ٹکیاں بنا لیں۔ اوون کو دس منٹ تک 180 پر گرم کر لیں۔ اب ٹکیوں کو پندرہ سے بیس منٹ تک بیک کر لیں۔ اوون میں رکھتے وقت تمام ٹکیوں پر انڈے کی زردی کی معمولی مقدار لگاتے جائیں۔ مزیدار نان خطائی تیار ہے۔

حسن و صحت

موٹاپا ایک عذاب

وزن کم کرنے کے لیے پہلے ان باتوں کا خیال رکھیں۔

وزن کم کرنے کی مہم میں ایک بات جو بڑی اہم اور ضروری ہے وہ ارادہ ہے۔ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں لیکن یقین سے مستقل کوشش کرنا ضروری ہے۔ کامیابی یک دم نہیں، آہستہ آہستہ حاصل ہوتی ہے۔

درمیانی عمر کی ایک موٹی عورت اگر وزن کم کرنا چاہتی ہے تو اس کو صرف ایک ہزار کیلوریز والی خوراک حاصل کرنی چاہیے۔ موٹاپے سے نجات پانے اور اس کے اثرات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ خوراک میں پروٹین کا استعمال زیادہ ہو۔ زائد پروٹین کی موجودگی سے جسم کی حرارت و قوت کے استعمال میں تیزی آجاتی ہے جس کی وجہ سے قوت کا زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ مٹھائی، خشک میوہ، کیک، پلاؤ، چینی، بالائی، حلوہ، پڈنگ اور دیگر میٹھی اشیاء سے پرہیز کریں۔ خوراک پر کنٹرول کے دوران ورزش جاری رکھنی چاہیے اور ورزش میں آہستہ آہستہ اضافہ کرنا چاہیے جس سے نہ صرف وزن میں کمی ہوگی بلکہ جتنا وزن کم کیا جائے گا اسے قائم بھی رکھا جاسکے گا۔ موٹاپے کا علاج دواؤں کے ذریعے اتنا کارگر ثابت نہیں ہوا۔ موٹاپا کم کرنے کے لیے عادت میں نظم و ضبط خصوصاً خوراک پر کنٹرول کرنا لازمی ہے اور یہ انسان کو خود کرنا پڑتا ہے۔

ورزش

پیدل چلنا بہترین ورزش ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ کھانا اچھی طرح ہضم ہو جاتا ہے بلکہ وزن قابو میں رہتا ہے۔ اگر آپ ورزش نہیں کرتے اور محض غذائی احتیاط سے وزن گھٹانے کی فکر میں ہیں تو اس کے نتیجے میں آپ بے شک جسم کو گھٹا لیں گے لیکن ڈھلکا ڈھلکا گوشت، بے جان جسم اور وقت سے پہلے جھریاں آپ کا مقدر بن جائیں گی۔ جبکہ ہلکی پھلکی پندرہ منٹ تا بیس منٹ روز کی چہل قدمی آپ کے ڈھیلے ہوتے ہوئے عضلات کو برقرار رکھے گی۔

وزن گھٹانے والی دوائیں

وزن گھٹانے والی اکثر دوائیں مہلک اثرات بھی رکھتی ہیں۔

وزن کم کرنے کے لیے چند نسخے اور گھریلو ٹوٹکے درج ذیل ہیں۔

☆ صبح و شام ایک عدد لیموں ایک گلاس پانی میں نچوڑ کر نہار منہ استعمال کریں۔

☆ ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک چمچ شہد گھول کر نہار منہ استعمال کریں۔

☆ آج کل سلمنگ سینٹرز میں وزن کم کرنے کے لیے سینکڑوں روپے کے بدلے میں جو سفید پاؤڈر دیا جاتا ہے وہ درحقیقت پسی ہوئی اسپغول کی بھوسی ہوتی ہے۔ دو چمچ اسپغول کی بھوسی صبح و شام آپ بھی استعمال کریں۔

☆ پپیتے کے دس عدد بیج (پھلی) رات کو آدھا کپ دودھ میں بھگو کر رکھ دیں۔ صبح نہار منہ دودھ میں چینی ملا کر اچھی طرح ہلا کر پندرہ دن تک استعمال کریں۔ بادی اور ثقیل اشیاء سے سخت پرہیز کریں۔

بڑھا ہوا پیٹ کم کیجیے

بڑھا ہوا پیٹ ایک مصیبت اور عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ ملبوس بھی، قدم چلتے بڑی سانس پھولتی ہے۔ بیٹھے رہنے یا چکنی اور میٹھی چیزوں کی کثرت سے پیٹ بڑھ جاتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لیجیے کہ کھانے کے بعد کم از کم ایک گھنٹے تک پانی نہیں پینا چاہیے۔ دوسری تدابیر کے سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ غذا میں کمی کردی جائے اور زیادہ کھانے کی عادت ترک کردینی چاہیے۔

بڑھے ہوئے پیٹ کو کم کرنے کے لیے لیموں اور شہد کا استعمال مفید ہے۔ اسپغول کی بھوسی بھی آپ کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اصلی چنگ تلاش کرکے اس سے حاصل کریں اور اسے گھی میں اچھی طرح بھون لیں۔ جب چنگ کا رنگ تبدیل ہونے لگے تو آنچ ہلکی کر کے الگ کرلیں۔ اب اس گھی کو کسی شیشی میں محفوظ کرلیں اور روزانہ رات کو سوتے وقت ناف کی جگہ مالش کریں۔ پیٹ کم کرنے میں یہ نسخہ خاصا مفید پایا گیا ہے۔

☆